دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

یل 2014

نگرانِ اعلیٰ

معراج رسول

جاسوسی ڈائجسٹ

جلد 44 • شمارہ 04 • اپریل 2014 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021)35895313 فیکس (021)35802551

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: 63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

لیجیے... اپریل 14ء کا شمارہ حاضر ہے۔ پچھلے مہینے کے ان صفحات میں بیوروکریسی یعنی نوکر شاہی کے بگاڑ اور حکمرانی کا نوحہ لکھا گیا تھا اور کم و بیش ان ہی دنوں اس انتظامی مشین کے کچھ کل پُرزوں نے تھر کے مفلس و بے زبان باسیوں پر وہ قہر ڈھایا کہ الامان... کسی نے فرمایا کہ گندم بھیج دی گئی تھی، اسے بانٹنا ہمارا کام نہیں ہے... ایک بیوروکریٹ بولا کہ گندم گودام میں تھی، ترسیل کے لیے کرایے کی رقم نہیں تھی... کتنے سفاک ہیں یہ لوگ کہ بھوک اور وبائی امراض سے مرنے والوں کا سہارا بننے کے بجائے حیلے بہانوں سے اپنے اپنے خول میں سمٹے رہے..... قحط اور وبائی امراض سے ہونے والی یہ ناگہانی ہلاکتیں ایک قومی المیہ ہیں... یہ اعلان روبہ عمل آنا چاہیے کہ حیلہ تراشوں کو عبرت ناک سزائیں دی جائیں گی... اپنے فرائض سے مجرمانہ غفلت برتنے والے، ٹارگٹ کلرز اور دہشت گردوں سے کم نہیں ہیں کیونکہ ان کی سہل پسندی سے بھی مرد و زن، بچے اور بوڑھے سسک سسک کر دم توڑتے رہے ہیں۔ ایک طرف عوام کی بے بسی اور بے کسی ہے تو دوسری طرف اشرافیہ کے ایک حصے کی خرمستیاں۔ گھر کے ایک بھیدی نے لنکا ڈھایا تو بھری برادری نے اسے اچھوت بنا دیا... اس کے الزامات اور ثبوتوں کی جانچ پڑتال اسی ہاؤس کے چند معزز اراکین کے سپرد کی گئی جنھوں نے ثبوت ناکافی قرار دے دیے۔ چلیں اب یہ قصہ دفن ہوا۔ ہمارے سب رہنما اور نمائندے پارسا ہیں۔ انہیں معززین کی سند مل گئی ہے۔ یہ قوم کے لیے خوش ہونے اور بغلیں بجانے کا موقع ہے۔ آئیں! ہم بھی اپنی اس محفل میں چلتے ہیں جہاں کچھ دوست سر پیٹ رہے ہیں تو کچھ بغلیں بجا رہے ہیں...

کراچی سے ادریس احمد خان کی رائے ”جاسوسی ڈائجسٹ اگرچہ دیر سے سہی مگر ہمیشہ آمد دل خوش کن ہوتی ہے مانندِ بہار... سرورق ذاکر صاحب کے ہاتھوں کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اندر کے صفحات پر چینی نکتہ چینی میں احتساب اور خود احتسابی کا ذکر تھا۔ یہ تو شاید اب ایک کتابی لفظ بن کر رہ گیا ہے۔ اس معاشرے میں احتساب صرف اور صرف ہم دوسروں کا کرنے پر زور دیتے ہیں جب خود احتسابی کرنا شروع کر دیں گے تو معاشرے کا چلن مثبت رویوں کی دلیل بن جائے گا مگر یہی فعل بہت مشکل ہے اور یہی ساری خرابیوں اور برائیوں کی جڑ ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ مثبت سوچ میں ہی امید چھپی ہے اور امید پر ہی اس کائنات کا نظامِ حیات چل رہا ہے۔ اس محبت کو یہیں چھوڑ کر محمد احسن زمان کو سرِفہرست ہونے پر مبارک باد۔ دیگر دوستوں کی آرا سے محظوظ ہوئے سب کو نیک نیتی سے پُرخلوص سلام۔ اس کے بعد احمد اقبال کے جواری سے ملنے چلے جہاں خاور ابھی چودھری انور ہی کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا ہے اور نورین کا حصول تاحال نہیں ہو سکا ہے۔ دوسری کہانی اسما قادری کی گرداب جو آہستہ آہستہ اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ شہریار اینڈ پارٹی انڈیا کی مہم سے کامیاب و کامران واپس آئے ہیں یا شاید کوئی تازہ معرکہ درپیش ہوگا جو سوئے فرنگ ہوگا۔ نغمۂ مرگ اسرار و تجسس میں ڈھلی دلچسپ کہانی تھی جو تشنہ کام رہی جس کے لیے دوسری قسط کا لاحقہ لگا ہوا ہے، خیر انتظار میں مزہ ہے۔ ایس انور کی سیاہ ماما میں ایک بھائی نے دوسرے بھائی کی جان لے لی جو شر کی ایک اکائی یعنی زر کی وجہ سے ہوا۔ عقلِ سلیم میں سلیم نے عقل سے کام لے کر شہرت، دولت اور عورت حاصل کر لی اور یہ ایک میں چار لفظی حرفِ محبت کی ودیعت کردہ ہمت اور جرأت کے سبب ہوا جو ناممکن ممکن ہو گیا بر خود غلط میں مائیکل نے غلط طرزِ عمل کیا جس کی اس کو سزا ملی۔ دل نگار میں ایڈی نے لینا کو ایک خوب صورت شوپیس سمجھتے ہوئے نوادرات کے خزانے میں جمع کر دینا چاہا مگر نتیجے میں اس کو موت ملی۔ تنویر ریاض کی دھند ابھی اچھی لگی۔ تفتیش نے بھی متاثر کیا۔ قرض میں اپنے بھائی کے قاتل کو سزا مل گئی جو وہ دینا چاہتا تھا۔ بوجھ میں میئر نے جس پولیس آفیسر کو نااہلی کی بنا پر برطرف کرنا چاہا، وہی آفیسر میئر ایڈورڈ کے لیے زندگی کی علامت بن گیا۔ محبت کی خاطر میں محبت کی وجہ سے ایک شخص کی جان گئی۔ تصادم میں ایک بیوی نے فرطِ انتقام سے مغلوب ہو کر اپنی رقیب کا قتل کر دیا۔ بدھو میں وکٹوریہ اور اس کے شوہر نے شیرف کو بے وقوف بنا دیا۔ سرورق کی کہانی دغاباز جو احمد اقبال کے قلم کا شاہکار تھی مزاح کی چاشنی لیے ہوئے تھی، اچھی تحریر تھی مزہ دیا۔ دوسری سرورق کی کہانی دوہری دھار بھی دلچسپ تر ثابت ہوئی۔ جہاں دوستی اور دشمنی کی بدترین مثال سامنے آئی تو محبت کی ثابت قدمی نے کامیابی سے ہمکنار کیا۔ میجر عامر کو سرخ رو کیا تو حسین ساتھی کا حصول ممکن ہوا۔“

تازہ گرام، مردان سے ہارون رشید کی کشمکش ”اس دفعہ جاسوسی صبر صبر کر کے 10 مارچ کو ملا۔ سرورق کی حسینہ ہمیں ایک مشہور پاکستانی اداکارہ جیسی لگی، نام نہیں لوں گا۔ محفل کی جانب بڑھے تو فرسٹ پوزیشن پر جناب محمد احسن زمان کو پایا، ایک طویل تبصرے کے ساتھ، بہت بہت مبارک ہو یار۔ نیہا گڑیا! قسم سے آپ نے تو ہمیں حیران کر دیا، یقین نہیں آتا۔ ویسے اکبر! پیر صاحب نکلے ہاں، بنا دیکھے آپ طبیعتوں کا حال جانتے ہیں۔ یار فرہاد! اپنے قیدی ساتھیوں کو دعا سلام کہنا۔ حسیب احمد! یار مارچ کے اوائل میں، میں الگڈی آیا تھا۔ دل نے بہت چاہا کہ آپ سے مل لوں مگر... پتا نہیں کیا بات تھی دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا اس لیے نہیں مل پایا۔ کہانیوں کی طرف بڑھا تو ابتدا جواری سے کی۔ دوسری قسطوں پر یہ قسط ذرا بھاری رہی۔ ریشم پر بہت افسوس ہوتا ہے، حویلی کے حکمراں انور علی کے ہوتے ہوئے بھی ریشم کے ساتھ ایسا سلوک۔ رئیس امجد کی نغمۂ مرگ پڑھتے ہوئے ذہن میں افریقا کے جنگلوں کا منظر گھوم رہا تھا۔ ڈینیل کی جانبازی اور جانی کی سرفروشی نے کہانی کا مزہ دوبالا کر دیا ہے۔ ایس انور صاحب کی سیاہ ماما نے بے اختیار ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ بابر نعیم کی عقلِ سلیم بھی بہت فنٹاسٹک تھی۔ سلیم کی غلطی خود سلیم کے کام آئی۔ گرداب کو میں نہیں پڑھتا کیونکہ حال ہی میں میری جاسوسی سے دوستی اور شناسائی ہوئی ہے۔ سرورق کی کہانیوں میں ثمیرا لیعقوب کی دوہری دھار سپر ہٹ رہی۔ کہانی کی اٹھان طارق اسماعیل صاحب کے کسی ناول جیسی تھی اور قلم کا

انداز ناصر ملک صاحب جیسا تھا ویلڈن سمیرا صاحبہ۔ اور ہاں، ایک بات کہنا تو میں بھول گیا۔ یہ جاسوسی کے لیے میرا پہلا خط ہے۔ دیکھتے ہیں سرفراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں یا نہیں۔ تمام دوستوں کو سلام۔"

کراچی سے سراج الحق چترالی کی جسارت "11 مارچ کو امتحانات کو داغ جدائی دیتے ہوئے جب جاسوسی ڈائجسٹ کا ہاتھوں ہاتھ استقبال کیا تو سرورق کی ٹائٹل گرل کو دیکھ کر بے اختیار اسکول کا زمانہ یاد آیا۔ بیک گراؤنڈ میں ایک طرف اسٹائلش شخص جبکہ نیچے دو آدمیوں کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر کافی ایڈونچر لگا۔ اس کے بعد محفل یاراں میں قدم رکھا تو محمد احسن کو مضبوطی سے کرسی تھامے ہوئے پایا۔ سارے جاسوسوں کے خطوط زبردست تھے۔ خاص طور پر ننھی قاریہ صاحبہ کو موسٹ ویلکم۔ طاہرہ گلزار آپی آپ واقعی گلزار ہیں۔ (خوش فہمی میں جتلانہ ہوتا)۔ ایف ایم صاحب! آپ کے عزیز کے لیے ایصال ثواب کریں گے۔ محفل میں اس دفعہ صنفِ نازک کے خطوط غالب رہے۔ پتا نہیں کیوں؟ مسز عباس کی کافی طلب محسوس ہوئی۔ خوردبین سے دیکھنے کے بعد بھی نظر نہ آیا۔ اس کے بعد اپنے پسندیدہ رائٹر کی پسندیدہ کہانی گرداب کی طرف بڑھا۔ جوں جوں کہانی پڑھتا گیا خود کو ان ہیروز کی جگہ محسوس کیا۔ رنگوں میں آخری رنگ کافی سنسنی خیز لگا۔ سمیرا یعقوب آپی آپ میں وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ سدا ایسا ہی رہے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ احمد اقبال کی کہانی دغاباز کو کافی انجوائے کیا۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔"

ائرفورس کمانڈو محمد صفدر معاویہ کی خانیوال سے ستائش "مارچ کا شمارہ 9 کو خوشبو بکھیرتے ہوئے ہم کو ضلع پشاور میں واقع ائرفورس بیس بڈھ بیر میں ملا۔ اتفاق دیکھیے کہ پچھلا خط میں نے کلر کہار سے لکھا لیکن خانیوال میں جا کر پوسٹ کیا کیونکہ اسی دن میری بھانجی فوت ہوگئی۔ بہرحال پاکستان ائرفورس کے ایک افسر کے ساتھ منسلک ہونے کی وجہ سے کبھی کہیں تو کبھی کہیں۔ بہرکیف سرورق اس دفعہ آخری رنگ کا عکس نظر آتا ہے۔ اس دفعہ اداریے میں آپ حکمرانوں کو غیرت دلاتے نظر آئے۔ اصل میں ہم خود ہی ان لوگوں کو اس کا موقع دیتے ہیں اگر ہم ٹھیک ہو جائیں تو حکمرانوں کی کیا مجال۔ بہرحال حکمرانوں کی بے حسی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے کہ تھر میں ایک سو سے زیادہ بچے زندگی کی بازی ہار گئے لیکن سندھ اور وفاق کی حکومت ان کو گندم فراہم نہ کرسکی۔ کسی شاعر نے شاید اسی موقع کے لیے کہا ہوگا گندم امیر شہر کی ہوتی رہی خراب... بیٹی مزدور کی فاقوں سے مرگئی۔ بھائی محمد احسن کو صدارت کی کرسی پر براجمان دیکھا، خاصے بے تکے الفاظ کا استعمال کرتے نظر آئے، اچھا تبصرہ ہے۔ مبارک ہو جناب۔ ساحر مراد کا تبصرہ بھی جاندار تھا۔ بہنا زویا اعجاز بھی ٹھیک ٹھیک حساب برابر کرتی نظر آئیں۔ نیا کائنات کو ویلکم ٹو دی جاسوسی۔ باقی سب کے تبصرے بھی جاندار اور کرارے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ بالآخر ہمارے شیر خونخوار بلوں کے جبڑے سے اپنا قیمتی اثاثہ نکال لائے۔ نغمۂ مرگ پہلے تو بوری لگی لیکن بعد میں بہت مزہ آیا۔ اب اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ حلِ سلیم میں آخر کار سلیم نے اپنی کامیابی سے اپنا پیار حاصل کرلیا۔ کاشف زبیر کی برخود غلط میں باربی نے مائیکل کو آخر انجام کو پہنچایا۔ جواری اب زیادہ دلچسپ ہوتی جارہی ہے لیکن ریشم کا مستقبل کیا ہوگا، اب آگے خاور کا کیا بنے گا، دیکھیے آگے آگے ہوتا ہے کیا کہ انور میاں کیا گل کھلاتا ہے۔ دغاباز میں بزدل صاحب نے پھر ایک کارنامہ ادا کرلیا لیکن میں پریشان ہوں کہ صائمہ اور بزدل اور شنو اور جلیل کی شادی کب ہوگی۔ بس دونوں لڑکیاں پیسے اکٹھے کرنے میں لگی ہیں۔ اسٹوری آف منتھ دہری دھار جس میں عامر نے را کے ایجنٹ کو جہنم رسید کیا اور اپنا قرض بھی اتار دیا، ساتھی کی موت کا۔ باقی سب کہانیاں بھی زبردست اور ہٹ رہیں۔ کترنوں نے بھی بہت مزہ دیا۔"

میانوالی سے احسان سحر کی مایوسی... ناامیدی... دل گرفتگی "امیدی ناامیدی انسان کے ساتھ ہی چلتی ہے۔ جس طرح خوشبو، پھول کے وجود میں موجود رہ کے اس کی اہمیت بڑھا دیتی ہے، اس طرح امید بھی انسان کو جینے کے ڈھنگ سکھاتی رہتی ہے۔ تتلیاں دور سے اڑ کر پھولوں کی طرف اس لیے آتی ہیں کہ یہ ان کے پسندیدہ ہوتے ہیں۔ جو پھول خوشبو نہیں رکھتے ان کی طرف کوئی نہیں جاتا ہے۔ جس چیز میں خاصیت ہو لوگ اسی کی طرف جاتے ہیں... اتنی لمبی چوڑی فلسفیانہ بات کرنے کا مقصد یہ تھا کہ جاسوسی ڈائجسٹ کا آغاز ہم نے اسی کشش کی وجہ سے کیا تھا۔ جب طاہر جاوید مغل کی کہانی پرواز شروع ہوئی تھی، اس کے بعد سلسلہ دراز اس وجہ سے ہوا کہ للکار جلوہ گر ہوئی جو جاسوسی کے ریکارڈ سلسلوں میں سے تھی۔ محبت، انتقام، نفرت، سازشوں، ایڈونچر اور بے پناہ سسپنس اور کمال کی منظر نگاری، کردار نگاری نے اس کہانی کو کئی ہزار چاند لگا دیے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تمام قارئین جاسوسی اور خاص کر للکار کے ہی ہو کر رہ جاتے۔ تاریکی اس وقت چھائی جب دو جون کو پتا چلا کہ للکار اپنے انجام کو پہنچی۔ ہر چیز کا انجام ہوتا ہے۔ آغاز کے بعد انجام کا بھی نمبر آتا ہے۔ لیکن جب للکار داغِ مفارقت دے گئی تو بہت ہی زیادہ دکھ ہوا۔ جواری سے ہمیں بہت ہی امیدیں تھیں، خاص کر اس لیے جاسوسی سے جڑا رہا۔ پہلی قسط پڑھنے کے بعد ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ویسی نہیں جیسی میں نے اس سے امید لگائی تھی۔ قسط میں پتا چل جاتا ہے کہ کہانی میں کیا کچھ نیا ہے کیا کچھ پرانا ہے لیکن اس کہانی نے پہلے سے ہی بتا دیا کہ میرا نام تبدیل ہوا ہے۔ کرداروں کے نام تبدیل ہوئے ہیں باقی وہی سب کچھ ہے جیسا پہلے اناڑی اور مداری میں پڑھ چکے ہیں۔ اس امید پر یہ آخری خط جاسوسی کے نام لکھ رہے ہیں اس وقت تک جب تک جاسوسی میں للکار کی طرح کا سلسلہ شروع نہیں ہوتا یا جب تک طاہر جاوید مغل واپس نہیں آتے۔ یہ ہمارا آخری خط ہے وجہ میں نے بہت تفصیل سے لکھ دی ہے۔ (محترم! ایک کہانی کے ختم ہونے سے سب کچھ ختم نہیں ہو جاتا... اور بہت سی امیدیں قائم رکھنی چاہئیں) ایک مشورہ اور خواہش بھی ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ہو سکے تو جاسوسی میں نئے رائٹرز کو جگہ دیں اور سلسلے لکھوائیں کیونکہ پرانے رائٹر اب بوڑھے ہو چکے ہیں اور نہ ہی اب ان کے پاس کچھ نیا لکھنے کے لیے آئیڈیا ہے۔"

میرپور آزاد کشمیر سے مرزا انجم جرال کی جرأت "سترہ، اٹھارہ سال سے جاسوسی پڑھ رہا ہوں لیکن خط پہلی بار لکھ رہا ہوں۔ خط نہ لکھنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مجھے ڈائجسٹ بہت لیٹ ملتا ہے۔ کبھی دس کو کبھی بارہ کو کبھی پندرہ تاریخ کو۔ مجھے یہ نہیں پتا تھا کہ خط کس تاریخ تک پہنچ جانا چاہیے۔ آپ کا بہت شکریہ آپ نے بتا دیا کہ چوبیس تک موصول ہو جانا چاہیے۔ خط لکھنے کی بڑی وجہ میرے فیس بک فرینڈ سید شکیل حسین کاظمی، افتخار اعوان، کبیر عباسی، زویا

اعجاز اور سعدیہ سید ہیں۔ ان کے تبصرے بہت شاندار ہوتے ہیں۔ خاص کر کاظمی صاحب کا تبصرہ مجھے بہت پسند ہے۔ ان کو دیکھ کر مجھے بھی شوق ہوا کہ میں بھی خط لکھوں۔ ٹائٹل کو نظر انداز کر کے اداریہ پڑھا۔ میں آپ کی باتوں سے سو فیصد متفق ہوں۔ چینی نکتہ چینی میں پہنچے تو محمد احسن زمان (وزیر آباد) کو کرسی صدارت پر پایا، مبارک ہو جناب، اچھا تبصرہ تھا۔ زویا اعجاز کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی بہت اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے جواری پڑھی۔ بلاشبہ یہ ایک اچھی کہانی ہے لیکن اس قسط کا مزہ کچھ خاص نہیں آیا۔ امید ہے آگے جا کے کہانی مزید بہتر ہو جائے گی۔ اس کے بعد گرداب پڑھی۔ سلو اور شہر یار بھارتی سورماؤں کو ناکوں چنے چبوا کر کامیابی سے واپس آگئے ہیں، ویل ڈن۔ شہر یار اب ماہ بانو کے پاس امریکا جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ میرا ذاتی مشورہ ہے کہ سلو کو بھی ساتھ لے جائے ایک سے دو بھلے۔ سرورق کی کہانیوں میں احمد اقبال کی کہانی بس گزارے لائق تھی۔ البتہ دوسری کہانی دہری دھار بہت پسند آئی۔ بہت عرصے بعد ایسی کہانی پڑھنے کو ملی۔ ابتدائی صفحات کی کہانی نغمۂ مرگ ایک بہترین کہانی تھی۔ کاشف زبیر اور مریم کے خان کی کہانیاں بھی پسند آئیں۔ باقی تمام کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ آخر میں ایک بار پھر یاد دلاتا چلوں کہ یہ میرا پہلا خط ہے۔"

نوشہرہ سے محمد جاوید مرزا کی شکر گزاری "بات چینی نکتہ چینی سے شروع کروں تو آپ کے الفاظ ہمارے دل کی ترجمانی کرتے ہوئے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ہمارے اجداد کی پچھلی نسل نے اپنی اولاد کے لیے مملکتِ خداداد کی صورت میں ایک خوب صورت اور روشن مستقبل کے خواب دیکھے جو آج تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے۔ یہ خواب ہماری آنکھوں میں اپنی اولاد اور آئندہ نسل کے لیے بھی ہیں۔ لیکن موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے لگتا ہے کہ یہ خواب، خواب ہی رہے گا۔ تمام قومی ادارے بری طرح تباہی و تنزلی کا شکار ہیں۔ کرپشن کی جڑیں اس قدر گہری ہو چکی ہیں کہ جنہیں اکھاڑنا کسی کے بس میں نظر نہیں آتا۔ میں آپ کی بات سے صد فیصد اتفاق کرتا ہوں کہ ان پینسٹھ برسوں میں اس ملک میں اگر کوئی مضبوط ہوا ہے تو وہ بیوروکریسی ہے۔ فلاحی ریاست کا تصور خیال و خواب لگتا ہے۔ معاشرتی اقدار بھی اس بری طرح پامال ہو رہی ہیں۔ کوئی وقت تھا جب حرام کھانے والوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے لیکن آج جس کے پاس جتنی حرام کی کمائی ہے، وہ اتنا ہی عزت دار ہے۔ من حیث القوم کرپشن اس قدر پھیل چکی ہے کہ پوری قوم اس میں لتھڑی نظر آتی ہے۔ اوپر تو اوپر ایک پھلوں کی ریڑھی والا بھی اپنی حیثیت کے مطابق اوپر سے تازہ اور نیچے سے داغ دار پھل اتنی صفائی سے شاپر میں رکھتا ہے کہ گھر آکر ہی پتا چلتا ہے کہ آپ کے ساتھ ہو کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ خدا اپنے کرم و فضل سے ہی اس قوم کی تقدیر کو بدلنے کے اسباب پیدا فرما دے۔ (آمین ثم آمین) مارچ کا شمارہ کافی دیر سے ملا۔ میرا خط شامل کرنے کا شکریہ۔ آئندہ خط لکھتے رہنے کے ارادے کو تقویت ملی۔ سب سے پہلے سرورق ہی نظروں میں آتا ہے۔ ذاکر صاحب کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ کوئی وقت تھا جب نوجوانی میں ٹائٹل کو دیکھ کر کچھ کچھ بلکہ بہت کچھ ہوتا تھا۔ لیکن حیرت ہے۔ ذاکر صاحب کے ذوقِ جمال میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جذبے جوان ہیں، تخلیق کے عمل کا حسن، نظر سے انگلیوں کی پوروں تک جاری و ساری رہے۔ احمد اقبال جواری کو اچھے سے لے کر چل رہے ہیں لیکن ٹیمپو تھوڑا بڑھانے کی ضرورت ہے۔ گرداب بھی خوب جارہی ہے۔ امجد رئیس کی نغمۂ مرگ انتہائی دلچسپی کا باعث رہی۔ اگلی قسط کا انتظار شروع۔ کاشف زبیر کی برخود غلط، متاثر کن رہی۔ تمام کہانیاں دلچسپ رہیں۔ قیمت ادا ہوگئی۔ احمد اقبال کی دغاباز میں بزدل نے ہنستے ہنساتے خوب کارنامہ انجام دیا۔ سمیرا یعقوب کی دہری دھار ایک جان دار، سنسنی خیز تحریر تھی۔ وقت کی کمی کے باعث کہانی بہ کہانی تبصرہ مکمل نہ ہو سکا۔ معذرت خواہ ہوں۔ لیکن دلی خواہش یہ ہے کہ پرچے کو خوب سے خوب تر بنانے کی کاوش جاری رہنی چاہیے۔"

راجن پور سے ذاکر علی گورچانی کی فرمائش "سب سے پہلے تمام دوستوں اور ہمارے محبوب رسالے کے منتظمین کو گرمیوں کی آمد کی ڈھیروں مبارک باد۔ ہر ماہ اس کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ اس بار کافی تاخیر سے ملا۔ میرا ایک دوست ہے وہ تقریباً اٹھارہ سال سے مسلسل آپ کا خاموش قاری ہے۔ لیکن ہماری مثال ایسے ہے کہ "چپ رہنا بھی مشکل ہے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔" پہلی اور خاص طور پر آخری کہانیاں زبردست ہوتی ہیں۔ ایک مشورہ ہے کہ غیر ملکی کہانیوں کو مختصر کر کے کچھ اچھی کہانیوں کو شامل کیا جائے۔ پہلا خط اور چند تحریریں بھیج رہا ہوں۔ شاملِ اشاعت فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔ گرداب، خاص طور پر ہمیں بہت اچھی لگتی ہے۔ ہم تو اس کے دیوانے ہیں۔ جواری بھی سب سے اچھی جارہی ہے، اچھا اب اجازت۔"

چشمہ بیراج سے ساگر ملوکر کا شکر و شکوہ "جاسوسی بہت دیر اور بہت جتن کے بعد ملا۔ ٹائٹل کی روایتی مار دھاڑ سے نظر بچاتے ہوئے محفلِ یاراں میں پہنچا۔ احسن زمان کو کرسیٔ صدارت مبارک۔ ساحر مراد، سید اکبر شاہ، عبادت کاظمی اور طاہرہ گلزار کے خطوط بہت شاندار تھے۔ صفدر آباد سے ننھی پری کی آمد بہت خوشگوار لگی۔ رانا فنی حماد خدا آپ کے دکھ دور فرمائے آمین۔ محفل میں آتے رہنا۔ سرورق کی دونوں کہانیاں اچھی تھیں۔ جواری اچھی چل رہی ہے۔ بوجھ، دل نگار اور بدھوا اچھی کہانیاں تھیں۔ اس دفعہ لطیفے بہت اچھے لگے۔ گرداب احتجاجاً پڑھنی چھوڑ دی ہے کیونکہ اسما قادری عرصہ دراز سے سرورق کی کہانی نہیں لکھ رہی ہیں۔ اسما قادری نے اگر اب بھی نہ لکھا تو رسالہ بھی پڑھنا چھوڑ دوں گا۔ مغل کی کہانی استادی پر تنقید کی تو آپ نے شائع نہیں کی۔ واقعی تنقید کوئی بھی برداشت نہیں کرتا چاہے وہ تنقید برائے تعمیر ہی کیوں نہ ہو۔" (آپ کا خیال غلط ہے)

لیہ سے سید محی الدین اشفاق کی شرکت "مارچ کا شمارہ لیٹ ملا۔ احسن زمان وہ آپ کو دیکھ کر ہی مسکرا رہی تھی۔ زویا اعجاز دورے کی کیفیت میں تھیں۔ سید اکبر شاہ! بے قراری جاسوسی کے ختم ہونے کے بعد پھر شروع کیوں ہو جاتی ہے؟ شاہان ایک اچھے تبصرے کے ساتھ اپنے نام کی تصحیح کرواتے نظر آئے۔ سید عبادت کاظمی! یار نولفٹ کا بورڈ اتار دیا ہے۔ طاہرہ گلزار بھی نظر آئیں۔ ساحر مراد صامت مشکل نام ہے، آپ کو صائم کہہ لیا کروں گا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے جواری کی طرف گئے۔ احمد اقبال نے نورین کو پاس لا کر دور کر دیا۔ خاور اور شاہینہ کا لگتا ہے کوئی چکر شروع ہونے والا ہے۔ انور بھی روایتی جاگیردار ثابت ہو رہا ہے۔ گرداب میں بالآخر شہر یار اور سلو کی انڈیا یاترا اتمام ہوئی اور وہ ڈاکٹر فرحان کو نکال لانے میں کامیاب ہوئے اور بھنا گر کو سلو نے جانبازی کے ساتھ ختم کر دیا۔ ماہ بانو کی مدد کے لیے مشا برم خان کے بعد لگتا ہے شہر یار بھی پہنچ جائے گا۔ کاشف زبیر صاحب کی برخود غلط میں باربی

نے اپنے کرسس کے تباہ کرنے اور دو انسانوں کے قاتل مائیکل کو آخر کار خود ہی ختم کر دیا۔ زبردست تحریر تھی۔ حمیرا اقبال، احمد اقبال صاحب کی کچھ لگتی ہیں؟ ان کی تحریر بدھو میں وکٹوریا نے شیرف ڈونالڈ کو خوب بدھو بنایا۔ باقی ڈائجسٹ زیرِ مطالعہ ہے۔"

اسلام آباد سے محمد کبیر عباسی کا 'مجا' گزیدہ تبصرہ "مارچ کا شمارہ اپنی تیرہ سالہ تاریخ میں سب سے لیٹ یعنی دس تاریخ کو ملا اور وہ بھی تقریباً سولہ ہزار میں پڑا۔ شاکڈ نا؟ ہوا یہ کہ ڈائجسٹ خریدتے ہوئے بک اسٹال پر کسی جیب کترے نے ہمارا اسیل فون جیب سے پار کر لیا اور ہم ڈائجسٹ ملنے کی خوشی میں اندازہ ہی نہ کر پائے۔ امید ہے کہ ادارہ و قارئین ہمارے اس دکھ میں برابر کے شریک ہوں گے۔ (یقیناً) سرورق کی لڑکی کی شکل پاکستانی ایکٹریس صوفیہ مرزا سے ملتی جلتی تھی۔ لیکن لگتا ہے کہ ذاکر انکل اسے فنشنگ ٹچ دینا بھول گئے۔ تھوڑی اور محنت اس پر کر لیتے تو 'مجا' آ جاتا۔ ساتھ میں اپنی تیرہ سالہ تاریخ میں ٹائٹل پر تین بندوں کو دیکھا لیکن 'مجا' آ گیا بھئی۔ ٹائٹل اور فہرست کے درمیان صرف ایک اشتہار؟ کیوں انکل، اسپانسرز آپ سے ناراض تو نہیں ہو گئے۔ (جی نہیں… وہ اشتہار اندر لے گئے ہیں) یہ واقعہ بھی ہماری تیرہ سالہ تاریخ میں پہلی دفعہ رونما ہوا۔ اداریہ 'مجا' دے گیا۔ احسن زمان کا تبصرہ پڑھ کر فروری کا باقی ماندہ شمارہ پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی کیونکہ موصوف نے تمام تحریروں کا خلاصہ لکھ مارا تھا۔ 'مجا' نہیں آیا جی۔ زویا اعجاز! آخر بلی تھیلے سے باہر آ گئی اور آپ اپنی چونچ پر قابو نہیں رکھ سکیں اور لوگوں کی ٹانگیں کھینچنا شروع کر دیں۔ سید اکبر شاہ کے تبصرے میں بریکٹس میں ہمیں مس کیا گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ مدیر صاحب کے قلم کا شاخسانہ ہے واقعی جی؟ گرداب میں اسما قادری بہت تیزی لے آئی ہیں مگر ہمیں تو ان کا وہی اندازِ تحریر پسند تھا جس میں وہ ہر واقعے کی جزئیات بیان کرتی تھیں۔ بہر حال اینڈ پر دل دھک سے رہ گیا۔ جواری میں اس دفعہ مزاح کی کمی محسوس ہوئی۔ باقی احمد اقبال کا بھی ہمیں سلو اندازِ تحریر پسند ہے اور اس دفعہ انہوں نے سلو ہی لکھا چنانچہ ہمیں بھی مجا آیا۔ مزاح کی کمی احمد اقبال نے دغاباز میں پوری کر دی۔ گو کہ بزدل کی کامیابی میں سراغ رسانہ صلاحیتوں سے زیادہ خوش قسمتی کا عمل دخل تھا مگر ہمیں پھر بھی مجا آیا۔ سمیرا لیعقوب کا جاسوسی میں دوسری دفعہ نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ان کی پہلی تحریر جو نومبر میں شائع ہوئی تھی، ہمارے دل پر ابھی تک نقش ہے۔ کاشف زبیر کی برخود غلط پڑھ کر کچھ خاص مجا نہیں آیا کیونکہ ایسی تحریریں اب بہت پڑھ چکے ہیں جس میں ہیروئن کسی جگہ پھنس جاتی ہے اور ولن اسے پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ آخر تیرہ سالہ تجربہ ہے۔ مریم کے خان کی بوجھ، واہ جی واہ کیا اندازِ تحریر ہے؟ کیا پلاٹ ہے؟ مزہ آ گیا بھئی مزہ۔ ایس انور کی سیاہ ماما ہماری تیرہ سالہ تاریخ کی سب سے مختصر تحریر جو اینڈ میں اس لیے چونکا گئی کہ اس کے اینڈ میں چونکا دینے والی بات کوئی تھی ہی نہیں۔ کترنیں اس دفعہ بالکل بھی متاثر کرنے میں ناکام رہیں۔ ہم نے کچھ کترنیں اس دفعہ ای میل کی ہیں اگر شائع ہو گئیں تو ہمیں اگلی دفعہ کترنوں سے یہ شکایت نہیں ہوگی۔"

لاہور سے سوہا جی، نازجی کی مشترکہ ستائش "ہم دونوں دوست جاسوسی کے باقاعدہ قاری ہیں۔ جاسوسی میں پہلی بار لکھ رہے ہیں۔ جاسوسی کی محفل کا ماحول ہمارا امن پسند ہے اس محفل کا الگ رکھ رکھاؤ اور معیار ہے۔ تبصروں کا انداز خوش گوار ہوتا ہے۔ ہم خود نرم دل انسان ہیں اور اب اس محفل کا حصہ بننا چاہتے ہیں۔ امید ہے جگہ دیں گے۔ محفل کی صدارت جناب محمد احسن زمان کے نصیب میں آئی۔ مبارک باد لگتا ہے احسن صاحب میٹھے چاولوں پہ اچار ڈال کر کھاتے ہیں۔ ساحر مراد صاحب آپ پولیس کی طرح کا کام کرتے ہیں تو جب اس محکمے میں آئے تو خالی دماغ تھے جو فریدی صاحب کے مشاہدے کی ضرورت پڑی۔ زویا اعجاز جی! کیا پانڈے آپ کا تکیہ کلام ہے یا آپ کے پڑوسی کا نام ہے۔ نیہا کائنات بے بی! ویلکم اینڈ ویلڈن۔ کہانیوں میں سب سے پہلے بابر نعیم کی عقلِ سلیم بیسٹ رہی۔ دل نگار بشریٰ امجد کی بہت پسند آئی۔ شوقِ تجسس نے محبت کرنے والے ایڈی کی جان لے لی۔ تنویر ریاض کی دھند کوئی بھی کام اللہ کی خوشنودی کے لیے کیا جائے تو اللہ کی مدد بھی شامل ہو جاتی ہے لیکن اس کام میں لالچ پیدا ہو تو انجام مورس جیسا ہوتا ہے۔ سیرینا جی کی محبت کی خاطر، میں محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے ایما اور الفرٹ نے اس بات پر عمل کرتے ہوئے دو جیتے جاگتے انسانوں کی جان لے لی اور خود بھی برے انجام سے دوچار ہوئے۔ حمیرا اقبال کی بدھو، زبردست اسٹوری تھی۔ یک نہ شد دو شد بیوی شوہر سے دو ہاتھ آگے نکلی۔ کاشف زبیر کی برخود غلط میں باربی نے مائیکل پر رحم نہ کھا کر بروقت ایک نفسیاتی مریض کو درست سزا دی۔ احمد اقبال کی دغاباز… مزاحیہ اور جاسوسی سے بھرپور کہانی تھی۔ دہری دھار، سمیرا لیعقوب کی بہترین اسٹوری تھی۔ شیلا کا کردار زبردست لگا۔"

حسبِ معمول شیخوپورہ سے محمد شاہان سعید کے حسبِ حال مفروضات "حسبِ سابق، حسبِ دستور، حسبِ معمول، حسبِ توقع اور حسبِ حال جاسوسی کا شمارہ 8 تاریخ کو شام پانچ بج کر اکیس منٹ پر ملا۔ چاروناچار پاکستان کے فائنل میچ کو پسِ پشت ڈال کر جاسوسی پڑھنے بیٹھ گئے۔ میں جانتا ہوں کہ خط شائع کروانے کے لیے سرورق پر تبصرہ ناگزیر ہے۔ (قطعی ناگزیر نہیں) مگر حیف صد افسوس! کہ سرورق کے پرخچے اڑے ہوئے تھے۔ ارے بھئی! بارش کی وجہ سے۔ اداریے میں بالکل درست لکھا گیا ہے۔ ہمیں اپنے شعور کو بیدار کرنا ہوگا ورنہ ہمارا حال بہت برا ہوگا۔ ایٹمی قوت ہونے کے باوجود آج تھر کے عوام فاقہ کشی کر رہے ہیں۔ خیر چھوڑیے یہاں تو ہر کوئی اپنا راگ الاپ رہا ہے۔ محمد احسن زمان کا خط ضخیم ہونے کی وجہ سے کرسیٔ صدارت کا حق دار قرار پایا، مبارک ہو۔ ساحر مراد سے قطعی طور پر ہمیں اتفاق ہے۔ زویا اعجاز کا شکریہ۔ نیہا کائنات کو خوش آمدید۔ ابھی ان کی عمر تو بچوں والے رسالے پڑھنے کی ہے۔ خیر ذوق اپنا اپنا۔ ارے سید عبادت کاظمی صاحب! آپ تو ہمارے ہم پلہ نکلے۔ مجھے بھی اسی سال فرسٹ ایئر کا امتحان دینا ہے۔ ایف ایم صاحب کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں مگر انہوں نے عزیز ہستی کا رشتہ نہیں بتایا۔ ساگر تلوکر! آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟ جاسوسی اور پھول؟ ناممکن! منشی حماد فرید صاحب کہیں اڈیالہ جیل سے بھاگنے کی تیاری تو نہیں کر رہے۔ مجھے دلی افسوس ہے کہ آپ سزائے موت کے قیدی ہیں۔ نصیب اپنا اپنا۔ باقی دوستوں کے خطوط بھی شاندار تھے۔ اب کہانیوں کا رخ کر لیتے ہیں۔ نغمۂ مرگ کو جب پڑھنا شروع کیا تو لگا کہ کافی ایکشن ہوگا اور ایجنسیوں کی لڑائی ہے مگر جوں جوں پڑھتے گئے توں توں ڈوبتے رہے، ہمارا مفروضہ اس بار بھی غلط نکلا۔ سیاہ ماما مختصر ترین مگر سنسنی سے خالی تھی۔ پہلی لائن پڑھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ آگے کیا ہوگا۔ عقلِ سلیم کا ٹائٹل پڑھا اور اندازہ لگایا کہ غالباً کوئی کھڑوس آفیسر کا کسی لڑکی سے عشق ہوگا مگر وہ مفروضہ ہی کیا جو صحیح نکلے۔ دل نگار کا اختتام سنسنی خیز تھا۔

لگتا ہے کہ جاسوسی میں مافوق الفطرت کہانیوں کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ جواری کی سمت غلط جا رہی ہے یا تو اسے سابقہ ناول پرواز کی طرز پر لایا جا رہا ہے یا پھر خدا جانے کہ مصنف کے دل میں کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے للکار کی طرز پر لایا جائے۔ ایکشن سے بھرپور۔ وحشہ اور تفتیش بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ گرداب میں ہمارے جانباز لوٹ ہی آئے۔ شہریار عادل کو واپس اپنے روپ میں آنا چاہیے کیونکہ وہ صرف بھارت میں مشن کے لیے ہی تبدیل ہوا تھا۔ واپس اپنے روپ میں آ کر اسے امریکا جانا چاہیے۔ ہیروئن بھابی کی مدد کے لیے جبکہ جاوید علی کو جنگل میں آپریشن کرنا چاہیے۔ ہم تو صرف مفت مشورے ہی دے سکتے ہیں۔ (اس کی تو کھلی اجازت ہے آپ کو) بوجھ میں جان بریڈ میئر کو اپنے خلاف بولتے سن کر بھی اس کی جان بچاتا ہے۔ دغاباز بہترین کہانی تھی۔ بالآخر دہری دھار کے ذریعے ایجنسی کا کیس سامنے آ ہی گیا۔"

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی ترش و تند باتیں "جاسوسی اس بار بھی انتہائی تاخیر سے 11 مارچ کی شام مل سکا۔ لگتا ہے ہم اسلام آباد والوں کو یہ تاخیر اب مستقل برداشت کرنی پڑے گی یا پھر سالانہ خریدار بننا پڑے گا کہ کراچی سے رجسٹرڈ ڈاک یہاں اگلے ہی روز مل جاتی ہے۔ سرورق اس بار بھی دلکش تھا بس مقامی حسینہ کا میک اپ کچھ زیادہ لگا۔ خطوط کی محفل میں 3 ماہ کی بلیک لسٹ کے بعد اپنا خط دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ اس ماہ اول نمبر پر وزیر آباد کے بھائی محمد احسن زمان رہے، مبارک ہو۔ اس محفل میں اس دفعہ صرف دو بہنوں زویا اعجاز اور طاہرہ گلزار نے شرکت کی۔ باقی لکھنے والیاں کہاں غائب ہیں؟ کہانیوں کے اعتبار سے اس ماہ جاسوسی کوئی مغربی رسالہ لگا کہ ترجمہ شدہ کہانیوں کی بھرمار تھی۔ مقامی طبع زاد صرف ایک بابر نعیم کی عقلِ سلیم ہی تھی۔ کیا وجہ رہی؟ (کوئی وجہ نہیں تھی… چھوٹی کہانیاں عموماً ترجمہ شدہ ہی ہوا کرتی ہیں) اس شمارے کی بہترین کہانی احمد اقبال کی دغاباز تھی۔ ایک مدت کے بعد بزدل اور صائمہ کی کہانی پڑھنے کو ملی۔ بہت بہت شکریہ۔ قسط وار کہانی جواری بے حد دلچسپ رہی۔ لگتا ہے ملک سلیم کو اب ریشم پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا کہ نورین لاپتا ہو گئی ہے مگر اس کے دل سے اب تک محو نہیں ہوئی اور اب اسے انور کی حویلی بھی خیرباد کہنی پڑے گی۔ دوسری قسط اور کہانی گرداب ابھی ختم ہوتی نظر نہیں آتی کہ شہریار ماہ بانو کو بچانے امریکا کے لیے پر تول رہا ہے تو کہ دشمن بھی اب زیادہ ہو گئے ہیں۔ اس شمارے کی پہلی کہانی نغمۂ مرگ چونکہ ابھی مکمل نہیں ہوئی اس لیے پہلی قسط کچھ تاثر نہ دے سکی۔ سرورق کی دوسری کہانی دہری دھار بھی بس گزارے لائق تھی۔ مختصر تحریریں، تراش خراش بھی انتہائی کم تھیں اور مشہور زمانہ بلیک لسٹ بھی غائب تھی جو کہ ایک اچھا شگون ہے۔" (ہر دفعہ ایسا نہیں ہوگا… وہ تو مجبوری تھی جو لگ نہ سکی)

عادل خان سردریاب ضلع چارسدہ سے "جاسوسی نے 10 مارچ کو اپنا دیدار کرایا۔ ذاکر انکل نے بہت محنت سے سنسنی خیز سرورق بنایا تھا۔ جس میں ایک شخص نے دوسرے کے گلے پر خنجر رکھ کر یرغمال بنایا تھا۔ باقی ایک حسینہ تیسرے آدمی سے سر جوڑ کر اور اپنی بتیسی نکال کر ہنس رہی تھی۔ سرورق اچھا تھا۔ کہانیوں کی فہرست میں احمد اقبال کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ محفل خطوط میں پہلے نمبر پر محمد احسن زمان کا نام تھا جو کرسیٔ صدارت پر بیٹھے خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ مبارک ہو جی تبصرہ اچھا تھا۔ نغمۂ مرگ امجد رئیس کی اچھی کہانی ہے۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ سیاہ ماما ایک صفحی کہانی اچھی لگی۔ عقلِ سلیم میں سلیم نے جان کی بازی لگا دی، محبت کے لیے کستوری لگا کے۔ جواری اچھی جا رہی ہے۔ انور دستخط نہ کرے تو اچھا ہے۔ تفتیش ایک مجرم کی بہترین کہانی تھی جس میں چور نے الٹا پولیس والے سے تفتیش کی۔ قرض اچھی کہانی تھی جس میں ایک بھائی نے دوسرے بھائی کا رچی سے بدلہ لے کر ان کا قرض اتار دیا۔ بوجھ ایک بہترین سبق سکھا گئی کسی انسان کو بیکار نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ پانی جتنا بھی گندا ہو آگ بجھانے کے کام ضرور آتا ہے۔ دغاباز احمد اقبال کی طنز و مزاح سے بھرپور کہانی تھی جس میں ڈاکٹر حامد کو بازیاب کر کے بزدل نے کارنامہ سرانجام دے ڈالا۔ دہری دھار ایک سنسنی خیز داستان تھی۔ یہ داستان مدتوں یاد رہے گی۔ کترنوں میں طاہرہ باجی، ج کاظمی اور اکبر شاہ پسند آئے۔"

سید اکبر شاہ، اوگی، مانسہرہ سے سوغات لائے ہیں "جاسوسی کا جان توڑ انتظار… 3 تاریخ کے بعد بک اسٹال والے سے تکرار… دن میں کئی کئی چکر دیوانہ وار… یہ سب تو الگ داستانِ محبت، غم و غصہ ہے لیکن جب شمارہ نگاہوں میں اور ہاتھوں میں سمویا تو ہر شے گرم خوباں چمن لگنے لگی۔ سرورق کا بھرپور جائزہ لینے کی غرض سے ہم کسی سراغ رساں کی طرح متحرک ہو گئے مگر سائنڈ… پوز یہ کیا؟ ہم جس کا پورے مہینے جان توڑ انتظار کرتے ہیں وہ یوں منہ موڑ رہی ہے۔ یہ بھانپ کر شاید کان سن ہو گئے تھے اس لیے شعلہ بن کر آنے والی دوشیزہ کی کھلکھلاہٹ سے محروم رہے۔ پاکیزہ دامن اور خوبرو چہرہ… لال لبوں پر مسکان… سرخ و سپید رنگوں کے امتزاج سے پُرمزین چہرہ دلکشی میں اپنی مثال آپ تھا۔ خلافِ معمول تین صنفِ وجاہت کی موجودگی وہ بھی ابتر حالت میں، دکھ ہوا۔ تبصروں پر تبصرہ کرنے تبصروں کی محفل میں پہنچے۔ محمد احسن زمان فرسٹ پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب۔ مبارک بھرا ٹرک وصول کیجیے۔ گمان کچھ یوں ہوتا ہے کہ جمائیاں لے لے کر خط لکھا گیا ہے۔ ساحر مراد آپ کے تبصرے پر تنقید کرنا… آپ سے زیادتی کے مترادف ہوگا۔ اتنی تعریف کافی ہے؟ ایسا نہ ہو کہ اگلے مہینے آپ کہیں یہ کہے کہ ہم کسی تعریف کے محتاج نہیں۔ زویا اعجاز! سواری پر بیاری؟ بہرحال نوک پلک خوب رہی۔ محمد شاہان! مینٹل اسپتال کے سینئر پیشنٹ ویلکم اب یہ نہ کہنا کہ ویلکم تو کب کے ہو چکے لیکن دل کم ہیں جہاں جگہ بنائی جائے۔ طاہرہ گلزار اصحت کا خیال رکھیں اس عمر میں پیاز کاٹنا ٹھیک نہیں یا شاید آپ پر سرورق کے صنفِ وجاہت والی پچویشن ہے۔ ہمارا تبصرہ بہ نفسِ نفیس موجود تھا۔ بے حد خوشی ہوئی۔ ایڈیٹر صاحب کے اصرار کی بنا پر ہم حاضر ہیں۔ انتظار گاہ مریضوں سے خالی تھا۔ یہ بات خالی از علت نہیں۔ کہانیوں میں پہلے جواری پڑھی۔ نہایت بور ہو گئی ہے کہانی۔ کبھی صحیح تو کبھی غلط قیاس آرائیاں کرتا ہیرو یا شاید زیرو، کہانی کو بور کرتا نظر آیا۔ نہ ختم ہونے والی گرداب کا مطالعہ کیا۔ راسے ٹکراؤ، بھجتا گر کی موت… بعد ازاں شہریار گروپ کا پاکستان پہنچنا… پڑھ کر دل جیسے گل کی طرح کھل گیا۔ عمیر اور جگو کی حکمتِ عملی اور پھر کارروائی بہتر رہی۔ سیاہ ماما… سانپوں کی ایک قسم… خطرناک، خطرناک تریا ترین مگر انسانوں سے بڑھ کر نہیں۔ سرورق کا پہلا رنگ، احمد اقبال برش تھامے ہوئے تھے۔ طنز و مزاح کے ماحول میں سنجیدگی سے کیے جانے والے کیس کا حل… بزدل ہی کر سکتا ہے۔ احمد اقبال صاحب کی مارچ کی 25 تاریخ کو 77 ویں سالگرہ…… مبارک ہو۔ میری اطلاع غلط بھی ہو سکتی ہے۔ سمیرا لیعقوب کے ہاتھوں دہری دھار دوسرا رنگ۔ عمیر کی شاندار شخصیت… راہول نوبا اور شیلا کی افغانستان میں

موجودگی... گفت وشنید... تنقید وتعریف... کہیں مزاح تو کہیں موڈ آف۔ دلچسپ کہانی اور مضبوط پلاٹ کی حامل تحریر اور اعلیٰ درجے کی تھی۔ سب سے بڑھ کر عامر کی ٹوبا سے پنجہ آزمائی بھی زبردست رہی۔ خانخیلی کا انجام بھی راحت بخش تھا۔ رسالت کا کردار اچھا لگا۔ بابر نعیم کی عقلِ سلیم بہت زبردست تھی۔ باقی کہانیاں بقیہ دنوں کے لیے، کترنوں کا تو یہی کہوں گا کیا خوب رنگ جمائیں یہ کترنیں، ہر ماہ سوغات لائے ہماری بہنیں۔ بھائی لوگ آپ کے ہاں سے کچھ جلنے کی بو آرہی ہے۔"

بہاولپور سے بشریٰ افضل کی پریشانیاں "آج کل ڈائجسٹ خاصے لیٹ مل رہے ہیں۔ ٹائٹل تو بڑا دھانسو ہے خیر ہے انکل جی تین تین صنفِ مخالف ان کی تو واہ واہ ہوگئی۔ صنفِ نازک بڑی فراخ دلی سے ان تینوں کو دیکھ کر مسکرا رہی ہے کہ انکل کی اعلیٰ ظرفی تو دیکھیے کہ سمندر کو کوزے میں بند کردیتے ہیں۔ یہ جو صنفِ مخالف گنگنا رہے ہیں (انکھیوں کے جھروکوں میں دیکھا جو سانورے) اوہ اوہ ظلم ہوگیا قتل کردیا بچو جیل جانے کو تیار ہوجائے۔ اپنی محفل میں داخل ہوئے۔ انکل کی باتیں دل کو لگتی ہیں۔ معاشرے کی عکاسی کرتی ہیں۔ محمد احسن زمان وکٹری اسٹینڈ مبارک ہو، انعامی تبصرہ اچھا لگا۔ خاصا تفصیلی تھا۔ میرے ساتھ کچھ پریشانیاں ہیں۔ دونوں اطراف ئے سب میرے لیے دعا کریں کہ میرے سارے مسئلے حل ہوجائیں ورنہ مجھے تو ہر طرف دشمن ہی دشمن نظر آرہے ہیں۔ سچ کہتے ہیں کوئی کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتا، میرے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔ انکل آپ بھی دعا کریں۔ اس بار تو سرے سے ویٹنگ لسٹ ہی غائب تھی۔ سیاہ ماما شون کے بھائی نے قرض واپس کرنے کے بجائے انوکھے انداز میں اس کی جان لی۔ پولیس سے تو بچ گیا مگر ضمیر کی ملامت اس کو کبھی چین نہ لینے دے گی۔ عقلِ سلیم، سلیم نے بھی جواں مردی سے سہرا سجانے کے لیے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ دھند امیں لکھاری نے دوسرے ملکوں کے معاشرے کی جو عکاسی کی ہے۔ واقعی وہاں یہ کام سرعام ہورہے ہیں اور ماں باپ بھی کچھ نہیں کرسکتے، اس لحاظ سے اسلامی ملک بہتر ہیں کہ ان کو اپنی حدوں کا پتا ہے کہ اسلام میں کیا جائز ہے اور کیا ناجائز۔ اس لیے حکومت نے سزائیں مختص کی ہیں۔"

محمد اقبال کی فکرمندی کورنگی سے "اس دفعہ کا جاسوسی ڈائجسٹ اپنی مصروفیت کی وجہ سے 8 مارچ کو حاصل کرسکا۔ حسبِ عادت سرورق کا سرسری سا جائزہ لینے کے لیے نظر دوڑائی تو ذاکر صاحب کے ہاتھوں کی مہارت کا اعتراف کرتے ہوئے توجہ سے جائزہ لیا اور داد دینے پر مجبور ہوئے ویلڈن ذاکر صاحب۔ فہرست پر کی گئی محنت کو دیکھنے کے ساتھ رائٹرز کے نام دیکھے۔ سرورق کی کہانیوں میں سمیرا یعقوب کا نام جگمگا رہا تھا۔ ساتھ میں اسما قادری، احمد اقبال، کاشف زبیر، امجد رئیس وغیرہ کے نام کے ساتھ ہمارا مطلوبہ نام نظر نہیں آیا، مایوس ہونے کے بجائے دعا اللہ تعالیٰ سے کہ کوئی سبیل بنائے کہ طاہر جاوید مغل صاحب کا نام سلسلے وار کہانی کے ساتھ جگہ بنا سکے، آمین۔ اداریے پر تبصرہ کیا کیجیے کہ اداریہ اخبار کی جان ہوتا تو اسی طرح ڈائجسٹ کی شان ہوتا ہے فکر کیا کیجیے کہ ہر حساس دل رکھنے والے کے یہی جذبات ہوتے ہیں۔ محفل میں چھلانگ لگائی تو محمد احسن زمان کو اول پوزیشن پر پایا مبارک ہو بھائی صاحب۔ کہانیوں میں اسٹارٹ لیا سمیرا یعقوب کی دہری دھار سے اور کہانی کے اختتام پر اپنے انتخاب کو داد دیتے ہوئے سمیرا یعقوب کے لیے بھی ویلڈن۔ دوسرے نمبر پر احمد اقبال کی دغاباز شروع کی اور بزدل صاحب کی ہلکی پھلکی جاسوسی سے محظوظ ہوئے۔ رئیس امجد کی نغمۂ مرگ، بابر نعیم کی عقلِ سلیم، کاشف زبیر کی برخود غلط بھی عمدہ کہانیاں تھیں۔ احمد اقبال صاحب کی جواری بادلِ ناخواستہ پڑھی کیونکہ ہیرو صاحب ابھی تک حویلی کی الجھنوں میں ہی الجھے ہوئے انور کی دوستی میں اپنی نورین کی تلاش کے لیے بھی وقت نہیں نکال پارہے اور کہانی کے اسٹارٹ سے لگتا تھا کہ ہیرو جیل سے فرار ہوکر تیز رفتار ایکشن میں نظر آئے گا مگر ابھی تک ہیرو دماغی ایکشن میں ہی نظر آرہا ہے جسمانی طور پر کوئی بڑے کارنامے اس کے کریڈٹ پر ابھی تک نظر نہیں آئے۔ چھوٹی کہانیوں کو نظرانداز کرتے ہوئے اسما قادری صاحبہ کی گرداب اس لیے آخر میں شروع کی کہ نئی قسط آنے تک سارے کردار ذہن میں رہیں کیونکہ نظر آرہا ہے کہ جلد ہی کہانی کا اختتام ہونے والا ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ اسما قادری صاحبہ اپنے تمام کردار کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے کہانی کا اینڈ کرتی ہیں یا تشنگی باقی رہ جائے گی یہ تو آخری قسط ہی بتائے گی۔ کیونکہ ماہ بانو امریکا میں دشمنوں کے ہاتھوں سے بچ کر محفوظ پناہ گاہ میں پہنچ چکی ہے، اس کے ساتھ خان صاحب موجود ہیں۔ عمیر اور جگنو نے جنگل کے کھیل کو اوپن کردیا ہے شہر یار اور سلو، انڈیا سے واپس آچکے ہیں، اب کہانی میں بچا کچھ نہیں، دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔ نئے کردار ڈال کر آگے بڑھاتی ہیں اسما قادری یا اینڈ کردیتی ہیں۔ اچھی امیدوں کے ساتھ انتظار رہے گا۔"

کراچی سے ایم کے احساس کے احساسات "نام تو میرا کچھ اور ہے پر ایک مخصوص حلقۂ احباب مجھے احساس کے نام سے جانتا ہے۔ کہنے کو میں ایک شاعر ہوں۔ احساس صرف ایک احساس نہیں ہے یہ ایک سوچ ہے جو تا قیامت زندہ رہے گی۔ قارئین مجھے جاسوسی کے ان ہی صفحات پر کسی اور نام سے شاید پڑھ چکے ہیں۔ اب دیکھتے ہیں کہ وہ مجھے پہچان پاتے ہیں یا نہیں۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے چینی نکتہ چینی میں کافی لوگوں کو محبت کے موضوع پر اداس پایا تھا، جس میں فہد علی جنجوعہ اور محسن کمال سرِفہرست تھے۔ ان سے میں اپنا ایک شعر میں یہ کہنا چاہوں گا اگر میرا شعر شائع ہوا تو۔ کہانیوں میں ابتدا گرداب سے کی، گرداب ایک بہترین کہانی ہے اسما قادری کی۔ میں نے گرداب کی کوئی بھی قسط مس نہیں ہونے دی۔ شروع سے پڑھتا ہوا آرہا ہوں۔ جنوری کی قسط پڑھ کر اندازہ ہوا کہ اب شاید زیادہ سے زیادہ 4، 6 ماہ کے اندر کہانی اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی۔ جس طرح اسلم کی موت واقع ہوئی اور ادھر شہر یار کامیابی کے ساتھ پاکستان آنے والا ہے اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اسما قادری صاحبہ اب کہانی کو سمیٹنے میں لگی ہیں۔ للکار کے بعد بہترین کہانی ہے جاسوسی میں۔ جواری میں انور کی بھابی اور ان کے والد پیر صاحب کھل کر فرید عرف ملک سلیم کے سامنے آچکے ہیں۔ ملک صاحب بالکل اناڑی کے فیکے پتر کی طرح بار بار خوار ہونے لگے ہیں۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ احساس کے احساس سے کسی بھی ڈائجسٹ میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ اگر شائع ہوا تو آئندہ لکھنے کی بھی جسارت کروں گا اور اگر شائع نہ ہوا تو مستقبل کے ایک عظیم شاعر کا دل ٹوٹ جائے گا۔ اپنے ایک شعر کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔ (ہم نہیں چاہتے کہ آپ کے نازک دل کو ٹھیس لگے)

محبت خودکشی ہے، جرم ہے! موت ہے یارب
محبت ظلم ہے، درد ہے! کروں گا نہ کبھی میں اب"

لاہور سے زویا اعجاز کی پسند "فروری کے اختتام تک جاسوستان کا ہر فرد خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا کہ مارچ کے شمارے کا چاند جلد طلوع ہوگا اور انتظار قدرے مختصر ہوگا مگر ہائے ری قسمت! گمان، گمان ہی رہا۔ ایشیا کپ کے سنسنی خیز مقابلوں سے فرصت ملنے کے بعد کنوؤں میں بانس ڈلوانے پر غور وخوض جاری تھا کہ ڈائجسٹ نے آٹھ مارچ کو اپنا دیدار کروا ہی دیا۔ ٹائٹل خونی رنگ سمیٹے محبت کی تکون کے بجائے ایک نئی چوکور دکھلا رہا تھا۔ اداریے میں بجا نشاندہی کی گئی کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے مگر ایک المیہ یہ بھی ہے کہ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے، عوام سدا سے تختۂ مشق بنی ہے اور آثار بتاتے ہیں کہ مستقبل میں بھی صورتِ حال جوں کی توں رہے گی۔ خطوط کی محفل سے سینئر نام غائب ہوچکے ہیں۔ نہ جانے کون سے چلے کاٹ رہے ہیں سب؟ سید اکبر شاہ! آپ کے حسنِ نظر کا شکریہ۔ کافی تحریر شناس معلوم ہوتے ہیں آپ۔ سید عبادت کاظمی! اپنے تئیں کسی کنگ کی چاپلوسی اور چمچہ گیری کرکے شاید کوئی درباری مراعات کے حصول کے گمان میں ہیں۔ لگے رہو منا بھائی۔ محی الدین اشفاق! ہم جن ریکارڈز کی بات کررہے ہیں آپ ان کے ججوں سے ہی نابلد ہیں لہٰذا اپنا ہوم ورک مکمل کرکے آیا کریں۔ گرداب اس بار فل ایکشن میں تھی۔ ہمیں تو عرصہ دراز سے چودھری اور شہر یار کی حتمی مڈبھیڑ کا انتظار ہے۔ کرنل توحید بھی یقینی طور پر تر نوالہ ثابت نہ ہوں گے۔ امجد بیگ کی نغمۂ مرگ نے جوزف کونارڈ کے ناول ہارٹ آف ڈارکنیس کی یاد دلادی۔ تاریک براعظم کے متعلق آج تک بہت کم پڑھنے کو ملا۔ کہانی نے مکمل طور پر اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ ہوش تو تب آیا جب بقیہ آئندہ ماہ کے الفاظ ہمارا منہ چڑا رہے تھے۔ جواری میں فریدالدین عرف خاور عرف ملک سلیم اختر حسبِ معمول سوچ نگر میں پھرتا نظر آیا۔ سرورق کے.... پہلے رنگ نے کافی محظوظ کیا۔ بزدل کی بزدلانہ حرکات نے سماں باندھے رکھا۔ دوسرا رنگ پورے شمارے کی جان ثابت ہوا۔ راحول ٹوبا اور میجر عامر کی نفرت، تلخی اور فائٹ کے انداز نے تاوان کے شکر شکرا اور جہانی استاد کی یاد تازہ کردی۔ بھارتیوں سے لڑائی سرحد پر ہو، کرکٹ کے میدان میں یا الفاظ کے پیراہن میں۔ قوتِ ایمانی اور ولولہ منوں کے حساب سے بڑھا دیا کرتی ہے۔ افغانستان کے ماحول کی منظرکشی بہت لاجواب تھی۔ سیاہ ماما پڑھ کر جھرجھری آگئی۔ برخود غلط میں ہالی ووڈ موویز کی جھلک نظر آئی تاہم بوریت بالکل محسوس نہیں ہوئی۔ بوجھ میں جان بریڈ کا دبنگ کردار بہت پسند آیا۔ بدھو، عقلِ سلیم، دھند اور دل نگار بھی کافی متاثر کن تھیں۔ مجموعی طور پر مارچ کے شمارے کو ننانوے اعشاریہ نو فیصد نمبروں کے ساتھ کامیابی کی سند عطا کی جاتی ہے۔"

پشاور سے طاہرہ گلزار کی روداد چمن "اپنا پیارا محبوب جاسوسی ڈائجسٹ 11 تاریخ کو شام 5 بجے ملا۔ اس جواب کے ساتھ کہ خط صاف اور کھلا کھلا لکھیں تو ہر ماہ شائع ہو۔ ادارے کے پاس میرا خط شائع نہ کرنے کے 110 بہانے ہیں، میں تو ہر دفعہ ایسا ہی خط لکھتی رہی ہوں اور شائع بھی ہوتے رہے ہیں۔ اب کیا ہوا؟ (اب یہ ہوا کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی) ادارے نے ایک بار پھر دل ودماغ کو ہلا دیا لیکن کیا کہیں کہ ہم بدنصیبوں کے نصیب میں یہ حکمران لکھے گئے ہیں اور کچھ ہماری غلطی کہ ہم ہر ظلم کو اپنی تقدیر مان کر صبر کرتے جاتے ہیں۔ پہلے نمبر پر بھائی محمد احسن زمان کا خط آیا مبارکاں۔ چلو انکل نے پھر اپنے صنفِ کرخت کو کرسیِ صدارت بخش دی۔ خیال رہے بھائی یہ پاکستان ہے اور جاسوسی کی سیاست میں کرسی ہر مہینے چھن جاتی ہے اس لیے زیادہ جوش میں ہوش نہ کھودیں کیوں بھائی آپ باز ہو اور جاسوسی چڑیا کہ آپ جھپٹا مار گئے حسینہ آپ کو دیکھ کر نہیں ہنسی شکر ہے۔ اب معلوم ہوا ہمارا دماغ محمد احسن کھا گئے ہیں، ویسے خط 80 فیصد اچھا لگا۔ ساحر مراد کا تبصرہ بھی شاندار رہا۔ زویا اعجاز جی، عبادت کاظمی کو ٹکا سا جواب دے کے دل خوش کردیا۔ زویا جی! ہم نہایت اچھا دل اور دردِ دل رکھتے ہیں اس لیے ہر انسان کی تکلیف پر دل دکھتا ہے۔ اکبر شاہ جی کے حسینہ کے لیے اتنے الفاظ کیوں، اکبر اور زویا جی دونوں کا شکریہ جس طرح بھی ہے یاد رکھا۔ اکبر شاہ جی! تبصرہ شاندار لگا لگتا ہے کافی بادام شادام کھاتے رہے ہو۔ محمد شاہان! بچے ابھی دودھ کے دانت ٹوٹے نہیں اور جاسوسی میں وارد ہوگئے۔ اپنی شخصیت بھول کے نہ بچے بری بات بڑوں پر حکم نہیں چلاتے۔ یاد کرو بادشاہوں کو ہمیشہ سازشوں سے ہٹایا گیا۔ عبادت کاظمی جی! صنفِ نازک اتنی بھی نازک نہیں کہ صنفِ کرخت کے ڈر سے بھاگ جائے۔ ماہا ایمان، دلنشین بلوچ، آمنہ پٹھانی اور سعدیہ بخاری بھی بہت جلد انٹری دیں گی۔ تمام سسٹرز سے التماس ہے کہ حاضری دیں یہ دل جلے کنگز بھائی بہت اداس ہیں۔ وجودِ زن سے ہے رنگ جہاں میں یہ بھائی لوگ مس کررہے ہیں ہمیں بھی۔ صفدر معاویہ لگتا ہے آپ کو سرورق کی حسینہ ہماری بھابی لگیں کبھی منہ سے ہماری بھابی یعنی اپنی وائف کے لیے بھی ایسی زبان استعمال کریں۔ زبان ختم نہیں ہوگی۔ حسبِ عادت پہلے گرداب، بھنا گر نے بڑا منظم حملہ کیا اور سلو نے جی داری سے مقابلہ کیا اور بھنا گر موت کے منہ میں چلا گیا غرور کا سر نیچا۔ شہر یار اور سلو چمن کی مدد سے اپنے ملک پاکستان میں چلے آئے پاک چین دوستی زندہ باد۔ چلو جواری نے آخر کچھ ہاتھ پاؤں نکال لیے۔ نورین کا پھر سے غائب ہونا، ریشم کو زہر دینا، سلیم اختر کا ریشم کا بھائی بننا۔ گندی جاگیردارانہ سیاست چلانا ویلڈن احمد اقبال، لگتا ہے بہت جلد سلیم اختر اور انور کے راستے الگ ہوجائیں گے۔ کاشف زبیر کی ایک اور مغربی معاشرے کی عکاس تحریر برخود غلط ایذا پسند مائیکل نے جو کچھ باربی کے ساتھ کیا وہ بھی اپنی مقدس عید کرسمس کی رات اور یہ لوگ پروپیگنڈا کرتے ہیں انسانیت سے محبت کا۔ سرورق کی پہلی کہانی احمد اقبال کی تحریر دغاباز جو کہ پہلے بھی پڑھی ہے فرق صرف یہ لفظ ویلنٹائن ڈے کا آیا۔ پھر بھی بزدل کی باتوں سے دکھی دل شاد ہوا۔ سرورق کی دوسری کہانی دہری دھار افغانستان جیسے زہریلے بچھو قوم کے پس منظر میں لکھی گئی کہانی تھی۔ میجر عامر نے بوتا اور جنرل خانخیلی کو مار کر دل خوش کردیا۔ آج کے اس مہینے اور ملک کے موجودہ حالات میں سمیرا یعقوب صاحبہ کے قلم نے جو سچی حقیقت، اپنوں اور غیروں کی غداری اور دشمنی کے بارے میں زہر اگلا ہے زبردست تحریر ہے۔ باقی مریم کے خان اور امجد رئیس کے ساتھ ساتھ باقی کہانیاں بھی کافی حد تک اچھی لگیں۔ پلیز جاسوسی کے ناراض تبصرہ نگاروں کو واپس لائیں اور وہ سب بھی واپس آجائیں پلیز مجھے اپنے الفاظ اور تبصرے سے محروم نہ کریں خاص کر کھلاڑیِ الفاظ تفسیر عباس بابر، آغا فرید، ہمایوں سعید، ماہا ایمان، تصویر العین اور قدرت اللہ نیازی۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہوسکے۔

میمونہ عزیز، کراچی۔ آفتاب احمد، حیدرآباد۔ عمران ملک، ٹنڈو آدم۔ سونیا جنید، کوٹری۔ رضوانہ سمیع، حیدرآباد۔ انصار احمد، کراچی۔ فرحان شیخ، کراچی۔ ظہیر عباس، اسلام آباد۔ زینب حنیف، لاہور۔ شازیہ طارق، کراچی۔

نغمۂ مرگ

امجد رئیس

آخری حصہ

ہاتھی دانت کی گھات میں رہنے والے چور اُچکوں سے ہوتی ہوئی یہ کہانی ،ہوسِ اقتدار و زر میں مبتلا قوتوں کے اس بھیانک کھیل میں داخل ہوتی ہے جس میں وہ آئینی حکومتوں کو عدم استحکام اور خونی سازشوں سے دوچار کرکے اپنے بے ضمیر مُہروں کو اقتدار کے ایوانوں میں پہنچا دیتے ہیں... سفید چمڑی والے سیاہ فام اور رنگ دار غلاموں کے ذریعے وہ کچھ حاصل کرلیتے ہیں جو ان کے اپنے بس میں بھی نہیں ہوتا... کہیں وہ کامیاب ہو جاتے ہیں اور کہیں ڈینی جیسا، آہنی ارادوں والا باضمیر گورا ان کے راستے کی دیوار بن جاتا ہے...سفاک ہر نام اور چنگ سب ہی اس سازش کے شریک تھے۔ان کا مقصد ایک تھا... غریب اور پس ماندہ افریقی ریاست کے قدرتی وسائل کی لوٹ مار اور بندر بانٹ... ولبر اسمتھ کے حساس قلم نے آج کے دور کی تلخ حقیقتوں کو کہانی کا روپ دے کر بہت حوصلہ افزا پیغام دیا ہے...کوئی دُھن کا پکا جب مقابلے پر اُتر آئے تو وہ اپنے حوصلے سے دشمنوں کے پورے وحشی غول کو بھی پیوندِ خاک کرسکتا ہے۔

عالمی بساط پر فتنہ گری کرنے والی قوتوں

کی ہولناک پنجہ آزمائی کی آخری کوششیں

رولز رائس نے پکاڈلی میں رٹز ہوٹل سے بونی کو لیا۔ اس میٹنگ کا بندوبست بونی کی سیکریٹری نے سر پیٹر ہیرن کی خواہش پر کیا تھا۔ وہ بذات خود سپر لگژری کار میں موجود تھا۔ کار میں رسمی گفتگو ہوئی۔ ہیرن اسے ایک مہنگے ترین ہوٹل میں لے گیا تھا۔ بونی اس ملاقات کے مقاصد کے بارے میں اندازے لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ٹنگ ہیرن ایک لیجنڈ تھا۔ ہوٹل میں اکثریت دونوں کی جانب متوجہ ہوگئی تھی...

خاطر تواضع کے بعد ٹنگ نے اسے ہالینڈ پارک چلنے کی دعوت دی۔ بونی تھوڑا ہچکچائی... کچھ دیر سوچا پھر حامی بھرلی۔

ہالینڈ پارک کی رہائش گاہ دیکھ کر وہ مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ معمولی چیز سے بھی بے پناہ امارت اور شوکت کا اظہار ہو رہا تھا۔ بوڑھے شکاری کا اندازہ صحیح تھا کہ بونی دولت کے لیے کچھ بھی کرسکتی ہے درحقیقت وہ پہلے ہی اس کے ماضی کو کھنگال چکا تھا۔ اس کو پتا تھا کہ بونی کا پرانا نام تھیلما اسمتھ تھا۔ اس کی ماں کا انتقال پینتیس سال کی عمر میں ہیروئن کی بڑی خوراک کی وجہ سے ہوا تھا۔ چودہ سال کی عمر میں خود بونی کو دکان سے چوری اور ماری جوانا رکھنے پر اسکول سے نکال دیا گیا تھا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں اسے نو مہینے کی سزا ہوئی۔ جیل میں اس نے فوٹوگرافی میں دلچسپی لینا شروع کی... غرض ہیرن کو اس کی ہر بات کا پتا تھا۔ اپنے آفس میں بونی کے ساتھ اس نے زیادہ وقت ضائع نہیں کیا اور جلد مطلب کی بات پر آگیا۔ اس سے پہلے وہ بونی کو اتنی بڑی رقم کی پیشکش کرچکا تھا جس کے بارے میں اس سے قبل بونی نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

”کام بہت آسان ہے۔“ اس نے بونی کو کام بتایا کہ وہ اس سے کیا چاہتا ہے۔

☆☆☆

ڈینیل نے ہفتے کے ساتوں دن برٹش میوزیم لائبریری کے ریڈنگ روم میں گزارے۔ ہر نئے پروجیکٹ کو شروع

کرنے سے پہلے یہ اس کی عادت تھی۔ اس نے اوبومو سے متعلق کتابوں کے علاوہ کانگو، رفٹ ویلی اور اس کی جھیلوں... افریقا کے بارانی جنگلات کے بارے میں متعدد کتابیں طلب کیں۔ نئی کتابوں میں اسے کیلی وان کی "بلند درختوں کے باسی" بھی مل گئی۔ ڈینیل نے کتاب میں کیلی کی تصویر دیکھی۔ اندازاً وہ تیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ بالوں کی رنگت سیاہ تھی۔ وہ ایک پُرکشش عورت تھی جو ٹنگ کے لیے ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی۔

کیلی نے گھنے جنگلات میں تین برس پگمی قبیلے کے ساتھ گزارے تھے۔ اوبوموکی چار ملین کی آبادی میں گیارہ قبائل تھے... سب سے چھوٹا قبیلہ بموٹی تھا۔ اوہالی سب سے بڑا قبیلہ تھا جبکہ صدر تفاری کا ہی تانامی قبیلہ سیاست اور فوج میں سب سے نمایاں تھا۔

کیلی وان ایک پیشہ ور ماہرِ بشریات تھی۔ حقائق تک پہنچنے کے معاملے میں اس کی نظر بہت تیز تھی۔ لکھنے کی قدرتی صلاحیت کی وجہ سے اس کی تحریر خشک سائنسی موضوعات میں بھی رنگ بھر دیتی تھی تاہم یہ محض رنگ آمیزی نہیں ہوتی تھی وہ اپنے مقصد پر یقین رکھتی تھی اور اس کے ساتھ مخلص تھی... نڈر بھی تھی۔ ان خصوصیات کی وجہ سے اب تک ٹنگ جیسے شکاری کے قابو میں نہیں آئی تھی۔

ڈینیل اس سے پہلے ہی متاثر تھا۔ اب وہ اس سے ملنے کا خواہش مند تھا۔ بوس کی سالانہ جنرل میٹنگ میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا اور وہاں کیلی کے ساتھ مڈبھیڑ متوقع تھی۔

سالانہ جنرل میٹنگ میں تمام نشستیں پُر تھیں۔ بقیہ ہجوم ہال کی عقبی نشستوں کے پیچھے تھا۔ ڈائس پر ایک بڑی ٹیبل پر ٹنگ ہیرسن مائیکروفون کے ساتھ موجود تھا۔ اطراف میں بورڈ کے ممبران تھے۔

ٹنگ ہیرسن نے کھڑے ہو کر بوس کی کارکردگی پیش کی۔ ہر اچھی خبر پر شیئر ہولڈرز مسرت کا اظہار کرتے رہے۔

ٹنگ ہیرسن نے وقت دیکھا، پانی کا گھونٹ لیا... اب وہ مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں بتانے جارہا تھا۔

اس نے چرب زبانی سے تقریر کا آغاز کیا اور پھر اوبومو کی کہانی چھیڑ دی۔ دس منٹ تک وہ سامعین کو غیر معمولی ڈیویڈنڈ اور بلند منافع کی خبروں سے مسحور کرتا رہا۔

اس کے بعد کمپنی سیکریٹری نے کھڑے ہو کر بڑے خوبصورت الفاظ میں حاضرین کو سوالات کی دعوت دی۔

"میرے پاس ایک سوال ہے مسٹر چیئرمین کے لیے۔" پُرسکون ماحول میں ایک بلند نسوانی، مستحکم آواز گونجی۔ اب تک ڈینیل کھچا کھچ بھرے ہال میں کیلی وان کو کھوجنے کی ناکام کوشش کرتا رہا تھا۔ اب وہ اپنی جگہ کھڑی تھی...

سامنے سے تیسری قطار۔ ڈینیل مسکرایا۔ کیلی کی آواز کی گونج اب تک باقی تھی۔ اس نے بلاتامل اپنی جوان مضبوط آواز میں کھیل کا رنگ بدلنا شروع کیا۔ "مسٹر چیئرمین، برٹش اوورسیز اسٹیم شپ کمپنی نے حال ہی میں کمپنی کے البم میں گرین ٹری کا عکس شائع کیا ہے۔ کمپنی کے آگے کے منصوبے اس کو کاٹنے جارہے ہیں... کیوں؟"

یکایک ہال میں سناٹا طاری ہوگیا۔

"تیس برس سے، سر پیٹر۔" کیلی کی زبان کا کوڑا حرکت میں تھا۔ "تب سے آپ کمپنی کے چیئرمین ہیں، کمپنی کا سلوگن رہا ہے "کھود ڈالو" یا "کچل ڈالو" تیس سال سے برٹش اوورسیز اسٹیم شپ کمپنی افریقا کی مٹی سے معدنیات نکال کر اسے پامال کررہی ہے... برباد کررہی ہے... یہ ہے... "کھود ڈالو"... والی ذہنیت، تیس سال سے بوس جنگلات کا صفایا کر کے نقد آور فصلیں اگا کر کاٹ رہی ہے، جیسے "کاٹن"... وغیرہ۔ یوں مٹی بانجھ ہورہی ہے... نائٹریٹ فرٹیلائزر کا استعمال زمین کو مزید تباہ کررہا ہے... جھیلیں اور دریا آلودہ ہورہے ہیں، یہ ہے "کچل ڈالو" والی ذہنیت۔"

ڈینیل نے قہقہے کا گلا گھونٹا۔ کیلی نے منٹوں میں رنگ میں بھنگ ڈال دیا تھا۔

ٹنگ نے تیوری چڑھا کر سیکریٹری کو دیکھا۔ بندۂ بے دام اچھل کر کھڑا ہوا۔ "برائے مہربانی اپنا نام بتائیے... سوال کو مختصر اور صاف رکھیں۔"

"میں ڈاکٹر کیلی وان ہوں اور چیئرمین سے مخاطب ہوں، ہم یہاں بیٹھے ہیں اور اوبومو میں بارانی جنگلات کا صفایا ہورہا ہے۔" وہ چیئرمین کو گھور رہی تھی۔ "کیا چیئرمین موصوف اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ بوس کی براہِ راست سرگرمیوں کے نتیجے میں جنگلی حیات کی تقریباً پچاس اقسام نابود ہوچکی ہیں۔"

ہال میں بھنبھناہٹ شروع ہوگئی۔ ڈینیل نے ٹنگ ہیرسن کو دیکھا جو خود کو پُرسکون ظاہر کررہا تھا۔ تاہم ڈینیل جانتا تھا کہ اس کا بس چلے تو اس عورت کو اسی ہال میں شوٹ کردے۔

"بیٹھ جاؤ!" کوئی چلایا۔

"ڈاکٹر وان۔" سیکریٹری بولا۔ "میں درخواست کروں گا کہ آپ بیٹھ جائیں۔"

وہ بھی آفت کی پرکالہ تھی۔ "میں آپ پر دھرتی کے "ریپ" کا الزام عائد کرتی ہوں۔" اس نے بندوق کی طرح ہاتھ دراز کر کے ٹنگ کی جانب انگلی سے اشارہ کیا۔

ہال میں شور مچ گیا۔

"شیم۔"

"یہ عورت پاگل ہے۔"

کسی نے کیلی کو بٹھانے کی کوشش کی تاہم واضح طور پر وہ اپنے حمایتیوں کے گھیرے میں تھی۔

"اس کو کہنے دو۔" کوئی چیخا۔

"ڈاکٹر، مجھے افسوس ہے کہ مجھے زبردستی آپ کو باہر بھیجنا پڑے گا۔" سیکریٹری نے بے بسی سے کہا۔

"میں کمپنی میں حصے دار ہوں... میرے حقوق..."

"باہر نکالو..."

ہلڑ بازی بڑھ رہی تھی۔ ڈینیل چوکس ہوگیا۔

"مجھے جواب چاہیے۔" کیلی چلائی۔ "جنگلی حیات کی پچاس اقسام ختم کردی گئیں... رولز رائس میں گھومنے کے لیے..."

سیکریٹری نے گارڈز کو اشارہ کیا اور وہ حرکت میں آگئے۔ ایک نے جگہ بنانے کے لیے کہنی سے ڈینیل کو ایک طرف کیا، جواباً ڈینیل خود کو ردِعمل سے نہ روک سکا۔ اس نے پھرتی سے سیدھی ٹانگ اڑائی... وہ لڑھکتا ہوا کرسیوں سے جا ٹکرایا۔

ہڑبونگ فساد میں بدلنے لگی... کرسیاں ٹکرائیں... خواتین چیخنے لگیں... شور بڑھنے لگا، پریس کے لیے یہ ایک آئیڈیل سچویشن تھی... فوٹو گرافرز کیمرے اٹھا کر اپنے کام میں لگ گئے۔

"وہ جنگلات تمہارے نہیں ہیں، وہ جنگلات کسی ظالم آمر کے نہیں ہیں جو اس غارت گری میں تمہارے ساتھ ملا ہوا ہے..." ڈاکٹر کیلی وان اسی طرح گرج رہی تھی۔

"وہ جنگلات بموٹی کے معصوم لوگوں کے ہیں... وہ پُرامن، کمزور لوگ ہزاروں سال سے وہاں رہتے آئے ہیں۔"

میگافون کی وجہ سے اس غل غپاڑے میں بھی کیلی کی آواز نمایاں تھی۔

بوس کے ہرکارے بالآخر اس تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کا واحد ہتھیار بھی چھین لیا گیا۔

"مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" وہ چیخی۔ اسے باہر نکال دیا گیا تاہم وہ جس مقصد سے آئی تھی وہ فتنہ اٹھا گئی تھی۔

ہال میں کچھ سکون طاری ہوا تو ٹنگ نے دوبارہ اپنی جگہ سنبھالی اور جھوٹ سچ باتیں... اعداد و شمار کا جال... چرب زبانی، پھر اس کی اپنی شخصیت اور پوزیشن، صورتِ حال بظاہر سنبھل گئی۔

☆☆☆

رنگ چنگ گانگ کے باپ نے اعلان نہیں کیا تھا کہ وہ اپنے کس بیٹے کو سنڈیکیٹ آپریشن کے لیے بوس کی ٹیم کے ساتھ اوبومو روانہ کرے گا۔ ان سب کے لیے یہ اعلان بہت اہم تھا۔ جسے بھی روانہ کیا جاتا، وہ از خود اس بات کی علامت بن جاتا کہ باپ کے بعد کون جگہ لے گا۔ ٹنگ چنگ گانگ باپ کے ساتھ رہنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے خاندان کا سفر ایک فیصلہ کن موڑ پر ہے۔ اس کی نیندیں حرام ہوگئی تھیں، ایک بار اعلان ہو جاتا تو کوئی کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ ٹنگ چنگ نے محسوس کرلیا کہ اس کا باپ کسی بھی وقت اوبومو پروجیکٹ کے بارے میں فیصلہ کردے گا۔ یہی لمحہ تھا کہ وہ باپ کا دل جیت لینے والا تحفہ دے۔ موقع ملتے ہی اس نے ارادے کو عملی جامہ پہنا دیا۔

"قابلِ احترام، والد گرامی۔" وہ باپ کے سامنے جھکا ہوا تھا۔ "میں آپ کے لیے دل میں جو عقیدت، عظمت، عزت و احترام محسوس کرتا ہوں، اس کے اظہار کے لیے میرے پاس ایک چھوٹی سی چیز ہے۔"

"بیٹا، مجھے دکھاؤ... تم میرے لیے کیا لائے ہو؟"

چنگ نے ہاتھ بلند کیا اور تھوڑی دور موجود ڈرائیور رولس رائس کو آگے بڑھا لایا۔

باپ بیٹا خاموش تھے۔ کار کچھ دیر بعد لکی ڈریگن کمپنی کے مرکزی گودام پر پہنچ گئی۔ ایک گودام کے دروازے کھلے تھے۔ چنگ نے باپ کو اندر لے جا کر ایک آرام دہ نشست پر بٹھایا اور چائے کا آرڈر دیا۔ وہ درحقیقت ڈرامائی انداز اپنا رہا تھا۔

دس ملازم اس کے باپ کے سامنے ایک قطار میں سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ چنگ نے باپ کو بتایا۔ "میں افریقا سے آپ کے لیے یہ لایا ہوں۔" اس نے ملازمین کے عقب میں رکھی پیٹیوں کی جانب اشارہ کیا۔ "مجھے شرم آتی ہے اتنا معمولی تحفہ پیش کرتے ہوئے۔"

"ٹی؟" باپ مسکرایا۔ "اتنی ساری چائے... میری بقیہ زندگی کے لیے بہت ہے... میرے بیٹے یہ ایک اچھا تحفہ ہے۔"

"آپ میرا دل رکھ رہے ہیں... کیا میں آپ کے لیے ان کو کھول دوں؟" مکار چنگ کی ڈرامے بازی جاری تھی۔

باپ نے سر ہلا کر اجازت دی۔

چنگ نے تالی بجائی۔ ملازم کھڑے ہوئے، دو ایک پیٹی اٹھا لائے۔

"اتنی وزنی چائے۔" جہاندیدہ باپ نے تاڑ لیا کہ بکس ضرورت سے زیادہ بھاری ہے۔

باپ کی نشست بلندی پر تھی۔ وہ ذرا آگے جھکا۔

دو ملازم بکس کھول کر چائے کے بستر پر سے ہاتھی کا ایک وزنی اور طویل دانت اٹھا رہے تھے۔ یہ ذخیرے کا سب سے نادر شاہکار تھا جسے چنگ نے کافی پہلے منتخب کر لیا تھا۔ کریم رنگ کا دانت سات فٹ لمبا تھا۔ اس کا زاویہ، جڑ سے نوک تک کا تناسب، رنگ... وزن... لمبائی... وغیرہ۔

جوہری کو ہی پتھر کی خوبیوں کا علم ہوتا ہے۔ ہاتھی دانت کی بیش بہا خوبیوں کو ہنگ جیسا کوئی باذوق ہی پہچان سکتا تھا۔

"ادھر لاؤ۔" بوڑھا جوہر شناس دنگ رہ گیا۔ دونوں ملازم احتیاط سے وزنی دانت لے کر چند قدم اوپر آئے اور قدرت کا شاہکار اس کے قدموں میں رکھ دیا۔ اس نے اسے چھوا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "حسین ترین" وہ بڑبڑایا۔ معاً اسے احساس ہوا کہ دانت پر اسٹیمپ لگی ہے... وہ تھوڑا اور جھکا اور زیڈ ڈبلیو کے حروف دیکھ لیے۔ "زمبابوے گورنمنٹ" اس نے تالی بجائی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ قانونی اور غیر قانونی ہاتھی دانت کا مارکیٹ میں کیا نرخ ہے۔

"میرے عظیم والد ہر پیٹی میں ہاتھی دانت ہیں... اور ہر ایک پر اسٹیمپ ہے۔" چنگ کا سینہ پھول گیا۔

باپ نے غیر یقینی نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔

"کہاں سے ملا یہ ذخیرہ؟" باپ بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔

"نہیں، رکو... میں بتاتا ہوں۔" اس نے دونوں ملازموں کو دور ہٹایا اور سرگوشی میں اپنی اخباری معلومات کا اظہار کیا۔

وہ نگاہیں نیچی کیے، ہمہ تن گوش تھا۔

"جس نے بھی چی واؤ پارک پر ریڈ کا منصوبہ بنایا تھا، وہ ہوشیار بھی تھا اور دلیر بھی، وہ اپنی مطلوبہ چیز کے حصول کے لیے خون بہانے سے بھی گریز نہیں کرتا... میں پسند کرتا ہوں ایسے آدمی کو... جوانی میں، میں بھی ایسا ہی تھا... وہی اسپرٹ مجھے تمہارے اندر نظر آئی ہے... اس تحفے سے قبل میں شک میں تھا اور فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کسے اوبوموبھیجنا چاہیے... تم نے مجھے خوش کیا ہے اور میری مشکل بھی آسان کر دی ہے، تیاری کرو جانے کی۔"

چنگ نے باپ کے ہاتھ کو ادب سے چوما۔ "میں آپ کی توقعات پر پورا اُتروں گا۔" خوشی کے مارے اس کی آنکھ سے آنسو ٹپک کر سن رسیدہ باپ کی ہتھیلی کی پشت پر جا گرا۔

☆☆☆

ہیتھرو سے اوبومو، کوئی ڈائریکٹ فلائٹ نہیں تھی۔ ڈینیل اور بونی پہلے نیروبی پہنچے وہاں سے.... اتر او بومو کے ذریعے کاہالی جانا تھا، ایک دن فارغ تھا۔

ڈینیل نے بونی سے پوچھا۔ "کیوں نا آج بیک گراؤنڈ فوٹیج نیروبی میں بنائے جائیں۔" دراصل وہ بونی کو ایکشن میں دیکھنا چاہتا تھا تاکہ فیلڈ میں کام کرتے ہوئے ان کے مابین ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔ وہ ٹرک ہائر کر کے نیروبی نیشنل پارک پہنچے۔ ڈینیل گزشتہ برسوں میں یہاں کئی بار فلم بنا چکا تھا اور وارڈن سے شناسائی رکھتا تھا۔ وارڈن نے ایک سینئر رینجر ان کے حوالے کر دیا۔ وہ پارک میں کہیں بھی جا سکتے تھے اور گاڑی سے اتر کر بھی شوٹ کر سکتے تھے۔

رینجر دونوں کو دریا کے کنارے اکیشیا جنگل کے پاس لے گیا جہاں گینڈوں کا ایک جوڑا خرمستیوں میں مگن تھا۔ ڈینیل اور بونی ٹرک سے اترے اور احتیاط سے گینڈوں کے قریب ہونے لگے۔ ڈینیل حیران تھا کہ بونی نہایت سہولت سے کیمرے کو سنبھالے ہوئے سبک رفتاری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

دونوں کافی قریب ہونے کے بعد چوکس ہو گئے۔ یہ ایک سخت اور خطرناک کام تھا لیکن بونی نے کسی قسم کے خوف کا مظاہرہ نہیں کیا۔

اچانک نر گینڈا بغیر کسی اشارے کے ان کی طرف لپکا۔

"اپنی جگہ جم جاؤ۔" ڈینیل نے بونی کا بازو تھاما۔ دونوں گھٹنوں کے بل فریز ہو گئے۔ قطعی بے حس و حرکت... بپھرا ہوا گینڈا بیس فٹ کے فاصلے تک آ گیا تھا۔ گینڈے کی نظر کمزور ہوتی ہے۔ وہ فیصلہ کر رہا تھا کہ یہ کوئی بے جان چیز ہے، کوئی پتھر یا کچھ اور... کسی بھی قسم کی حرکت اسے یقین دلانے کے لیے کافی تھی کہ یہ کوئی بے جان

چیزیں نہیں ہیں... اس کی پیش قدمی سست ہو گئی۔

ڈینیل کو اچانک مدھم سی بھنبھناہٹ کا احساس ہوا... کیمرے کی مخصوص آواز تھی۔ وہ ششدر رہ گیا۔ اس نے آنکھ کے کونے سے دیکھا کہ بونی اب بھی عکس بندی میں مصروف تھی۔ کیمرے کا لینس گینڈے کی ناک سے محض چند فٹ کے فاصلہ پر تھا۔ ڈینیل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس عورت کی شکل میں اسے ایک غیر معمولی کیمرا مین کا ساتھ مل گیا ہے۔

اچانک وزنی گینڈا پھرتی سے مڑا اور اپنی ساتھی کی طرف دوڑ گیا۔

بونی ہنس رہی تھی۔ ڈینیل کو یقین نہیں آیا۔ ڈینیل نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ "نکلو یہاں سے۔" دونوں قدم بہ قدم احتیاط سے پسپا ہونے لگے۔ نظریں بدستور گینڈوں پر جمی تھیں۔

"تم خطرناک حد تک دلیر بھی ہو اور اپنے کام سے تمہارا رشتہ بہت مضبوط ہے۔" ٹرک کے قریب پہنچ کر ڈینیل نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔

اس نے دانت چمکائے۔ "ابھی تو میں شروع ہوئی ہوں، ذرا روشنی کو جانچ رہی تھی... ایک ہفتے بعد تم میرا کام دیکھنا۔"

ایک گھنٹے بعد وہ صاف ستھرے لباس میں ہوٹل سے نکلے اور کینیا کی کھلی فضا میں برآمدے سے گزر کر لان کی جانب چل دیے... کچھ دیر کے لیے وہ رنگ رنگ کے پرندوں کے پاس رکے۔

ڈینیل نے قریب کھڑی اوسط قامت کی خاتون کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی، جب تک کہ اس نے رخ بدل کر اسے نام سے مخاطب نہیں کیا۔

"مداخلت کے لیے معذرت چاہتی ہوں۔" وہ بولی "آپ ڈاکٹر ڈینیل آرم اسٹرانگ ہیں؟"

ڈینیل اسے پہچان گیا۔ "ڈاکٹر وان، آخری مرتبہ میں نے آپ کو بوس کی سالانہ جنرل میٹنگ میں دیکھا تھا۔"

"اوہ، آپ وہاں تھے؟" وہ ہنس پڑی۔ "میں نہیں دیکھ پائی تھی۔"

"یقیناً، کیونکہ آپ کا دماغ اس وقت کسی اور جانب تھا۔" ڈینیل بھی مسکرایا۔

"آپ کے میگافون کا کیا ہوا؟"

"اس کا کام ختم، وہ بھی ختم۔" وہ پھر ہنسی۔ کیلی وان کی حس مزاح اس کی تحریر میں جھلکتی تھی۔

اس کی آنکھیں اس سے زیادہ خوبصورت تھیں جتنی کہ فوٹو میں دکھائی دیتی تھیں۔ ڈینیل کو کیلی پسند آئی تھی۔ اس غیر متوقع ملاقات نے اس کا موڈ مزید خوشگوار کر دیا۔

"کیلی، یہ بونی ماہون ہیں، میری کیمرا ویمن۔" ڈینیل نے تعارف کرایا۔

"ہاں" کیلی نے شناسائی کا اظہار کیا۔ "میں نے تمہارا کام دیکھا ہے، تمہاری فلم آرکٹک ڈریم بہت شاندار تھی۔"

"شکریہ" بونی نے کہا۔ "تاہم میں نے تمہاری کتاب نہیں پڑھی۔"

"یہ امر تم کو کئی سو ملین افراد کی اکثریت میں شامل کرتا ہے جنہوں نے یہ کتاب نہیں پڑھی۔" وہ پھر ڈینیل کی طرف متوجہ ہوئی۔

"میں تقریباً تمہارا سارا کام گزشتہ برسوں میں دیکھ چکی ہوں... اور اس سال "ڈائنگ افریقا" سیریز بھی۔ درحقیقت تم ہی میری افریقا میں موجودگی کے ذمے دار ہو... بہت اچھا کام ہے تمہارا... شاندار... بلا کسی مروت میں کہہ سکتی ہوں کہ میں تمہاری مداح ہوں اور سچ یہ ہے کہ جب سے مجھے تمہاری نیروبی میں موجودگی کا علم ہوا میں ملاقات کی امید میں یہاں چلی آئی۔ میں تم سے کچھ تبادلۂ خیال بھی کرنا چاہتی ہوں۔"

"مطلب، تم یہاں ٹھہری ہوئی نہیں ہو؟"

"نہیں" اس نے کہا۔ "میں ایک کامیاب ٹی وی پروڈیوسر نہیں ہوں۔ میں ایک کم وسیلہ فیلڈ ریسرچر ہوں... نو اسپانسر... جب سے صدر تقاری نے اوبومو سے نکالا۔"

"چلو کچھ کھاتے ہیں۔" ڈینیل نے کہا۔

"ہاں، ڈاکٹر وان تم ہمیں جوائن کیوں نہیں کر لیتیں؟" بونی کی آواز میں شہد آمیز زہر تھا۔ اس نے ہم پر قصداً زور دیا تھا۔

"تم کتنی سوئٹ ہو مس ماہون۔" کیلی کا لہجہ کسی قدر سرد تھا۔ اس نے بونی ماہون کی طرف نگاہ ڈالی۔ دونوں کے درمیان رقابت و عداوت کا اظہار بجلی کی طرح چمکا تھا۔

ڈینیل دوستانہ انداز میں مسکرایا۔ "چلو بھئی کچھ کھانے کے لیے تلاش کرتے ہیں۔" وہ ان کے ساتھ کورٹ یارڈ میں گرل روم کی طرف بڑھ گیا۔

"نیروبی میں، ڈاکٹر آرم اسٹرانگ..."

"ڈینی" ڈینیل نے کیلی کی بات کاٹ کر اسے غیر رسمی انداز اپنانے کی دعوت دی۔

"اوکے... ڈینی تم یہاں کیا کررہے ہو؟"

"درحقیقت ہماری منزل اوبوموہے۔"

"اوبوموا!" کیلی نے اسے دیکھا اور یک لخت خاموش ہوگئی... پھر وقفے سے بولی۔ "گریٹ... بغاوت سے قبل کیا تم وہاں تھے؟"

"نہیں، میں وہاں تین چار سال قبل گیا تھا۔"

"یعنی وکٹر اومیرو کے دورِ حکومت میں۔" کیلی نے کہا۔

"ہاں، میں اس سے مل چکا ہوں۔ وہ آدمی مجھے پسند آیا تھا۔" وہ بولا۔ "کیا ہوا اس کے ساتھ، میں نے سنا ہے کہ دل کا دورہ پڑا تھا؟"

کیلی نے کندھے اچکائے۔ اتنے میں ہیڈ ویٹران کی جانب آیا اور ڈینیل ادھر متوجہ ہوگیا۔

وہ واپس موضوع کی طرف آیا۔ "میں نے سنا ہے کہ تمہاری صدر اومیرو کے ساتھ اچھی ہم آہنگی تھی؟"

"کس نے بتایا؟" کیلی نے تیزی سے سوال کیا۔

ڈینیل نے بروقت خود کو روک لیا۔ ٹگ ہیرسن کا یہاں نام لینا قطعی نامناسب تھا۔ "میرے خیال میں، میں نے کہیں آرٹیکل میں پڑھا تھا۔" اس نے وضاحت پیش کی۔

"اوہ ہاں" کیلی نے کہا۔ "غالباً سنڈے ٹیلی گراف کی بات ہے... انہوں نے اومیرو کا پروفائل دیا تھا، میرا بھی ذکر تھا۔"

"ہاں غالباً" ڈینیل نے کہا۔ "اوبومو میں کیا ہو رہا ہے؟ کچھ دیر قبل تم نے کہا تھا کہ تم وہاں کے بارے میں بریف کروگی۔"

"اوبومو میں وہ تمام مسائل ہیں جو تقریباً ہر افریقی ملک کو درپیش ہیں" کیلی نے کہنا شروع کیا۔ "نسلی تفرقات، قبائلی تفریق، بڑھتی ہوئی آبادی، جہالت، غربت وغیرہ اور اب وہ گندا آدمی تفاری مسلط ہوگیا ہے۔ نئے مسائل پیدا کرنے کے لیے۔ کرپشن، بیرونی مداخلت اور لوٹ مار، آمریت... قدرتی وسائل کی تباہی اور انخلا..."

"قبائل کے بارے میں کچھ بتاؤ؟"

"قبائلی تفریق... افریقا کی عظیم لعنت۔ اوبومو میں قابلِ ذکر چھ قبیلے ہیں لیکن صرف دو ہی ہر چیز میں عمل دخل رکھتے ہیں۔ اوہالی سب سے زیادہ ہیں، چار ملین میں سے تین ملین۔ روایتی طور پر یہ کھیتی باڑی اور ماہی گیری کرتے آئے ہیں تاہم یہ لوگ خود سے کہیں کم تعداد والے قبیلے کے زیرِ تسلط ہیں... میرا مطلب "ہی تا" قبیلے سے ہے۔ ہی تا جنگجو قبیلہ ہے، یہ لوگ مویشیوں پر انحصار کرتے ہیں، یہ لوگ قد کاٹھ میں بھی بلند ہیں... چھ فٹ کا قد ان میں ایک عام بات ہے... یہ ظالم، ضدی اور وحشی افریقی ہیں۔" کیلی نے بات جاری رکھی۔ "اومیرو، اوہالی قبیلے سے تھا۔ وہ اچھا صدر تھا... اس نے سب کا خیال رکھنے کی کوشش کی، وہ غیر ملکی مداخلت کو بھی پسند نہیں کرتا تھا ہی تا قبیلہ مغرور اور خونخوار تھا، وہ فطرتاً لڑاکا تھے نتیجتاً فوج میں ان کا تناسب بڑھتا گیا جس کا نتیجہ منطقی تھا اور اب الفرم تفاری تاحیات صدر ہے۔ ہی تا کی اقلیت باقی تین ملین پر حکومت کررہی ہے۔ ان میں اوہالی بھی ہیں اور میرا پسندیدہ بمبوٹی قبیلہ بھی۔"

"کیلی، بمبوٹی کے بارے میں بتاؤ۔" ڈینیل نے دلچسپی ظاہر کی۔ "بلند درختوں کے باسی" وہ مسکرایا۔

"اوہ، تم کتاب کے ٹائٹل کو دیکھ چکے ہو..."

"میں پڑھ بھی چکا ہوں... تین مرتبہ۔" اس نے نفیس اشارہ دیا کہ وہ بھی اس کا فین ہے۔

بونی اچانک کھڑی ہوگئی۔ "معاف کیجیے" وہ پہلی مرتبہ بولی۔ وہ نظرانداز کیے جانے کی عادی نہیں تھی۔ "مجھے اور وائن کی ضرورت ہے، اگر کسی اور کو بھی دلچسپی ہے؟" یہ کہہ کر بونی وہاں سے ہٹ گئی۔

آخرکار ڈینیل نے ناخوشگوار سکوت کو توڑا۔ "ہم بمبوٹی کے بارے میں بات کررہے تھے۔"

کیلی نے اس کی جانب دیکھا تاہم فوراً جواب نہیں دیا۔

"تم بمبوٹی کے بارے میں جاننا چاہتے ہو، ٹھیک ہے۔" بالآخر وہ بولی "میں تمہیں وہاں لے جاتی ہوں۔ میں تمہیں وہ جگہیں دکھاؤں گی جو اس سے قبل مغرب کے کسی انسان نے نہیں دیکھی ہیں۔"

"میں اس موقع کو نہیں گنواؤں گا، کیلی۔" ڈینیل نے سنسنی محسوس کی۔ "لیکن کیا ایک چھوٹی سی رکاوٹ نہیں ہے؟ صدر تفاری تمہیں سب سے بلند درخت سے لٹکا دے گا اگر تم نے ایک قدم بھی سرحد کی اس جانب رکھا؟"

کیلی کا قہقہہ بڑا گونج دار تھا۔ وہ اپنی ہنسی کی آواز سے خوب لطف اندوز ہورہی تھی۔ "پھانسی سے زیادہ وہ دوسری ترکیب کو ترجیح دے گا۔"

"پھر تم کیونکر ہمیں بمبوٹی تک گائیڈ کرسکوگی؟"

"میں نے ان جنگلات میں پانچ سال گزارے ہیں۔ تفاری کی عملداری وہاں پر ختم ہوجاتی ہے، میرے بہت سے دوست ہیں اور تفاری کے بہت سے دشمن ہیں۔"

"میں کیسے رابطہ کروں گا؟" ڈینیل نے بے قراری سے پوچھا۔

"تم نہیں، میں رابطہ کروں گی۔"

"مجھے بتاؤ کہ تم کیوں خطرہ مول لیتی ہو، بغیر کسی اسپانسر کے، بغیر کسی سپورٹ کے جبکہ گرفتاری اور موت تک کے امکانات موجود ہیں۔"

کیلی کچھ دیر اسے گھورتی رہی، پھر بولی "وہاں میرے لیے بہت کام ہے، دوسری چیزوں کے علاوہ میں فزیالوجی پر کام کررہی ہوں، میں ان کے چھوٹے قد کو اسٹڈی کرتی رہی ہوں... میری کوشش ہے اور میں پُرعزم ہوں کہ ان کے رکے ہوئے قدوقامت کی وجوہات سے پردہ اٹھا سکوں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے ایک نیا زاویہ تلاش کیا ہے، اب تک ہر کوئی گروتھ ہارمونز پر توجہ مرکوز کرتا رہا ہے۔" وہ رک گئی اور مسکرائی۔ "میں تمہیں تفصیلات سے بور نہیں کرنا چاہتی۔"

"اوہ، ہم بور نہیں ہورہے۔" بونی نے واپس آکر مداخلت کی اور اپنے فقرے کے مصنوعی پن کو چھپانے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔

"بمبوٹی قبیلے کا چھوٹا قدوقامت بارانی جنگلات میں ان کی رہائش کے لیے آئیڈیل ہے، تم دیکھ کر حیرت میں پڑ جاؤ گے کہ وہ وہاں کس انداز میں حرکت پذیر رہتے ہیں۔ وہ نہایت آسانی سے تمہاری نگاہوں کے سامنے غائب ہوجاتے ہیں۔" کیلی کا چہرہ اور آنکھیں جوش اور فخر سے چمک رہی تھیں۔ وہ ان بونوں کے بارے میں بات کررہی تھی جن کو اس نے اپنا بنالیا تھا۔

ڈینیل نے آئس کریم کا آرڈر دیا۔

کیلی کا پسندیدہ موضوع ختم نہیں ہوا تھا۔

"تحقیق کا دوسرا رخ مزید اہم ہے۔ بمبوٹی پودوں اور ان کے حیرت انگیز خواص کا بھرپور علم رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری جان لیوا بیماریوں کا حل ان پودوں میں پوشیدہ اور بیکار پڑا ہے۔ کینسر اور ایڈز جیسی ہولناک بیماریوں کے قفل کی چابی تاریک براعظم کے تاریک جنگلات میں دفن ہے۔"

"سائنس فکشن۔" بونی نے اب باقاعدہ مذاق اڑایا۔

"کیا تم اپنا منہ بند رکھوگی؟" ڈینیل تڑخ اٹھا۔ "یہ بڑا سحرانگیز ہے، تمہاری تحقیق کتنی آگے بڑھ گئی ہے؟"

کیلی کسی قدر سنجیدہ ہوگئی۔ "اتنی آگے نہیں جتنا کہ میں چاہتی تھی... میرے پاس نہ صرف وہاں جگہ کی کمی ہے بلکہ رقم بھی نہیں ہے۔"

"پھر بھی میں دیکھنا پسند کروں گا۔"

"تم دیکھوگے۔" اس نے وعدہ کیا۔ اس کے کام میں ڈینیل جیسے شخص کی دلچسپی کیلی کو کہیں دور لے گئی تھی غیر اختیاری طور پر اس کا ہاتھ ڈینیل کے ہاتھ پر تھا۔ "تمہیں گونڈالا جانا پڑے گا جہاں میں رہتی ہوں۔"

بونی کی نظر کیلی کے ہاتھ پر تھی۔ وہ حسد محسوس کررہی تھی۔ زہرناک حسد... "سرپیٹر ایڈز کے فارمولے میں بہت دلچسپی لیں گے۔" بونی نے کہا۔ اس کی نظر ابھی تک کیلی کے ہاتھ پر تھی۔ "بوس اسے مارکیٹ کرے گی اور کمپنی کا شیئر آسمان سے باتیں کرے گا۔"

"بوس سرپیٹر؟" کیلی کو جھٹکا لگا۔ اس کا ہاتھ ڈینیل کے ہاتھ سے ہٹ گیا۔

"ٹگ ہیرسن۔" بونی نے تسکین محسوس کی۔ "وہ ہماری پروڈکشن کو فنانس کررہا ہے۔ ڈینیل اوبومو بوس کے لیے جارہا ہے... یہ ڈینیل کا ماسٹر پیس ہوگا..." اوبوموہائی روڈ ٹو افریقن فیوچر..."

کیلی نے بونی کی پوری بات بھی نہیں سنی اور کھڑی ہوگئی۔ "تم!" اس نے ڈینیل کی آنکھوں میں دیکھا۔ "تم .... اور بدمعاش ہیرسن؟ آخر تم کیسے..." وہ مڑی اور بھاگتی ہوئی وہاں سے نکل گئی۔

"لعنت ہے تم پر۔" ڈینیل غرایا۔ "انوکھی چیزوں کی عکس بندی کا موقع تم نے برباد کردیا۔"

وہ غصے میں بھرا ہوا کیلی وان کے پیچھے گیا۔ لابی میں وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ بیرونی گیٹ کی طرف بھاگا، فاصلے پر اسے کیلی نظر آئی۔ وہ گردآلود طاقتور ہونڈا کو کک لگا رہی تھی۔

"کیلی۔" ڈینی چلایا۔ اس نے ایک پہیے پر بائیک گھمائی اور ریس دے کر کلچ چھوڑا، موٹرسائیکل غراتی ہوئی پچھلے پہیے پر بھاگی۔

"رک جاؤ، مجھے موقع دو وضاحت کا۔" وہ چیخا۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے کیلی نے ایک لمحے کے لیے اس کی جانب دیکھا۔ اس کے تاثرات میں غصہ بھی تھا اور شاک بھی۔ اس نے منہ پھیر لیا لیکن ڈینیل نے اس کے رخساروں پر آنسو دیکھ لیے تھے۔

ڈینیل واپس مڑا۔ اس کا موڈ بگڑ گیا تھا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اگر وہ اس موڈ میں یونی کے سامنے گیا تو دونوں میں جھڑپ ہوجائے گی اور وہ ایک باکمال کیمرا ویمن سے محروم ہوجائے گا۔ پھر موزوں فرد تلاش کرنے میں کئی ہفتے لگ جائیں گے... بہت ممکن ہے کہ بوس کے ساتھ اس کا کنٹریکٹ ہی خطرے میں پڑ جائے۔ نتیجتاً کی ڈریگن اور نگ چنگ تک پہنچنے کا معاملہ بھی تقریباً ختم ہی سمجھا جائے گا۔ ایسا سنہری موقع دوبارہ ملنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اس نے خود کو سنبھالا۔

اگلے دن صبح اس نے ادائیگی سے قبل ہوٹل بل چیک کیا تو 120 شلنگ کے آئٹم پر اس کی نظر جم گئی۔ ''انٹرنیشنل فون کال؟'' اس نے یونی سے استفسار کیا...

''میں نے اپنی ضعیف ماں کو بتایا تھا کہ میں ٹھیک ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنا سامان پیک کرنے چلی گئی۔

ڈینیل نے فوراً ایکسچینج فون کر کے اوورسیز کا وہ نمبر معلوم کیا جو بل پر تھا۔

''7276464 لندن، سر۔''

''پلیز یہ نمبر ملایئے۔''

''بیل جارہی ہے سر۔''

''شکریہ۔''

تیسری گھنٹی پر جواب آیا۔ ڈینیل نے آواز پہچان لی۔ خالص افریقی لہجہ۔ اس نے ایک چانس لیا۔ ''سیلبی، تم ہو۔'' اس نے خالص سواحلی زبان میں پوچھا۔

''ہاں، میں سیلبی ہوں، کون بات کررہا ہے؟''

ڈینیل سن ہوگیا اور فون بند کردیا۔ وہ کچھ دیر ریسیور کو گھورتا رہا۔ ''نگ ہیرسن کا ملازم؟'' وہ بڑبڑایا۔

''وہ یونی کی ماں ہے؟ بہت خوب... مسٹر نگ اینڈ مس یونی ماہون۔'' اس کی بڑبڑاہٹ سے زہر ٹپک رہا تھا۔

☆☆☆

ائراوبوموکی ہر نشست پُر تھی۔ فلائٹ کی منزل اوہالی تھی۔ زیادہ تر مسافر کاروباری تھے۔ چھ سیاہ فام فوجی کیموفلاج لباس اور سیاہ چشمے لگائے ہوئے تھے، کوئی سیاح نہیں تھا... جب تک برٹش اوورسیز اسٹیم شپ کمپنی جھیل کنارے کیسینو کا افتتاح نہیں کرتی... ایک ہٹے کٹے آفیسر نے پسنجرز کے گروپ میں ڈینیل کو الگ ہونے کا اشارہ کیا۔

''ڈاکٹر آرم اسٹرانگ۔'' اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

''میں کیپٹن کاجو ہوں، اپنے پروجیکٹ کے دوران میں آپ کا گائیڈ ہوں۔ صدر نے ذاتی طور پر مجھے آپ کو خوش آمدید کہنے کے لیے کہا تھا۔ سر پیٹر... صدر کے قریبی دوست ہیں... صدر تفاری جلد آپ سے ملاقات کے متمنی ہیں... جب تک آپ سفر کی تھکن اتار لیں۔ آپ کے اعزاز میں انہوں نے کاک ٹیل پارٹی کا انتظام کیا ہوا ہے۔''

کیپٹن کاجو کی انگریزی اچھی تھی۔ وہ ایک متاثر کن دراز قد جوان تھا حتیٰ کہ ڈینیل سے بھی چند انچ بلند تھا۔ کیلی کی اطلاعات درست تھیں، ہی تا قبیلے کے بارے میں۔

یونی ماہون کو دیکھ کر کاجو کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

''یہ میری کیمرا آپریٹر ہیں، مس ماہون۔'' ڈینیل نے تعارف کرایا۔ یونی بھی برابر کی دلچسپی کے ساتھ کاجو کو ناپ رہی تھی۔

☆☆☆

کیلی اپنے دوستوں کی مدد سے ایک بار پھر اوبوموکے مخصوص جنگلات میں داخل ہوچکی تھی۔ بمبوٹی قبیلے کے لوگ بلحاظ قد اوسطاً کیلی کی ٹانگ کے برابر تھے۔ کیلی یہاں اسی طرح گھومتی تھی جیسے وہ بھی بمبوٹی ہی کی نسل سے ہے۔ کیلی کی چال اور روانی کو کوئی بھی بیرونی سفید فام میچ نہیں کرسکتا تھا۔

وہ گانا گارہی تھی جو جنگلات کی تعریف سے متعلق تھا۔

یہ گانا سی پو کی بیوی پمبا نے اسے سکھایا تھا۔

دوپہر میں بارش شروع ہوگئی جو یہاں روز کا معمول تھا۔ یہ بڑی دھواں دھار برسات تھی، بوندیں چھوٹے کنکروں کی طرح تھیں جو ننگی زمین پر برستیں تو بالائی مٹی کا صفایا ہوجاتا اور زمین میں نالیاں، دراڑیں نمودار ہوجاتیں لیکن یہ مخصوص جنگلات انہی بارشوں کے محتاج تھے۔

کیلی بارش سے لطف اندوز ہورہی تھی۔ اس کے بدن پر کم سے کم لباس تھا۔ اس لباس میں پیشانی کا ہیئر بینڈ بھی شامل تھا۔

دن ڈھل رہا تھا کہ کیلی سے دس فٹ آگے اچانک ایک دھماکا ہوا جیسے کار کا ٹائر پھٹتا ہے۔ جنگل میں یہ چند خطرناک ترین آوازوں میں سے ایک تھی۔ کیلی ازخود پیچھے کی جانب اچھل گئی... ساتھ ہی اس نے پیشانی سے ہیئر بینڈ ہٹایا اور جیب سے گوپھن نکالا۔

جنگل کے نباتاتی فرش پر کوئی چیز حرکت کررہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے مردہ پتوں کا کوئی ڈھیر ہے...

کیلی جانتی تھی کہ یہ بے ضرر سا نباتاتی ڈھیر نہیں ہے بلکہ ایک موٹا سانپ ہے... گبون وائپر... افریقا کے مامبا کے بعد سب سے زہریلا سانپ۔ وہ دائروں کی حالت میں

ایک نباتاتی ڈھیر لگ رہا تھا۔ اس کی موٹائی کیلی کی پنڈلی کی موٹائی کے برابر تھی۔ اس گول مخروطی ڈھیر کے مرکز میں اس کا سر تھا جو پیچھے کی جانب بلند ہورہا تھا۔ آنکھوں کا رنگ قیمتی زمرد کی طرح تھا... چمکدار اور سحرناک... یہ آنکھیں کیلی پر جمی ہوئی تھیں...

کیلی کو نشانہ لینے کے لیے بمشکل سیکنڈ ملا ہوگا اور سن سن کرتا بال بیرنگ گوپھن سے پرواز کرگیا۔ مدھم سبز روشنی میں یہ پارے کی طرح چمکا اور... گبون وائپر نے آخری دہشت ناک پھنکار ماری۔ اس کا سر کھل گیا تھا۔ اس کے دائرہ نما بل نزاعی لہریں پیدا کررہے تھے۔

صبح اس نے اپنے بیس کیمپ گونڈالا کا قصد کیا۔ نارنجی رنگ کے مشروم اور بعض سبز کونپلیں کھانے کے بعد اپنا بیگ پیک کیا... اسے اچھی طرح پتا تھا کہ یہاں کیا کھانا ہے اور کس چیز کو ہاتھ نہیں لگانا، حتیٰ کہ رات میں گبون وائپر نامی سانپ کے بھی منتخب حصوں کو تراش کر کباب بنانے تھے۔

اچانک وہ اچھل کر کھڑی ہوگئی اور چھری ہاتھ میں لے لی... خطرہ... اس نے کان لگائے... آواز پھر آئی۔ واضح خونی غراہٹ، یہ تیندوا یا گلدار تھا۔ اس کی نبض کی رفتار تیز ہوگئی۔ دن کی روشنی میں یہ آواز اس کے لیے غیر متوقع تھی۔ آواز مزید قریب آگئی اور کیلی شک میں پڑگئی۔ طویل خاموشی... پھر درندے کی آواز محض پچاس فٹ کے فاصلے سے آئی اور کیلی کا شک یقین میں بدل گیا۔ اس نے بھی حلق سے حیوانی آواز بلند کی اور درندے کی کمین گاہ کی جانب چل پڑی۔ جھاڑیوں میں سے کوئی چھوٹے قد کی چیز اچھل کر نکلی اور کیلی کی چھری لہرائی... چوٹ سی پو کے مختصر کولہوں پر پڑی۔ وہ چیخا۔

''شیطان... اولڈی پو۔'' کیلی ہنس رہی تھی۔ ''مجھے ڈرا رہے تھے؟'' کیلی چھری لہراتے ہوئے بڑھی۔

سی پو بندر کی طرح اچھل رہا تھا۔ دونوں ہنس رہے تھے۔

دوپہر میں وہ بندر کے گوشت سے لطف اندوز ہوئے جو سی پو نے کئی گھنٹے قبل تیر کمان سے مارا تھا۔

سی پو نے اسے بتایا کہ ماں باپ غصے میں ہیں۔

''کیوں؟''

''دریا کا پانی جنگلات کے خون سے سرخ ہورہا ہے۔''

''کیا مطلب... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' کیلی کو تعجب ہوا۔ ''کیا تم مجھے دریا تک لے چلو گے، سی پو۔ اس کے بعد ہم گونڈالا جائیں گے۔''

سی پو غیر نشان زدہ خفیہ راستوں پر کیلی کے ساتھ چل دیا۔ کیلی نے نوٹ کیا کہ سی پو اپنی بہترین رفتار استعمال کر رہا ہے... غالباً وہ کیلی کی روانی کو چیک کررہا تھا یا پھر اسے چھیڑ رہا تھا۔ وہ بھی کسی ماہر رقاص کی طرح اڑی جارہی تھی تاکہ سی پو سے زیادہ پیچھے نہ رہ جائے۔ کیلی عالمِ دہشت میں دریا کو گھور رہی تھی جس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بہتے پانی میں سرخی شامل تھی... چمکتا ہوا شفاف پانی جو قدرت کا تحفہ تھا... آلودہ ہونے کے باعث بھاری ہوگیا تھا اور دریا کی رفتار سست تھی جیسے پانی نہیں تیل کا دریا بہہ رہا ہے۔ مری ہوئی مچھلیاں جابجا نظر آرہی تھیں۔ کیلی کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ گھٹنوں تک کیچڑ نما پانی میں چلی گئی اور جھک کر چلو بھر لیا کے یہ سرخی مائل خاکی رنگ کا گریس جیسا تھا... چکنی مٹی کے مانند۔ اس نے ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی، رنگ پکا تھا۔ اس کے ہاتھ قاتل کے ہاتھ لگ رہے تھے۔ کیلی نے سونگھ کر دیکھا تو اسے کیمیکل کی بو آئی، وہ پانی سے باہر آگئی۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ

اور ''ابی سعد''

جب حضرت سعد بن وقاصؓ نے مدائن فتح کرنا چاہا تو درمیان میں دریائے دجلہ حائل تھا اور دوسرے کنارے پر ایرانی فوج تھی۔ کوئی کشتی نہیں تھی مگر مسلمانوں نے حضرت سعدؓ کی قیادت میں دریائے دجلہ میں گھوڑے دوڑا دیے تھے اور دریا عبور کرلیا تھا۔

بقول اقبال (یہ شعر اسی واقعہ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے)

دشت تو دشت دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

یہ وہی حضرت سعدؓ تھے جن کا ذکر عشرۂ مبشرہ صحابہ کرام میں آیا ہے مگر افسوس ان کے بیٹے ''ابی سعد'' نے یزید کی فوج کی قیادت کی اور حضرت حسینؓ پر جس لشکر نے حملہ کیا تھا، یہ اس فوج کا سپہ سالار تھا۔

محمد شاہان سعید، شیخوپورہ

"سی پو، یہ کیسے ہوا... کیا ہوا؟"

سی پو نے اس کی نظروں سے بچنا چاہا۔ "مجھے نہیں پتا کارا کی۔"

"کیوں نہیں پتا؟ تم نے دریا کی بالائی سمت جا کر نہیں دیکھا؟"

"میں خوفزدہ تھا، کارا کی۔" وہ گڑبڑایا۔

کیلی کو احساس ہوا کہ بمبوئی اس تبدیلی کو مافوق الفطرت مظہر سے تعبیر کر رہے ہیں۔

"کتنے دریاؤں کی یہ حالت ہے؟" کیلی غم و غصے کی کیفیت سے دوچار تھی۔

"بہت، بہت۔" وہ بڑبڑایا۔ "یعنی کم از کم چار یا چار سے زیادہ۔"

"ہمیں اوپر جانا ہوگا۔" کیلی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ایسا لگا جیسے سی پو رو پڑے گا۔ وہ گونڈالا جانا چاہتا تھا کیلی کے ساتھ...

تاہم کیلی دریائی منبع کی طرف چل پڑی تھی۔ دو سو میٹر جانے کے بعد اسے حماقت کا احساس ہوا۔ یہ جگہ اس کے لیے اجنبی تھی اور سی پو کے بغیر آگے جانا ٹھیک نہیں تھا۔

پھر عقب میں اسے سی پو کی احتجاجی آوازیں سنائی دیں اور وہ مطمئن ہوگئی... اس نے رفتار بڑھا دی...

دو دن گزر گئے... ہر میل پر پانی کی کثافت بڑھتی جا رہی تھی۔ دریا میں پانی نہیں کیچڑ تھی۔ آبی حیات، نباتات سمیت برباد ہوگئی تھی۔

تیسرے دن وہ دوپہر کو ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں دریا نے بہنا بند کر دیا تھا۔ کیچڑ اور ملبہ اتنا دبیز تھا کہ دریا مردہ ہو چکا تھا۔ جنگل اچانک ختم ہو گیا تھا اور وہ سطح زمین پر سورج کی روشنی میں کھڑے تھے۔ جہاں روشنی لاکھوں سال سے نہیں پہنچی تھی... اب پہنچ رہی تھی۔

سامنے جو سائٹ تھی، کیلی کو لگا کہ وہ زندگی کا مکروہ ترین بھیانک خواب دیکھ رہی ہے۔ وہ گھورتی رہی اور پھر یہ نظارہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا۔

وہ پلٹ گئی۔

☆☆☆

رات میں معاً اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ با آواز بلند رو رہی تھی اور سی پو اس کے بازو کو تھپک کر سلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

واپسی کا سفر دھیما تھا جیسے غم کا بوجھ بھی شانوں نے اٹھا رکھا ہو۔ پانچ دن بعد وہ گونڈالا پہنچ گئے۔

جنگل کے اس حصے میں گونڈالا بڑی منفرد جگہ تھی۔ وسیع رقبہ صاف تھا، میدان کی طرح... جنوب کی طرف یہ جنگلات سے پُر پہاڑی سلسلہ تھا۔ اطراف میں دو چھوٹی جھیلیں تھیں۔ دن کے بیشتر حصے میں پہاڑی جنگلات کے بلند درخت میدانی علاقے پر سایہ کیے رہتے تھے... شمال مغربی جانب عظیم جنگلات کا سلسلہ تھا۔

ہمیشہ کی طرح کیلی نے جنگلات کے سرے پر رک کر سو میل دور پہاڑی چوٹیوں کو دیکھا جو چاند کی پہاڑیاں کہلاتی تھیں اور زیادہ تر بادلوں میں چھپی رہتی تھیں۔

کیلی نے بمشکل رخ پھیرا اور اپنے مختصر گھر اور لیب کی جانب دیکھا۔ جو لکڑی اور مٹی کے پلاسٹر سے تعمیر شدہ تھیں۔ دونوں جب وہاں پہنچے تو فوراً ہی ان کی آمد کا پتا چل گیا۔ پستہ قد بمبوئی عورتیں خوشی سے چیخ رہی تھیں، ہنس رہی تھیں۔ اوہالی عورتیں بھی ان میں شامل تھیں، انہوں نے کیلی کو گھیر لیا۔

اس کو شور و غوغا نے لیب کے چوڑے دالان میں آنے پر مجبور کر دیا... وہ ایک بوڑھا آدمی تھا جس کے سر کے تمام بال برف کی طرح تھے۔ اس نے نیلا سفاری سوٹ اور سینڈل پہن رکھے تھے۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور کیلی کو دیکھ کر مسکرایا۔ اس کے دانت سفید تھے اور بوڑھے چہرے پر ذہانت کے آثار تھے۔

"کیلی۔" اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ وہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی اور دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"میں تمہاری طرف سے پریشان تھا اور کئی دن سے انتظار کر رہا تھا۔" بوڑھا آدمی بولا۔ "بہت خوشی ہوئی تمہیں دیکھ کر۔"

"مجھے بھی۔ مسٹر پریذیڈنٹ۔"

☆☆☆

"آؤ میری بچی۔" وہ کوئی اور نہیں معزول وکٹر اومیرو تھا۔

"وکٹر۔" وہ بولی۔ "میں نے آپ کو مس کیا، مجھے آپ کو بہت سی باتیں بتانی ہیں... کہاں سے شروع کروں؟"

"بعد میں۔" سابق صدر نے اپنے سر کو جنبش دی۔ ستر سال کی عمر میں بھی وہ توانا اور پُرعزم دکھائی دیتا تھا۔ "پہلے میں دکھاتا ہوں کہ تمہاری غیر موجودگی میں، میں نے تمہارا کام کتنی خوبی سے سنبھالا۔ مجھے سائنس داں ہی رہنا چاہیے تھا بجائے سیاست داں کے۔" وہ دونوں لیب میں آ گئے۔

نوجوانی میں صدر اومیرو نے لندن میں تعلیم حاصل کی تھی۔ الیکٹرونک میں ماسٹرز ڈگری لے کر وہ واپس اوبومو لوٹ آیا تھا۔ کچھ عرصہ اس نے اپنا متعلقہ کام کیا پھر استعفیٰ دے کر آزادی کی تحریک میں شامل ہو گیا۔ تاہم سائنس میں اس کی دلچسپی قائم رہی اور اس کی معلومات نے ڈاکٹر کیلی کو متاثر کیا تھا۔

جب تفاری کی خونی بغاوت نے حکومت کا تختہ پلٹا تو اپنے تھوڑے سے جاں نثار ساتھیوں کے ساتھ وہ کیلی کی رہنمائی میں گونڈالا میں پناہ گزین ہو گیا۔

پھر یہ جگہ تفاری کی غیر قانونی اور ظالم حکومت کے خلاف تحریکِ مزاحمت کا ہیڈ کوارٹر بن گئی اور اومیرو نے یہاں کیلی سے مزید بہت کچھ سیکھا۔

"وکٹر، بمبوئی کے ہارٹ لینڈ میں دریاؤں کے ساتھ ناقابلِ برداشت سلوک کیا جا رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیسے وضاحت کروں...!"

وہ خاموشی سے سنتا رہا پھر دھیمی سرد آواز میں بولا...

"تفاری، زمین اور ہمارے لوگوں کو ختم کر رہا ہے، فضا میں گدھوں نے نغمۂ مرگ محسوس کر لیا ہے اور وہ جمع ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ ہمیں اسے ہٹانا پڑے گا۔"

کیلی نے اس سے قبل بوڑھے آدمی کو اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح ہو رہا تھا۔

"کیسے؟ ان کے پاس پیسا بھی ہے اور طاقت بھی؟"

"کوئی قوت ایسی نہیں ہے جو محض آدمی کے جائز مقصد کو فنا کر سکے۔" اومیرو نے کہا۔

کیلی کو اپنی مایوسی کم ہوتی محسوس ہوئی۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اس نے سرگوشی کی۔ "ہمیں کوئی راستہ تلاش کرنا ہوگا... ہمیں اس زمین کو بچانا ہوگا۔"

☆☆☆

شام ڈھلے ڈینیل اور یونی آرمی لینڈ روور میں اوبومو گورنمنٹ ہاؤس پہنچے جہاں ہی تا قبیلے کے ایک مسلح سپاہی نے پارکنگ تک گاڑی کی راہنمائی کی۔ لان میں بہت سے لوگ کرسیوں پر براجمان تھے۔ فلڈ لائٹس نے ماحول کو روشن کیا ہوا تھا۔ آرمی بینڈ پس منظر میں افریقن بیٹ کے ساتھ جاز کی دھن بکھیر رہا تھا۔

"یہ سب تمہارے اعزاز میں ہے۔" یونی نے دانتوں کی نمائش کی۔

"میں شرط لگاتا ہوں کہ تفاری یہ بات اپنے سب مہمانوں کو سنائے گا۔" ڈینیل مسکرایا۔

"آہ، ڈاکٹر آرم اسٹرانگ۔" سب سے پہلے کیپٹن کا جوان سے ملا۔ "آپ آج کی رات خاص مہمان ہیں۔" وہ ان کو صدر تفاری تک لے گیا۔ کمرا بلند قامت ہی تا آفیسرز سے بھرا ہوا تھا۔

"ڈاکٹر!" تفاری نے اسے خوش آمدید کہا۔ "میں تمہارے کام کا مداح ہوں۔ تمہارے سوا کوئی صحیح طرح سے اوبومو کو جدید دنیا سے متعارف نہیں کرا سکتا... سابق صدر کی وجہ سے اب تک ہم اندھیرے اور تنہائی کا شکار رہے... اب ایسا نہیں ہوگا۔"

"میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔" ڈینیل نے محتاط لب و لہجہ اختیار کیا۔

تفاری مرعوب کن اور طاقتور شخصیت کا مالک تھا۔ اعتماد اس کے بشرے سے ٹپکتا تھا۔ وہ ڈینیل کے چھ فٹ قد کے سامنے بھی پورے سر کے برابر اونچا تھا۔ نقوش کسی مصری فرعون سے مشابہت رکھتے تھے۔

تفاری کی نظریں ڈینیل سے پھسل کر یونی پر مرکوز ہو گئیں۔

"تم فوٹوگرافر ہو... سر پیٹر نے تمہاری ویڈیو "آرکیٹک ڈریم" مجھے بھیجی تھی۔ مجھے خوشی ہوئی، مس یونی۔" اس کی نگاہ یونی کی گردن سے نیچے پھسل رہی تھی۔

یونی بھی اپنی ذات میں فتنہ تھی۔ جو قدرے اشتعال انگیز لباس پہن کر آئی تھی۔

"آپ بہت مہربان ہیں، مسٹر پریذیڈنٹ۔" اس نے بے باکی سے کہا۔

تفاری ہنس پڑا۔ "تمہاری کیا رائے ہے ہمارے ملک کے بارے میں؟"

"ہمارا آج پہلا دن ہے... تاہم جھیلیں سحر انگیز ہیں اور لوگ بلند قامت ہیں، مرد بہت ہینڈسم ہیں۔" اس نے ذاتی رائے پیش کی۔

"ہی تا اونچے قد کے اور ہینڈسم ہیں۔" تفاری نے خوش ہو کر اتفاق کیا۔ "لیکن اوہالی چھوٹے اور بدصورت ہیں، بندر کی طرح۔" ہی تا آفیسرز کے قہقہے بلند ہوئے۔

یونی کو عجیب لگا۔ وہ بولی۔ "ہم جہاں سے آئے ہیں، وہاں ایسی باتوں کو نسلی تعصب سمجھا جاتا ہے۔"

تفاری نے یونی کی آنکھوں میں دیکھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس چیز کا عادی نہیں تھا کہ کوئی اس کی تصحیح کرے۔

پھر وہ مسکرایا، باریک اور ٹھنڈی مسکراہٹ۔

’’ویل، مس بونی، افریقا میں ہم سچ بولتے ہیں اگر لوگ بدشکل یا احمق ہیں تو ہم انہیں ایسا ہی کہیں گے... یہ قبائلی انداز ہے۔‘‘

اس کے اسٹاف نے پھر قہقہے لگائے۔

تفاری نے ڈینیل کی جانب رخ کیا۔ ’’برطانوی سفارت کار آج رات یہاں ہے، مجھے یقین ہے کہ تم ملنا پسند کرو گے۔‘‘ اس نے کاجو کو اشارہ کیا۔

بونی بھی ڈینیل کے پیچھے گئی تاہم تفاری نے اس کے بازو کو چھوا۔ ’’مس بونی مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔‘‘

بونی پلٹی اور پھر اپنی فطرت کا مظاہرہ کیا۔ اس نے کھڑے ہونے کے لیے اشتعال انگیز پوز اختیار کیا تھا، دونوں ہاتھ سینے کے نیچے باندھ لیے تھے۔

’’تم افریقا کو یورپ کے معیار سے جج نہیں کر سکتیں... ہمارا انداز مختلف ہے۔‘‘ تفاری نے کہا۔

آنکھ کے کونے سے بونی نے دیکھا کہ ڈینیل اور کاجو لان کی طرف نکل گئے ہیں۔ بونی کے بدن سے بھینی بھینی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ وہ تفاری سے کچھ اور قریب ہوگئی اور بولی ’’میں ہمیشہ نئے اور مختلف انداز پسند کرتی ہوں۔‘‘

☆☆☆

ڈینیل ذرا سا رکا پھر تیزی سے پُرہجوم لان میں ایک جانی پہچانی شخصیت کی جانب بڑھا۔

’’سر مائیکل! آپ کب یہاں آئے... یہ سب کب ہوا؟‘‘

مائیکل ہرگریو نے اسے کہنی سے پکڑا ’’تمہیں میرا خط نہیں ملا؟ سب کچھ جلدی میں ہوا اور مجھے لوسا کا چھوڑنا پڑا۔‘‘

’’مبارک ہو... یہ تمہارا حق تھا، کافی عرصے سے ڈیو تھا۔‘‘ ڈینیل نے کہا۔

’’تم نے کچھ لیا نہیں؟ ہاں مقامی وہسکی کو نہ چھونا۔ مائیکل نے کہا ’’مگر مچھ کا پیشاب معلوم ہوتا ہے۔ جن ٹرائی کرو۔‘‘ مائیکل نے ویٹر کو اشارہ کیا۔

’’وینڈی کہاں ہے؟‘‘

’’نیا آدمی تمہارے سامان کا خیال رکھے گا اور وینڈی ایک آدھ ہفتے میں یہاں پہنچ جائے گی۔‘‘

’’کیا اسے پتا ہے یہاں ہماری ملاقات ہوگی؟‘‘

’’فک ہیرسن نے بتایا تھا تمہارے بارے میں۔‘‘

’’تم جانتے ہو اسے؟‘‘

’’افریقا میں ہر کوئی اسے جانتا ہے۔‘‘ مائیکل نے جواب دیا۔

’’اس نے مجھے یہاں تمہارے اسائنمنٹ کے بارے میں بھی بتایا تھا... اور حیرت ہے کہ تم پر نظر رکھنے کی درخواست بھی کی تھی۔‘‘

’’اس کا مطلب ہے کہ صورتِ حال پہلے سے زیادہ پیچیدہ ہے مائیک۔‘‘

’’مجھے کچھ خاص پتا نہیں۔‘‘ مائیک اسے لان کے نسبتاً سنسان کونے میں لے آیا۔ ’’پہلے یہ بتاؤ کہ تفاری کے بارے میں تم کیا رائے رکھتے ہو؟‘‘

’’تم تو واقف ہی ہو۔‘‘

’’ایم آئی فائیو کے میرے ساتھیوں نے اشارہ دیا ہے کہ... سوئٹزرلینڈ میں اس کے کئی کھاتے کھل گئے ہیں... اور ان میں کچھ رقم بھی رکھ دی گئی ہے۔‘‘

’’حیرت کی بات نہیں ہے... تمام آمر ایسا ہی کرتے ہیں۔‘‘ ڈینیل نے تبصرہ کیا۔

’’میں تمہارے تجزیے سے متفق ہوں لیکن وہ زیادہ ہی پر پُرزے نکال رہا ہے۔ اوہالی قبیلے کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا جارہا ہے۔ بوڑھے اومیرو کو جو اچھا آدمی تھا، پہلے ہی صاف کردیا گیا ہے... باقی اوہالی قبیلہ سخت مصیبت میں ہے... افواہیں گردش کررہی ہیں کہ اوہالیوں کا صفایا کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح کی مکروہ افواہیں اس کے سیاہ کارناموں کے بارے میں اڑ رہی ہیں۔ ہم اسے اس حد تک جانے کی اجازت نہیں دے سکتے... حتیٰ کہ پی ایم بھی پہلے ہی برافروختہ ہیں... یاد آیا، چند خبریں ہیں تمہارے پرانے دوست کے بارے میں۔‘‘

’’میرا دوست؟‘‘

’’لکی ڈریگن کمپنی... تم اندازہ نہیں کرسکتے، کسی کو بھی لکی ڈریگن کی طرف سے بھیجا جاسکتا ہے۔‘‘

’’ننگ چنگ گانگ۔‘‘ ڈینیل نے اطمینان سے کہا۔

’’اس کو آنا ہی ہوگا... یہی وجہ ہے کہ میں یہاں نظر آرہا ہوں۔‘‘

’’درست... وہ اگلے ہفتے آرہا ہے اور تفاری اس کے لیے ایک اور پارٹی دینے جارہا ہے۔‘‘

ڈینیل کے تصور میں پھر چی واؤ کے ہولناک مناظر گھوم گئے۔ وہ خود کو بیمار محسوس کرنے لگا۔ ’’مجھے ہر بات بتاؤ، تفاری اور اوبومو کے بارے میں۔‘‘

’’لمبی بات ہے، ڈیئر بوائے۔‘‘ مائیکل بولا... ’’میں

سرخیاں پیش کرسکتا ہوں اگر تم کل ایمبیسی کا چکر لگا لو تو میں تفصیل بتا سکتا ہوں اور فائلیں بھی دکھا سکتا ہوں۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’صرف تمہاری دید کے لیے۔‘‘

’’کل مجھے فلم بندی کے لیے جانا ہے۔ پوری آرمی میرے ڈسپوزل پر ہے، کوشش کروں گا۔‘‘ ڈینیل نے کہا اور بونی کے لیے نظریں گھمائیں، کاجو قریب ہی تھا۔ اس نے بونی کے بارے میں اس سے معلوم کیا تاہم اس نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ ڈینیل نے مائیکل سے ہاتھ ملایا اور پارکنگ میں لینڈ روور کی طرف چل پڑا۔

وہ گیسٹ ہاؤس پہنچا تو اسے توقع تھی کہ بونی پہلے ہی وہاں پہنچ کر سوگئی ہوگی تاہم اس کا خیال غلط نکلا۔ جب وہ سونے کے لیے لیٹ رہا تھا تب اسے باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ کچھ اور آوازیں بھی تھیں۔ ذرا دیر بعد بونی اندر آئی اور خاموشی سے اپنی خواب گاہ میں داخل ہوگئی۔

صبح کے ناشتے میں وہ دوسرا کپ لے رہا تھا جب بونی کی شکل نظر آئی۔ وہ مسکراتی ہوئی میز پر اس کے مقابل بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ پوری نیند نہیں سوئی ہے۔ گیسٹ ہاؤس کا باورچی روایتی انگریزی ناشتا سرو کررہا تھا۔

’’کیا تمہیں کوئی آئیڈیا ہے؟‘‘ ڈینیل نے کہا ’’کہ تم ایک ناقابلِ بھروسا شخص کے ساتھ رسک لے رہی ہو؟‘‘

’’حسد کررہے ہو... تمہیں کیا پتا میں کیا کرتی رہی ہوں؟‘‘

’’یہ کوئی خفیہ بات نہیں ہے۔ سب جانتے ہیں کہ تم ایک دل پھینک عورت کا کردار ادا کرتی رہی ہو۔‘‘ ڈینیل نے احتیاط کی ورنہ وہ ’’فاحشہ‘‘ کا لفظ استعمال کرنے والا تھا۔

ڈینیل کھڑا ہوگیا، وہ غصے میں تھا... جانے انجانے میں بونی پورے آپریشن کو خطرے میں ڈال دیتی۔

اسی وقت کیپٹن کاجو کی شکل نظر آئی۔ اس کے ساتھ تین سپاہی اور تھے۔ وہ لوگ لینڈ روور میں تھے۔ بونی کا سامان احتیاط سے گاڑی میں منتقل کیا گیا۔ کاہالی میں بہت کچھ ڈینیل کا جانا پہچانا تھا... اس نے صرف ایک فرق محسوس کیا کہ عوام کا رویہ بدلا ہوا ہے۔

جھیل پر پہنچ کر وہ گن بوٹ پر منتقل ہوگئے... بونی تیزی سے فلم بندی کی تیاری کررہی تھی۔ ڈینیل ڈیک کے اگلے حصے پر تھا اور حسین قدرتی مناظر سے لطف اٹھا رہا تھا۔ بونی نے کام شروع کردیا۔ اس کے اخلاقی نظریات کچھ بھی ہوں تاہم وہ اپنے کام کی ماہر تھی۔

ہوٹل اور کیسینو کے لیے جو سائٹ منتخب کی گئی تھی، وہ کوسٹ لائن کے ساتھ سات میل اوپر تھی۔ ڈینیل نے سر پیٹر ہیرسن کے مہیا کردہ نقشہ جات دیکھے...

ہوٹل اور کیسینو کے لیے آئیڈیل جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ ڈینیل کے خیال میں ایک چیز ٹھیک نہیں تھی اور وہ مچھیروں کا گاؤں تھا۔ منزل پر پہنچ کر وہ لوگ گن بوٹ سے اتر گئے۔ کیا خوبصورت اور رنگین نظارے تھے۔ کاجو اور بحریہ کے دو آدمیوں کو وہیں چھوڑ کر وہ دونوں چٹانوں کی اونچائی تک پہنچنے کے لیے اوپر چڑھنے لگے... اس کا صلہ بھی ان کو مل گیا۔ یہاں سے اوبومو دریا کا منبع، گاؤں، کھاڑی، جھیل وغیرہ سب نظر آرہا تھا۔ ڈینیل کی رہنمائی میں بونی نے فلم بنانی شروع کی۔

اچانک ڈینیل نے جھیل کے کنارے سڑک، جو کاہالی کو واپس جاتی تھی، پر کچھ دیکھنے کی کوشش کی...

’’ذرا دینا، میں تمہارا ٹیلی فوٹو لینس استعمال کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ اس نے بونی سے درخواست کی۔ ڈینیل نے لینس کو انتہائی حد تک زوم کیا... تھوڑی دیر بعد اس نے کیمرا بونی کو واپس کردیا۔

’’کیا ہے؟‘‘

’’آرمی کانوائے۔‘‘ ڈینیل نے کہا۔ ’’ٹرک، ٹرانسپورٹ، بل ڈوزرز، کھدائی کی مشینیں وغیرہ۔‘‘

’’افریقا میں کہیں بھی کیمرا استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن ملٹری کی جانب نہیں لیکن صدر تفاری کی اجازت ہے... شوٹ آؤٹ۔‘‘ ڈینیل نے سگنل دیا۔

بونی نے پھرتی سے ٹرائی پوڈ سیٹ کیا... وہ لانگ رینج ٹیلی فوٹو شاٹ استعمال کررہی تھی... قریب آتے ہوئے کانوائے کو زوم کیا۔

ڈینیل، بونی کے کام کو دیکھ رہا تھا۔

’’سپاہی کیموفلاج یونیفارم میں تھے اور کلاشنکوف رائفلوں سے مسلح تھے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کی توقع نہ گاؤں کے مرد و زن اور بچوں کو تھی نہ ڈینیل اور بونی کو۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر گاؤں کا صفایا کردیا گیا اور جھونپڑیوں کو آگ لگا دی گئی... کچھ لوگ مارے گئے... باقی کو ایک ٹرک میں لوڈ کردیا گیا، مردہ لوگوں کو آگ میں پھینک دیا گیا۔

یہ سب دیکھ کر ڈینیل کی آنکھیں جلنے لگیں۔ وہ سخت دل گرفتہ تھا۔

"ٹھیک ہے۔" ڈینیل نے آواز کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔ "سائٹ نیو پروجیکٹس کے لیے صاف ہو گئی ہے باسٹرڈ! قاتل، خونی درندے..." ڈینیل کا جسم غصے اور اشتعال سے لرز رہا تھا۔

ڈینیل نے کاجو کی تلاش میں نظریں گھمائیں... کاجو چٹانوں پر چڑھ رہا تھا اور غصے میں لگ رہا تھا۔ وہ ان دونوں کی تلاش میں تھا... ہر چند منٹ بعد وہ رک جاتا، دونوں ہتھیلیاں جوڑ کر منہ کے قریب لاتا اور ڈاکٹر کو آواز دیتا۔

ڈینیل جھکا جھکا بونی کی طرف دوڑا "کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ ہم نے یہ سب کچھ ریکارڈ کر لیا ہے۔ یہ ڈائنامائٹ ہے۔"

"سمجھ گئی۔" بونی نے اتفاق کیا۔

"ٹیپ مجھے دے دو... میں سنبھال لوں گا... وہ یقیناً چیک کریں گے۔"

بونی نے کیمرے سے ٹیپ ایجکٹ کی اور ڈینیل نے اسے جرسی میں لپیٹ کر پشت کے بیک پیکٹ کے نچلے حصے میں منتقل کر دیا۔

"نکلو یہاں سے!" ڈینیل نے کہا۔ اسی اثنا میں بونی اپنا سامان لپیٹ چکی تھی۔ وہ دوسری طرف سے راستہ کاٹ کر گاؤں کی باقیات اور جھیل کی مخالف سمت میں اونچی گھاس میں اترے۔

"میری سمجھ میں نہیں آیا۔" بونی نے ہانپتے ہوئے کہا "آخر انہیں اتنی جلدی کیا تھی... کیا آج ہی گاؤں کا صفایا کرنا ضروری تھا؟" بونی نے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے، کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے اور کوئی کسی کو بتانا بھول گیا ہے۔" ڈینیل نے جواب دیا۔ انہوں نے ہوشیاری سے راستہ چنا اور جھیل کی طرف بڑھنے لگے۔ انہوں نے تقریباً دو سو میٹر سے زیادہ فاصلہ طے کیا ہوگا کہ چٹان کی چوٹی پر سے کیپٹن کاجو کی آواز آئی۔ انہوں نے رک کر اوپر کی جانب دیکھا اور اس طرح ہاتھ ہلایا جیسے کاجو کو انہوں نے کافی دیر بعد پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔

کاجو لڑھکتا، پھسلتا... اچھلتا نیچے آ رہا تھا۔ جب وہ نیچے پہنچا تو اس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔

"تم لوگ کہاں تھے؟"

"ہم لوگ فلم بنا رہے تھے... کیسینو سائٹ کی بھی بنائی ہے... اب ہوٹل کی سائٹ دیکھیں گے۔" ڈینیل نے کہا۔

"نو... نو... و... و۔" کاجو نے ڈینیل کا بازو پکڑا۔ اتنا کافی ہے۔ آج کا کام ختم۔ اب ہم واپس جائیں گے۔" ڈینیل نے مصنوعی ہچکچاہٹ اور بحث کا مظاہرہ کیا... کاجو کو کچھ ٹیکنیکل پوائنٹس سمجھائے جو اس کے سر سے گزر گئے۔ بونی نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔

بالآخر ڈینیل نے کاجو کی بات مان لی اور گن بوٹ پر سوار ہو گیا۔ ڈینیل نے دیکھا کہ کاجو، کیپٹن کے ساتھ کھسر پھسر میں مصروف ہے، دونوں کچھ پریشان تھے۔ جلتی ہوئی کشتیاں اور ان کا دھواں چھپ نہیں سکتا تھا، اس سے پہلے کہ ڈینیل، بونی کو روکتا، بونی چلتی ہوئی ریلنگ کی جانب گئی اور عکس بندی میں مصروف ہو گئی۔

کیپٹن کاجو گھبرایا ہوا سیڑھی کے ذریعے برج سے نیچے ڈیک پر آیا اور چیختا ہوا بونی کی طرف بھاگا۔

"نہیں... رکو! اس کی فلم مت بناؤ۔"

"کیوں؟ یہ محض جھاڑیوں کی آگ ہے، کیا نہیں؟" اس نے کیمرا نیچے کیا۔

"نو... یس! ہاں یہ جھاڑیوں کی آگ ہے لیکن یہ معاملہ خفیہ ہے۔"

"تمہارا مطلب کلاسیفائیڈ؟"

جھاڑیوں کی آگ ٹاپ سیکرٹ بونی نے اسے چھیڑا اور کیمرا بند کر دیا۔

جیسے ہی انہیں تنہائی ملی، ڈینیل نے کہا "ڈیئر زیادہ ہوشیاری ہمیں نہیں دکھانی... یہ مذاق بیک فائر بھی کر سکتا ہے۔"

"میرے خیال میں، میں نے اسے قائل کیا ہے کہ ہم معصوم ہیں۔" بونی نے وضاحت کی۔

"وہ بھی بچے نہیں ہیں۔"

"ہاں، دن میں تو بچے ہی ہیں۔" بونی نے آنکھ ماری۔ "اچھا ٹیپ کب واپس کرو گے؟"

"میں اپنے پاس رکھوں گا۔" اس نے جواب دیا۔ "کاجو کو شک ہے اور میں شرط لگاتا ہوں کہ کاہالی واپسی پر وہ ٹیپس چیک کرنے کی کوشش کرے گا۔"

رات ہو چکی تھی جب گن بوٹ برتھ کے ساتھ لگی۔ وہارف پر جب بونی کا ویڈیو سامان لینڈ روور میں منتقل کیا جا رہا تھا... المونیم کیس جس میں بونی کی ٹیپس تھیں، غائب تھا۔

اگرچہ بونی، کاجو پر برس رہی تھی اور اس کو شکایت کی دھمکی دے رہی تھی۔ کاجو اسے یقین دلا رہا تھا کہ جلد ہی اس کی اشیا مل جائیں گی۔ "میں تمہیں ذاتی طور پر ضمانت دیتا

ہوں۔"

اگلی صبح گیسٹ ہاؤس میں سب کچھ آرڈر میں تھا اور کاجو سر تا پا معذرت کا اشتہار بنا کھڑا تھا۔ "سارا سامان موجود ہے مس ماہون... احمق اوہالی پورٹر کی غلطی تھی۔ برائے مہربانی میری معذرت قبول فرمائیں۔"

"انہوں نے تمام کیسٹ اسکین کی ہوں گی... سو فیصد۔" کاجو کے جانے کے بعد ڈینیل نے کہا۔ "اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں نے کسی کو ٹائم دیا ہے۔" بونی نے کہا۔

"اگر تم اپنے نئے بوائے فرینڈ سے ملنے جا رہی ہو، تو احتیاط کرنا، اسے میرا مشورہ سمجھو۔ تم اس کا انداز دیکھ چکی ہو۔"

"ایفرم تقاری ایک معزز شخصیت ہے۔" بونی نے کہا "میں یقین نہیں کر سکتی کہ اسے اس ریڈ کے بارے میں پتا ہوگا۔"

"یقین کرو، یا نہ کرو... لیکن اس ٹیپ کے بارے میں کسی کو ہوا نہ لگے... حتیٰ کہ نگ ہیرسن کو بھی!"

بونی ساکت رہ گئی۔ وہ ہراساں تھی اور حیرت زدہ بھی۔ "کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"کم آن بونی... میں تمہاری صلاحیتوں کا معترف ہوں لیکن تم مجھے سمجھنے میں غلطی کر رہی ہو بلکہ ہیرسن کو بھی۔ میں اتنا بے خبر اور ناسمجھ ہوتا تو برسوں پہلے افریقا کی خون آشام بھول بھلیوں میں کھو چکا ہوتا۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو۔" بونی نے کمزور آواز میں راہِ فرار تلاش کی۔

"تم ایسا سوچ سکتی ہو۔ لیکن اگر تم نے نگ کو اس ٹیپ کے بارے میں بتایا تو تم مجھ سے زیادہ پاگل ثابت ہوگی۔"

ڈینیل اس کو وہیں کھڑا چھوڑ کر برٹش ایمبیسی کی طرف چلا گیا۔

مائیک کے ذریعے اسے پتا چلا کہ وینڈی آ گئی ہے اور ننگ چنگ توقع سے قبل پہنچ چکا ہے۔ "ہفتے کی شام پارٹی ہے، تمہارا دعوت نامہ سرکار کی جانب سے آنے والا ہے... مجھے اوبومو کے روٹری کلب کے اراکین کے سامنے ایک تقریر کرنی ہے۔ فائل کا وعدہ اپنی جگہ ہے... فائلز میری سیکریٹری سے ملیں گی، کمرا بھی مل جائے گا... صرف آنکھیں استعمال کرنا، کوئی نوٹس نہیں... نہ ہی کوئی فوٹو کاپی۔"

"شکریہ مائیک، تم ہیرو ہو... لیکن ایک مہربانی اور..."

"فرمائیے۔"

"میں ایک لفافہ دے رہا ہوں، اسے اپنے ذاتی سیف میں محفوظ کر دو۔"

ڈینیل ایمبیسی سے تین گھنٹے بعد نکلا تھا اور جو کچھ اس نے مائیکل کی فراہم کردہ فائلوں سے اخذ کیا تھا، اس کے بعد تقاری کے بارے میں اس کی منفی رائے سو گنا بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

ڈینیل اور بونی ہمیشہ کی طرح کیپٹن کاجو کی ہمراہی میں تھے۔ کاہالی سے وہ دو سو میل کا سفر طے کر چکے تھے جس میں انہیں دو دن لگے۔ فلم بنانے کے لیے درمیان میں بار بار رکنا پڑ رہا تھا۔

بونی نے بہت سی چیزیں اور مناظر پہلی مرتبہ دیکھے تھے، وہ کافی پُرجوش تھی۔ ان کی آخری منزل سینگی تھی۔ استوائی گھنے جنگلات کے بلند و بالا درخت دیکھ کر بونی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ غیر معمولی بلند ستونوں نے درختوں کی شکل میں آسمان کو سہارا دیا ہوا ہے...

☆☆☆

جابجا انہوں نے اوہالیوں کو مزدوروں کی طرح ہی تا قبیلے کے دیے ہوئے کام کرتے دیکھا۔ کاجو کی رائے ان کے بارے میں متعصبانہ تھی۔

وہ لوگ بمبوٹی کے جنگلات کے سر پر تھے۔

"مجھے نفرت ہے، اس جگہ سے۔" کاجو بولا "یہ تاریک اور شیطانی جگہ ہے... صرف بندروں اور ان کے قریبی رشتے دار بمبوٹی پگمی..."

"کیا ہم کسی پگمی کو دیکھ سکتے ہیں؟" بونی نے اشتیاق سے پوچھا۔

"بہت کم پالتو جانوروں کی طرح ہیں جو سڑک پر آ جاتے ہیں... زیادہ تر بالکل جنگلی جانور ہیں... ان کو نہیں دیکھ سکتے، کوئی نہیں دیکھ سکتا، ہم ان درختوں کو گرا دیں گے، فروخت کر دیں گے... پھر ہم اپنے مویشیوں کے لیے چراگاہیں بنائیں گے۔"

"اگر درخت ختم ہو گئے تو بارشیں بھی رک جائیں گی دریا اور جھیلیں متاثر ہوں گی... تمہارے مویشیوں کو پانی نہیں ملے گا۔ قدرت کی ہر چیز ایک دوسرے پر انحصار کرتی ہے۔ تم ایک کو تباہ کرو گے، باقی سب خود ہی برباد ہو جائے گا۔" ڈینیل نے وضاحت کی۔

کاجو کے تیور بدل گئے۔ ”مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے، ڈاکٹر آرم اسٹرانگ... عجیب لگے گا لیکن میرے پاس یونیورسٹی کی ڈگری ہے، اور میں آپ لوگوں کے بہت سے فلسفوں اور تھیوریز سے واقفیت رکھتا ہوں بلکہ...“ اچانک وہ رک گیا اور ایک گہرا سانس لیا۔ ”معذرت خواہ ہوں، ڈاکٹر، میرا مطلب آپ کی دل شکنی نہیں تھا لیکن ہم افریقیوں کو یہاں رہنا ہے۔ یہ درخت جو آپ کو بہت پسند ہیں، ہمارے ہیں۔ ہمیں تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کا خیال رکھنا ہے... ہمیں غذا، رہائش اور تعلیم چاہیے... اور زمین۔“

ڈینیل اداسی کے ساتھ اس کا فلسفہ سنتا رہا۔ وہ تعلیم یافتہ اور ذہین تھا لیکن وہ بہت سے حقائق سے لاعلم تھا... حتیٰ کہ اپنے لیڈر کے عزائم سے بھی بے خبر تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ لی ڈریگن کے نمائندے کے یہاں آنے کے بعد تفاری کے سوئس اکاؤنٹس میں کتنی رقم کا اضافہ ہوا ہے جو پروجیکٹس کنسورشیم کے لیے کشش رکھتے ہیں، ان میں تعلیمی ادارہ ایک بھی نہیں تھا وغیرہ وغیرہ۔

ڈینیل با آسانی کاجو کے نظریات کے پرزے اڑا سکتا تھا تاہم وہ جانتا تھا کہ یہ لاحاصل ہے بلکہ اس کی اپنی پوزیشن خطرے میں پڑ جائے گی۔

بالآخر وہ سینگی پہنچ گئے۔ جنگل کے درمیان کافی رقبہ صاف کیا گیا تھا۔ یہ جگہ لیبر فورس، ورکشاپس اور انتظامیہ کی عمارتوں کے لیے مخصوص تھی۔

کاجو نے مرکزی آفس کی عمارت کے سامنے گاڑی لگائی۔

”میں آپ لوگوں کی ملاقات پہلے اوبوموڈیولپمنٹ کارپوریشن کے فیلڈ منیجر سے کراتا ہوں۔“ کاجو نے ان کی طرف رخ کر کے کہا۔ وہ ڈینیل کے سامنے کھڑا تھا... چھ فٹ چھ انچ، وہ سامنے سے ہٹا تو ڈینیل نے فیلڈ منیجر اور منیجر نے ڈینیل کو دیکھا۔

ڈینیل کو یوں لگا جیسے وہ کافی دنوں سے، چی واؤ پارک سے لے کر اب تک، ٹی وی پروڈیوسر یا بائیولوجی ڈاکٹر نہیں بلکہ کسی سنسنی خیز فلم کا مرکزی کردار ہے... ہرنام سے خوں ریز معرکے کی ساری جزئیات اس کے ذہن میں یک لخت تازہ ہو گئیں۔

”مسٹر ہرنام سنگھ۔“ اس نے نرمی سے کہا۔ ”مجھے توقع نہیں تھی کہ ہم دوبارہ ملیں گے، کیا خوشی کا لمحہ ہے۔“

ہرنام سنگھ یوں جھٹکا کھا کر رکا جیسے سامنے ان دیکھی شیشے کی دیوار آگئی ہو۔ وہ ڈینیل کو گھور رہا تھا۔

”آپ لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں، کتنا خوشگوار اتفاق ہے۔“ کاجو نے حیرت کا اظہار کیا۔

”ہم پرانے دوست ہیں۔“ ڈینیل نے جواب دیا۔

”وائلڈ لائف میں ہم نے کچھ تجربات کیے تھے خصوصاً ہاتھی اور تیندوے پر۔“ ڈینیل نے ہاتھ آگے کیا۔ ”کیسے ہو مسٹر سنگھ؟ آخری بار ملنے سے پہلے تمہارے ساتھ کوئی حادثہ ہو گیا تھا؟“

ہرنام کا ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا تاہم جلد ہی وہ سنبھل گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں چراغ جلے اور ڈینیل کو لگا کہ وہ اس پر حملہ کر دے گا، تاہم دوسرے لمحے یہ سرخ چراغ بجھ گئے۔

اس نے دوستی کی اداکاری کی اور ڈینیل کا ہاتھ پکڑ لیا... بائیں ہاتھ سے... اس کی دائیں آستین خالی تھی جسے موڑ کر پن اپ کیا گیا تھا۔ ڈینیل نے دیکھا کہ ہاتھ کہنی کے نیچے سے کاٹا گیا تھا۔

”یقیناً، یہ ایک غیر معمولی خوشی کا موقع ہے، ڈاکٹر۔“ سنگھ کی آنکھیں اس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھیں۔

”شکریہ تمہاری ہمدردی کا... حادثے کے بعد اب میں پوری طرح صحت یاب ہوں... بہرحال مجھے دائیں ہاتھ سے محروم ہونا پڑا تاہم امید ہے کہ مجھے اس محرومی کا پورا پورا بدلہ ملے گا... کوئی بات نہیں۔“

پھر وہ بونی اور کاجو کی طرف متوجہ ہوا۔ کاجو نے بونی کو متعارف کرایا۔

”ڈاکٹر“ سنگھ نے ڈینیل کو مخاطب کیا۔ ”تمہاری وجہ سے ہم سب مشہور ہو جائیں گے، ٹی وی پر فلم اسٹارز کی طرح۔“ وہ بغور ڈینیل کے چہرے کو دیکھ رہا تھا... عجیب تاثرات تھے، جیسے اژدھا، خرگوش کو دیکھتا ہے۔

ملاقات کا شاک دونوں کے لیے شدید تھا... ہرنام سنگھ کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ڈینیل خطرے میں ہے اور وہ پہلی فرصت میں اسے ٹھکانے لگانے کی کوشش کرے گا، اس میں کوئی شک و شبے والی بات ہی نہیں تھی۔ یہاں ہرنام سنگھ کی حکومت تھی... وقت اور جگہ کا انتخاب اسی کو کرنا تھا۔ سینگی سینگی سے فرار کا واحد راستہ وہ پتلی سڑک تھی جو جنگلات سے گزرتی یہاں تک آتی تھی جس کے ہر میل پر کمپنی کے گارڈ اور ملٹری کے ناکے تھے۔

ڈینیل کو مائیک کے ذریعے بہت پہلے پتا چل گیا تھا

کہ ہرنام سنگھ نانڈی نامی درندے کے خوں خوار جبڑوں سے زندہ ضرور بچ گیا تھا لیکن گہرے زخموں کے طویل علاج میں اسے زہر سے بچنے کے لیے دایاں بازو کٹوانا پڑ گیا تھا۔ ڈینیل کو اوبومو میں سنگھ کی موجودگی کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا۔ یہ اس کی غلطی تھی کہ وہ سنگھ کو بھلا بیٹھا تھا جبکہ وہ جانتا تھا کہ تنگ چنگ گاتنگ اور ہرنام سنگھ کا افریقا میں گہرا تعلق اور مشترکہ مفادات ہیں۔

سنگھ، بونی اور کاجو کے ساتھ مصروفِ گفتگو تھا۔ اس گفتگو سے ڈینیل کو پتا چلا کہ صدر تفاری بذریعہ ہیلی کاپٹر اگلی صبح یہاں پہنچ رہے ہیں... یہاں ان کا انٹرویو عکس بند ہوگا اور صدر کے ہمراہ اوبومو ڈویلپمنٹ کارپوریشن کا چیف ایگزیکٹو آفیسر بھی ہوگا اور جو کوئی اور نہیں تنگ چنگ گاتنگ تھا۔

”یک نہ شُد دو شُد“ ڈینیل سمجھ گیا کہ جو دردناک کہانی چی واؤ نیشنل پارک میں قتل و غارت گری سے شروع ہوئی تھی، وہ یہاں اوبومو میں اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔

ہرنام کے سیکریٹری نے انہیں گیسٹ روم کی قطار میں ان کے کمروں تک پہنچایا تھا۔

ڈینیل نے اپنے کمرے کو بڑی احتیاط کے ساتھ چیک کیا۔ دروازے کا لاک اتنا محفوظ نہیں تھا، ڈینیل کو یقین تھا کہ اس کی دوسری چابی ہرنام کے پاس یقیناً ہوگی۔

ڈینیل کے لیے یکدم صورتِ حال خطرناک ہو گئی تھی... ہرنام کب پہلا وار کرتا ہے، اس کے پاس متعدد مواقع تھے...

”ٹھیک ہے دوستو... ایسے ہی سہی۔“ ڈینیل نے زیادہ سوچنا بند کر دیا۔

رات کا کھانا میس میں ہوا۔ بونی اور ڈینیل نے دیکھا کہ وہاں برٹش اور تائیوانی انجینئرز اور ٹیکنیشن موجود تھے۔ بار کا انتظام بھی تھا۔ کچھ لوگ ڈارٹ کھیل رہے تھے۔

کھانے کے بعد وہ پھر اپنے کمرے میں پہنچا تو دروازہ کھول کر ایک منٹ تک سُن گُن لیتا رہا... پھر ہاتھ اندر کر کے دروازے کے ساتھ سوئچ آن کیا، کمرا روشن ہو گیا تو وہ اندر داخل ہوا۔

☆☆☆

ہیلی کاپٹر مشرق کی جانب سے نمودار ہوا تھا، یہ پیوما کاپٹر تھا اور کافی استعمال شدہ لگتا تھا۔

تفاری باہر نکلا تو بونی نے شاٹ لیا۔ وہ مسکرایا اور استقبالیہ کمیٹی کی طرف بڑھا جو ہرنام سنگھ کی قیادت میں وہاں موجود تھی۔ تفاری کے عقب میں پیوما کی سیڑھی سے تنگ چنگ گاتنگ اتر رہا تھا۔ وہ کریم رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا، جو اس کی زردی مائل رنگت سے میچ کر رہا تھا۔ اس نے اترتے ہی تیزی سے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ ڈینیل قدرے پیچھے، کیمرے سے ہٹ کر کھڑا تھا۔ چنگ کی نظر لمحہ بھر کے لیے ڈینیل کے چہرے پر رکی اور کسی بھی قسم کا تاثر دیے بغیر ہٹ گئی... تاہم ڈینیل جانتا تھا کہ ہرنام سنگھ نے اسے پہلے ہی خبر پہنچا دی ہوگی۔

ڈینیل پہلے ہی اس نظر کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا پھر بھی چنگ کی نگاہ نے اسے جسمانی شاک پہنچایا۔ نارمل انداز میں تفاری کا استقبال کرنے کے لیے اسے خاصی کوشش کرنی پڑی۔

”آؤ، ڈاکٹر“ تفاری بولا ”تم نے دیکھا کہ آج کا بیشتر حصہ تمہاری عکس بندی کے لیے رکھا ہے، تم جس طرح چاہو گے، میں تمہاری کمانڈ میں ہوں۔“

”میں ممنون ہوں، مسٹر پریذیڈنٹ۔ میں نے ایک شوٹنگ شیڈول وضع کیا ہے۔ مجھے آپ کے پانچ گھنٹے لینے پڑیں گے... اس میں میک اپ اور ریہرسل بھی شامل ہے۔“

”ڈاکٹر آرم اسٹرانگ، مجھے خوشی ہوگی اگر میں آپ کا تعارف کارپوریشن کے منیجنگ ڈائریکٹر مسٹر چنگ سے کراؤں۔“

ڈینیل نے خود پر قابو پا لیا تھا۔ اس نے چنگ سے ہاتھ ملایا، مسکرایا اور بولا ”ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں، ہم تھوڑی دیر کے لیے زمبابوے میں ملے تھے... اس وقت جناب سفیر تھے... میرے خیال میں آپ کو یاد ہوگا؟“

”معاف کیجیے“ چنگ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”سرکاری فرائض کی انجام دہی کے دوران میں مجھے بہت سے لوگوں سے ملنا پڑتا تھا۔“

ڈینیل زبردستی مسکراتا رہا۔ اس کے تصور میں پھر وہ خون آشام واقعات گھومنے لگے جن سے وہ ماضی میں دوچار ہوا تھا۔ شدید خواہش ابھری کہ چنگ کے منہ کا بھرتا کر دے۔

اس نے رخ بدل لیا، اسے خود پر اعتماد نہ رہا کہ وہ کسی ایسی حرکت سے باز رہ سکے گا جو اسے ناقابلِ تلافی نقصان

پہنچانے کا سبب بن جائے۔
پہلی بار اسے ایسی صورتِ حال کا سامنا تھا کہ ننگ چنگ گا تنگ کو مارنا ہے یا خود مرنا ہے۔ جانی کا یہ بہت بھاری قرض تھا جو اسے چکانا تھا۔ اپنے دوست کی لاش پر اس نے جو قسم کھائی تھی، وہ اسے یاد تھی۔ اس کے لیے یہ ایک سیدھی سادی ڈیوٹی تھی۔ جانی نے اپنے اکلوتے بیٹے کا نام اسی کی محبت میں ڈینیل رکھا تھا۔ ایک ڈینیل مر چکا تھا، ایک زندہ تھا۔ زندہ ڈینیل کو جانی اور اس کی پوری فیملی اور معصوم ڈینیل کا حساب برابر کرنا تھا۔
چند لمحوں بعد ڈینیل، تفاری کو شوٹنگ کے بارے میں سمجھانے لگا۔ تفاری کا میک اپ بونی نے خود دیکھا۔
ڈینیل، تفاری کی بھی سن رہا تھا اور اپنا خیال بھی بتا رہا تھا، اس کے ہاتھ میں نوٹ بک تھی۔ شوٹنگ میں یونٹ کی مہیب مشین بھی استعمال ہونی تھی۔ وہ تفاری کو روشنی، زاویوں اور کلوزاپ وغیرہ کے بارے میں بتا رہا تھا۔
پھر وہ کھدائی والی مشینوں کی طرف گیا جن کے بلیڈ بے انتہا طاقت سے گھوم رہے تھے اور کھدائی کے لیے زمین تیار کر رہے تھے۔ یہ بہت بڑی اور طاقتور مشینیں تھیں جو زمین میں تیس فٹ گہرا اور اتنا ہی چوڑا گڑھا کر سکتی تھیں۔ یہ متواتر کام کر رہی تھیں۔ ڈینیل نے ایک گڑھے میں جھانکا۔
''اچھی جگہ ہے، لاش چھپانے کے لیے۔'' وہ بڑبڑایا ''تمہاری لاش کے لیے۔'' پھر وہ پیچھے ہٹ گیا۔
اچانک اس نے اوپر کی جانب نگاہ کی، سنگھ اور چنگ اوپر بلندی پر کمانڈ پلیٹ فارم پر تھے، جو سو فٹ بلند تھا۔ دونوں کے سر ملے ہوئے تھے۔ دیوہیکل مشینوں کے شور میں آواز سنائی دینا ناممکن تھا۔ ایک ساعت کے لیے ان دونوں کی نگاہیں ڈینیل سے ٹکرائیں اور ہٹ گئیں۔
کیمرا کریو اسٹیل کی سیڑھی کے ذریعے موبائل مائننگ یونٹ کے مرکزی پلیٹ فارم پر چڑھ رہا تھا۔
ڈینیل نے پھر اوپر دیکھا تو سنگھ اور چنگ کو غائب پایا، اسے کچھ بے چینی محسوس ہوئی۔
بونی اپنا کام کر رہی تھی اور تفاری، ڈینیل کی ہدایات کے مطابق مختلف مقامات پر تقریر شروع کر دیتا کہ کس چیز کی کیا افادیت ہے اور مستقبل میں کیا نتائج برآمد ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ بونی کو بھی ڈینیل نے اچھی طرح بریف کر دیا تھا۔
''کٹ'' ایک مقام پر ڈینیل نے باآوازِ بلند آرڈر کیا۔

''شاندار، بہت اچھے، مسٹر پریذیڈنٹ... بہت شکریہ۔ آپ چاہیں تو لنچ لے سکتے ہیں... ہم یہاں کام ختم کر کے نقشوں اور ماڈلز کے ذریعے اسے فائنل کریں گے۔''
ہرنام سنگھ دوبارہ نظر آیا۔ تفاری خوشگوار موڈ میں تھا۔ ہرنام اسے سائٹ سے بیس کیمپ لے گیا جہاں اور بھی لوگ کھانے کے لیے اکٹھے ہو رہے تھے۔
کھانے کے بعد پھر کچھ سرگرمی شروع ہوئی۔ تفاری، بونی کی معیت میں خوش تھا اور ہنسی مذاق میں لگا ہوا تھا۔ بونی خود کو فرسٹ لیڈی سمجھ رہی تھی، اس کو ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ ہی تا افریقی اپنی بیگمات سے کیسا سلوک کرتے ہیں۔

☆☆☆

لینڈ روور کے ٹیلی بورڈ پر ہرنام اور ننگ چنگ بیٹھے تھے۔ ہرنام بائیں ہاتھ سے ڈاکومنٹ کو ران پر پھیلا رہا تھا۔
''کاغذ کا یہ ٹکڑا، ایک مذاق ہے۔'' سنگھ بولا۔
''یہ مذاق نہیں ہے۔'' ننگ چنگ نے سرد لہجے میں کہا ''یہ ایک تحفہ ہوگا میرے معزز والدِ گرامی کے لیے اور یہ کام بھی کرے گا۔''
ہرنام نے چنگ کو دیکھا اور بے دلی سے مسکرایا۔ وہ چنگ میں واضح تبدیلی دیکھ رہا تھا جو اسے پسند نہیں آئی تھی۔ یہ وہ چنگ نہیں تھا جو ابتدا میں ہرنام سے ملا تھا۔ تائی پے سے اوبومو واپس آنے کے بعد اس کے اندر ایک نئی طاقت، بے خوفی اور اعتماد ابھر آیا تھا۔ ہرنام نے اپنی نگاہیں چنگ کی چبھتی ہوئی نظروں سے ہٹائیں اور کاغذ کی تحریر کو پڑھنا شروع کیا۔
''پیپلز ڈیموکریٹک ری پبلک آف اوبومو
اسپیشل پریذیڈنٹ گیم لائسنس
حاملِ رقعہ، ننگ چنگ گا تنگ، اور اس کے تفویض کردہ ایجنٹ کو یہاں اختیار دیا جاتا ہے بذریعہ اسپیشل پریذیڈنٹ آرڈر کہ وہ درج ذیل پانچ نسلوں کو ٹریپ یا شکار کر سکتے ہیں۔ نیچے افریقن ہاتھی کی پانچ نسلوں کی تفصیل تھی۔
حاملِ رقعہ کو مزید اختیار حاصل ہے کہ وہ سائنسی تحقیق کے لیے، انہیں یا ان کے اعضا کو اپنی تحویل میں رکھے، بیچے یا ایکسپورٹ کرے...
انگرم تفاری، پریذیڈنٹ آف ری پبلک آف اوبومو۔''
''یہ لائسنس میری حیثیت کو بُری طرح متاثر کرے

گا۔" ہرنام نے کہا۔

چنگ بے صبری سے ایک طرف مڑا۔ ہرنام نے اسے بدمزہ کر دیا تھا۔ چنگ سوچوں میں کھو گیا۔ اس نے اپنی بے قراری کو چھپانے کے لیے گھڑی کی طرف دیکھا "اس نے دیر کر دی ہے۔" چنگ نے تیز لہجے میں کہا۔

ہرنام نے کندھے اچکائے اور گیم لائسنس کو تہ کر دیا۔ "وہ اپنے حساب سے آئے گا، ممکن ہے آ گیا ہو اور نگرانی کر رہا ہو۔"

"آرم اسٹرانگ کا کیا کرنا ہے؟" چنگ نے سوال کیا۔

"آہ... ہاہا... ہائے" ہرنام سنگھ ہنسا۔ "ایک مزیدار کھیل ہوگا۔" اس نے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کے ٹھنٹھ کو سہلایا۔ "میں کئی مہینوں سے آرم اسٹرانگ کے خواب دیکھ رہا ہوں... میں اسے سینگی سینگی سے صاف نہیں نکلنے دوں گا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے بہت سوچا ہے اس کے لیے..." ہرنام بولا "ڈاکٹر کی موت اذیت کی مثال ہوگی اور قابلِ وضاحت بھی کہ یہ کتنا خوفناک اور بدقسمت حادثہ تھا" شدتِ نفرت سے ہرنام سنگھ کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔

"زیادہ انتظار نہیں کرو۔" چنگ نے مشورہ دیا۔

"میرے پاس پانچ دن ہیں۔" ہرنام بولا "میں نے اس کا فلمی شیڈول دیکھا ہے... وہ پانچ دن سے پہلے کام مکمل نہیں کر سکتا۔"

اچانک ہرنام کھڑا ہو گیا اور جنگل کی سمت گھورنے لگا... "میرا خیال ہے، وہ پہنچ چکا ہے۔" ہرنام سنگھ نے سرگوشی کی۔ اس نے آگے بڑھ کر آواز بلند کی اور سواحلی میں بولا "جنگل کے بیٹے، خوش رہو اور آگے آ جاؤ تا کہ ہم اچھے دوستوں کی طرح مل سکیں۔"

کچھ دیر بعد ایک پگمی جنگل سے برآمد ہوا۔ چھوٹے بدن کے عضلات مضبوط تھے... ناک چپٹی اور پھیلی ہوئی تھی، اس کا سر چھوٹا سا تھا۔

"پیری، عظیم شکاری۔" ہرنام سنگھ نے ہاتھ ہلایا۔

"کیا تم تمبا کو لائے ہو؟" بونے نما انسان نے سواحلی میں پوچھا۔ اس نے بچوں کی طرح چسکا لیا۔

ہرنام نے ایک ٹن پیک اس کے حوالے کر دیا۔

پیری نے ڈھکن کھولا... تھوڑا سا تمبا کو نکال کر بالائی لب کے نیچے رکھا اور گنگنانے لگا۔

"کیا یہ شکاری ہے؟" چنگ نے حیرت سے سوال کیا۔ "کیا یہ ہاتھی کو مار سکتا ہے؟"

ہرنام سنگھ نے قہقہہ لگایا۔ "یہ اپنے قبیلے کے عظیم شکاریوں میں سے ہے۔ یہ خالص بمبوٹی نہیں ہے... اس کا باپ ہی تا تھا، خون میں ملاوٹ کی وجہ سے اس کے اندر کچھ اور خوبیاں بھی ہیں۔"

"مثلاً؟" چنگ جاننا چاہتا تھا۔

"آم کھاؤ... اتنا سمجھ لو کہ یہ بمبوٹی یعنی بعض خالص افراد کے برعکس لالچ اور پیسے کو سمجھتا ہے..."

پیری کے محض زیریں حصے پر کپڑا تھا، بقیہ جسم ننگا تھا۔ وہ تیر کمان اور چھرے سے مسلح تھا، تیز دھار... چھرا کمر سے لٹک رہا تھا۔

"یہ کون ہے؟" اس نے سواحلی میں پوچھا۔ وہ چنگ کو گھور رہا تھا۔

"یہ بہت مشہور اور دولت مند چیف ہے۔"

"اس سے ہاتھی کے بارے میں پوچھو؟" چنگ بولا۔

ہرنام سنگھ کے سوال پر پیری نے کہا "ادھر تیس ہاتھی ہیں، گونڈالا کے قریب اور دو بل ہیں۔"

"بل؟" چنگ نے پوچھا۔

"وہ ہاتھی کا بھی باپ ہوتا ہے... اس کے دانت بہت بڑے ہوتے ہیں۔" ہرنام سنگھ نے بتایا۔ چنگ کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی۔

"تم اسے مار کر دانت مجھے لا دو۔"

"نہیں۔" پیری نے نفی میں سر ہلایا۔ جنگل میں زرد مشینوں کی آمد اور شور نے انہیں بھگا دیا ہے۔ وہ ایسی جگہ ہے جو مقدس ہے وہاں انہیں کوئی نہیں مار سکتا۔"

"میں تمہیں بہت پیسے دوں گا۔" ہرنام نے چارا ڈالا۔

"نہیں۔" پیری نے سختی سے چھوٹا سر نفی میں ہلایا۔

"میں بیس کلہاڑیوں کے پھل اور دس چاقو بھی دوں گا۔"

"میرا قبیلہ مجھ سے نفرت کرے گا اور مجھے باہر نکال دے گا۔"

"جن کی بیس بوتل اور" ہرنام سنگھ نے بولی بڑھائی۔ تھوڑی دیر اور محنت کے بعد ہرنام سنگھ نے اسے راضی کر لیا۔

"چلو تمہارے والد گرامی کے تحفے کا بندوبست تو ہو

گیا اب ہمیں دوسرے تحفے کا بندوبست کرنا ہے۔"

"یعنی؟"

"یعنی... آرم اسٹرانگ کا سر۔" ہرنام سنگھ کی آواز سے بے رحمی اور انتقام کی بو آ رہی تھی۔

☆...☆...☆

بونی قدرے تاخیر سے پہنچی تھی۔

"پانچ بجے کا مطلب ہے، صبح کے پانچ بجے۔" ڈینیل کسی قدر برافروختہ نظر آ رہا تھا۔

جواباً بونی ہنسنے لگی۔ "تم کیا چاہتے ہو ماسٹر میں "ہارا کاری" کر لوں؟"

ڈینیل کو ادراک ہوا کہ وہ سیدھی تفاری کے بستر سے اٹھ کر آ رہی ہے۔ وہ مزید غضبناک ہو گیا۔ "خود کو سنبھالو ڈینی بوائے ورنہ تمہارے ٹکڑے کر دیے جائیں گے۔" وہ یہ سوچ کر چپ رہا۔

انہوں نے کام کا آغاز کیا تاہم دونوں ہی کھنچے کھنچے سے تھے۔ دوپہر سے قبل بونی نے ٹیپ ختم ہونے کا اعلان کیا۔

"کیا بات ہے ایسے کیمرے مین کی جس کا اسٹاک کام کے دوران ختم ہو جائے۔" ڈینیل چڑ گیا۔

"میں جانتی ہوں، تمہیں کس بات کی تکلیف ہے... تم تفاری کی وجہ سے مجھے برا سمجھتے ہو کہ میں تمہارے پاس نہیں بلکہ ادھر ہوتی ہوں۔" وہ تڑخ اٹھی۔

"تمہیں اپنی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہے جو تمہیں اس کے ساتھ سونے پر مجبور کرتا ہے۔" ڈینیل نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ وہ تنگ آ گیا تھا، بونی کی حرکتوں سے۔

"کسی کو ہمت نہیں ہوئی مجھ سے اس طرح بات کرنے کی۔" بونی چیخنے لگی، "اپنا کام اپنے پاس رکھو۔" اور پیر پٹخ کے چل پڑی۔

"لندن کا ریٹرن ٹکٹ چیک کے ساتھ تمہیں مل جائے گا، خود کو اب فارغ سمجھو۔" ڈینیل غصے سے چلّایا۔

"میں استعفیٰ دیتی ہوں... تمہیں جلد پتا چل جائے گا میری اہمیت کا۔" وہ غصے سے لال پیلی ہو رہی تھی۔

"احمق عورت... افریقا اور افریقیوں کو تم، مجھ سے بہتر نہیں جانتیں... تم بہت جلد اپنے فیصلوں پر پچھتاؤ گی۔"

بونی غصے سے پاگل ہوئی جا رہی تھی اور بہت ظالمانہ انتقام کے بارے میں سوچ رہی تھی، ڈینیل کو پتا نہیں تھا کہ وہ کس حد تک چلی جائے گی۔

☆☆☆

وہ الفرم تفاری کے ساتھ لیٹی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس جیسا شاندار آدمی اسے پہلے کیوں نہیں ملا۔

دونوں کچھ دیر بدمستی میں رہے پھر وہ بولی "تم ایک لاجواب مرد ہو، تفاری۔"

"تمہیں محبت ہو گئی ہے شاید۔"

"تمہیں نہیں ہے؟"

"ہے۔" تفاری نے اس کے بال کھینچے۔ "تمہیں نہیں ہے شاید۔" وہ بولا۔

"کیا مجھے ثبوت دینا پڑے گا؟"

"نہیں۔ ضرورت تو نہیں ہے۔"

"لیکن میں ثابت کروں گی کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔"

"اچھا!" تفاری ہنسنے لگا۔

"میں تمہارے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔"

"تم کیا کر سکو گی؟"

"بہت کچھ!"

"اچھا!" تفاری نے دلچسپی سے کروٹ بدل کر اس کی گردن کو چوما۔

"میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" تفاری کے کان کھڑے ہوئے اور بونی نے اسے ڈینیل کی اس ٹیپ کے بارے میں بتا دیا جس میں عوام کو مارتے اور گاؤں کو نذرِ آتش کرنے جیسے واقعات فلم بند تھے۔

"اب تم کبھی میری وفاداری پر شک نہیں کر سکو گے۔" وہ تفاری سے لپٹ گئی۔ "آئی لو یو۔"

تفاری کی نبض کی رفتار ہلکی سی بڑھ گئی، اس کا سانس خود بخود بے ربط ہو گیا۔

"مائی لٹل للی... مائی روز۔ مجھے سمجھاؤ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

بونی نے سب کچھ بتا دیا۔

"تم نے وہ سب عکس بند کر لیا؟" تفاری نے سوال کیا۔ دفعتاً بونی کو اس کی آواز بدلی ہوئی محسوس ہوئی، وہ غیر یقینی کیفیت سے دوچار ہو گئی، اسے خوف کا احساس ہوا۔

"ڈینیل نے مجھے مجبور کیا تھا۔"

"میں نے ایسے کوئی آرڈر نہیں کیے تھے۔ وہ فلم کہاں ہے؟"

"ڈینیل کے پاس... اس نے کاہالی میں برٹش ایمبیسی میں رکھ دی ہے۔"

”کس کس کو پتا ہے فلم کے بارے میں؟“
”کسی کو نہیں۔“
”مطلب، صرف تم دونوں کو معلوم ہے؟“
”میرے خیال میں ایسا ہی ہے۔“ بونی بے چینی محسوس کررہی تھی۔
”گڈ۔“ تفاری نے اس کا رخسار تھپتھپایا۔ ”تم اچھی لڑکی ہو... تم دوستی سے آگے چلی گئی ہو۔“
”آئی لو یو، تفاری۔“ بونی نے اس کا نام لے کر اظہارِ محبت کیا۔ ”مجھے شاید پہلے بتانا تھا۔“
”اب بھی تاخیر نہیں ہوئی ہے۔“ تفاری نے اسے مطمئن کیا۔
”کیا تم میری مدد نہیں کروگی، فلم کے لیے؟“
”میں تمہارے لیے کچھ بھی کرسکتی ہوں۔“
”میں جانتا ہوں۔“ پھر وہ دونوں رنگ و بو کی پُرکیف دنیا میں ڈوبتے چلے گئے۔

☆☆☆

بونی کی آنکھ کھلی تو بارش ہورہی تھی۔ اس نے بستر پر ہاتھ پھیرا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ معاً اسے ملحقہ کمرے سے مردانہ آوازیں سنائی دیں۔ اس نے اٹھ کر اپنے کان پتلے پارٹیشن کے ساتھ چپکا دیے۔ تفاری کی آواز اس نے پہچان لی تاہم بارش کی وجہ سے وہ دوسری آواز نہیں پہچان سکی، جو کچھ وہ سن رہی تھی... اس کے رونگٹے کھڑے کرنے کے لیے کافی تھا۔ حسبِ معمول ہی بارش اچانک رک گئی اور بونی لہجے کی وجہ سے دوسری آواز بھی پہچاننے میں کامیاب ہوگئی، جو ہرنام سنگھ کی تھی۔
بونی جیسے سرتاپا برف میں ڈوب گئی۔ اس کا نشہ ہرن ہوگیا۔ ڈینیل کے الفاظ اس کی سماعت میں گونج رہے تھے۔ وہ جذبات اور غصے میں ایک بھیانک غلطی کر بیٹھی تھی۔ ہرنام سنگھ کے رخصت ہوتے ہی وہ بلی کی طرح دبے پاؤں واپس بستر پر آگئی۔ اس کا جسم بے جان لکڑی کی طرح سیدھا پڑا تھا اور ذہن گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑ رہا تھا۔
اس نے سوچا تھا کہ تفاری زیادہ سے زیادہ ڈینیل کو گرفتار کرلے گا یا ڈی پورٹ کردے گا۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ لمبا افریقی ایک حقیر کیڑے کے مانند ڈاکٹر ڈینیل کے قتل کا حکم دے دے گا... وہ بھی فوری...
یقیناً ڈینیل نے اس کی بے عزتی کی تھی لیکن وجہ تو خود بونی نے فراہم کی تھی۔ وہ ڈینیل سے نفرت نہیں کرتی تھی کجا اس کی موت کی خواہش کرتی۔ وہ تو اس کے مداحوں میں شامل تھی اور پھر بھی تیسری بار وہ ڈینیل کو دھوکا دے چکی تھی۔ پہلی بار جب وہ سر پیٹر ہیرسن کے جال میں پھنسی، دوسری بار جب اس نے کیلی وان کو بدظن کیا اور آج تو اس نے ڈینیل کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ وہ سسک اٹھی۔
بونی، تفاری کا انتظار کررہی تھی تاہم وہ نہیں آیا۔ ڈرتے ڈرتے وہ اٹھی... بستر کے کنارے فرش سے اپنا لباس اٹھایا۔ آہستگی سے دروازہ کھول کر وہ بنگلے کے برآمدے میں آگئی۔ بیٹنگ روم سے روشنی جھلک رہی تھی۔ اس نے خود کو بچاتے ہوئے کھڑکی سے جھانکا... اندر تفاری سگریٹ نوشی میں مشغول تھا اور ڈیسک پر بکھرے کاغذات میں سر کھپا رہا تھا۔
بونی دھڑکتے دل کے ساتھ بچتی بچاتی مہمانوں کے کمروں کی قطار تک پہنچ گئی۔ اسے اطمینان ہوا کہ ڈینیل کے کمرے سے روشنی آرہی تھی۔ وہ چکر کاٹ کر عقبی سمت میں چلی گئی۔ یہاں کھڑکی پر پردہ پڑا تھا۔ شیشے پر ڈیزائن تھا اس نے آواز پیدا کرنے کے بجائے اسے کھرچنا شروع کردیا۔ دوسری کوشش میں اسے کرسی کھسکنے کی آواز آئی۔
”کون ہے؟“
”خدا کے لیے ڈینی، میں ہوں، جلدی کرو۔“
”اندر آجاؤ، میں دروازہ کھولتا ہوں۔“
”نو... نو... و... نو“ وہ بری طرح بے قرار تھی۔ ”ادھر آؤ، جلدی کرو... کوئی مجھے دیکھ سکتا ہے، سامنے سے۔“
آدھا منٹ میں کھڑکی میں اسے چوڑے شانے نظر آئے۔
”ڈینی، تفاری کو فش ایگل بے والی ٹیپ کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔“
”کیسے؟“
”اس سے فرق نہیں پڑتا۔ میں تمہیں خبردار کرنے آئی ہوں۔ اس نے تم کو ختم کرنے کے آرڈر کردیے ہیں۔ ہرنام سنگھ کسی فوجی کے ساتھ آرہا ہے... تمہیں جنگل میں لے جاکر ماردیں گے۔“
”تمہیں کیسے پتا چلا؟“
”اوہ خدا... میرے پاس وقت نہیں ہے، سوال نہیں پوچھو... یقین کرو... ایک ایک لمحہ قیمتی ہے...“ وہ پلٹی۔ ڈینی نے اس کا بازو پکڑلیا۔ ”شکریہ بونی“ وہ بولا ”کیا تم اب بھی الگ ہونا چاہتی ہو؟“
بونی نے نفی میں سر ہلایا ”میں اب ٹھیک ہوں، بس نکلنے کی کرو... زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا ہے... نکل جاؤ...“
وہ واپس چل پڑی...

☆☆☆

ڈینیل نے اندرونی روشنی بند کردی اور پورے ایک منٹ تک تاریکی میں کھڑا رہا، جب تک صرف ہرنام اور چنگ سے نمٹنے کی بات تھی تو صورتِ حال مختلف تھی لیکن اب تو ہرنام کو اس کے قتل کی کھلی اجازت مل گئی تھی۔ وہ بری طرح پھنس گیا تھا۔
اس نے کمپاؤنڈ اور اطراف کا جائزہ لیا جہاں تاریکی اور خاموشی کا راج تھا۔ اس نے میز کے نیچے سے اپنا ٹریول بیگ اٹھایا جس میں پاسپورٹ، ایئرلائن ٹکٹس، ٹریولرز چیک، کریڈٹ کارڈ اور چند ضروری اشیا تھیں۔ جیب میں لینڈ روور کی چابی چیک کی اور باہر نکل گیا۔
وہ گاڑی تک پہنچ گیا، گاڑی میں تمام چیزیں تھیں سوائے ہتھیار کے۔ ہتھیار کے نام پر اس کے پاس وہی پرانا شکاری چاقو تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور لائٹس بند رہنے دیں، دھیمی رفتار سے وہ مین گیٹ کی طرف چلا...
اسے کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ واپس جانے کی صرف ایک ہی سڑک ہے اور اس پر بھی قدم قدم پر رکاوٹیں ہیں، ایک ریڈیو کال سب کو الرٹ کردے گی نتیجتاً اس کا استقبال ہولناک گولیوں سے کیا جائے گا۔
نہیں... اسے جنگل میں گھسنا چاہیے۔ رھوڈیشیا میں اسے جنگلات میں جان بچانے کا تجربہ تھا، البتہ وہ بارانی جنگلات کا عادی نہیں تھا۔
اچانک گیٹ پر نصب فلڈ لائٹس نے صبح کا منظر پیش کردیا۔ چھ گارڈ بیرک کی جانب سے آرہے تھے۔ دوسری جانب سے کیپٹن کاجو اور ہرنام سنگھ نازل ہورہے تھے... کیپٹن کاجو آٹومیٹک پسٹل ہوا میں لہرا رہا تھا جبکہ ہرنام سنگھ اس کے پیچھے آرہا تھا۔
گیٹ پر موجود گارڈز میں سے ایک نے گیٹ بند کرنا شروع کیا۔
ڈینیل نے ہیڈ لائٹس آن کردیں اور ایک ہاتھ ہارن پر رکھ کر رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ گاڑی شدت کے ساتھ ادھ کھلے گیٹ سے ٹکرائی... گارڈ نے اندھا دھند ایک جانب چھلانگ لگائی... لینڈ روور گرجتی ہوئی باہر نکل گئی۔ وہ فائرنگ کا انتظار کیے بغیر اسٹیئرنگ پر اوندھا ہوگیا، دایاں پیر ایکسلریٹر پر دبتا چلا گیا۔
خودکار ہتھیاروں سے فائرنگ ہوئی اور کئی گولیاں گاڑی پر لگیں۔ دوسرے برسٹ نے عقبی شیشے کو چور چور کردیا... کوئی چیز ڈینیل کی پشت پر ذرا بلندی پر لگی... اور اسی وقت وہ سڑک کا پہلا موڑ مڑ گیا۔
ماضی میں اس کے جسم نے پہلے بھی گولی کا ذائقہ چکھا تھا اور وہ گولی کی مار کو پہچانتا تھا۔ پوزیشن کے مطابق اسے پھیپھڑے کو ہٹ کرنا تھا۔
”بھگاتے رہو جب تک تم بھگا سکتے ہو۔“ اس نے خود کو ہدایت دی۔ اس نے گرم خون کو پشت پر محسوس کیا۔ اسے سانس لینے میں کوئی مشکل نہیں ہورہی تھی، نہ ہی کمزوری تھی... بلکہ عجیب سا درد اور چبھن تھی تاہم اس کا دماغ پوری طرح کام کررہا تھا۔
دور اسے ٹرک کی روشنیاں نظر آئیں جس کا رخ ڈینیل کی ہی طرف تھا۔ اس نے گاڑی کی رفتار کم کردی اور سڑک کے ساتھ گھنے جنگل میں گھسنے کے لیے راستہ تلاش کرنے لگا۔ آخر ایک جگہ اس نے لینڈ روور ناقابلِ عبور جنگل میں ڈال دی۔ جنگل کا نباتاتی فرش بھی اتنا دبیز اور گھنا تھا کہ باوجود کوشش کے لینڈ روور کی رفتار کم ہی ہوتی چلی گئی... بالآخر اسے رکنا پڑا۔ ڈینیل نے انجن بند کردیا۔ اس نے غور سے سنا کہ ٹرک وہاں سے گزر گیا ہے... وہ سینگی سینگی جارہا تھا۔ ٹرک کی آواز معدوم ہوتے ہی ڈینیل اپنی پشت کے زخم کا جائزہ لینے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے ہیڈ لائٹس پہلے ہی بند کردی تھیں، اندرونی بتی روشن تھی۔
قدرے تردد سے وہ ایک ہاتھ پشت پر عین زخم کے مقام پر لے گیا۔ دانت پر دانت جما کر اس نے نامعلوم ٹھوس شے کو کھینچ لیا... خون پھر نکلنے لگا تاہم اس کی رفتار معمولی تھی۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود شیشے کا ٹکڑا تھا۔
”فی الحال تم مرنے نہیں جارہے۔“ اس نے خود کو یقین دلایا اور عقبی نشست سے فرسٹ ایڈ کٹ اٹھائی... اپنی ہی پشت پر موجود زخم کی مرہم پٹی ایک دشوار کام تھا۔ لیکن کم از کم اس نے مرہم زخم پر لیپ کردیا اور کسی نہ کسی طرح الٹی سیدھی بینڈیج بھی کردی، اس کے لیے اس نے ایک ہاتھ اور دانتوں کا استعمال کیا تھا۔ اس تمام عمل کے دوران اس کے کان بیرونی آوازوں پر لگے رہے تھے۔
ڈینیل سڑک پر آیا۔ سڑک بھی کیچڑ آلود تھی۔ اس کی گاڑی کے ٹائروں کے نشان ٹرک کے بھاری پہیّوں کے

نیچے آکر نا قابلِ شناخت ہو گئے تھے، جہاں سے اس کی گاڑی جنگل میں گھسی تھی وہاں دبیز نباتاتی فرش پر کیچڑ کے نشانات تھے اور زمین دب سی گئی تھی۔ ایک ٹہنی کی مدد سے اس نے نرم دبیز زمین کو اوپر نیچے کر کے سابقہ حالت میں کر دیا۔

فوراً ہی اس کی آزمائشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جب اس نے سینگی سینگی کی جانب سے کسی گاڑی کی روشنیاں دیکھیں۔

ڈینیل نے ہاتھوں اور چہرے پر پھرتی سے کیچڑ ملی اور سڑک سے ہٹ کر اوندھے منہ لیٹ گیا۔

وہ فوجی گاڑی تھی جس پر خاکی اور سبز رنگ کیا گیا تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ پگڑی میں یقیناً ہرنام سنگھ تھا۔ عقبی حصے میں ہی تا فوجی تھے۔ ایک فوجی اسپاٹ لائٹ کو متواتر دائیں بائیں حرکت دے رہا تھا۔ ڈینیل نے سر دونوں بازوؤں میں لپیٹ لیا۔ ٹرک بغیر رکے گزرتا چلا گیا۔

ٹرک کے غائب ہوتے ہی وہ گاڑی کی طرف چل پڑا۔ گاڑی میں سے اس نے انتہائی ضرورت کی اشیا منتخب کیں... جن میں کمپاس اور فرسٹ ایڈ کٹ لازم تھے... بیگ اس نے بستر کی طرح پشت پر لے لیا۔

روشنی ہونے سے پہلے اسے کسی محفوظ مقام تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ تاریکی اور بے حد گھنے جنگل میں کوئی فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ بہر حال وہ مغرب کی سمت چل پڑا۔ ٹارچ یہاں اس کی مجبوری تھی، ہر چند سو گز پر وہ کمپاس کا جائزہ لیتا جا رہا تھا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد وہ دس منٹ کے لیے آرام کرتا۔ اپنے حساب سے جب اس نے دس میل کا سفر طے کر لیا تو رک گیا۔ اس نے حساب لگایا کہ زائر کی سرحد تک پہنچنے میں اسے کم از کم آٹھ روز لگ جائیں گے۔ سوال یہ تھا کہ وہ وہاں تک پہنچ بھی سکے گا یا نہیں...

اس نے عارضی گھونسلے نما جگہ بنائی اور سونے کے لیے تیار ہو گیا۔

جب وہ بیدار ہوا تو اتنی روشنی تھی کہ وہ چہرے کے سامنے اپنے ہاتھ کو دیکھ سکتا تھا۔ بھوک کے ساتھ اسے زخم بھی اذیت دے رہا تھا۔ اس نے ہاتھ سے سوجن محسوس کی اور ہلکی تپش بھی، انفیکشن شروع ہو گیا تھا، جتنی اور جیسی بھی وہ کر سکتا تھا، ڈریسنگ کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ دوپہر تک اسے بھوک نے کافی پریشان کر دیا۔

ایک گرے ہوئے مردہ درخت کی چھال میں اسے سفید اور موٹے کیڑوں کا گھونسلہ نظر آیا۔ ڈینیل بلا تامل انہیں چٹ کر گیا۔ ان کیڑوں کا ذائقہ کچی زردی کی طرح تھا۔

کمپاس اس کے ہاتھ میں تھا۔ مغرب کی جانب سفر جاری تھا... شام میں اسے کچھ کائی نظر آئی جسے اس نے چکھنے کے بعد داخلِ شکم کیا... کچھ دیر بعد وہ چمکتی ہوئی ایک چھوٹی سی جھیل کے قریب تھا یہاں اس نے اپنی پیاس بجھائی۔

اگلی صبح وہ پیچش کا شکار ہو چکا تھا، وجہ کائی تھی یا سفید کیڑے... تاہم دوپہر تک وہ کافی کمزوری محسوس کرنے لگا تھا... اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اب تک کسی درندے یا سانپ کا شکار نہیں ہوا تھا۔ زخم کی جگہ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے جلتا ہوا کوئلہ رکھ دیا ہو۔

یہ وہ وقت تھا جب ڈینیل نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ اس کی چھٹی حس واضح اعلان کر رہی تھی کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔

گزرتے وقت کے ساتھ اس کا احساس قوی تر ہوتا جا رہا تھا کہ نادیدہ شکاری نہ صرف اس کے پیچھے ہے بلکہ ہر گزرتے ہوئے گھنٹے کے ساتھ قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔

☆☆☆

ہرنام سنگھ کو پیری کی تلاش تھی۔ ڈینیل، ہرنام کی مٹھی سے پھسل گیا تھا۔ سنگھ خوب جانتا تھا کہ وہ جنگل میں ہے، اس کا بہترین آپشن اب پیری ہی تھا۔ حریص اور مکار پیری سے رابطہ ہوتے ہی ڈینیل کی موت یقینی تھی۔

بہر حال اس رابطے میں سنگھ کو دو دن لگ گئے۔

"کیا تم نے ہاتھی کو ہلاک کر دیا ہے؟" سنگھ کا پہلا سوال ہاتھی سے متعلق تھا۔ یہ سوال اس نے قصداً کیا تھا کیونکہ پیری نے چھوٹتے ہی تمبا کو اور تحفوں کا مطالبہ کیا تھا۔

"اگر تم نے مجھے واپس نہ بلا لیا ہوتا تو ہاتھی اب تک ہلاک ہو چکا ہوتا۔ تھوڑا سا تمبا کو۔" پیری نے التجا کی "میں تمہارا تابعدار غلام ہوں... صرف ایک مٹھی تمبا کو دے دو۔"

ہرنام نے اسے نصف مٹھی تمبا کو دیا اور وہ آلتی پالتی مار کر اس سے لطف اندوز ہونے لگا۔ ہرنام بولا "میں اپنے وعدے پر قائم ہوں بلکہ میں ایسا ہی ایک اور وعدہ کرتا ہوں، اگر تم ایک جانور ہلاک کر کے اس کا سر مجھے لا دو۔"

پیری نے حیرت سے اسے دیکھا، اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔

"کیسا جانور؟" اس نے محتاط انداز اختیار کیا۔ "کیا ایک اور ہاتھی؟"

"نہیں۔" ہرنام نے کہا "یہ ایک آدمی ہے۔"

"تم چاہتے ہو، میں کسی انسان کو ہلاک کر دوں؟" پیری بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ "اگر میں نے ایسا کیا تو موبیمو آئے گا اور مجھے پھانسی پر لٹکا دے گا۔"

"نہیں۔" سنگھ بولا "وہ ایک شیطان صفت آدمی ہے، سرکار کے لوگ الٹا تمہیں انعام دیں گے... تمہاری توقع سے بڑھ کر۔"

پیری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ ایک مرتبہ سفید آدمی کو زائر میں ہلاک کر چکا تھا... تب وہ نوجوان تھا اور سرکار نے اسے نوازا تھا۔ سفید آدمی جنگل میں احمق اور سست ثابت ہوتا ہے، اس کو ڈھونڈنا اور ختم کرنا آسان کام ہوتا ہے۔

پیری نے سودے بازی شروع کر دی... تھوڑی دیر میں سودا طے ہو گیا۔ "وہ مجھے کہاں ملے گا؟" پیری نے سوال کیا۔ ہرنام سنگھ نے اپنی معلومات کے مطابق ڈینیل کے محلِ وقوع کے بارے میں بتایا۔

"تمہیں صرف سر چاہیے؟" پیری نے پوچھا۔ "کھانے کے لیے؟"

"نہیں۔" ہرنام کو برا ماننے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ایک بمبوٹی سے بات کر رہا تھا۔ "تاکہ مجھے اطمینان ہو کہ تم نے صحیح آدمی کو مارا ہے..." پھر ہرنام سنگھ، ڈینیل کی شناخت کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔

☆☆☆

علی الصباح کیلی وان گونڈالا میں اپنے کلینک پر تھی۔ اس دن مریضوں کی تعداد زیادہ تھی۔ زیادہ تر السر کے مریض تھے۔ وکٹر او میرو بھی ساتھ تھا... تب اچانک کلینک کے باہر ہلچل کی آوازیں آنے لگیں...

وکٹر نے کھڑکی سے جھانکا۔ "تمہارے ننھے دوست آگئے ہیں۔" اس نے کیلی کو بتایا۔ کیلی خوش دلی کے ساتھ ہنسی اور باہر نکل آئی۔ سورج ذرا بلند ہو گیا تھا۔

سی پو اور اس کی بیوی دالان کے نیچے مریضوں کے ساتھ بیٹھے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ کیلی کو دیکھتے ہی دونوں اس کی طرف بھاگے۔ دونوں اسے اس کی مخصوص نشست پر لے گئے۔ یہ دالان کی بالائی سیڑھی پر تھی۔

"میں تمہارے لیے خاص قسم کی جڑوں کا بنڈل لائی ہوں۔" پمبا نے اس سے کہا۔ "اور خوبصورت ہیٹ بنانے کے لیے کھال لے کر آئی ہوں، کارا کی۔"

کیلی نے ان کا شکریہ ادا کیا "لیکن سینگی سینگی کی کوئی خبر نہیں ہے؟" کیلی نے استفسار کیا "پیلی مشینیں جو جنگل کو ہڑپ کر رہی ہیں۔ سفید آدمی کی خبر جس کے بال گھنگھریالے ہیں؟ اور وہ عورت جس کے بال آگ کی طرح ہیں؟"

"عجیب خبریں ہیں۔" سی پو نے کہا "بڑا سفید آدمی سینگی سینگی سے بھاگ گیا ہے اور سرکاری آدمی نے پیری، میرے بھائی کو بڑا لالچ دے کر اسے مارنے پر آمادہ کر لیا ہے۔"

کیلی کی خوبصورت آنکھیں دہشت سے چوڑی ہو گئیں۔ "پیری اسے مارے گا؟"

"پیری اس کا سر الگ کر کے لے جائے گا۔" سی پو نے مزید بتایا۔

"تمہیں اسے روکنا ہے۔" کیلی اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے سی پو کو جھنجوڑا "اسے ہر حال میں روکنا ہے، اس آدمی کو یہاں لانا ہے۔ تم سن رہے ہو؟ جاؤ، جلدی کرو۔"

سی پو، کیلی کے ردِ عمل سے پریشان ہو گیا۔

"میں اس کے ساتھ جاؤں گی، کارا کی۔" پمبا نے اعلان کیا۔

"میں دیکھوں گی کہ یہ ٹھیک کام کرتا ہے یا نہیں... یہ بوڑھا ہو گیا ہے... راستے میں کوئی یار اس کو مل گیا تو یہ تمہاری بات بھول جائے گا۔"

"چلو بڑے میاں۔" پمبا نے اپنے شوہر کو ٹہوکا دیا۔

☆☆☆

پیری جنگل میں ایک گھٹنے پر جھکا زمین پر نشانات کھوج رہا تھا۔ "اسے پتا ہے، میں اس کے پیچھے ہوں۔" پیری نے ہچکچاہٹ کے ساتھ اپنے شکار کو سراہا "لیکن اسے کیسے پتا چلا؟"

پیری نے جھک کر کھرا بغور دیکھا جہاں اس کے شکار نے پانی چھوڑا تھا۔ سفید آدمی نے بڑی مہارت سے قدم کے نشان کو غائب کیا تھا... نہایت مبہم ایک آدھ نشان تھا جسے یہاں کا پیدائشی اور پیری جیسا کاریگر شکاری ہی تاڑ سکتا تھا۔

"ہاں، تم جانتے ہو میں تمہیں شکار کرنے آ رہا ہوں۔" پیری کی آنکھیں گھوم رہی تھیں۔ "لیکن تم نے کھوج کیونکر چھپائے، یہ کام صرف کوئی بمبوٹی ہی کر سکتا ہے۔" وہ بڑبڑایا۔

اس نے سوچا تھا کہ یہ ایک آسان شکار ہے، خصوصاً

جہاں ڈینیل نے زہریلی کائی کھائی تھی، وہاں پیری خوش تھا کہ اب اس کا شکار زیادہ دور تک نہیں جاسکے گا۔

اب تک وہ اپنے شکار کی رفتار سے دوگنی رفتار سے کھوج اٹھاتا آیا تھا۔ دوسرے دن شام سے ذرا پہلے وہ نسبتاً چٹیل خطے تک پہنچ گیا جہاں اس نے پہلی بار اپنے ذہین شکار کی جھلک دیکھی۔ اس کا رخ مغرب میں پہاڑوں کی طرف تھا۔ یہ جھلک ایک میل دور خفیف سی حرکت تھی۔ پہلی بار تو پیری کی تیز نگاہ بھی دھوکا کھا گئی۔ یہ کوئی آدمی نہیں ہے کم ازکم اس کا مطلوبہ شکار نہیں ہے... وہ ہیولا ایک بار پھر جنگل میں داخل ہوگیا تھا۔ اس وقت پیری کو احساس ہوا کہ وہ آدمی ہی ہے، وہ سر سے پیر تک کیچڑ سے ڈھکا ہوا تھا... سر پر شاخوں، پتوں اور چھال کی عجیب سی ٹوپی تھی جس نے اس کے سر کی ہیئت کو چھپالیا تھا۔

''ہاہا!'' پیری نے پیٹ سہلاتے ہوئے چٹخارا لیا، اسے مزہ آنے لگا تھا... اس کا شکار کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ ''تم زبردست ہو۔'' پیری نے سرگوشی کی ''تاریکی پھیلنے سے قبل میں بھی تم کو قابو نہیں کرسکتا... تمہارا شکار روشنی میں ہی ہوسکتا ہے... اور صبح میں تمہارا سر حاصل کرلوں گا۔''

صبح ہوتے ہی چوہے بلی کا کھیل پھر شروع ہوگیا۔ پیری اپنے شکار کی چالبازیوں سے زیادہ اس کی قوتِ مدافعت سے متاثر تھا کہ زہریلی کائی کھا کر بھی وہ اتنی دور تک آگیا تھا۔

بالآخر تین گھنٹے بعد زندگی اور موت کا کھیل ختم ہوگیا۔ وہ مہاگنی درختوں میں سے ایک کی جڑ میں پڑا تھا۔ اس کا جسم مردہ خشک پتوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ افریقا کے پستہ قامت موذی شکاری سے بچنے کی آخری اور ناکام کوشش... پیری سمجھا کہ اس کا شکار مرچکا ہے۔

پیری نہایت احتیاط سے اس کے قریب ہوتا جارہا تھا۔ چوڑے پھل کے چھرے کی دھار بلیڈ کے مانند تھی۔ چھرا پیری کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ پیری شکار کے سر پر پہنچ گیا... زخمی اور بیمار ڈینیل آرم اسٹرانگ زندہ تھا تاہم اس کی ہمت اور توانائی ختم ہوچکی تھی۔ اس کی سانسوں میں خرخراہٹ تھی... سر ایک جانب ڈھلکا ہوا تھا۔ پسینا نے اس کے چہرے اور گردن سے کئی مقامات پر کیچڑ ہٹا کر لکیریں سی ڈال دی تھیں۔

پیری نے قاتل چھرا دونوں ہاتھوں میں لے کر سر سے بلند کرلیا تھا۔ آرم اسٹرانگ کو پتا تھا کہ موت اس کے سر پر کھڑی ہے لیکن اس میں ہلنے کی بھی سکت نہیں تھی... حتیٰ کہ اس نے اپنے شکاری کو بھی دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

پیری فیصلہ کن وار کرنے سے قبل چند ساعت کے لیے ساکت ہوگیا۔ وہ ایک سچا شکاری تھا اور ہمیشہ اپنے شکار کو ہلاک کرتے وقت اداس ہوجاتا تھا۔ قبیلے کا عقیدہ تھا کہ شکار کی جان اور وقار قابلِ عزت ہوتا ہے۔ پیری ایک بہادر اور ماہر شکاری تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے شکار کی بہادری اور صلاحیتوں کا اعتراف کیا... پھر اس کا جسم تن گیا۔ اس کو محض ایک ہی وار کرنا تھا۔ اس کا خیال، ارادے کی شکل اختیار کرتا ہوا عمل کی آخری منزل میں داخل ہوگیا۔

معاً وہ ششدر رہ گیا... اس کی قوتِ عمل چھرے میں منتقل ہوچکی تھی۔ سیکنڈ کے ناقابلِ ذکر حصے میں ایک کوندا لپکتا تھا... لیکن یہ جان لیوا شرارہ اوپر سے نیچے نہیں آیا... سورج کی کرنیں چھرے کے چمکتے ہوئے پھل کی دھار سے ٹکرا رہی تھیں...

پیری کے عقب میں ایک مستحکم آواز ابھری... ''اپنا ہاتھ روک لو، میرے بھائی، یا میں اپنا زہریلا تیر تمہارے جگر کے پار کردوں؟''

پیری کا اپنی سماعت پر سے اعتبار اٹھ گیا۔ وہ اچھل کر پھرکی کی طرح ہوا میں ہی گھوما اور اپنے سوتیلے بڑے بھائی سی پو کو دیکھا۔ سی پو کی کمان کھنچ کر دہری ہوچکی تھی اور تیر کا پچھلا حصہ سی پو کے کان سے لگا تھا۔ تیر کی زہریلی نوک پیری کی طرف تھی۔ سی پو کا چھوٹا سا جسم ہتھیار سمیت حملے کی قطعی اور آخری پوزیشن میں تھا۔

''تم میرے بھائی ہو۔'' پیری کا منہ کھلا رہ گیا۔ ''تیر کو پرواز نہیں کرنے دینا۔''

افریقا کے بمبوٹی قبیلے کے دو خطرناک بونے مدِمقابل تھے... ستم بالائے ستم دونوں بھائی تھے۔

''پیری، مائی برادر، یقین کرو تم اس سے زیادہ احمق ہو جتنا میں سمجھتا تھا... کیا تم جانتے ہو یہ آدمی کارا کی کا دوست ہے... اس کے لہو کا ایک قطرہ بھی گرا تو میرا تیر فضا میں اپنا سفر پورا کرنے میں اتنی ہی دیر لے گا جتنی دیر میں تم پلک جھپکتے ہو۔''

''اور میں...'' پمبا درخت کے سائے سے نکل آئی۔ ''تمہارے تڑپتے جسم کے گرد ناچتے ہوئے گانا گاؤں گی۔''

''کارا کی؟'' پیری کو شرمندگی اور ذلت کا احساس ہوا۔ اسے ہرنام سنگھ پر بھی غصہ آیا۔

''ہاں کارا کی!!'' سی پو بولا۔

اب تو پمبا بھی سامنے تھی، وہ سی پو سے زیادہ پمبا کی عزت کرتا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پمبا نے موقع نہیں دیا۔ ''میری بات ختم ہونے سے پہلے یہاں سے نکل جاؤ۔''

''میں جارہا ہوں۔'' پیری کا سر جھکا ہوا تھا۔

ہرنام سنگھ نے اسے دھوکا دیا تھا۔ پیری کو یاد تھا کہ سنگھ نے سفید آدمی کے لیے شیطان صفت کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ کیلی وان بمبوٹی قبیلے کے لیے فرشتہ صفت تھی... اس کا دوست کوئی شیطان نہیں ہوسکتا تھا۔ پیری کے لیے سیدھی منطق بہت تھی ہرنام سنگھ کو سمجھنے کے لیے۔

پمبا نیم بے ہوش ڈینیل آرم اسٹرانگ کے پاس آئی۔ وہ گھٹنوں کے بل اس کے قریب جھکی اور تیزی سے اس کی حالت کا جائزہ لیا۔ آنکھوں کے کناروں اور ناک کے نتھنوں سے چیونٹیوں کو ہٹایا۔ ''کارا کی تک اسے زندہ پہنچانے کے لیے مجھے محنت کرنی پڑے گی۔'' پمبا کی آنکھوں میں تشویش تھی۔ ''اگر میں یہ نہ کرسکی تو میں کارا کی کے سامنے کبھی نہیں جاؤں گی۔''

جہاں ڈینیل لیٹا تھا وہاں سی پو نے تیزی سے ایک چھپر بنا دیا۔ پھر اس نے مچھروں کو بھگانے کے لیے آگ روشن کی... وہ بیٹھ کر اپنی بیوی کی کارگزاری کا مشاہدہ کررہا تھا۔ پمبا بمبوٹی قبیلے کی سب سے ماہر تجربہ کار حکیم نما چیز تھی... اس نے مہارت اور نرمی کے ساتھ ڈینیل کی پشت کے زخم پر کسی پودے کی جڑوں اور پتوں کا لیپ کیا۔ پھر اس نے خاص جڑی بوٹیوں کا عرق ایک خاص مقدار میں پلایا۔ تین گھنٹے میں ڈینیل کے حواس کام کرنے لگے۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور تعجب سے سیاہ فام بونوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے سواحلی زبان میں پوچھا ''تم کون ہو؟'' اس کی آواز میں نقاہت تھی۔

''میں سی پو ہوں، بمبوٹی کا مشہور شکاری۔''

''اور میں پمبا ہوں، اس کی بیوی اور میں بمبوٹی کی سب سے مشہور دروغ گو بھی ہوں۔'' پمبا نے قہقہہ لگایا۔ ڈینیل کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ رینگنے لگی۔

سی پو نے ناک بھوں چڑھائے تاہم بیوی، بیوی ہوتی ہے... چاہے افریقا کی ہو یا منجمد شمالی کی۔

اگلی صبح ڈینیل کو قلیل مقدار میں بندر کے گوشت کا ناشتا دیا گیا اور پمبا کی منتخب کردہ جڑی بوٹیاں بھی کھلائی گئیں۔

ڈینیل نے اندازہ لگالیا کہ یہ وہ شکاری نہیں ہے جو کتے کی طرح دو دن سے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا اور جس سے جان چھڑانے کے لیے اس نے انتہائی نامساعد حالات میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اس کو دیکھ سکا تھا نہ سی پو کو پہچانا تھا، اسے اتنا پتا تھا کہ وہ موت کے منہ میں سے نکل آیا ہے اور یہ دونوں اس کے خیر خواہ ہیں۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اسے احساس ہوگیا تھا کہ نامعلوم شکاری اس کے سر پر ہے اور موت کے سائے نے پوری طرح اسے گرفت میں لے لیا ہے۔ یہ ایک کرشمہ تھا کہ وہ ابھی تک زندہ تھا۔

ایک دن اور گزرا اور نامعلوم جڑی بوٹیوں کے کرشماتی اثرات نے ڈینیل کو کھڑا کردیا۔ جلد ہی اسے معلوم ہوگیا کہ وہ لوگ گونڈالا جانے کی تیاری کررہے ہیں، گونڈالا کے ساتھ اسے کیلی وان یاد آگئی۔

پُراسرار کارا کی کی شناخت کو ڈینیل غالباً دریافت کرچکا تھا تاہم وہ پمبا سے مزید سوالات کررہا تھا اور وہ جواب دے رہی تھی ''وہ بہت لمبے قد کی ہے'' پمبا نے بتایا۔ ڈینیل نے سوچا کہ بمبوٹی قبائلیوں کے لیے ہر غیر انسان بہت لمبا ہے... ''اور اس کی ناک اونچی نوک دار ہے۔'' پمبا نے مزید کہا۔ تمام بمبوٹیوں کی ناکیں چپٹی اور چوڑی ہوتی ہیں۔ پمبا جو نقشہ کھینچ رہی تھی وہ کسی بھی غیر بمبوٹی پر ثبت کیا جاسکتا تھا چنانچہ ڈینیل نے سوالات کا سلسلہ ترک کردیا۔

بمبوٹی عورت کی زبان بہت چلتی تھی جبکہ سی پو اس کے سامنے دبا دبا رہتا تھا۔ ڈینیل کی طاقت پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھی تاہم طبیعت بہتری کی طرف مائل تھی۔ کارا کی نے ان دونوں کو ڈینیل کی جان بچانے کے لیے بھیجا تھا۔ یعنی اسے کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ ڈینیل کہاں ہے اور اس کے پیچھے کون ہے... بہرحال گونڈالا پہنچنے تک ڈینیل نے سوچنا بند کردیا۔

اگلے دن وہ گونڈالا پہنچ گئے۔

''ڈینیل۔'' کیلی کے چہرے سے اطمینان اور خوشی چھلک رہی تھی۔

ڈینیل ابھی والان کے قدچے پر ہی تھا۔ وہ تقریباً پچاس فیصد پُرامید تھا کہ اس کی ملاقات کیلی سے ہی ہوگی۔ پھر بھی اس سے دوبارہ ملنے پر اسے ایک خوشگوار شاک محسوس ہوا۔

کیلی تازہ دم، توانا اور پُرکشش نظر آرہی تھی۔ ڈینیل نے محسوس کیا کہ کوئی چیز کیلی کے اندر ایسی ہے جو اس کے لیے الجھن کا باعث ہے۔

دونوں نے مصافحہ کیا ''میں پریشان تھی کہ شاید سی پو بروقت نہ پہنچ سکے... گاڈ... تمہاری حالت تو ٹھیک نہیں

ہے۔“

”شکریہ، کیلی۔“ وہ دھیمے سے مسکرایا۔

”آخر تمہارے ساتھ کیا ہوا؟“

”اس کا جواب دینے کے لیے مجھے کافی لمبی بات کرنی پڑے گی۔“ ڈینیل نے کہا۔

”اچھا تم اندر آؤ، مجھے تمہارا معائنہ کرنا ہے۔“

”کیا میں پہلے غسل نہ کرلوں؟ مجھے خود اپنے آپ سے گھن آرہی ہے۔“

وہ ہنسی۔ ”تمہاری ناک زیادہ تیز ہے لیکن میں مریضوں کے درمیان رہ کر عادی ہوگئی ہوں۔“

اندر لے جاکر کیلی نے اسے ٹیبل پر لٹادیا۔ کچھ دیر بعد وہ بولی۔

”ٹیمبا نے کافی اچھا کام کیا ہے۔“ میں تمہیں اینٹی بائیوٹک دوں گی پھر تم نہا کر لباس تبدیل کرلینا، تمہارے زخم پر ٹانکے لگنے چاہیے تھے لیکن اب بہت دیر ہوگئی ہے۔“

”تمہیں میرے بارے میں کیسے پتا چلا؟ تم نے سی پو کو کیوں مجھے بچانے کے لیے روانہ کیا؟ جبکہ گزشتہ ملاقات میں تم مجھ سے ناراض تھیں اور مجھے وضاحت کا بھی موقع نہیں دیا؟“ ڈینیل نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کرڈالے۔

”اور یہ کارا کی کیا بلا ہے؟“

”ہم دونوں کے پاس کہنے سننے کے لیے بہت کچھ ہے، میرے خیال میں ہمیں تھوڑا انتظار کرلینا چاہیے۔“ کیلی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”یہاں بسنے والے بھوٹی پیار سے مجھے کارا کی ہی کہتے ہیں۔“

”میری جان بچانے کے لیے تم نے جو کچھ کیا...“

”تو... بس خاموش... کیلی نے مسکراتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

ڈینیل کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بولا ”تم اوبوموو میں کیسے داخل ہوئیں؟ اور یہاں کیا کررہی ہو؟ اگر تقاری کو پتا...“

”تو تم تقاری کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہو، اس نے تمہیں بھیجا، میں سمجھی تھی...“

”اوہ نو، دوبارہ جھگڑا مت کرو۔“ ڈینیل نے التجا کی۔ ”میں ابھی نقاہت محسوس کررہا ہوں... اپنا دفاع نہیں کرسکوں گا۔“

”او۔کے، آؤ ڈنر کرتے ہیں۔ میرے پاس ایک سرپرائز ہے تمہارے لیے۔“ وہ پُراسرار انداز میں مسکرائی۔

”سرپرائز؟“ ڈینیل نے سوچا کہ وہ کبھی افریقا کے اس سفر کو بھلا نہ سکے گا... اگر وہ اس بار افریقا سے زندہ نکل گیا۔ اس کے دشمنوں کی تعداد بڑھ گئی تھی... چنگ، سنگھ اور اب ایفرم تقاری اور اس کی سفاک حکومت۔

”اچھا... اب کیا سرپرائز رہ گیا ہے؟“ اس نے سوچا۔

کیلی کے ساتھ ڈنر ٹیبل پر کوئی اکیلا بیٹھا تھا، جوان کی آمد پر کھڑا ہوگیا۔

”ڈاکٹر آرم اسٹرانگ کتنی خوشی کا موقع ہے کہ میں تمہیں دوبارہ دیکھ رہا ہوں۔“

ڈینیل عالمِ حیرت میں غوطہ زن سابق صدر کو تک رہا تھا۔

”میں نے سنا تھا، مسٹر پریذیڈنٹ کہ آپ دل کے دورے سے جانبر نہیں ہوسکے تھے یا پھر میرا خیال تھا کہ تقاری نے آپ کو شوٹ کردیا ہے۔“

”میری موت کی خبر کسی قدر مبالغہ آمیز تھی۔“ وکٹر اومیرو نے ڈینیل کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اوبوموو کو ہم آمریت سے آزاد کرائیں گے۔“ کیلی نے کہا۔

وکٹر نے ڈینیل کو بتایا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ وہ کیسے فرار ہوا؟ اور اب تک کیا کرتا رہا ہے؟

”کیلی کی مدد سے میں گونڈالا تک پہنچنے میں کامیاب ہوا... گونڈالا، تقاری کی آمرانہ بربریت کے خلاف مزاحمت کا مرکز ہے۔“

کیلی کے اکسانے پر اس نے مزید بتایا کہ تقاری ملک کے ساتھ کیا کررہا ہے... ڈینیل کے کردار کا ذکر بھی آیا...

”نہیں، کیلی۔“ ڈاکٹر ڈینیل نے قطع کلامی کی ”میرا کردار وہ نہیں ہے جیسا کہ سمجھا جارہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم اور پریذیڈنٹ اومیرو بھی اس بارے میں پُریقین نہیں ہو... ورنہ تم مجھے بچانے کی کوشش نہیں کرتیں... آپ دونوں سمیت دنیا جانتی ہے کہ میں افریقا سے عشق کرتا ہوں اور میری وابستگی بھی ڈھکی چھپی نہیں... اس بارے میں، میں نہیں سمجھتا کہ مجھے زیادہ دلائل دینے کی ضرورت ہے۔“ ڈینیل رکا اور دونوں کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ ”غلط فہمی میرے موجودہ اسائنمنٹ اور یونی کی وجہ سے شروع ہوگی۔“ اس نے کیلی کی جانب دیکھا ”میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے کام اور افریقا سے وابستگی

سے متاثر ہیں... یا نہیں۔“

جواب میں کیلی مثبت انداز میں مسکرائی تاہم خاموش رہی۔ وہ ڈینیل کی بات کے تسلسل کو جاری دیکھنا چاہتی تھی۔

”میں یہاں کے حالات سے کافی باخبر ہوں۔“ وہ پھر گویا ہوا ”اور تقریباً تمام غیر ملکی بااثر، طاقتور افراد سے واقف ہوں جو یہاں اپنے مخصوص مفادات کے لیے سرگرم ہیں... سر پیٹر ہیرسن کے لیے کام کرنے پر میں ذاتی وجوہ کی بنا پر آمادہ ہوا تھا... پھر اس نے جانی کے قتل اور چی داؤ پارک کی خون آشام واردات کے بارے میں بتایا نیز بعد کے واقعات پر بھی روشنی ڈالی۔ ”چنگ، سنگھ، ٹنگ ہیرسن اور تقاری سب نہ صرف مجھ پر شک کرتے ہیں بلکہ میرے خون کے پیاسے افراد کی تعداد اب تین ہوگئی ہے... آپ دونوں کو نکال کر...“ اس نے آخری بات کرتے وقت شرارت سے کیلی کو دیکھا۔ اومیرو اور کیلی دوستانہ انداز میں ہنس پڑے۔ پھر ڈینیل نے بتایا کہ تقاری کب اور کیوں اس کی جان کا دشمن بنا۔

”وہ کیسٹ اب کہاں ہے؟“ اومیرو نے سوال کیا۔

”برٹش ایمبیسی میں محفوظ ہے۔“

اومیرو اور کیلی نے تجسس کی نگاہ سے ڈینیل کو دیکھا اور اتفاق کیا کہ وہ ٹیپ تقاری کے خلاف ایک تباہ کن ہتھیار کی طرح ہے۔

”میں بے تکلفی سے بتانا چاہتا ہوں کہ تقاری اور اوبوموو میرا اصل مسئلہ نہیں ہیں، میں یہاں اپنے دیرینہ دوست کے حقیقی قاتل چنگ سے بدلہ لینے کے لیے موجود ہوں۔ یہ ایک اضافی بات ہے کہ چنگ افریقا کے لیے بھی ایک خطرناک وائرس کی طرح ہے۔ میرا فلم کنٹریکٹ تو ایک بہانہ ہے...“

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ کیلی کچھ شرمندہ نظر آرہی تھی۔ ”میں نے نیروبی سے نکلنے میں جلدی کی اگر میں تمہاری بات سن لیتی تو شاید کچھ تلخ واقعات ظہور پذیر نہ ہوتے... دراصل یونی کی باتوں نے مجھے شدید صدمہ پہنچایا تھا۔“

ڈینیل نے ہاتھ اٹھایا ”میں سمجھتا ہوں، وہ اندر سے اتنی بری نہیں ہے... اس کا اپنا ایک خاص مزاج ہے... اہم بات یہ ہے کہ وہ افریقا اور افریقیوں کو صحیح طرح نہیں جانتی حالانکہ میں نے اشارتاً اسے خبردار کیا تھا۔ پھر بھی ایک موقع پر اس نے مجھے مشتعل کردیا اور بات بگڑ گئی... میرے اندازے کے مطابق اسے اپنی حماقت کا احساس ہوگیا ہے۔ اگر وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر بروقت مجھے خبردار نہ کرتی تو بے خبری میں میرا خاتمہ وہیں سینگی سینگی میں ہوجاتا...“ ڈینیل نے ایک گہرا سانس لیا اور خاموش ہوگیا۔ کمرے میں سکوت طاری تھا۔ اس سکوت کا پردہ اومیرو نے چاک کیا۔

”ہمارے لیے حقیقتاً تمہارے پروجیکٹ کی اطلاع کسی صدمے سے کم نہیں تھی، تاہم یہ بھی سچ ہے کہ ہم دونوں ہی الجھن کا شکار تھے۔ ہمارا دل نہیں مانتا تھا کہ تم پیٹر اور تقاری کے ساتھ ہو... ہم اپنے دل کی آواز سے خوش ہیں۔“ ماحول یکسر بدل گیا۔

”ہی تا کہاں ایکشن کررہا ہے؟“

ڈینیل نے جگہ کی نشاندہی کی۔

”تقاری نے تمہیں بے وقوف بنایا ہے۔“ کیلی بھڑک اٹھی۔ ”تمہیں اعتماد میں لینے کے لیے اس نے چھوٹا شو دکھایا... اصل مائننگ آپریشن یہاں ہورہا ہے“ اس نے نقشے پر انگلی رکھی... ”وانگو میں پچاس میل پرے سینگی سینگی سے۔“

”یہ سینگی سینگی سے کس طرح مختلف ہے؟“ ڈینیل نے پوچھا۔

”مت بتاؤ، کیلی۔“ اومیرو نے مداخلت کی ”بہتر ہے کہ تم ڈینیل کو وہ جگہ دکھاؤ۔“ ایک لمحے کے لیے کیلی نے سابق صدر کو دیکھا پھر سرہلایا۔

”او۔کے۔“ اس نے اتفاق کیا ”ہم اس کی فلم بھی بنالیں گے، یہاں ہونے والی تباہ کاری اور بدمعاشیوں کے کئی ثبوت ہماری تحویل میں ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے میں اپنا کیمرا استعمال کروں گا... لیکن میرا کچھ سامان گاڑی میں ہے، مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ ڈینیل نے مشکل بیان کی۔

”اگر گاڑی اب بھی وہیں ہے تو سی پو تمہاری مدد کرے گا گاڑی تک پہنچنے میں۔“ کیلی نے کہا۔

☆☆☆

”میں اس کا سر لے آیا ہوں۔“ پیری نے ڈرامائی انداز میں اعلان کیا۔

اس نے کندھے پر سے بیگ اتارا اور کھول کر کھوپڑی ہرنام سنگھ کے سامنے لڑھکا دی۔ ہرنام سنگھ اچھل پڑا۔

”مجھے کیونکر پتا چلے گا کہ یہ اس آدمی کا سر ہے؟“ سنگھ کھوپڑی کو گھور رہا تھا۔

''یہ کئی دن پہلے مر چکا ہے... چیونٹیوں اور حشرات الارض کی وجہ سے اس کی شناخت ممکن نہیں ہے۔''

''تم نے اسے نہیں مارا؟'' سنگھ نے پوچھا۔

''نہیں۔'' پیری نے تسلیم کیا۔ اس احمق نے زہریلی کھمبی کھالی تھی... میرے پہنچنے سے پہلے یہ جنگل میں مر چکا تھا لیکن میں اس کا سر لے آیا اور یہی ہمارا سودا تھا۔''

پیری چار فٹ چھ انچ کے پورے قد سے سیدھا کھڑا تھا ''اب تم اپنا وعدہ پورا کرو۔'' پیری کو اندازہ تھا کہ یہ مشکل ہے لیکن اسے کم سے کم تمبا کو تو حاصل کرنا ہی تھا۔ یہ کھوپڑی اس نے ایک اجتماعی قبر سے حاصل کی تھی۔ ہی تا سیاہی غلام مزدوروں سے کام کرا رہے تھے اور مرنے والوں کو گڑھے میں پھینک کر مٹی ڈال دیتے تھے۔

ہرنام سنگھ الجھن کا شکار تھا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ یہ اسی کا سر ہے؟'' سنگھ کو بھی پر شک تھا لیکن دوسری طرف وہ تقاری اور چنگ کے سامنے اس امکان کا اظہار کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا کہ آرم اسٹرانگ فرار ہو گیا ہے۔

''یہ وہی آدمی ہے۔'' پیری اڑا ہوا تھا۔

ہرنام کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا ''اسے لے جا کر جنگل میں دفن کر دو۔''

''اور میرا انعام؟'' پیری نے اسے گھورا۔

''تم پورا سر نہیں لائے ہو، اس کے بال اور کھال بھی نہیں ہے۔'' ہرنام بولا۔ ''اس لیے میں تمہیں پورا معاوضہ نہیں دوں گا۔ البتہ ہاتھی دانت کا سودا جوں کا توں ہے۔''

پیری غصّے کے عالم میں غرایا اور اپنا چھرا نکالا۔ ''اسے ایک طرف رکھو، ورنہ میں تمہیں گولی بھی مار سکتا ہوں۔''

پیری نے چھرے کو ہوا میں گھمایا۔ ''میں ہاتھی کا دانت لاؤں گا۔'' اس نے کھوپڑی اٹھائی اور غائب ہو گیا۔ وہ بری طرح بپھرا ہوا تھا۔ ''پیری کو کوئی دھوکا نہیں دے سکتا۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''پیری دھوکا دینے والے کو مار دیتا ہے... تمہیں سر چاہیے، ایک ہاتھ کے آدمی... میں سر دوں گا... تمہارا اپنا سر!''

☆☆☆

''ڈینیل آرم اسٹرانگ ختم ہو چکا ہے۔'' ہرنام نے کہا ''بمبوٹی نے اس کا سر لا کر مجھے دکھا دیا ہے۔''

''کوئی شک؟'' تقاری نے تصدیق طلب کی۔

''بالکل نہیں۔'' اس نے یقین دہانی کرائی۔

''اس کا مطلب اب عورت صرف ایک زندہ گواہ بچی ہے۔'' چنگ نے سکون کی سانس لی ''اسے بھی فوراً فارغ کرو۔''

''تم اس ویڈیو ٹیپ کے بارے میں بھول رہے ہو، مسٹر چنگ...'' تقاری نے کہا۔

''نہیں میں نہیں بھولا... وہ سفارت خانے سے ٹیپ لے آتی ہے تو ہمیں چاہیے کہ ہم فی الفور اسے بھی اوپر پہنچا دیں۔'' چنگ نے کہا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا ''میں اس کا بندوبست کر دوں گا۔''

تقاری معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا ''اس کی اب میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رہی ہے... اس کے بعد وہ تمہاری ہوئی، لیکن کوئی غلطی مت کرنا۔''

☆☆☆

''ڈینی نے مجھے کہا تھا کہ وہ خود لفافہ واپس لے جائے گا۔'' مائیکل ہرگریو آفس کی کھڑکی کی طرف آیا۔ ''اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی کہ میں اس کی امانت کسی تھرڈ پارٹی کے حوالے کر دوں۔ تم میری پوزیشن سمجھ رہی ہو... میں... آہ۔ مس بونی۔''

بونی تیزی سے سوچ رہی تھی کہ اس کا اصرار اس کی شخصیت کو مشکوک بنا ڈالے گا... خالی ہاتھ جانے کی صورت میں وہ اپنے انجام سے بھی بے خبر نہیں تھی۔

''کیا تم شک کر رہے ہو کہ میں ڈینیل کی اسسٹنٹ نہیں ہوں۔'' اس نے احتیاط سے اپنی نسوانی کشش کو بھی استعمال کرنے کی کوشش کی۔ تاہم مائیکل پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔

''نہیں، میں جانتا ہوں کہ تم اس کے ساتھ کام کر رہی ہو...''

تاہم بونی نے اس کو اس حد تک قائل کر لیا کہ وہ رسید دینے کے لیے بھی تیار ہے۔

مائیکل نے ''او کے'' کہہ کر اس سے رسید پر اس کے دستخط لے لیے اور نیچے اس کا پاسپورٹ نمبر لکھوا لیا۔

☆☆☆

''ویل ڈن، مائی ڈیئر۔'' تقاری نے اسے اپنے قریب بٹھایا اور لفافہ کھول کر دیکھا۔ تقاری کا ہاتھ بونی کی ٹانگ پر تھا۔ اس نے کاجو کو حکم دیا کہ ریفریجریٹر سے شیمپین نکالے۔

کاجو نے سب سے پہلے بونی کا جام بھرا پھر چنگ اور تقاری کا...

''شکریہ مسٹر پریذیڈنٹ۔'' بونی نے جام

چڑھایا...

''میرے خیال میں ہمیں جھیل میں جشن منانا چاہیے۔'' تقاری بولا۔

''اچھی تفریح... ح... ہو... گی...'' معاً بونی کی زبان لڑکھڑائی۔ اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی مگر دیر ہو چکی تھی۔ اسے ان تینوں کی شکلیں بھی صاف نظر نہیں آ رہی تھیں۔ ''خدا حافظ، میری پیاری دوست'' یہ تقاری کے آخری الفاظ تھے جو وہ سن سکی... پھر اس کا سر ڈھلک گیا۔

کچھ دیر بعد چنگ کمرے میں اکیلا تھا۔ وہ سرخ بالوں والی سرو قامت بے ہوش بونی کو عجیب ہیجانی انداز میں دیکھ رہا تھا۔ ''آہ، مس بونی۔'' وہ بولا ''تمہارے مرنے سے پہلے ہم کچھ دلچسپ تجربات کریں گے۔''

☆☆☆

سی پو اور ڈینیل جلد ہی بے تکلف ہو گئے تھے۔ سی پو نے اس کا نام ''کواکو'' رکھ دیا تھا جس کا مطلب تھا ''وہ جس کو میں نے بچایا'' ڈینیل نے نام قبول کر لیا تھا۔

وہ دونوں رات سے قبل منزل تک پہنچ گئے تھے تاہم جنگل میں اس وقت داخل ہوئے جب تاریکی نے اپنے پر پھیلا لیے تھے۔

گاڑی اسی جگہ موجود تھی اور ایکسل تک نباتاتی زمین میں دھنسی ہوئی تھی۔ کیمرا اور بیٹریز کام نہیں کر رہی تھیں تاہم ڈینیل نے تمام ضروری اشیا سمیٹ لیں۔ کچھ سی پو کے حوالے کیں، کچھ خود سنبھالیں۔ گونڈالا پہنچ کر ڈینیل نے سب سے پہلے اومیرو کی مدد حاصل کی۔ وہ جانتا تھا کہ اومیرو ایک اچھا الیکٹریکل انجینئر ہے۔

اومیرو نے بیٹری کی خامی دور کر کے اسے چارج پر لگایا، کیمرے اور لینس کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ کیمرے سے الجھ گیا... ایک اڑا ہوا ٹرانسسٹر اس نے تلاش کر لیا۔

چوبیس گھنٹوں میں ویڈیو ریکارڈر بھی پوری طرح کام کر رہا تھا۔

☆☆☆

کیلی اور ڈینیل کے علاوہ آٹھ بمبوٹی تھے جن میں سی پو اور پمبا بھی تھے۔ گیارھویں شخصیت خود ڈوکٹر اومیرو کی تھی۔ تیسرے دن وہ خون رنگ دریا تک پہنچ گئے۔ سب خاموش اور سنجیدہ تھے۔ پمبا کی قینچی کی طرح چلتی زبان بھی تالو سے لگی ہوئی تھی۔

ڈینیل نے پانی میں ہاتھ ڈالا پھر سونگھ کر کیچڑ آلود سرخ پانی کو جھٹک دیا۔

''یہ کیا ہے کیلی؟''

''ریجنٹ۔''

''ریجنٹ؟''

''سنکھیا، جس کے بارے میں تقاری نے تمہیں بتایا تھا کہ اس کے استعمال کا تو سوال نہیں پیدا ہوتا۔'' کیلی نے جواب دیا۔

ڈینیل نے بے یقینی سے اسے دیکھا ''یہ پاگل پن ہے؟''

''یقیناً۔'' کیلی نے اتفاق کیا ''یہ ایک قاتل حریص گروہ ہے جو اوبوموکی زمین، جنگلات اور جنگلی حیات کو برباد کر رہا ہے... اصل ہولناک قصہ تو تم وانگو میں دیکھو گے۔''

چھوٹی سی سفاری نے رخ وانگو کی طرف پھیر لیا۔ وہ لوگ دریا کی مخالف سمت جا رہے تھے۔

وہ اس مقام تک پہنچ گئے جہاں ان کی سماعت سے بھاری مشینوں کی آوازیں ٹکرا رہی تھیں۔ دریا کا پانی شہد کی طرح گاڑھا تھا۔ یہ خوفزدہ کر دینے والی سرخی مائل زہریلی کیچڑ تھی۔ جنگل خاموش تھا، جیسے نوحہ کناں ہو... کوئی بندر، جانور یا پرندہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بمبوٹی بھی خاموش تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سب لوگ جنگل کی طرح خاموش آواز میں سوگ منا رہے ہوں۔

بھاری مشینیں چند سو میل دور تھیں اور گارڈز کی موجودگی کے باعث وہ مزید آگے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

سی پو کی رہنمائی میں وہ جتنا قریب جا سکتے تھے، چلے گئے۔ کیلی اور پمبا نے ایک خاص درخت منتخب کیا۔ یہ قبیلے کے مقدس درختوں میں سے ایک تھا۔ بمبوٹی بندروں کی طرح غیر معمولی چوڑے تنے پر چڑھ کر نچلی شاخوں تک پہنچ گئے۔ پھر انہوں نے گھنے درخت میں سے رسی کی سیڑھی نیچے لٹکائی۔ کیلی، اومیرو اور عقب میں ڈینیل نے سیڑھی پر قدم رکھا۔ ویڈیو ریکارڈر اس کے کندھوں پر لٹک رہا تھا۔ وہ درخت کے پھیلاؤ اور اونچائی کا صحیح اندازہ کرنے سے قاصر تھا۔ اس نے بمشکل نیچے جنگل کے نباتاتی قالین کو دیکھا اور اندازہ کیا کہ اس سے قبل وہ کسی جگہ پر اتنا اونچا نہیں گیا تھا۔

دفعتاً ان کے سر سورج کی روشنی میں آ گئے۔ وہ چوٹی پر پہنچ چکے تھے جہاں سے وہ اطراف میں دور دور تک دیکھ سکتے تھے۔ بعض کی چیخیں نکل گئیں۔ منظر بھیانک خواب کے جیسا تھا۔ شمال میں جنگل ہی غائب تھا۔ سیکڑوں، ہزاروں

برس قدیم بلند و بالا درختوں کی جگہ چٹیل میدان تھا۔

"یہ بھیانک تباہ کاری ہے۔" سب سے پہلے اومیرو کی رنجیدہ آواز ابھری۔

"تخمینہ لگانا ممکن نہیں ہے۔" کیلی نے کہا۔ "انہیں کام کرتے ہوئے محض چند مہینے ہوئے ہیں... اگر ایک سال یہ عفریت..." وہ خاموش ہوگئی... سی پو رو رہا تھا۔

ڈینیل نے یونٹ نمبر ایک کی زرد دیوہیکل مشینوں کو شمار کیا... آٹھ... نو... دس!

ڈینیل کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اس نے کندھوں پر کیمرا سنبھالا اور ٹیلی فوٹو لینس کو فوکس کرنے لگا۔ وہ پورے دھیان سے فلم بنا رہا تھا۔ وہ کوئی اہم منظر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ برہنہ او بالی مزدوروں کے غول کام کر رہے تھے... گارڈز ان کے سروں پر مسلط تھے... ڈینیل کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ سب معاً جیسے ایک ہی بندھن میں بندھ گئے تھے۔ سب کے جذبات کم و بیش ایک جیسے تھے۔

یہ مشینوں کی آوازیں نہیں تھیں بلکہ موت کا گیت تھا... کٹنگ، کھدائی، گرج، گڑگڑاہٹ، انجنوں کی غراہٹ، مٹی کی شکل میں زہریلی موت نکال کر پھینکی جا رہی تھی۔

تاریکی چھانے لگی تو فلڈ لائٹس نے دن دوبارہ اگا دیا۔ ایک سسٹم کے تحت کام دن رات جاری تھا۔

واپسی کے سفر میں ان لوگوں کو ایک جگہ رکنا پڑا۔ ہاتھی کے قدموں کے نشان تھے، یہ عام ہاتھی نہیں تھا... کچھ چیخیں بلند ہوئیں...

"کیا بات ہے، سی پو؟" کیلی نے سوال کیا۔

"خون۔" اس نے جواب دیا۔ "ہاتھی کا خون، کوئی یہاں ہاتھی کا شکار کر رہا ہے۔"

بمبوٹیوں کے نزدیک وہ مقدس زمین پر تھے اور ان کے قاعدے، قانون، روایات میں کہیں بھی کسی قسم کے شکار کی اجازت نہیں تھی۔

وہ سب خوفزدہ اور مشتعل تھے۔ جلد ہی سی پو نے شکاری کا کھرا اٹھا لیا۔ قدم کا مدھم نشان بہت چھوٹا تھا۔ نامعلوم شکاری بمبوٹی تھا... خوفناک، جنگل کے خدا کی بے حرمتی، وہ سب ایک جگہ اکٹھے ہوگئے۔

"میں اس کو جانتی ہوں۔" یمبا کی چیخ بلند ہوئی۔ "یہ پیری کے کھوج ہیں۔" اس نے اعلان کیا۔ بمبوٹیوں نے اپنے چہرے ہاتھوں سے ڈھانپ لیے۔ پیری اپنی ہی مقدس زمین کو خون سے رنگ رہا تھا جس کا عذاب سب پر نازل ہوگا...

☆☆☆

پیری تین دن سے دیوہیکل نل ہاتھی کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ جب وہ ہاتھی تک پہنچا تو وہ کھڑے کھڑے ایک درخت کے نیچے سو رہا تھا تاہم اس نے پیری کی موجودگی کو محسوس کر لیا۔ اس کے پنکھے جیسے کان پھیل گئے لیکن ہاتھی کچھ سننے میں ناکام رہا۔ پیری ایک ماسٹر شکاری تھا۔ اس کا سارا بدن ہاتھی کے گوبر میں لتھڑا ہوا تھا اور انسانی جسم کی بو ختم ہو گئی تھی... اچانک ہاتھی نے عجیب سی آوازیں نکالنی شروع کر دیں جو اس کے پیٹ اور حلق کے آہنگ سے پیدا ہو رہی تھیں۔ یہ "ہاتھی کا گیت" تھا۔

جنگل میں "ہاتھی کا گیت" دوست یا دشمن کی موجودگی کے احساس کے لیے تھا۔ یہ ہاتھیوں کے درمیان کمیونی کیشن کا بھی ذریعہ ہوتا ہے۔

اپنی پناہ گاہ میں پیری نے دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر منہ اور ناک پر رکھا، ہوا اپنے پیٹ تک کھینچ لی پھر جو آواز اس کے حلق سے برآمد ہوئی وہ "ہاتھی کا گیت" تھا... ہاتھی کے گیت کا انداز بدل گیا۔ وہ دوسرے ہاتھی کی نادیدہ موجودگی کو ٹیسٹ کر رہا تھا۔ اس نے کان پھڑپھڑائے اور مطمئن ہوگیا۔ وہ شاخوں اور جھاڑیوں کو ہٹاتا ہوا اپنے نادیدہ ساتھی کی طرف بڑھا۔

پیری نے دیکھا کہ اس کے مڑے ہوئے دانت پیری کی کمر جتنے موٹے تھے۔ پیری بے حس و حرکت لکڑی کے ٹکڑے کی طرح لیٹ گیا۔ ہاتھی اس کے سر پر تھا اور پیری اس کی موٹی کھال کی سلوٹیں تک دیکھ سکتا تھا۔ اس نے جو دھاری دار بھاری تیر تیار کیا تھا وہ اس کے قد سے دوگنا تھا لیکن پیری جانتا تھا کہ یہ تیر ہاتھی کی کھال، ہڈی یا پسلیوں کے پنجرے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا... ظاہر ہے پھر وہ کیسے ہاتھی کے دل یا پھیپھڑوں تک پہنچتا؟

پیری گیند کی طرح لڑھک کر ہاتھی کے پیٹ کے نیچے آگیا۔ اس نے تیر کمان سنبھال کر نیچے سے اوپر کی طرف حملہ کیا... پیری کا نشانہ ہاتھی کی جانگھ کا مخصوص زاویہ تھا... جہاں تیز دھار تیر کی زہریلی انی نے اپنا راستہ بنا لیا اور ہاتھی کے مثانہ تک جا پہنچا... بلیڈر پھٹ گیا، ہاتھی کی اذیت ناک چنگھاڑ بلند ہوئی۔ بھاگنے سے قبل ہاتھی نے اپنی کمر کو جھٹکا۔ اسے ابھی تک دوست یا دشمن کوئی بھی نظر نہیں آیا تھا۔ وہ اندھادھند چنگھاڑتا ہوا دوڑ پڑا۔

پیری اوسط رفتار سے اس کے پیچھے گیا لیکن اس نے ایک شکاری جیسا ہیجان اور لذت محسوس نہیں کی... اس کی

جگہ ایک مکروہ جرم کے احساس نے لے لی تھی، اس کا دل مسرت سے خالی تھا۔

پیری کو ہاتھی دوسرے دن صبح ملا۔ وہ گھٹنوں کے بل تھا، اگلی ٹانگیں مڑ کر پیٹ کے نیچے چلی گئی تھیں۔ اس کا بھاری بھرکم سر ایک طرف مہیب دانت کے سہارے ٹکا ہوا تھا۔ ہاتھی کی آنکھیں کھلی تھیں۔ رات کی بارش نے اس کو دھو ڈالا تھا، جس کے باعث وہ زندہ دکھائی دیتا تھا۔

پیری غیر معمولی احتیاط سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے لمبی نازک سی شاخ سے ہاتھی کی آنکھ کو چھوا تاہم ہاتھی کی پلک نہیں جھپکی۔ کھیل ختم ہوگیا تھا۔

پیری احساسِ جرم کے باعث اذیت ناک بے قراری میں مبتلا تھا۔ نامعلوم خوف کے سائے اسے گھیر رہے تھے۔ اس نے سر جھٹک کر نیام سے اپنا مخصوص چھرا نکالا اور ہاتھی کے دانتوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ یہی وقت تھا جب بمبوٹی اس کے سامنے آگئے۔ انہوں نے شکار اور شکاری کے گرد دائرہ بنا لیا تھا۔

پیری کے ہاتھ سے چھرا گر گیا۔ وہ کھڑا ہوگیا۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ اپنے لوگوں سے نظر ملاتا۔

"میں اپنے قیمتی انعام میں سے سب بھائیوں کو حصہ دوں گا۔" وہ بمشکل بول پایا۔

کسی نے جواب نہیں دیا۔ ماحول پر مرگ آسا سکوت طاری تھا۔ ایک ایک کر کے سب لوگ وہاں سے چلے گئے، سی پو رہ گیا۔

"تم جو کچھ کر چکے ہو اب جنگل کا خدا ہم سب کے لیے "مالیمو" کو بھیجے گا۔"

پیری بے بس اور مایوس کھڑا تھا، اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ سی پو وہاں سے کب گیا؟

☆☆☆

"مالیمو آرہا ہے..." یہ آواز پورے جنگل میں پھیل گئی۔ سی پو نے ڈینیل کو پکارا۔ ڈینیل اپنے کیمرے کے ساتھ سی پو کے پیچھے جا رہا تھا۔ ڈینیل اب جنگل کے سفر میں کافی رواں ہوگیا تھا اور سی پو سے پیچھے نہیں تھا۔

وہ دونوں اکیلے چلے تھے لیکن کونے کھدروں سے بمبوٹی نکل نکل کر ان کے ساتھ شامل ہو رہے تھے، ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ "مالیمو" کے مسکن کی طرف رواں دواں تھے۔ وہ منزل پر پہنچے تو وہاں پہلے ہی بہت سے بمبوٹی موجود تھے۔

جنگل کی گہرائی میں بہت تناور درخت کے گرد بمبوٹی

انقلاب

میں نے ایک فوڈ چین کے مینیو میں دیکھا کہ میرے لیے چکن نگٹ موزوں تھے۔ وہ چھ، نو یا بارہ کی تعداد میں خریدے جا سکتے تھے۔

میں نے کاؤنٹر پر نوعمر لڑکے سے کہا۔ "نصف درجن نگٹ دے دو۔"

اس نے معذرت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "سر! ہم صرف چھ، نو اور بارہ دیتے ہیں... نصف درجن نہیں مل سکتے۔"

"ٹھیک ہے... پھر چھ دے دو۔" میں نے دل ہی دل میں اس انقلاب کا ماتم کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

مسز ڈ کا اپنا کریڈٹ کارڈ بار بار کمپیوٹر ڈرائیو میں ڈال اور نکال رہی تھیں اور سخت الجھن کا شکار تھیں۔ اتفاقاً میں پہنچ گئی۔ وہ اسی افتاد میں گرفتار رہیں تو پتا چلا کہ وہ انٹرنیٹ پر آن لائن خریداری کر رہی تھیں۔ اسکرین پر کریڈٹ کارڈ نمبر مانگا جاتا اور وہ اپنا کریڈٹ کارڈ سلاٹ میں اسی طرح ڈال دیتیں جیسے اے ٹی ایم مشین میں ڈالا کرتی تھیں۔ ان کا "انٹرنیٹ شاپنگ" کا شوق پورا نہیں ہو رہا تھا۔

☆☆☆

خاتون کو گاڑی کے قریب افسردہ اور پریشان دیکھ کر میں رک گیا اور مدد کی پیشکش کی۔

انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "گاڑی کا ریموٹ کئی دنوں سے گڑبڑ کر رہا تھا۔ اب اچانک جواب دے گیا ہے۔ گاڑی کے دروازے نہیں کھل رہے۔ مکینک بہت دور ہے۔ گاڑی چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتی۔"

میں نے ریموٹ سمیت کی چین لی اور چابی سے دروازہ کھولا تو خاتون کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"اب کہیں بھی رک کر ریموٹ کا سیل بدلوا لیں۔"

کراچی سے نہال علی کا مشورہ

آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ڈینیل بھی ان میں شامل ہو گیا۔ وہ فلم بنا رہا تھا۔

''یہ مالیمو کا گھر ہے۔'' سی پو نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ''ہم لوگ اسے لینے آئے ہیں۔''

کسی نے ''گریوی'' کا نام پکارا۔ ایک ببوٹی کھڑا ہوا اور درخت کی بنیاد کے قریب چلا گیا۔ کسی دوسری سمت سے پھر نام پکارا گیا اور اس مرتبہ سی پو کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر میں درخت کی جڑ میں پندرہ بیس ببوٹی کھڑے نظر آئے۔ اچانک سی پو نے ایک چیخ بلند کی اور سب درخت پر چڑھنے لگے۔ ذرا سی دیر میں وہ گھنے درخت میں نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

وہ واپس آئے تو ان کے پاس پندرہ فٹ طویل بانس تھا۔ ڈینیل کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ ''یہ مالیمو ہے؟'' ڈینیل نے حیرت سے سی پو کے کان میں سرگوشی کی۔ ''ہاں، کواکو، یہ مالیمو ہے۔'' اس نے تصدیق کی۔

''مالیمو کیا ہے؟'' ڈینیل کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''مالیمو جنگل کی آواز ہے۔'' سی پو نے کہا۔ ''یہ ہمیشہ رہنے والے ماں اور باپ کی آواز ہے لیکن اس آواز کو سننے کے لیے ضروری ہے کہ مالیمو کو پانی پلایا جائے۔''

منتخب افراد مالیمو کو ٹھنڈی میٹھی چھوٹی ندی تک لے گئے اور اسے پانی میں ڈبو دیا۔ ببوٹی تالاب کے کنارے حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ مالیمو ایک گھنٹے تک جنگلی ندی کا میٹھا سرد پانی پیتا رہا۔ پھر وہ اسے کنارے پر لے آئے۔ مالیمو چمک رہا تھا۔ اس سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔

ڈینیل نے بغور جائزہ لیا۔ یہ خشک ٹیوب نما بانس پتا نہیں کتنے برس قبل کاٹا گیا تھا... اس پر انوکھی اشکال بنی ہوئی تھیں... اور مختلف جانوروں کے نقوش کھدے ہوئے تھے۔

سی پو نے بانس کے کھلے منہ سے منہ لگا دیا۔ گہرا سانس لینے سے اس کا سینہ پھول گیا اور مالیمو نے بولنا شروع کیا... ناقابلِ یقین، صاف میٹھی آواز ٹیوب سے خارج ہو رہی تھی... جیسے کوئی کمسن دوشیزہ جنگل میں نغمہ سرا ہو... معاً آواز تبدیل ہو گئی... کسی چوپائے کی چیخ تھی جو جال میں پھنس گیا ہو... منتخب افراد باری باری ٹیوب نما بانس سے ہونٹ لگاتے رہے اور آوازیں بدلتی رہیں... جنگل کے ہر جانور، ہر پرندے... ہر چیز کی آواز مالیمو کے اندر سے برآمد ہو رہی تھی...

ڈینیل کے کان اور آنکھیں مالیمو کے اسرار کے گواہ تھے... آخری آواز ہاتھی کی تھی... دہشت ناک اور غضبناک... ببوٹی مکھیوں کی طرح مالیمو کے گرد جمع ہو گئے... بانس ان کے درمیان غائب ہو گیا، تاہم ہاتھی کی غضبناک چنگھاڑ ابھی تک بلند ہو رہی تھی۔

پھر ایک اور انوکھا، سحر انگیز منظر وجود میں آیا... ببوٹیوں کا وسیع جتھا... تمام کے تمام اپنی انفرادی شناخت سے محروم ہو رہے تھے اور ایک مہیب عفریت کے مانند نظر آ رہے تھے... وہاں اب صرف ایک ہی وجود رہ گیا تھا... مالیمو... اس کے سیکڑوں پیر، آنکھیں اور ہاتھ تھے... مالیمو غصے میں تھا، وہ سیکڑوں ٹانگوں پر اِدھر اُدھر اچھل رہا تھا... پھر اس کا رخ قبیلے کی طرف ہو گیا۔ بچے کھچے ببوٹی جن میں عورتوں اور بچوں کی تعداد زیادہ تھی، چیخ رہے تھے... بھاگ رہے تھے... کوئی جھونپڑی میں چھپ رہا تھا، وہ جانتے تھے کہ مالیمو آ رہا ہے۔

جھونپڑیوں کے دروازے بند ہو رہے تھے۔ مالیمو سامنے آنے والی ہر شے کو روندتا ہوا بستی کے بعید ترین کونے کی طرف جا رہا تھا جہاں پیری کی جھونپڑی تھی۔ اس کی بیویاں باخبر تھیں کہ مالیمو آ رہا ہے، وہ جنگل میں نکل گئیں۔ پیری کہیں نہیں بھاگا نہ وہ دوسرے ببوٹیوں کے ساتھ مقدس درخت تک گیا تھا۔

پیری گھٹنوں کے بل جھونپڑے میں پڑا تھا۔ اس نے سر بازوؤں میں چھپایا ہوا تھا۔ وہ انتظار کر رہا تھا۔ مالیمو نے پیری کی جھونپڑی کا چکر لگایا۔ اچانک ہیبت ناک عفریت نے حملہ کیا اور جھونپڑی کا نام و نشان مٹا دیا... اس نے تمبا کو سمیت پیری کی ہر چیز تباہ کر دی۔ پیری کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

اب پیری، مالیمو کی زد میں تھا۔ نہ اس نے مزاحمت کی نہ اٹھ کر بھاگا۔ منٹوں میں وہ لہولہان ہو گیا۔ اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے... پسلیاں کریک ہو گئیں، سر پھٹ گیا... جسم، ٹانگوں اور ہاتھوں پر ان گنت زخم آئے۔

دفعتاً مالیمو، پیری کے پاس سے ہٹ گیا۔ اس کی آواز تبدیل ہو گئی جس میں غصے کا عنصر ناپید تھا... وہ جنگل کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی آواز دور ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی۔

پیری بمشکل اٹھا۔ اس نے صرف تیر کمان لیا اور لنگڑاتا ہوا جنگل کی طرف چلنے لگا۔ وہ تنہا تھا۔ اس کی بیویاں اس کے ساتھ نہیں تھیں۔ وہ بیوہ ہو چکی تھیں۔ انہیں اب قبیلے میں نئے شوہر تلاش کرنے تھے۔

پیری اپنے قبیلے کے لیے ہمیشہ کے لیے مر گیا تھا۔ پھر اسے دوبارہ کسی نے نہیں دیکھا...

☆☆☆

''کیا تم ہماری مدد کرو گے؟'' وکٹر اومیرو نے ڈینیل سے پوچھا۔

''ہاں، میں کروں گا... میں بندوبست کروں گا کہ یہ ٹیپس لندن، نیویارک، پیرس وغیرہ میں ٹیلیویژن پر دکھائی جائیں۔'' ڈینیل نے جواب دیا۔

''میرا مطلب کچھ اور تھا، مائی سن۔''

''میں اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہوں؟''

''میری اطلاعات کے مطابق تم ایک اچھے سپاہی ہو، کیا تم آزادی کی جنگ میں ہمارا ساتھ دو گے؟''

''میں سپاہی تھا۔ بہت پرانی بات ہے۔'' ڈینیل نے تصحیح کی۔

''ایک ظالمانہ اور ناحق جنگ سے میں نے جنگ کے خلاف نفرت سیکھی۔''

''ڈینیل میں تم سے حق کی خاطر جنگ کی بات کر رہا ہوں۔ میں تم سے آمریت کے خلاف لڑنے کے لیے پوچھ رہا ہوں۔'' اومیرو نے کہا۔

''میں اب سولجر نہیں بلکہ صحافی ہوں وکٹر، یہ میری جنگ نہیں ہے۔''

''یہ تمہاری جنگ ہے۔'' وکٹر نے تصحیح کی۔ ''یہ ہر اچھے آدمی کی جنگ ہے۔''

ڈینیل نے فوراً جواب نہیں دیا۔ اس نے کیلی کی طرف دیکھا اور محسوس کیا، کیلی اس کی جانب سے مثبت جواب کا انتظار کر رہی ہے۔ اس نے دوبارہ وکٹر کی جانب دیکھا۔ بوڑھا آدمی جھک کر اس کے قریب ہو گیا۔

''ہم اوبالی پُرامن لوگ ہیں... یہی وجہ ہے کہ ہم جنگی حربوں سے ناآشنا ہیں اور اتنی صلاحیت نہیں رکھتے کہ نقاری سے اوبوموکی جان چھڑا سکیں۔ ہمیں ہتھیاروں کی ضرورت ہے... تربیت کی ضرورت ہے۔ پلیز، ڈینیل مدد کرو، میں تمام بہادر جوان فراہم کروں گا اگر تم ان کو کمانڈ کرنے کی حامی بھر لو۔''

''میں نہیں چاہتا...'' ڈینیل نے بات شروع کرنی چاہی تاہم وکٹر نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''فوراً انکار مت کرو، آج کی رات کوئی بات نہ کرو... سو جاؤ اور خواب میں اوبوموکی بربادی کے مناظر پھر دیکھو... پھر صبح مجھے جواب دو۔'' وکٹر کھڑا ہو گیا۔

''کیا کرو گے تم؟'' کیلی نے نرمی سے سوال کیا۔

''مجھے نہیں پتا... مجھے واقعی نہیں پتا۔'' وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ ''میں کل بتاؤں گا، جیسا کہ وکٹر نے مشورہ دیا ہے۔ مجھے بستر پر جانا چاہیے۔''

''ہاں۔'' کیلی بھی اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

''شب بخیر۔'' ڈینیل نے کہا۔ وہ ڈینیل کے بہت قریب کھڑی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا... ڈینیل نے اس کے احمریں ہونٹ چوم لیے... کیلی نے سر چند انچ پیچھے ہٹایا اور بولی۔

''آؤ میرے ساتھ'' ڈینیل اس کی خواب گاہ میں چلا گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح... ابھی تک جھٹپٹا تھا۔ وہ دونوں مچھر دانی کے اندر بستر پر تھے۔ کیلی کی گرم سانسیں ڈینیل کی گردن سے ٹکرا رہی تھیں۔ ڈینیل نے محسوس کیا کہ وہ بھی بیدار ہو چکی ہے۔

''میں وکٹر کا ساتھ دوں گا۔''

کیلی چند لمحوں تک خاموش رہی پھر بولی۔ ''یہ رشوت نہیں تھی۔''

''کیلی، میں جانتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''رات جو کچھ بھی ہوا، یہ ہمارے درمیان ایک الگ معاملہ ہے۔'' کیلی نے کہا ''میں جب پہلی بار تم سے ملی تھی تب سے اس رات کی منتظر تھی۔''

''میں ایک عرصے سے تمہارا منتظر تھا، کیلی۔ میں جانتا تھا کہ تم یہیں کہیں ہو، بالآخر میں نے تمہیں پا لیا۔''

''میں تمہیں اتنی جلدی کھونا نہیں چاہتی۔'' کیلی نے اپنا سر اس کے فراخ سینے پر رکھ دیا۔ ''پلیز جلد واپس آنا۔''

''ہنی، میں پوری کوشش کروں گا۔'' ڈینیل نے اس کی خوبصورت آنکھوں میں نمی دیکھی اور پہلی مرتبہ اس کا نام نہیں لیا۔ کیلی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ایک شفاف موتی اس کے آتشیں رخسار پر پھسل گیا۔

''ڈینی... ی...'' اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

ڈینیل نے اسی دن گونڈالا چھوڑ دیا۔ سی پو اور چار ببوٹی اس کے ہمراہ تھے۔ جنگل کے کنارے وہ رکا اور پلٹ کر دیکھا۔ کیلی مکان کے کمپاؤنڈ میں کھڑی تھی، اس نے ہاتھ لہرایا۔ وہ کسی نوجوان دوشیزہ کی طرح لگ رہی تھی... ڈینیل نے دل سے دل کا رابطہ محسوس کیا... اسے پانے کے بعد وہ اتنی جلدی نہیں جانا چاہتا تھا۔ ڈینیل نے ہاتھ لہرایا اور

پھر اپنا رخ پھیر لیا۔

وہ مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے بلند پہاڑ تک پہنچ گئے جو سطح سمندر سے بارہ ہزار فٹ بلند تھا۔ بمبوٹیوں نے کمبل نکالے جو کیلی نے فراہم کیے تھے تاہم یہ کمبل اتنے مفید نہیں تھے۔ جب وہ لوگ بلند ترین درے تک پہنچے تو ڈینیل نے اپنے ساتھیوں کو واپس بھیج دیا۔ سی پو نے بحث کرنا چاہی ''کواکو میرے بغیر تم راستہ کھو دو گے۔''

''وہاں اوپر دیکھو۔'' ڈینیل نے چوٹی کی طرف اشارہ کیا، جو بادلوں کے اندر سے جھانک رہی تھی... چمکیلی سفید۔ ''وہاں بہت ٹھنڈ ہے، کسی بمبوٹی کو اس سے واسطہ نہیں پڑا... یہ سرد آگ ہے جو تم لوگوں کو جلا دے گی...''

آگے کا سفر ڈینیل نے اکیلے طے کیا۔ اس کی جیکٹ میں بیش قیمت اور تباہ کن فلمیں موجود تھیں۔ اس کو رواٹو گوفا نامی گلیشیئر تک پہنچنا تھا۔

سی پو سے جدا ہونے کے بعد وہ گلیشیئر کو عبور کر کے زائر کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کا ایک پنجہ اور تین انگلیاں فراسٹ بائٹ کا شکار ہو چکی تھیں۔

☆...☆...☆

ڈینیل اسٹوڈیو میں اَن تھک کام کر رہا تھا۔ اس مصروفیت نے بونی کے لیے اس کی اُداسی کو ایک طرف کر دیا۔ بہرحال اس نے عین وقت پر اس کی جان بچائی تھی۔ اس کی نادانی اور ناتجربہ کاری اسے لے ڈوبی۔ درحقیقت اس کا آغاز اسی وقت ہو گیا تھا جب وہ سر پیٹر ہیرسن کے جال میں پھنسی تھی۔

اڑتالیس گھنٹوں میں ڈینیل نے پہلی فلم تیار کر لی۔ ضروری نہیں تھا کہ سواحلی مکالموں کو انگریزی میں ڈب کیا جائے...

ڈینیل ہالینڈ پارک میں تنگ ہیرسن کی کوٹھی کے قریب ایک کار سے ٹیک لگائے اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہ خوش قسمت تھا، اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تنگ کی رولز رائس کوٹھی سے نکلتی نظر آئی تو ڈینیل نے اطمینان سے اسے روک لیا۔

''آرم اسٹرانگ... ڈینی؟'' تنگ کا استعجاب مصنوعی نہیں تھا۔ ''میں نے سنا تھا کہ تم اوبوموں میں غائب ہو گئے ہو؟''

''جھوٹ تھا، تنگ... تمہیں میرے پیغامات نہیں ملے، میں نے کوئی چھ مرتبہ تمہارے آفس فون کیا؟''

''مجھے نہیں معلوم، میں دیکھوں گا۔''

''میرے پاس تمہیں دکھانے کے لیے کچھ ہے جو میں اوبوموسے لایا ہوں۔'' ڈینیل نے بتایا۔ ''اور یہ مصالحہ تمہیں اور بوس دونوں کو ڈبونے کے لیے کافی ہے۔''

تنگ کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ ''یہ تو دھمکی معلوم ہوتی ہے؟''

''صرف ایک دوستانہ مشورہ۔''

''ٹھیک ہے، اندر آجاؤ۔'' تنگ نے دروازہ کھولا۔

''دیکھتے ہیں تم کیا لائے ہو؟'' کار میں خاموشی چھا گئی... چیختی ہوئی خاموشی۔

تنگ ڈیسک کے پیچھے براجمان تھا اور فلم دیکھ رہا تھا... فلم ختم ہونے کے بعد اس نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے اسے دوبارہ دیکھا۔ بعدازاں اس نے ڈینی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''ظاہر ہے اس کی مزید نقول بھی ہوں گی؟''

''بچکانا سوال ہے۔'' ڈینیل نے کہا۔

''تو یہ براہِ راست دھمکی ہے؟''

''ایک اور بچکانا سوال۔'' ڈینیل نے پھر کہا۔

''تو تم اسے لے کر پبلک میں جا رہے ہو؟''

''تین اور ہیں قطار میں۔'' ڈینیل نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اور یقیناً میں پبلک میں جاؤں گا۔ صرف ایک چیز مجھے روک رہی ہے اور وہ ہے ایک ڈیل جو ہمارے درمیان ہو جائے۔''

''تم کیا ڈیل پیش کرتے ہو؟'' تنگ نے نرمی سے پوچھا۔

''میں تمہیں وقت دوں گا کہ تم اس اسکینڈل سے نکل جاؤ... اور میں تمہیں وقت دوں گا کہ اوبوموں میں تمہارے جو بھی مالی مفادات ہیں، وہ تم لکی ڈریگن کو فروخت کر دو یا کسی اور کو...''

تنگ نے فوراً جواب نہیں دیا تاہم ڈینیل نے اس کی آنکھوں میں اطمینان کی مدھم سی چمک دیکھ لی۔ تنگ نے گہری سانس لی... ''تمہیں کیا دینا پڑے گا؟''

''اس کے بدلے تم تقاری حکومت کے خلاف اومیرو کی جوابی کارروائی میں سرمایہ لگاؤ گے... یعنی جوابی بغاوت میں۔ یہ تمہارے لیے کوئی نئی بات نہیں ہوگی... افریقا میں ایسا بارہا ہو چکا ہے۔''

''اس پر میرے کیا اخراجات آئیں گے؟''

''بہت کم، اس نقصان کے مقابلے میں بہت معمولی جو تمہیں فلموں کی ریلیز پر اٹھانا پڑے گا۔ تیس منٹ میں ایک کاپی دفترِ خارجہ کو جائے گی، دوسری نقل امریکی سفیر

کو... زیادہ سے زیادہ چھ بجے تک بی بی سی پر تمام مصالحہ جات کی نمائش ہو رہی ہو گی۔''

''پھر بھی کتنا؟'' تنگ نے اصرار کیا۔

''پانچ ملین کیش سوئس اکاؤنٹ میں، فوراً۔''

''تمہارے دستخط؟''

''اور کاؤنٹر سیکنڈری اومیرو!''

''اس کے علاوہ؟''

''زائر کا صدر تمہارا دوست ہے لیکن تقاری کا نہیں... تم اس سے اومیرو یا میرے حوالے سے بات کرو گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ اوبوموں میں سرحد پار اسلحے کی ترسیل میں خفیہ راہداری فراہم کرے۔''

''بس یا اور کچھ؟''

''یہی بہت ہے۔'' ڈینیل نے سر ہلایا۔

''میں راضی ہوں۔'' تنگ نے کہا ''اکاؤنٹ نمبر دو۔''

''مسکراؤ تنگ، تمہارا کچھ بھی نہیں گیا۔'' ڈینیل کھڑا ہو گیا۔ ''اومیرو آنے کے بعد تمہارے لیے اچھا ثابت ہو گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے لیے کسی اچھے سودے پر راضی ہو جائے گا... مناسب وقت آنے پر۔''

ڈینیل کے جانے کے بعد اس نے وقت دیکھا اور تائی پے میں تنگ ہنگ سوئی کا ذاتی نمبر ملانے لگا... وہ اپنا اوبوموڈیولپمنٹ کارپوریشن کا شیئر لکی ڈریگن کو بیچنے جا رہا تھا۔

☆☆☆

تین مہینے گزر گئے اور ڈینیل ایک بار پھر رواٹو گوفا گلیشیئر پر تھا۔ اس مرتبہ وہ تمام ضروری لباس اور اشیا سے لیس تھا۔ علاوہ ازیں اس کے ساتھ پورٹرز بھی تھے۔ یہ کانجو قبیلے کے لوگ تھے جو زیادہ تر اس پیشے سے وابستہ تھے اور کوہ پیمائی کی سختیوں سے نمٹنے کی نسلی صلاحیت رکھتے تھے۔ گلیشیئر والا معاملہ ان کے لیے ایک آسان کام تھا۔ اصل چیز وزن تھا جو انہوں نے اٹھایا ہوا تھا۔

ان کی تعداد 650 تھی اور ہر ایک نے چالیس کلو کی پیکنگ اٹھائی ہوئی تھی۔ کل 26 ٹن، پیٹیوں میں اسلحہ تھا۔ اے کے 47، یوزی، RPD لائٹ مشین گن، RPG راکٹ لانچرز، M26 گرینیڈز...

یہ سارا تباہ کن اسلحہ اور ہتھیار کیش ملتے ہی بہت شارٹ نوٹس پر حاصل کر لیے گئے تھے اور ڈینیل حیران تھا کہ تنگ نے اسلحہ ڈیلرز کے نام اور نمبر... ریفرنسز کے ساتھ بلا حیل و حجت فراہم کر دیے تھے۔

ڈینیل نے حساب لگایا تھا کہ چار انسٹرکٹرز کافی ہیں۔ یہ چار اس نے زمبابوے سے منتخب کیے تھے اور سب اس کے ساتھ پہلے بھی لڑائی میں حصہ لے چکے تھے، ان میں کوئی بھی سفید فام نہیں تھا۔ گروپ کا لیڈر سابق سارجنٹ میجر مور گن تھا۔

بونی کی جگہ دوسرا کیمرا مین شوراچ تھا۔ یہ بھی سیاہ فام ساؤتھ افریقن تھا اور بی بی سی کے لیے کام کرتا تھا۔

☆☆☆

سی پو اسے مقررہ جگہ پر ملا۔ سب سے پہلے اس نے کاراکی کا پیغام ڈینیل کو دیا۔

''کاراکی نے اپنا دل بھیجا ہے۔'' اس نے بتایا ''وہ کہتی ہے کہ وہ اور انتظار نہیں کر سکتی۔''

ڈینیل کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ جدائی اور ملن کے اوقات میں دل کی دھڑکن اپنی چال بدل لیتی ہے۔

سی پو کے ساتھ اگلے پڑاؤ پر وکٹر اومیرو کا بھتیجا پیٹرک اومیرو اوبالی جوانوں کے ساتھ موجود تھا تاکہ کانجو کوہ پیماؤں کو فارغ کر دیا جائے...

ڈینیل کی پارٹی اب گونڈالا کی طرف جا رہی تھی۔ کیلی کا پیغام ملنے کے بعد ڈینیل اپنی رفتار پر قابو نہیں رکھ پا رہا تھا۔ دل ایک الگ ہی تال پر دھڑک رہا تھا... یہ تیسری تال تھی... جدائی اور ملن... کے درمیانی وقفے کی تال۔

مال بردار ٹیم پیچھے رہ گئی، ڈینیل اور سی پو آگے نکل گئے تھے۔

اومیرو اور کیلی کو اطلاع مل چکی تھی... کیلی وہیں رک کر انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بے قراری سے جنگل کے تنگ راستے پر سفر شروع کر دیا... اس پگڈنڈی پر ڈینیل کا قافلہ آ رہا تھا۔

ایک موڑ مڑتے ہی دفعتاً دونوں نے خود کو ایک دوسرے کے سامنے پایا... دونوں کھڑے رہ گئے... وہ ایک دوسرے کو تک رہے تھے... آنکھیں بول رہی تھیں، زبان خاموش تھی۔ ڈینیل دھڑکنوں کی چوتھی چال دریافت کر رہا تھا۔

بالآخر کیلی نے ڈینیل کے چہرے سے نظر ہٹائے بغیر میٹھی میٹھی آواز میں کہا ''سی پو، جاؤ... دور جاؤ... بہت دور...!''

سی پو کی آنکھوں میں خوشی کے رنگ تھے۔ وہ کھلکھلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

کیلی روتے ہوئے ڈینیل سے لپٹ گئی۔ ڈینیل نے اسے اپنے چوڑے سینے میں جذب کرلیا۔
''کیا ہوا؟''
''اتنی دیر...؟''
''کتنی؟''
''بہت!''
''نہیں۔''
''ہاں، ہاں، ہاں۔ں ں۔ں...''
''اچھا، سوری۔''
''نہیں۔''
''سزا؟''
''ہاں!''
''منظور ہے۔'' ڈینیل نے اس کے پھول جیسے بدن کو گود میں اٹھالیا۔

☆☆☆

ڈینیل کی غیر حاضری میں وکٹر اومیرو نے جنگل کے کنارے گونڈالا کی آبشار سے دور نیا ہیڈ کوارٹر تشکیل دیا تھا۔ یہ جگہ آسمان سے جائزہ لینے پر نظروں میں نہیں آسکتی تھی۔

وہ ڈینیل کے ساتھ چند فٹ بلند ڈائس پر بیٹھا تھا۔ مزاحمت کاروں کے لیڈروں سے ڈینیل پہلی بار مل رہا تھا۔ ان کی تعداد 38 تھی۔ زیادہ تر اوہالی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں چھ بااثر ہی تابھی تھے جنہوں نے نقاری کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے وکٹر کو قیمتی معلومات فراہم کی تھیں، ان میں سے دو آرمی میں اعلیٰ پوزیشن پر رہے تھے۔ تیسرا ایک سینئر پولیس آفیسر تھا، بقیہ تین سینئر سرکاری ملازم تھے۔ یہ تینوں ٹرانسپورٹ اور ٹریول کے لیے پرمٹ اور لائسنس فراہم کرسکتے تھے۔

ڈینیل نے جو پلان تیار کیا تھا، اس کے لیے یہ چھ ہی تا افراد اہم کردار ادا کرسکتے تھے۔

ابتدا میں کچھ اعتراضات اٹھے کہ فلم کیوں بنائی جا رہی ہے تاہم وکٹر کی مداخلت اور وضاحت کے بعد شوراچ کی موجودگی کو بھلا دیا گیا اور وہ بے فکری سے اپنا کام کرتا رہا۔

ڈینیل نے اپنے چار ملٹری انسٹرکٹر کے تعارف سے میٹنگ کا آغاز کیا۔ چاروں میں سے باری باری ایک کھڑا ہوتا اور ڈینیل ماضی میں ان کی فوجی کارکردگی اور بائیو ڈیٹا پڑھ کر سناتا۔ چاروں متاثر کن تھے لیکن سارجنٹ میجر مورگن کے کارہائے نمایاں اور شخصیت کو سب نے مرعوب کن پایا۔

''اس کے علاوہ یہ چاروں ہزاروں لڑاکا افراد کو تربیت دے چکے ہیں۔ ہم پہاڑوں سے جو ہتھیار لائے ہیں، یہ ان کا استعمال سکھائیں گے۔'' ڈینیل نے اومیرو کی جانب دیکھا ''تمہارے پاس کتنے آدمی ہیں؟''
''پندرہ سو۔''
''بہت اچھے۔'' ڈینیل نے سراہا۔

اسٹاف کانفرنس تین دن تک جاری رہی۔ آخری سیشن میں ڈینیل نے پھر خطاب کیا۔

''ہمارا منصوبہ سادہ ہے جس میں غلطی کا امکان کم سے کم رہ جاتا ہے۔ تمام کارروائی دو اصولوں پر مشتمل ہے نمبر ایک ہمیں سرعت کے ساتھ حرکت کرنی ہے۔ نمبر دو سرپرائز ہمیں مہینوں نہیں بلکہ ہفتوں کے اندر تیار ہو جانا ہے۔ ہم یہیں پر اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو ملیں گے۔ تب تک میں اور پریذیڈنٹ اومیرو تفصیلی منصوبہ تیار کر چکے ہوں گے۔ اس دوران میں ٹریننگ کیمپ میں ہدایات آپ لوگوں کو اپنے اپنے انسٹرکٹر سے ملیں گی... گڈلک۔''

☆☆☆

پیری بیک وقت غیظ وغضب اور الجھن کا شکار تھا۔ اس کی مایوسی اور نفرت کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ مہینوں سے وہ جنگل میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ وہ کسی سے بات بھی نہیں کرسکتا تھا۔

اچانک ایک دن اس نے ایک ناقابلِ یقین چیز دیکھی۔ جنگل کی گہرائی میں ایک کیمپ تھا جہاں سیکڑوں مسلح افراد تربیت میں مصروف تھے۔ پیری دنگ رہ گیا۔ سب سے انوکھی بات یہ تھی کہ وہ لوگ ہی تا نہیں بلکہ اوہالی تھے۔ اسے پھر ہرنام سنگھ یاد آیا جو اسے تمبا کو فراہم کرسکتا تھا۔ وہ سنگھ سے نفرت کرتا تھا کیونکہ اس نے پیری کو دھوکا دیا تھا، جھوٹ بولا تھا۔

اگلے دن ہی اس نے ہرنام سنگھ کی تلاش شروع کر دی۔

پیری سخت غصے میں تھا، اس پر آفتیں سنگھ ہی کی وجہ سے آئی تھیں۔

کئی دن بعد اس کا رابطہ ہرنام سے ہوگیا۔
''مجھے تمبا کو چاہیے۔''
''میرا کام ہوگیا؟'' ہرنام نے پوچھا۔
''میرے پاس ایسی چیز ہے کہ تم ہاتھی کو بھی بھول جاؤ

گے اور میرے اس تحفے کو کبھی بھلا نہیں پاؤ گے۔"

"ایسی کیا چیز ہے؟"

"ہاتھی دانت کچھ بھی نہیں ہے، اس کے سامنے۔" پہلے تمبا کو دو۔"

"تمبا کو جتنا چاہو گے، ملے گا۔" ہرنام سنگھ کا اشتیاق بھڑکنے لگا۔ "وہ چیز کہاں ہے؟ کتنی دور ہے؟"

"میرے ساتھ آؤ، زیادہ دور نہیں ہے، اتنی قیمتی چیز تم نے پہلے نہیں دیکھی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے، چلو۔" ہرنام راضی ہوگیا۔

پیری آہستہ چل رہا تھا۔ جنگل کے گھنے ترین حصے میں اس نے ایک بڑا چکر لگایا اور ایک ہی دریا ہرنام کو دو مختلف سمتوں سے دکھایا۔ ہرنام سنگھ اب پوری طرح بھٹک چکا تھا۔ وہ اندھوں کی طرح سیاہ فام پودنے کے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ دو گھنٹے بعد تھکن اور پیاس سے ہرنام سنگھ کی حالت غیر ہوگئی۔ "اب ہم کتنی دور رہ گئے ہیں؟"

"بس تھوڑی دور۔" اسے وہی سابقہ جواب ملا۔

"میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔" وہ ایک گرے ہوئے تنے پر بیٹھ کر سانس درست کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ پیری غائب ہے۔ اس نے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا۔ وہ اس کا عادی تھا۔

"واپس آجاؤ۔" وہ زور سے بولا مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ تنہا بیٹھے ہوئے اسے کافی دیر ہوگئی تھی۔ اس نے کئی مرتبہ پیری کو آواز دی۔ ہر مرتبہ اس کی آواز میں خوف کا عنصر بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی بدحواسی عروج پر پہنچ گئی... "پلیز پیری، آجاؤ... جو مانگو گے میں تمہیں دوں گا۔" جواب میں اسے ایک قہقہہ سنائی دیا۔ وہ کھڑا ہوگیا اور آواز کی سمت بڑھا۔

"پیری۔" وہ منت سماجت پر اتر آیا لیکن قہقہہ مخالف سمت سے بلند ہوا۔ ہرنام اس طرف بھاگا۔ وہ ہانپ رہا تھا، پسینے سے تر تھا، قہقہے کی آواز دور ہونے لگی... وہ پاگلوں کی طرح بھاگا جیسے کسی تتلی کا پیچھا کر رہا ہو... اس کی پگڑی کھل کر گر گئی۔ وہ رو پڑا۔ لگتا تھا، درخت قہقہے لگا رہے ہیں، آواز بار بار سمت بدل رہی تھی... وہ گر پڑا۔ اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ اچانک جنگل سائیں سائیں کرنے کا سکوت... "پلیز۔" اس نے سرگوشی کی۔

پیری دو دن تک دور رہ کر اس کی نگرانی کرتا رہا تھا۔ ہرنام سنگھ کمزور ہوگیا تھا... نیم پاگل دکھائی دے رہا تھا، تیسرے دن دفعتاً پیری اس کے سامنے آگیا۔

سنگھ شاک کی حالت میں چلّایا "اب مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جانا۔"

"تمہاری طرح میں بھی تنہا ہوں۔" پیری نے نفرت سے کہا۔ "میں مر چکا ہوں۔ مالیمو نے مجھے مار دیا ہے۔ تم ایک مردہ آدمی سے بات کر رہے ہو... بھوت سے۔ تم اس آدمی کے بھوت سے رحم کی توقع کر رہے ہو، جسے تم نے قتل کیا۔"

پیری نے کمان پر تیر چڑھایا جس کی انّی پر سیاہ رنگ کا زہر لگا تھا۔ ہرنام منہ پھاڑے احمقوں کی طرح اسے دیکھ رہا تھا... پیری نے کمان سیدھی کی جو کھنچ کر اس کی ٹھوڑی سے جا لگی۔

"نہیں!" سنگھ دہشت سے چلّایا۔

پیری نے تیر چھوڑ دیا، زہریلا تیر ہرنام کی پسلیوں میں گھس گیا۔

"اب ہم دونوں مردہ ہیں۔" پیری یہ کہہ کر غائب ہو گیا۔

ہرنام سنگھ تیر پکڑ کر چیختا رہا۔ زہر کی وجہ سے اسے ناقابلِ بیان اذیت ہو رہی تھی۔ زہر کا اثر تیز تر تھا۔ ہرنام سنگھ کی آواز دھیمی پڑتی گئی پھر معدوم ہوگئی۔

جنگل پھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔

☆☆☆

"ہم تیار ہیں۔" ڈینیل نے دھیرے سے کہا لیکن اس کی آواز گونڈالا کے ہیڈ کوارٹر میں ہر فرد نے سنی۔ وہ سب وہی لوگ تھے جو ایک مہینے قبل اکٹھے ہوئے تھے۔

"وہ اب لڑاکا جوان ہیں۔" مورگن نے ڈینیل کو بتایا۔

"تم نے اچھا کام کیا ہے، قلیل مدت کے باوجود۔" ڈینیل بلیک بورڈ کی جانب متوجہ ہوگیا جس پر شیڈول اور اشکال بنی ہوئی تھیں۔ "یہ ہمارا میدانِ جنگ ہے، چار یونٹ ہیں اور چار ٹارگٹ۔ مرکزی آرمی بیرک، دوسرا ایئر فیلڈ، تیسرا لیبر کیمپ اور چوتھا ہاربر۔ ہر یونٹ کے الگ ٹارگٹ اور مقاصد ہیں۔"

"سب سے اہم بات یہ ہے کہ کاہالی کے ریڈیو اور ٹیلیویژن اسٹوڈیوز محفوظ رہیں۔ تفاری کے جنگجو زیادہ تجربہ کار نہیں بلکہ فطرتاً جنگجو ہیں۔ ہمارے لیے ابتدائی چند گھنٹے نہایت اہم ہیں۔ ہمیں یہ امید نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم طویل جنگ لڑ کر جیت سکتے ہیں، جو کچھ کرنا ہے وہ ابتدائی چند گھنٹوں میں کرنا ہے، کسی مرحلے پر بدحواسی کی ضرورت نہیں، سکون، اعتماد اور پھرتی سے اپنا اپنا کام کرنا ہے۔ پریذیڈنٹ اومیرو دارالحکومت جائیں گے اور اعلان

براڈکاسٹ کریں گے، جیسے ہی عوام کو پتا چلے گا کہ وہ زندہ ہیں اور تحریک کو لیڈ کر رہے ہیں تو ایک بہت بڑی تعداد اٹھ کھڑی ہوگی۔ اتنی بڑی تعداد کو تفاری کے جنگجو بھی نہیں کچل سکتے، اس طرح ہم گیم جیت لیں گے۔

"ایک اور شرط نہایت اہم ہے بلکہ فیصلہ کن ہے وہ یہ کہ ہم حملے کے پہلے گھنٹے میں تفاری کو گرا لیں۔ تفاری کے بغیر وہ بری طرح مار کھا جائیں گے۔ آخر میں کہوں گا آج سونے سے پہلے دعا کرنا نہ بھولیں، میں پیشگی فتح کا یقین دلاتا ہوں۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہوگا۔" اومیرو نے کہا۔

"ہاں، تفاری ایک بہت ہی کمینہ اور سخت حریف ہے۔ وہ کسی روٹین کو عادت نہیں بناتا لیکن ایک عادت اس کے اندر پختہ ہو چکی ہے۔ وانگو میں کان کنی کا آپریشن دیکھنے مہینے میں ایک بار ضرور آتا ہے، زمین کی گہرائیوں سے نکلتے خزانے دیکھنے کے لیے۔ وانگو دوسرے علاقوں سے کٹا ہوا ہے اور "شکار" کا کمزور حصہ ہے۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ میجر نشووا نے اچھی انٹیلی جنس کا مظاہرہ کیا ہے۔" اس نے اپنے قریب کھڑے ہی تا آفیسر کو دیکھا "نشووا، تفاری کی ذاتی ٹرانسپورٹ کی ذمے داری سنبھالتا ہے۔ اس نے اطلاع دی ہے کہ تفاری نے حکم دیا ہے کہ پیوما ہیلی کاپٹر کو پیر کے روز یعنی چودہ تاریخ کو تیار رکھا جائے، مطلب یہ کہ پیر کے دن بہت زیادہ امکان ہے کہ وہ وانگو معائنے کے لیے آئے گا، ہمارے پاس پانچ دن ہیں فائنل تیاری کے لیے۔"

☆☆☆

ننگ چنگ فضائیہ کے پیوما میں تفاری کے برابر بیٹھا تھا اور کھڑکی سے باہر کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"ہرنام سنگھ کی خبر؟" تفاری اس کے کان کے قریب چیخا۔

"کچھ نہیں۔" وہ جواباً چیخا "ہمیں اس کی گاڑی مل گئی تھی تاہم اس کا کوئی پتا نہیں، دو ہفتے ہو گئے ہیں، خیال غالب ہے کہ آرم اسٹرانگ کی طرح جنگل میں ہلاک ہو چکا ہے۔"

"وہ اچھا تھا۔" تفاری چیخا "کم وقت میں اس نے اچھی کارکردگی پیش کی تھی۔ اس کے غائب ہونے سے پیداوار اور منافع کا گراف گرا ہے۔"

"میں دیکھ رہا ہوں۔" چنگ نے تفاری کو بہتری کی یقین دہانی کرائی۔ ہمیشہ کی طرح سفر کے دوران میں تفاری کے ساتھ ایک لڑکی تھی، بی تا لڑکی کاہالی نائٹ کلب کی گلوکارہ تھی۔ صدارتی گارڈ بھی ساتھ تھے۔ بیس چھاتا بردار فوجی اور

کاجو، یونی کی ہلاکت کے بعد کاجو کی ترقی ہوگئی تھی۔

☆☆☆

ڈینیل پیوما کو اترتے دیکھ رہا تھا۔ نشووا کی اطلاع درست تھی۔ ڈینیل مہاگنی درخت کی چوٹی پر شاخوں میں چھپا ہوا تھا۔ لینڈنگ پیڈ سے فاصلہ تین سو بیس گز تھا۔ تمام لوازمات کے ساتھ وہ رات ہی اس درخت پر گھات لگا چکا تھا۔

اس کا لباس مکمل کیموفلاج تھا۔ چہرے پر ماسک موجود تھا۔ اس کی اسنائپر سات ایم ایم کی ریمنگٹن میگنم تھی۔ ڈینیل نے نرم نوک والی بڑی گولیوں کا انتخاب کیا تھا۔

اوبومو ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے چیف ایگزیکٹو آفیسر کی حیثیت سے چنگ کی موجودگی لازمی تھی۔ پہلی گولی تفاری کے لیے اور دوسری چنگ کے لیے۔ لیکن پہلی گولی کے بعد جو ہلچل مچتی تھی، اس دوران ایک لمحاتی چانس بنتا تھا چنگ کے لیے۔

ڈینیل کے تصور میں جانی اور چی واؤ نیشنل پارک کے مناظر ایک بار پھر ابھرنے لگے۔ اس کے سینے میں ایک شعلہ بھڑکا۔ وہ درحقیقت چنگ کی وجہ سے اوبومو آیا تھا۔ دوسری گولی اسی کا حصہ ہے۔ ڈینیل نے فیصلہ کیا۔

منصوبے کے مطابق وکٹر اومیرو پہلے ہی کاہالی پہنچ چکا تھا۔ دو یونٹ اس کے ساتھ تھے۔ یعنی پانچ سو جوان۔ اومیرو منتظر تھا۔ "اسٹرائیک" کا، اشارہ ملتے ہی اسے ریڈیو اور ٹی وی پر قوم کو مخاطب کرنا تھا۔

اسی دوران میں باقی دو یونٹ وانگو اور سینگی سینگی کے لیے صف آرا کیے گئے تھے، جن کا پہلا کام تفاری کے بی تا جوانوں کا صفایا کرنا اور لیبر کیمپ کے تیس ہزار افراد کو آزاد کرانا تھا۔

ڈینیل کی گولی کے ساتھ اس لڑائی کا آغاز ہونا تھا... فوراً ہی ریڈیو کے ذریعے کاہالی میں اومیرو اور پیٹر پیرسن کو اطلاع مل جانی تھی۔

☆☆☆

پیوما کنکریٹ سے بنے پیڈ پر اترا۔ ڈینیل کی رائفل کا دستہ اس کے رخسار کے ساتھ ٹکا تھا۔ وہ ٹیلی اسکوپ سائٹ میں گھور رہا تھا جہاں اسے چہروں کے تاثرات تک نظر آرہے تھے۔ اس نے نشانہ لیا، فلائٹ انجینئر سامنے تھا... اس کے پیچھے کندھے پرے تفاری کا سر ابھرا۔

ہیلی کاپٹر کی حرکت، ڈینیل کی اپنی دھڑکن اور مرتعش ہاتھ... شاٹ کو ناممکن بنا رہے تھے، لیکن وہ اپنی تمام تر توجہ، ذہنی ارتکاز اور قوتِ ارادی تفاری پر لگا رہا تھا۔ اس

نے زبردستی خود پر ایک پیشہ ور قاتل کا سرد خول چڑھایا۔

عین اسی لمحے بارش کا پہلا قطرہ اس کی گردن سے ٹکرایا۔ اس کا نشانہ لرزا، دوسرا قطرہ ٹیلی اسکوپ کے لینس پر لگا... بارش شروع ہو رہی تھی۔ ڈینیل کی بصارت متاثر ہوئی، کسی نے رنگین چھتری نکالی... دیگر افراد بھی صدر کو بارش سے بچانے کے لیے لپکے۔

ڈینیل اپنی کوشش میں مصروف تھا کہ معاً چھتری درمیان میں حائل ہوگئی۔ اتنے میں ننگ چنگ بھی نمودار ہوا اور ڈینیل کی توجہ بٹ گئی۔ اس نے زاویہ ننگ چنگ کی جانب بدل دیا... ''نہیں۔'' اس نے خود کو روکا۔ تفاری کو ترجیح حاصل تھی۔ اس نے ٹیلی اسکوپ میں پھر تفاری کو دیکھا... خوش آمدید کہنے والوں نے صدر کو چھپالیا تھا۔

ہی تاسل کے چھاتا فوجی جست لگا کر باہر آرہے تھے، وہ صدر کے گرد گھیرا ڈال رہے تھے اور لوگ لینڈ روور کی جانب بھاگ رہے تھے۔ تفاری پھر نظر آنے لگا۔ وہ اگلی گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ یہ ایک ناممکن شاٹ لگ رہا تھا۔ اس کی تمام حسیات ایک آنکھ میں سمٹ آئیں... ٹریگر پر دباؤ بڑھ گیا۔ عین اسی ساعت میں ایک ہی تا باڈی گارڈ اپنے آقا کی مدد کے لیے دوڑا۔

ڈینیل نے اسے چکر کھا کر گرتے دیکھا۔ جو گولی تفاری کے پھیپھڑے میں گھسنی تھی، وہ باڈی گارڈ کے سینے پر لگی۔

تفاری نے چھتری کی آڑ لی اور گاڑی کی طرف لپکا... اس کے اطراف میں موجود افراد الجھن کا شکار ہو گئے اور اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔

ڈینیل نے دوسرا فائر کیا۔ کچھ نہیں ہوا۔ گولی صاف خطا گئی۔ تفاری بھاگ رہا تھا، اس سے قبل کہ ڈینیل ایک اور کوشش کرتا۔ وہ گاڑی تک پہنچ گیا۔

تفاری نے دروازہ کھول کر خود کو گاڑی کی اگلی نشست پر پھینک دیا۔ ایک اور فائر... ایک اور فوجی زمین بوس ہوگیا... سپاہی جنگل کی طرف دوڑ رہے تھے۔ وہ ابھی تعین نہیں کر سکے تھے کہ گولیاں کہاں سے آرہی ہیں۔

ڈینیل نے ایک اور کوشش کرنا چاہی مگر تفاری کی گاڑی چل پڑی۔ اس نے بھاگتی گاڑی پر میگزین خالی کر دیا۔ اس کا ہاتھ اضافی گولیوں کے لیے کمر کی جانب گیا تو اسے چھوٹے ہتھیاروں سے چلنے والی گولیوں کے دھماکے سنائی دیے۔ اس کے اپنے یونٹ نے جنگل سے فائرنگ کا آغاز کر دیا تھا۔

لڑائی شروع ہوگئی تھی لیکن ابھی تک تفاری زندہ تھا۔

ڈینیل نے دیکھا کہ اس کی گاڑی اٹھتے ہوئے ہیلی کاپٹر کے نیچے جا رہی تھی۔ تفاری پائلٹ کی طرف ہاتھ لہرا رہا تھا۔ یہ مایوس کن لمحات تھے۔

اسی وقت جنگل سے کوئی برآمد ہوا۔ یہ مورگن تھا۔ آر پی جی راکٹ لانچر اس کے کندھوں پر تھا۔ اس سے پیشتر کوئی ہی تا فوجی اسے تاڑتا، مورگن نے کاپٹر سے سو قدم دور ایک گھٹنا زمین پر ٹکایا اور راکٹ فائر کیا۔ دھماکے کے ساتھ پیوما دھوئیں اور شعلوں میں گھر گیا۔ ایک اور دھماکا ہوا جو پیوما کے زمین سے تصادم کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔

مورگن جنگل کی طرف واپس بھاگا لیکن جنگل میں داخل نہ ہو سکا... وہ ہی تا باڈی گارڈ کی گولی کا نشانہ بن گیا... تاہم وہ تفاری کے فرار کا راستہ بند کر گیا تھا۔

حریف اس حیران کن ابتدائی شاک سے سنبھلنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ تین گاڑیوں میں سوار ہو کر تفاری کے پیچھے جا رہے تھے۔

غالباً تفاری نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس کے بھاگنے کا واحد بہترین موقع سیگی سیگی روڈ کا قریب ترین روڈ بلاک ہے۔

سویلین وہیں اوندھے لیٹے ہوئے تھے۔ کچھ عمارتوں میں پناہ لے رہے تھے۔ ڈینیل کو چنگ کی جھلک بھی نظر آئی، وہ نیلے رنگ کے سفاری سوٹ میں تھا۔ ڈینیل با آسانی اسے نشانہ بنا سکتا تھا تاہم وہ عمارت کی پناہ لینے میں کامیاب ہوگیا۔

ڈینیل کی توجہ پھر مفرور گاڑیوں کی طرف ہوگئی۔ اوہالی جوان پوری وحشت سے فائرنگ کر رہے تھے تاہم یہ موثر و مربوط فائرنگ نہیں تھی، مورگن مر چکا تھا۔

تفاری نکلا جا رہا تھا۔ انقلابی مزاحمت ناکام ہو گئی تھی۔

اس موقع پر ایک ہیبت کیٹر پلر اچھلتا ہوا جنگل سے نکلا۔

''کم از کم کسی نے تو اس کی ہدایات کو یاد رکھا تھا۔'' ڈینیل بڑبڑایا۔ وہ اپنی ناکامی پر غصے میں تھا۔

کیٹر پلر نے عین وقت پر فرار ہوتی ہوئی گاڑیوں کا راستہ بند کر دیا تھا۔ اوہالی لڑاکوں کا ایک جتھا جنگل سے نکلا اور کیٹر پلر کی آڑ لے کر لینڈ روور پر فائرنگ شروع کر دی۔ کم فاصلے سے... اجتماعی مرکوز فائر قدرے مؤثر تھا۔ تفاری کی گاڑی خطرناک انداز میں واپس گھومی۔ دوسری گاڑیوں نے بھی واپسی میں عافیت جانی۔

تفاری پھر ڈینیل کی رینج میں آرہا تھا۔ ڈینیل نے اس کے سر پر فائر کیا لیکن گاڑی 60 میل فی گھنٹا کی رفتار سے ناہموار سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

گاڑیاں سڑک سے اتر کر بکھر گئیں، ان کا رخ اسی طرف تھا جہاں موبائل مائننگ یونٹس کام کر رہے تھے۔ یہ ایک ڈیڈ اینڈ تھا کیونکہ ذیلی ٹریک وہاں ختم ہو جاتا تھا جہاں کان کنی کی کھدائی ہو رہی تھی۔

ڈینیل نے رائفل کو اس کے پٹے کے ساتھ لٹکتا چھوڑا اور نائلون کی رسی کے سہارے زمین پر پہنچ گیا۔ جیسے ہی وہ زمین پر پہنچا، سی پو وہاں آگیا۔ اس نے لوڈڈ کلاشنکوف ڈینیل کو پکڑائی۔ ایک بیگ جس میں فاضل میگزین کے علاوہ گرینیڈ بھی تھے۔

''کارا کی کہاں ہے؟''

سی پو نے جنگل کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں اندر کی طرف ایک ساتھ بھاگے۔ کیلی گھٹنوں کے بل وی ایچ ایف ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ساتھ الجھی ہوئی تھی۔ ڈینیل کو دیکھ کر وہ کھڑی ہوگئی۔

''کیا ہوا؟'' وہ چیخی۔

''وہ بچ گیا۔'' ڈینیل نے سنجیدگی سے اسے بتایا۔

''اوہ گاڈ، اب کیا ہوگا؟''

''ٹرانسمٹ۔'' ڈینیل نے فیصلہ کیا ''وکٹر کو بتا دو کہ آپریشن جاری رہے گا، ہم خونی کھیل شروع کر چکے ہیں... واپس نہیں ہو سکتے۔''

''لیکن اگر تفاری...''

''کیلی جلدی کرو... تفاری بچا ضرور ہے لیکن نکل نہیں سکا۔ ہم اس وقت بھی کھیل کے اندر ہیں، باہر نہیں۔''

کیلی نے بحث نہیں کی وہ پھر ریڈیو سیٹ پر جھک گئی اور مائیکروفون اٹھالیا ''فاریسٹ بیس، دس از مشن روم... کیا تم سن رہے ہو؟''

''مشن روم، دی از فاریسٹ بیس۔'' گونڈالا سے جواب موصول ہوا۔

''کاہالی میں سلور ہیڈ کے لیے پیغام ہے، سورج بلند ہو چکا ہے۔ پھر دہراتی ہوں سورج بلند ہو چکا ہے۔''

''اسٹینڈ بائے، مشن روم۔''

چند منٹ کی خاموشی...

''مشن روم، سلور ہیڈ کو پیغام مل گیا ہے، سورج بلند ہو چکا ہے۔''

''کیلی میری بات سنو۔'' ڈینیل نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اٹھایا۔ ''گونڈالا سے رابطے میں رہو۔ تفاری کے

بدقسمتی

وہ نیویارک کے ایک پب میں بہت دیر سے اپنا پیگ سامنے رکھے، خالی خالی نظروں سے اسے گھورے جا رہا تھا۔ اچانک ایک قوی الجثہ ٹرک ڈرائیور اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نوجوان کے سامنے سے پیگ اٹھا کر اپنے حلق میں انڈیل لیا۔

نوجوان نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھاما اور بلک کر رو پڑا۔

ٹرک ڈرائیور نے خفت سے اسے پچکارا۔ ''اتنی سی بات پر یوں پھوٹ پھوٹ کر رونے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے لیے نیا پیگ خرید دیتا ہوں۔''

''یہ بات نہیں ہے۔'' وہ اپنا سر پیٹتے ہوئے بولا۔ ''میرے لیے آج کا دن ہی منحوس ہے۔ صبح دیر سے آنکھ کھلی۔ دیر سے دفتر پہنچا تو باس مجھ پر برس پڑا اور مجھے نوکری سے نکال دیا۔ میں مایوس ہو کر باہر نکلا تو میری گاڑی غائب تھی۔ پولیس والوں نے صاف جواب دے دیا کہ وہ فوری طور پر میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ میں ٹیکسی لے کر گھر پہنچا۔ وہاں اترتے ہوئے میں کریڈٹ کارڈ سمیت اپنا پرس ٹیکسی میں بھول گیا۔ گھر میں گھسا تو وہاں خواب گاہ میں میری بیوی نوجوان مالی کے ساتھ دادِ عیش دے رہی تھی۔ یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ میں ایک نکما اور بے کار آدمی تھا جس کی بیوی بے وفا تھی۔ میں اپنی زندگی کے خاتمے کا فیصلہ کر کے یہاں آگیا مگر یہاں بھی میری بدقسمتی تمہاری صورت میں نازل ہوگئی۔ اپنا پیگ خالی کر کے میں نے اس میں زہر انڈیل لیا تھا... اور وہ تم اٹھا کر پی گئے۔''

کراچی سے عروج عارف کی تحریر

فوجی ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ جب تک میں واپس نہ آؤں، یہیں رہنا۔"

"احتیاط کرنا، ڈارلنگ۔" کیلی نے سر ہلایا۔

"سی پو" ڈینیل نے نیچے دیکھا۔ "کاراکی کا خیال رکھنا۔"

"اپنی زندگی کی طرح۔" سی پو نے جوش سے کہا۔

"بس ہی۔" کیلی نے سر اٹھایا۔

ڈینیل نے عجلت میں اس کے لب چھوئے "اور بھی بعد میں۔"

ڈینیل ان کو چھوڑ کر اوبومو ڈیولپمنٹ کارپوریشن بلڈنگ کی طرف بھاگا۔ اس کے جوان قریب ہی تھے۔

"اومیرو!" وہ دھاڑا۔ یہ پاس ورڈ تھا۔

"اومیرو۔" جوابی نعرے بلند ہوئے "سورج بلند ہو چکا ہے۔"

ڈینیل نے درجن بھر جوانوں کو ساتھ لیا۔ کھدائی کے ذیلی کچے راستے کے قریب 30 آدمی اور مل گئے... بارش بھرپور نہیں ہوئی اور اب رک چکی تھی۔

جنگل سے نکلنے سے پہلے رک کر اس نے جائزہ لیا۔ تفاری کی گاڑیاں، بھاری مشینوں کے قریب کیچڑ زدہ کچے علاقے میں بکھری ہوئی تھیں۔ تفاری کی گاڑی قریب ترین موبائل مائننگ مشین تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کھدائی کا یہ فولادی دیو بہترین مورچا تھا۔ آر پی جی راکٹ بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ زرد فولادی قلعے تک ایک بار تفاری پہنچ جاتا اور اسے کنٹرول میں لے لیتا تو اس کے ذریعے وہ کہیں بھی جا سکتا تھا۔

باقی گاڑیاں بھی تفاری کے پیچھے ہو گئیں۔ تفاری مشین تک پہنچ گیا تھا اور دفاع منظم کرنے میں ہوا تھا۔

"چلو۔" ڈینیل نے نعرہ لگایا۔ "اومیرو، سورج بلند ہو چکا ہے۔"

وہ جوانوں کو کھلی جگہ میں کیچڑ میں لے آیا جو ٹخنوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ لوگ خالی لینڈ روور کے پاس سے گزرے تو اس وقت تفاری آہنی سیڑھی کے ذریعے اوپر جا رہا تھا۔ ڈینیل کے کچھ لوگ، گاڑیوں کے عقب میں رک گئے اور کچھ واپس جنگل میں چلے گئے۔ ڈینیل ان کو الزام نہیں دے سکتا تھا۔ یہ لوگ فوجی نہیں تھے، نہ ہی ان کو سخت تربیت کا وقت ملا تھا۔ اس نے خود کو اکیلا محسوس کیا۔

ہی تا فوجیوں کا فائر اس کی طرف مرکوز ہونے لگا۔ ڈینیل کا ایک جوان گولی کا نشانہ بن گیا تھا جس کے بعد ہی ان میں ابتری پھیلی تھی۔

ڈینیل اکیلا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ ایک لینڈ روور کے پیچھے ہو گیا۔ دیوقامت مشین کے عملے نے کام چھوڑ دیا۔ تقریباً سب ہی اپنی اپنی پوزیشن سے ہٹ گئے اور آہنی سیڑھی کی طرف لپکے۔ گولیاں مشین کے مختلف فولادی حصوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ زرد مشین کا انجن اسٹارٹ تھا، کوئی فولادی چادروں کی آڑ لے رہا تھا، کوئی سیڑھی کے ذریعے اوپر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مشین بے قابو ہو رہی تھی...

اسی وقت ڈینیل کی سماعت سے عجیب آوازیں ٹکرائیں جو جنگل کی طرف سے آ رہی تھیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا، بے شمار لوگ ٹڈی دل کی طرح ابل رہے تھے، یہ لیبر کیمپ کے قیدی تھے... "اومیرو" وہ نعرے لگا رہے تھے۔ کیچڑ میں ڈینیل کے آدمی بھی کھڑے ہو گئے۔ کیچڑ نے انہیں بھوتوں کی شکل دے دی تھی۔

یہ ہجوم سخت مشتعل تھا۔ لڑائی کا رنگ پھر بدل گیا۔ یہ لوگ دیوانوں کی طرح آگے بڑھ رہے تھے۔ ہی تا فوجیوں کا فائر بے اثر تھا... ایک آدمی مرتا تو درجن اور آ جاتے... ہی تا کا ایمونیشن ختم ہو رہا تھا، لڑائی ایک نئے موڑ پر آ گئی تھی۔ ڈینیل کی چھٹی حس نے کہا کہ "سورج بلند ہو چکا ہے" اتنے فاصلے سے بھی وہ ہی تا فوجیوں کی سراسیمگی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اسلحہ پھینک کر سیڑھی کے ذریعے زرد رنگ کے بلند ترین پلیٹ فارم پر جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

فولادی قلعہ ان کے لیے چوہے دان بنتے جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لاتعداد اوہالیوں نے جو سرخی مائل کیچڑ کی وجہ سے بھوتوں میں تبدیل ہو گئے تھے، زرد رنگ کی رگ مشین کو گھیر لیا۔ پناہ گیر بے بسی سے انہیں یلغار کرتے دیکھ رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ خوف و دہشت نے اپنا رخ پھیر لیا تھا... اب ہی تا اس کی زد میں تھے۔ تفاری نے مشتعل اوہالیوں سے بات کرنے کی کوشش کی پھر مایوس ہو کر اپنا پستول نکال لیا۔ وہ فائرنگ کر رہا تھا اور ننگے اوہالی اس پر چھاتے چلے گئے، تفاری نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ نظر آیا لیکن اوہالیوں کے ہاتھوں پر بلند تھا... انہوں نے ظالم و جابر آمریت کی بدنما علامت کو سترفٹ کی بلندی سے نیچے پھینک دیا۔ مشین کے کھدائی والے بھاری سر کے خوفناک بلیڈ تیزی سے گھوم رہے تھے۔ تفاری ان پر گرا اور گرتے ہی پرزے پرزے ہو کر غائب ہو گیا...

ایک لرزہ خیز منظر تھا...

ڈینیل مڑا، وہاں موجود اوہالیوں نے اسے گھیر لیا۔

اس سے ہاتھ ملا رہے تھے، پشت پر تھپکی دے رہے تھے، ہنس رہے تھے... چیخ رہے تھے... گا رہے تھے۔

ایڈمنسٹریٹو بلاک میں آگ لگی ہوئی تھی... آزاد اور مشتعل اوہالی ہر طرف چکرا رہے تھے۔ وہ کسی کو بخشنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

ڈینیل ابھی جنگل کے اندر سو میٹر ہی گیا تھا کہ اسے ایک چھوٹا ہیولا اپنی جانب دوڑتا دکھائی دیا۔

"سی پو!" وہ چیخا۔

"کاراکی!" اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟ کاراکی کہاں ہے؟"

"وہ اسے لے گیا، وہ اسے جنگل میں لے گیا۔"

☆☆☆

کیلی ٹرانسمیٹر کے پاس تھی، وہ ریسیور کے فائن ٹیوننگ ڈائل کو چھیڑ رہی تھی جب اسے فائر کی آواز آئی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا، ایک آدمی آہٹ پیدا کیے بغیر اس تک پہنچ گیا تھا۔ یہ کوئی ایشیائی تھا، چینی یا جاپانی... اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔

کیلی نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن وہ اسے پہچان گئی۔ ڈینیل نے تنہائیوں میں کیلی کو بہت سی باتیں بتائی تھیں۔

وہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن چنگ نے اس کی کلائی جکڑ لی۔ کیلی اس کی طاقت پر ششدر رہ گئی۔ چنگ نے اس کے بازو کو بل دے کر پوری طرح اسے قابو کر لیا "ایک سفید عورت" وہ انگلش میں بولا۔

سی پو نے حملہ کیا... چنگ نے پھرتی سے گھوم کر آہنی پستول اس کے سر پر دے مارا، یہ ایک شدید ضرب تھی جس نے عمر رسیدہ سی پو کا سر پھاڑ دیا، وہ گر گیا۔

چنگ نے ایک ہاتھ سے کیلی کو قابو کیا ہوا تھا اور اسے دھکیل رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ چلنے پر مجبور تھی۔ آدھا میل چل کر وہ ایک تنگ دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ یہ دریائے وانگو تھا جس کے نام پر علاقے کا نام وانگو پڑ گیا تھا۔

چنگ نے کیلی کو گھٹنوں کے بل بٹھا دیا اور سر پر کھڑا رہا... وہ ہانپ رہا تھا اور غیر یقینی انداز میں اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔

"کیا یہ وانگو دریا ہے؟" اس نے اچانک پوچھا "کیا یہ جنوب کی طرف مرکزی سڑک تک جائے گا؟"

کیلی فوراً سمجھ گئی کہ وہ محلِ وقوع سے واقف ہے اور ہی تا ملٹری پوسٹ تک پہنچنا چاہ رہا ہے۔

چنگ نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"مجھے نہیں پتا۔"

"جھوٹ بولتی ہے۔"

"میں ایک نرس ہوں، مجھے جنگل کے بارے میں کچھ نہیں پتا..."

"ٹھیک ہے، کھڑی ہو جاؤ۔" وہ اسے لے کر چل پڑا۔ وہ دریا کے کنارے جنوب کی طرف جا رہے تھے۔ کیلی چلتے وقت زمین پر پورا وزن ڈال رہی تھی، کہیں لڑکھڑا کر زمین پر ٹھوکر لگاتی، کہیں پیر گھسیٹتی... وہ سی پو جیسے ماہر کھوجی کے لیے نشانات چھوڑ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سی پو آئے گا اور ڈینیل کے ساتھ آئے گا۔

اس نے اپنی شرٹ کا ایک بٹن بھی کسی طرح نیچے گرا دیا۔ وہ کبھی گرنے کی اداکاری کرتی، کبھی لڑکھڑانے لگتی۔ اس کا مقصد رفتار کم رکھنا تھا تاکہ سی پو اور ڈینیل کو زیادہ سے زیادہ وقت مل سکے۔ ساتھ ہی وہ بلند آواز میں التجا کرتی، کبھی روتی، کبھی چیخنے لگتی۔ "مجھے چھوڑ دو، مجھے جانے دو۔ میں زیادہ نہیں چل سکتی۔"

وہ جانتی تھی کہ اس کی آوازیں سی پو کے تربیت یافتہ حساس کانوں تک پہنچ جائیں گی۔

☆☆☆

سی پو نے جھک کر زمین سے بٹن اٹھایا اور ڈینیل کو دکھایا۔

"کواکو" وہ بولا "کاراکی ہمارے لیے نشانات چھوڑتی جا رہی ہے۔"

"چلتے رہو۔" ڈینیل نے بے صبری سے کہا۔

سی پو بآسانی کھوج اٹھاتا جا رہا تھا... معاً وہ بولا۔ "ہم قریب ہیں، بہت قریب۔" سی پو کے علاوہ ڈینیل نے بھی کیلی کی آواز سن لی تھی۔

ڈینیل بے قابو ہو کر آگے بھاگا تاہم سی پو نے بروقت اس کی کلائی تھام لی۔

"کاراکی زخمی نہیں ہے... وہ صرف ہمیں ہوشیار کر رہی ہے... جلدی نہیں کرو۔" سی پو نے کہا۔

ڈینیل نے خود کو قابو کیا لیکن وہ غصے کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ "میں چکر کاٹ کر دریا کے نچلی جانب گھات لگاؤں گا تم آگے نکل کر اسے میری جانب ہانکو... سمجھ گئے۔"

"سمجھ گیا، جب تم تیار ہو جاؤ تو سنہری طوطے کی آواز نکالنا۔" سی پو نے کہا۔

ڈینیل نے اپنی کلاشنکوف کے ساتھ رخ بدلا اور درخت کی آڑ میں اوجھل ہوگیا۔

مخصوص جگہ پہنچ کر اس نے خود کو دریا کے کنارے ایک چھوٹے درخت کے پیچھے سمیٹا اور دونوں ہاتھ کا پیالہ بنا کر مخصوص آواز نکالی۔

سی پو نے بلند سیٹی سے ملتی جلتی تیز آواز نکالی۔ اس آواز کی سمت اور فاصلے کا تعین کرنا چنگ کے بس کی بات نہیں تھی۔ چنگ ہڑبڑا کر رک گیا۔ پھر سی پو کی دھمکی سنائی دی ”اسے چھوڑ دو یا مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ!“

ڈینیل کو شک تھا کہ چنگ سواحلی زبان سمجھتا ہے۔ بہر حال دھمکی کا فوری اور مثبت اثر ہوا۔ سی پو رک رک کر بول رہا تھا اور چنگ، کیلی کو ڈھال بنا کر پیچھے ہٹ رہا تھا۔

آخر چنگ، ڈینیل کے قریب پہنچ گیا، اس کا تمام تر دھیان سامنے کی جانب تھا اور پستول تیار تھا۔

ڈینیل کو پتا تھا کہ وہ مارشل آرٹس کا ماہر ہے اور دست بدست لڑائی میں، ڈینیل پھنس جائے گا۔

چنگ پشت کی جانب سے قطعی غافل تھا۔ ڈینیل سنگین اس کے گردے میں پیوست کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا...

وہ اپنی کمین گاہ سے نکلا اور بھرپور وار کیا۔ پلک جھپکتے میں چنگ پہلو بچا گیا۔ ڈینیل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کس چیز نے اسے خبردار کیا تھا۔ یہ صرف کنگ فو فائٹر کی چھٹی حس ہی ہو سکتی تھی۔

سنگین نشانے پر لگنے کے بجائے ایک انچ اوپر لگی اور دستے تک اندر تیر گئی لیکن پھر بھی چنگ نے ڈینیل کی گرفت سنگین پر سے ختم کرا دی اور کیلی کو چھوڑ دیا۔ ساتھ ہی پستول سے ڈینیل کے چہرے پر فائر کیا۔ عین اسی لمحے اس نے ڈینیل کو شناخت بھی کر لیا اور بوکھلا گیا۔ ”کیا یہ ڈینیل کا بھوت ہے؟“ اسے جھٹکا لگا اور گولی ڈینیل کا کان چھو کر گزر گئی۔

اس کے لیے اتنا موقع کافی تھا... ڈینیل نے چنگ کی کلائی پکڑ کر فضا میں بلند کر دی۔ آنکھ کے کونے سے اس نے دیکھا کہ چنگ کا بایاں ہاتھ کلہاڑی کی طرح اکڑ گیا ہے پھر یہ کلہاڑی برق رفتاری سے سر کی طرف آئی، نشانہ کان کے نیچے گردن پر تھا۔ ڈینیل نے بے پناہ پھرتی سے کندھا اوپر کیا... کنگ فو کا ظالم وار ڈینیل کے کندھے کے پیچھے مضبوط عضلات سے ٹکرایا۔ وار کی شدت نے ڈینیل کے اعتماد کو لرزا دیا۔ اس کی گرفت پستول والے ہاتھ پر کمزور پڑ گئی۔ چنگ کا کلہاڑی نما وار اسی شدت سے پھر آیا۔ ڈینیل جانتا تھا کہ گردن زد میں آتے ہی خشک ٹہنی کے مانند ٹوٹ جائے گی۔

اسی اثنا میں کیلی اپنی پوری طاقت جمع کر کے اٹھ چکی تھی۔ وہ کندھے کے بل پوری شدت سے چنگ کے اسی پہلو سے ٹکرائی جہاں ڈینیل نے سنگین پرو دی تھی۔ چنگ کا وار خالی گیا... اس کی کربناک چیخ سنائی دی اور پستول بھی ہاتھ سے نکل گیا، وہ لڑکھڑایا۔ ڈینیل نے ایک ہاتھ اس کی گردن سے لپیٹا اور خود کو پیچھے گرا دیا۔ دونوں گتھم گتھا دریا کے کیچڑ نما پانی میں چلے گئے... ذرا دیر بعد دونوں کے سر پھر سطح پر نظر آئے۔ دونوں ابھی جڑے ہوئے تھے اور سانس بحال کر رہے تھے۔

ڈینیل کو احساس ہوا کہ وہ چنگ کو قابو نہیں کر پا رہا۔ کیلی بے قرار اور ہراساں تھی۔ اس نے سنگین اٹھالی اور دریا کے کنارے میں پاؤں رکھ دیا۔ اپنی پوزیشن مستحکم کر کے اس نے سنگین بلند کی۔

چنگ کا خطرناک ہاتھ ڈینیل کی گردن ناپ چکا تھا۔ اس کی پشت کیلی کی طرف تھی۔ کیلی نے آخرکار سنگین چنگ کی پسلیوں میں اتار دی۔

چنگ تڑپ کر کیلی کی جانب پلٹا اس کا چہرہ کسی بھیانک جانور کی طرح تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ کیلی کی طرف بڑھائے... ڈینیل نے سنبھالا لیا اور چنگ کی پشت پر جست لگائی۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کی گردن کو جکڑ چکے تھے ”جانی، مسٹر ایمبیسڈر“ ڈینیل اس کے کان میں پھنکارا اور اپنے پورے وزن کو استعمال کر کے اسے نیچے گرا دیا۔

چنگ کا سر آلودہ پانی کے اندر تھا۔ دو سنگینیں اس کے بدن کے اندر پیوست تھیں۔ ڈینیل نے اس کو سر پانی سے نہیں نکالنے دیا۔ پانی کے اندر ہی چنگ کی سماعت سے ڈینیل کی دھاڑ ٹکرائی ”جانی نی ی...ی...“

اس کے تصور میں ایزا ہو پارک کی ہولناک خونی رات کی فلم چل رہی تھی، اس نے محسوس کیا کہ جانی کہیں آس پاس ہے۔

”کہاں ہو جانی؟“ ڈینیل کسی اور دنیا میں تھا۔

”وہ مر چکا ہے۔“ کیلی نے سرگوشی کی ”ڈینی وہ مر چکا ہے۔“ اس نے پھر کہا۔

ڈینیل نے دھیرے دھیرے اپنی گرفت ختم کر کے آنکھیں بند کر لیں اور لیٹ گیا۔ بند آنکھوں میں جانی اور اس کے بیوی بچے مسکرا رہے تھے۔

سرپرائز

بابر نعیم

جدیدیت کے نئے رنگ ڈھنگ نے انسان سے بہت سی چیزیں دور کر دی ہیں...اب ایک دوسرے سے ملنے کے لیے عذرِ ملاقات کی شرط قرار پا چکی ہے...کچھ ایسے ہی پڑوسیوں کا احوال جو ایک شام اپنے ہمسائے کے ساتھ انوکھے انداز میں گزارنا چاہتے تھے...

ایک چونکا دینے والے اختتام کی حیران کن کہانی

نصف درجن کے قریب خدمت گزاروں نے ویرم کی میز کے گرد جمع ہو کر ہیپی برتھ ڈے کا گیت گانا شروع کیا تو وہاں موجود بہت سے گاہک تالیاں بجا کر اور فرش پر تال کے ساتھ جوتے مارتے ہوئے ان کا ساتھ دینے لگے۔

ویرم نے اپنی بیوی کو اس طرح گھور کر دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، میرا خیال ہے ہم نے یہ اتفاق کیا تھا کہ اس قسم کی کوئی لغویت نہیں ہوگی لیکن پھر گیت گانے والوں کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ جب ان خدمت گزاروں نے گیت ختم کیا تو ویرم نے نہایت نرم لہجے میں ان کا شکریہ ادا کیا۔

ان میں سے ایک ویٹرس کو دیکھ کر اسے اپنی سیکریٹری الفریڈا یاد آگئی۔ گو اس کا نام قدرے مردانہ ٹائپ تھا لیکن وہ ایک بھرپور اور مکمل عورت تھی۔ یہ بات ویرم نے اس کے کام پر آنے کے ایک ماہ بعد دریافت کی تھی۔

دو سال قبل ان کی پہلی ملاقات کے بعد سے ان کے درمیان ہفتے میں کم از کم ایک بار ملاقات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ نہایت غیر معمولی محبوبہ ثابت ہوئی تھی اور اس کی بیوی گلوریا کبھی اس کا پاسنگ بھی نہیں رہی تھی۔

الفریڈا کی عمر صرف چوبیس برس تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ویرم اور گلوریا کی شادی سے صرف دو سال پہلے پیدا ہوئی تھی۔

آج ویرم بقول اپنے بہت سے دوستوں کے اپنی ”بگ فائیو او“ سالگرہ منا رہا تھا۔ اس نے آج تک کبھی بڑے پیمانے پر اپنی سالگرہ نہیں منائی تھی اور نہ ہی کبھی سالگرہ پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس بار بھی اس نے کسی قسم کی تقریب منعقد نہیں کی تھی۔ وہ نہیں سمجھتا تھا کہ کسی کو اس بات کی یاددہانی کرائی جائے کہ وہ نصف صدی سے زندہ ہے۔

ماضی میں ہر دفعہ گلوریا اس کے احتجاج کے باوجود بھی اس کی سالگرہ پر کوئی نہ کوئی خاص اہتمام کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس بار جب گلوریا نے یہ شام سادگی کے ساتھ منانے پر اتفاق کیا تو ویرم کو نہ صرف خوشی ہوئی بلکہ وہ قدرے حیران بھی ہوا۔

گلوریا ایک عمدہ ڈنر کرنے اور پھر ایک فلم دیکھنے پر رضامند ہو گئی تھی۔ انہوں نے 'دی بکٹ لسٹ' نامی فلم منتخب کی۔ ویرم کو بطور اداکار جیک نکلسن اور مورگن فری مین بے حد پسند تھے۔ چونکہ وہ دونوں ہی 'دی بکٹ لسٹ' کے ستارے تھے اس لیے ویرم کو یقین تھا کہ یہ فلم بھی نہایت عمدہ ہوگی۔

وہ اس لیے بھی خوش تھا کہ اس نے گلوریا سے چھٹکارا پانے کا ایک منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ جب ان دونوں کی شادی ہوئی تھی تو گلوریا کے باپ نے شادی سے قبل اس معاہدے پر اصرار کیا تھا کہ اگر ان کے درمیان طلاق ہو گئی تو اس صورت میں ویرم کو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی اور وہ مالی طور پر تباہ ہو جائے گا۔

گلوریا کی فیملی مال دار تھی اور گلوریا کا باپ یہ نہیں چاہتا تھا کہ ویرم اس کی بیٹی کے ساتھ کسی لالچ میں شادی کرے یا اس کی نیت کچھ اور ہو۔ اس وقت یہ بات واقعی حقیقت سے قریب تر محسوس ہوئی تھی۔

گزشتہ سال کے دوران میں اس نے اپنے ذہن میں سیکڑوں خیالی واقعات ترتیب دیے تھے لیکن اس بار اس نے جو منصوبہ بنایا تھا اس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ یہ اس کی پریشانی کو ایک بار ہی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا۔

آج رات کے بعد وہ تمام وقت الفریڈا کے ساتھ گزارنے کے لیے آزاد ہو جائے گا۔ پھر جونہی گلوریا نے اس کی پچاسویں سالگرہ سادگی سے منانے پر اپنی رضامندی ظاہر کی تو ویرم نے دو دن قبل سے اپنے منصوبے پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

دفتر سے گھر واپسی پر وہ راستے میں ایک بڑے سے

ڈسکاؤنٹ اسٹور پر رکا اور اپنے سائز سے تین سائز بڑے جوتوں کی ایک جوڑی خرید لی۔

اپنی سالگرہ کے دن ویرم دفتر سے جلدی نکل آیا۔ اسے معلوم تھا کہ گلوریا اس وقت بیوٹی پارلر گئی ہوئی ہے۔ اس نے اپنی کار گھر کے اس سائڈ پر پارک کی جو اونچی جھاڑیوں کی باڑ کی وجہ سے باہر سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔

ویرم نے وہ بڑے سائز کے جوتے پہن لیے اور پھولوں کی ایک کیاری سے گزرتا ہوا بیسمنٹ کی کھڑکی تک پہنچ گیا۔ اس نے یہ یقین کرلیا تھا کہ نرم مٹی پر اس کے جوتوں کے نقش واضح ثبت ہو جائیں۔ اس نے بیسمنٹ کی کھڑکی کا شیشہ توڑا، دستانے پہن کر کھڑکی کا تالا کھولا اور یہ یقین کرلیا کہ کھڑکی کھل چکی ہے۔

اس طرح پولیس یہ تعین کرلے گی کہ وہ چور کس طرح گھر میں داخل ہوا ہوگا۔ پھر وہ وہاں سے اپنی کار میں شہر کی دوسری جانب ایک بزنس ڈسٹرکٹ میں چلا گیا۔ اس نے اپنے خریدے ہوئے بڑے سائز کے جوتے ایک کوڑے دان میں پھینک دیے۔

پھر جب وہ اس رات گھر واپس لوٹیں گے تو ان کی مڈبھیڑ اس نقب زن سے ہو جائے گی۔ راہِ فرار اختیار کرتے وقت وہ نقب زن گلوریا کو خنجر گھونپ دے گا۔ یہ وہ کہانی ہوگی جو وہ پولیس کے گوش گزار کرے گا۔ یہ ایک سادہ سا منصوبہ تھا۔

اس طرح وہ نہ صرف گلوریا کی دولت کا حق دار بن جائے گا بلکہ اس کی زندگی کے بیمے کی رقم بھی اسے مل جائے گی۔ اس کے بعد وہ اور الفریڈا اپنی بقیہ زندگی ساؤتھ پیسیفک کے کسی جزیرے میں گزارنے کے قابل ہو جائیں گے۔

حسبِ پروگرام وہ دونوں سالگرہ کے موقع کی مناسبت سے ریسٹورنٹ کی جانب سے پیش کیے جانے والے کیک اور آئس کریم سے لطف اندوز ہو رہے تھے تو گلوریا نے اچانک اپنا چمچہ گرا دیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں تھام لیں۔

''کیا ہوا؟'' ویرم نے پوچھا۔

گلوریا نے اپنی آنکھیں سختی سے بھینچ لیں۔ ''اوہ، ویرم! مجھے دردِ شقیقہ ہو رہا ہے۔''

ویرم اس کی صورت تکنے لگا۔ ساتھ ہی دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ یہ کیا ہو گیا، ابھی تو ہم گھر بھی نہیں پہنچے ہیں۔

''تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' ویرم نے اسے تسلی دی۔

''نہیں، آئی ایم سوری۔ میں تمہاری سالگرہ برباد نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن بہتر یہی ہوگا کہ تم مجھے گھر لے چلو۔''

کار واپس گھر کی جانب چلاتے ہوئے ویرم نے ذہن میں اپنے منصوبے پر نظرِ ثانی شروع کردی۔ اسے اپنا شکاری خنجر اپنی ٹانگ سے بندھا ہوا محسوس ہو رہا تھا جو غلاف میں بند تھا۔ اس کی انگلیوں کے نشانات اس خنجر پر موجود تھے لیکن یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ یہ خنجر اس کا ذاتی تھا اور وہ اسے کئی بار استعمال کرچکا تھا۔

اور یہ خنجر نقب زن نے چرا لیا تھا۔

''میں پولیس کو یہ بتاؤں گا کہ گلوریا نے دروازہ کھولا، پھر گھوم کر مجھے ہیپی برتھ ڈے کہا، مجھے بوسہ دیا اور میری بانہوں میں ڈھیر ہوگئی۔ میں نے اندھیرے میں کسی کو اپنے پاس سے دوڑتے ہوئے دیکھا لیکن مجھے اس کے پیچھے دوڑنے سے زیادہ اپنی بیوی کی فکر تھی۔ میں نے فوراً ہی 911 پر فون کردیا۔''

جب ان کی کار ریسٹورنٹ سے واپسی پر گھر کے ڈرائیو وے میں داخل ہوئی تو گلوریا بولی۔ ''پورچ کی لائٹ آن نہیں ہے۔''

''ہوں؟ شاید میں اسے آن کرنا بھول گیا ہوں گا۔''

داخلی دروازے پر پہنچ کر ویرم اپنی چابیاں ٹٹولنے لگا۔ پھر گلوریا سے بولا۔ ''تمہارے پاس گھر کی وہ چابیاں اب بھی موجود ہیں جس میں چھوٹی سی فلیش لائٹ بھی ہے؟''

گلوریا نے اپنے پرس میں سے اپنی چابیوں کا سیٹ نکالا اور ویرم کے پاس سے گزرتے ہوئے داخلی دروازے تک پہنچ گئی جیسا کہ ویرم نے اندازہ لگایا ہوا تھا۔

ویرم نے یہ یقین کرنے کے لیے چاروں طرف نگاہ دوڑائی کہ کہیں اس کا کوئی پڑوسی اپنے کتے کو تو ٹہلانے کے لیے نہیں نکلا ہوا ہے یا کوئی اور کام تو نہیں کر رہا کہ وہ انہیں دیکھ لے۔ لیکن اس وقت آس پاس کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

پھر جونہی گلوریا نے تالے میں چابی لگائی تو ویرم نے چپکے سے اپنی پنڈلی سے بندھے ہوئے غلاف سے اپنا خنجر باہر کھینچ لیا۔ ادھر دروازہ کھلتے ہی ویرم نے خنجر گلوریا کی پیٹھ میں گھونپ دیا۔ گلوریا کا جسم آگے کی سمت لڑھک گیا اور اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلنے لگی۔

عین اسی لمحے لیونگ روم کی تمام لائٹس اچانک روشن ہوگئیں اور وہاں موجود ویرم کے ستائیس پڑوسی اور دوست اچھل کر تالیاں بجاتے ہوئے خوشی سے چلائے۔ ''سرپرائز اینڈ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو!''

ایک بے ضرر سا بوڑھا آدمی کسی کا کیا بگاڑ سکتا ہے... گھاگ مجرموں کا معاملہ ہو تو ایسا قیاس کرنا بھی ممکن نہیں... وہ جیت کی دُھن میں مگن اپنی بازی کھیل رہے تھے... کامیابی کچھ فاصلے پر تھی کہ بھوک نے انہیں ایک ہولناک گرداب میں دھکیل دیا... وہ بھی بھوکے تھے اور ان کی کار بھی... ٹنکی کے لیے پیٹرول اور آتشِ شکم کے لیے سینڈوچ درکار تھے... یہی ان کے لیے حلق کا پھندا بن گئے...

عقابی نظریں رکھنے والے ایک بوڑھے کی پھرتی کا دلچسپ ماجرا...

باریک بین

دانیال عارف

کیلی فورنیا کی سرحد سے وہ لوگ پینتالیس منٹ کی دوری پر تھے۔ جب کورڈ نے دیکھا کہ فیول گیج کی سوئی پیٹرول ختم ہونے کا اشارہ دے رہی ہے۔

''پیٹرول ختم ہو رہا ہے۔'' اس نے ٹائلر سے کہا۔

''میں بھی ختم ہو رہا ہوں۔'' ٹائلر نے انگڑائی لینے کی کوشش کی۔ ''کچھ کھا لینا چاہیے۔''

عقبی نشست پر فیلین اور بریز ایک دوسرے سے جڑے بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں دہری ہتھکڑی لگی

ہوئی تھی... فیلن کی آنکھیں سرد اور کھوجنے والی تھیں۔

''وہ دیکھو۔'' ٹائلر نے اچانک کورڈ کے بازو کو چھوا اور ایک سمت اشارہ کیا۔

دوپہر ڈھل رہی تھی۔ کورڈ نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ کئی سو گز کے فاصلے پر فری وے کے دائیں جانب ایک سفید عمارت دکھائی دے رہی تھی۔

اس کے بیرونی جانب پیٹرول مشینز ایک قطار میں نظر آرہی تھیں۔ ہائی وے اور عمارت کے درمیان، کھمبے سے جڑا ایک سائن بورڈ موجود تھا، اس پر لکھے گئے سرخ رنگ کے الفاظ دھندلا گئے تھے... ''ایڈ سروس... چوبیس گھنٹے مہیا۔''

''اوکے، گڈ۔'' کورڈ بولا۔

کچھ دیر بعد وہ ہائی وے سے اتر کر پیٹرول پمپ کے ساتھ گاڑی لگا چکے تھے۔ کورڈ نے انجن بند کیا اور باہر نکلنے لگا لیکن ٹائلر نے اسے روک لیا۔

''یاد رکھو، یہ اوریگان ہے۔ ریاست کے قانون کے مطابق یہاں سیلف سروس نہیں ہے۔''

''رائٹ۔'' کورڈ نے جواب دیا۔

ایک سفید بالوں والا عمر رسیدہ شخص نمودار ہوا۔ امتدادِ زمانہ کے اثرات اس کے نقوش میں نمایاں تھے۔ وہ گھوم کر ڈرائیور والی کھڑکی کی جانب آیا۔ ''مدد چاہیے؟''

''ہاں، ٹینکی بھر دو۔''

''سادہ پیٹرول...؟''

''جی جناب۔''

اس وقت بڑے میاں کی نگاہ عقبی نشست پر موجود فیلن اور بریئر پر پڑی۔ بڑے میاں نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور چمک دار نیلی آنکھیں عقبی نشست پر گاڑ دیں۔

''پریشانی کی بات نہیں۔'' کورڈ نے کہا۔

''تم دونوں پولیس آفیسرز ہو؟''

ٹائلر نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں یو ایس مارشل ہوں۔'' کورڈ نے وضاحت کی۔ ''اور یہ میرا گارڈ۔'' اس نے ٹائلر کی جانب اشارہ کیا۔ ''ہم ان دونوں کو سان فرانسسکو فیڈرل کورٹ میں حاضری کے لیے لے جا رہے ہیں۔''

''وہ کمک نیل آئی لینڈ، واشنگٹن سے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

عقبی نشست سے فیلن نے بڑے میاں کو مخاطب کرنا چاہا۔

''اپنا منہ بند رکھو۔'' ٹائلر نے تیز لہجے میں کہا۔

''آرام کے لیے کمرے کہاں ہیں؟'' فیلن نے بڑے میاں سے سوال کیا۔ بڑے میاں کی آنکھیں عمر اور چہرے کے برخلاف جوان اور روشن تھیں۔

''پروا مت کرو، خاموش بیٹھے رہو۔ تم جانتے ہو کہ تمہاری بھلائی کس میں ہے۔'' کورڈ نے کہا۔

یوں محسوس ہوا کہ فیلن کچھ کہنا چاہتا ہے... تاہم اس نے ارادہ بدل دیا اور خاموش بیٹھا رہا۔

بڑے میاں کار کی پچھلی جانب چلے گئے۔ پیٹرول ٹینک کا ڈھکن کھول کر انہوں نے فیول پمپ اٹھایا... پھر سامنے کی جانب آکر ونڈ شیلڈ کی صفائی شروع کر دی۔

ٹائلر نے جماہی لی۔ کورڈ عقبی آئینے میں فیلن کا جائزہ لے رہا تھا۔ بڑے میاں صفائی کے دوران میں بغور اندر بیٹھے چاروں افراد کا جائزہ بھی لینے میں مصروف تھے۔

تیز کلک کی آواز آئی۔ یہ آٹومیٹک پمپ کے بند ہونے کی آواز تھی۔ بڑے میاں نے پمپ کو مشین پر فٹ کیا اور پیٹرول ٹینک کا ڈھکن بند کر کے دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ کی جانب آگئے۔

''آئل چیک کرنا ہے؟''

''نہیں، آئل ٹھیک ہے۔'' کورڈ نے کہا۔

''بارہ ڈالر۔'' بڑے میاں بولے۔ ''کریڈٹ کارڈ ہے؟''

کورڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کیش۔'' اس نے والٹ نکالا اور دس کے ساتھ پانچ کا نوٹ دیا۔

''میں رسید اور باقی پیسے لے کر واپس آتا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں۔ پاپ باقی پیسے آپ رکھو۔ ہمیں جلدی ہے ذرا۔''

''اتنی جلدی بھی نہیں۔'' ٹائلر نے مداخلت کی پھر بڑے میاں کی جانب رخ کیا۔ ''کچھ کھانے پینے کا بندوبست ہے؟''

''گیراج تک جانا پڑے گا، سینڈوچ مل جائے گا۔'' بڑے میاں نے جواب دیا۔

''گیراج کہاں ہے؟''

''عقبی جانب۔''

''کس قسم کا کھاؤ گے؟'' ٹائلر نے کورڈ سے پوچھا۔

''کچھ بھی منگوالو۔''

''میرے لیے پنیر والا۔'' پچھلی نشست سے فیلن کی آواز آئی۔

ٹائلر نے منہ بنایا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنا منہ بند رکھنے کے لیے کہا گیا تھا۔''

''کیا میں اور بریئر کچھ نہیں کھائیں گے؟''

''نہیں۔'' مختصر جواب آیا۔ ''ٹائلر سینڈوچ پکڑو... ابھی ہمیں طویل سفر طے کرنا ہے۔''

ٹائلر، کار سے نکل چکا تھا اور بڑے میاں کے پیچھے عمارت کی عقبی سمت جا رہا تھا۔ کچھ دیر میں دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

کورڈ، فیلن کی طرف پلٹا۔ ''تم کو سمجھ داری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔'' کورڈ، فیلن کو گھور رہا تھا۔

''یہی بات میں تم سے بھی کہہ سکتا ہوں۔'' فیلن نے تُرش‌بہ‌تُرش جواب دیا۔

''آرام سے بیٹھو۔'' کورڈ نے وارننگ دی۔ اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے تھے۔

''جہنم میں جاؤ۔''

''تم مجھے دیوار سے لگا رہے ہو۔ اپنا منہ بند نہیں رکھ سکتے۔'' کورڈ کو غصہ آ گیا۔

فیلن کی سیاہ آنکھیں کورڈ کی آنکھوں میں پیوست ہو گئیں... دونوں میں سے کوئی بھی پلک نہیں جھپکا رہا تھا۔

بریئر نے ماحول کو ٹھنڈا کرنے کے لیے فیلن کو پکارا۔ ''اپنے ساتھی کی سنو وہ تم سے زیادہ سمجھ دار ہے۔'' کورڈ نے کہا۔

فیلن خاموش رہا۔ ہتھکڑیوں میں اس کی مٹھیاں کھل بند ہو رہی تھیں۔

کورڈ نے اپنا رخ دوبارہ ونڈ شیلڈ کی جانب کر لیا... اس نے بڑے میاں کو آتے دیکھا۔ اسے حیرت ہوئی... بڑے میاں تنہا آرہے تھے۔

بڑے میاں کے ایک ہاتھ پر بوسیدہ کپڑا پڑا تھا جس پر گریس کے دھبے نمایاں تھے۔ وہ سیدھا ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی کی جانب نمودار ہوا۔

''میرا ساتھی کہاں ہے؟'' کورڈ تڑخا۔ ''میں نے پہلے کہا تھا کہ ہم لوگ جلدی میں ہیں۔''

''میرا بھی یہی اندازہ ہے کہ تم لوگ جلدی میں ہو۔'' بڑے میاں نے کہا۔ کورڈ کو اس کے تاثرات بدلے بدلے نظر آئے۔

دفعتاً بڑے میاں نے ہاتھ پر پڑا پرانا کپڑا نیچے گرا دیا۔ کورڈ نے جو کچھ دیکھا، وہ اسے سُن کرنے کے لیے کافی تھا۔

بڑے میاں کے ہاتھ میں اعشاریہ 44 کی میگنم تھی جس کا رخ کورڈ کی کنپٹی کی طرف تھا۔ ''مسٹر! تم نے حرکت کی تو سمجھ لو کہ مر گئے۔''

فیلن اور بریئر آگے کی جانب جھک گئے۔ دونوں حیران تھے۔ کورڈ سکتہ زدہ سا تھا اور میگنم کو گھور رہا تھا۔

بڑے میاں نے فیلن کو مخاطب کیا۔ ''ہتھکڑی کی چابی کہاں ہے؟''

''اگنیشن رِنگ میں۔'' جواب آیا۔ ''ہوشیاری سے...'' فیلن نے خبردار کیا۔

''فکر مت کرو۔ اس نے کوئی حرکت کی تو بغیر سر کے نظر آئے گا۔'' بڑے میاں بالکل بدلے ہوئے اور چیتے کی طرح چوکس تھے۔

بڑے میاں نے کورڈ سے نگاہ ہٹائے بغیر دوسرے ہاتھ سے اگنیشن کی نکال لی۔

''دروازہ کھول کر باہر آجاؤ۔ آرام اور دھیرے سے... ہاتھ اوپر کر لینا۔'' بڑے میاں نے حکم جاری کیا۔

کورڈ نے ایسا ہی کیا۔ بڑے میاں نے اسے مڑنے کا حکم دیا اور کار پر اوندھا کر دیا۔ میگنم کی سرد نال کورڈ کی ریڑھ کی ہڈی میں چبھ رہی تھی۔

کورڈ کی بیلٹ سے اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور لٹک رہا تھا۔ بڑے میاں نے ریوالور قبضے میں کیا۔

فیلن ہنوز بڑے میاں کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی حرکات میں مہارت اور تجربہ جھلک رہا تھا۔ فیلن حیرت کا شکار تھا۔

سب کچھ قطعی غیر متوقع تھا...

''چند قدم آگے جاؤ اور اطراف میں مت دیکھنا۔'' بڑے میاں نے کورڈ کے لیے نیا حکم جاری کیا... چابی اس نے فیلن کو دی، جس نے اپنے ساتھی کی ہتھکڑی بھی کھول دی۔ بڑے میاں نے کورڈ کا ریوالور فیلن کے حوالے کیا... بڑے میاں کی شکل اور تیور بالکل مختلف نظر آرہے تھے۔ وہ اعتماد کے ساتھ مصروفِ عمل تھا۔

فیلن اور بریئر کار سے باہر آچکے تھے۔

''آپ کون ہیں؟'' فیلن نے سوال کیا۔

''میں ریٹائرڈ مارشل ہوں، میرے بچے۔''

''اس کا ساتھی کہاں ہے؟'' فیلن کا اشارہ ٹائلر کی جانب تھا۔

''میں نے جھانسا دے کر بہ آسانی اسے قابو میں کر لیا

تھا اور اپنی گن نکال لی تھی۔ وہ غالباً بے ہوش پڑا ہوگا۔ یہ اسی کا ریوالور ہے۔'' بوڑھے مارشل نے دوسری گن فیلن کے حوالے کی۔

فیلن نے ہتھیار بریزر کے حوالے کیا اور اسے ٹائلر کی جانب روانہ کیا۔

''ٹھہرو۔'' فیلن نے اسے روکا۔ ''یہ ہتھکڑیاں لے جاؤ۔''

☆☆☆

''گھوم کر سینہ گاڑی سے لگا دو۔ ٹانگیں پھیلا دو اور ہاتھ سر پر رکھ لو... تم کو پتا ہے، تمہیں کیا کرنا ہے۔'' فیلن نے کورڈ سے کہا۔ کورڈ نے خاموشی سے اس کی ہدایات پر عمل کیا۔ نقشہ پلٹ چکا تھا... فیلن نے اس کی جیب سے والٹ نکال کر اپنی جیب میں منتقل کیا اور اسے ہاتھ کمر پر رکھنے کے لیے کہا۔ پھر مارشل کی جانب دیکھا۔ بڑے میاں نے اطمینان سے کورڈ کے ہاتھوں کو آہنی زیور سے آراستہ کر دیا۔

ٹائلر لڑکھڑاتا ہوا بریزر کے آگے آگے چلا آرہا تھا... اس کے ہاتھ بھی پشت پر بندھے تھے... فیلن اور بریزر کی جگہ اب وہ دونوں بے دست و پا عقبی نشست پر تھے۔

فیلن نے تشکر آمیز لہجہ میں بوڑھے مارشل کو مخاطب کیا۔ ''سمجھ میں نہیں آرہا کیا کہوں... تم نے ہماری زندگی بچالی ہے۔'' اس کا ایک ہاتھ مارشل کے شانے پر تھا۔

''یہ حقیقت ہے۔'' بریزر نے اضافہ کیا۔ ''واشنگٹن سے یہاں تک یہ بدمعاش کھل کر اظہارِ خیال کر رہے تھے کہ جلد یا بدیر ہمیں مار کر جنگل میں پھینک دیں گے۔ اصل ملزم یہ تھے اور ہم انہیں لے جا رہے تھے۔''

''کیا ہوا تھا؟'' بوڑھے مارشل نے سوال کیا۔

''بس ذرا چوک گئے تھے۔'' فیلن نے اعتراف کیا۔ ''صبح ہی صبح کافی کے لیے رکے تھے۔ ان دونوں کو بھی پیشکش کی غلطی کر بیٹھے... ذرا سے غافل ہوئے اور انہوں نے کافی ہمارے چہروں پر الٹ دی۔ سنبھلتے سنبھلتے بھی ہم کورڈ کے قابو میں آچکے تھے... پل بھر میں بازی الٹ گئی۔''

''لیکن آخر صورتِ حال کو آپ نے کیونکر بھانپ لیا؟'' بریزر نے استفسار کیا۔ ''انہوں نے ہمیں موقع ہی نہیں دیا تھا کہ ہم آپ کو کوئی اشارہ کر پاتے۔''

بوڑھے مارشل نے ہیٹ جھکالی۔

''ویل۔'' وہ بولا۔ ''ان دونوں نے کئی غلطیاں کی تھیں جو ان کے نزدیک غیر اہم تھیں۔ تاہم ان سب کو ملا کر دیکھا جاتا تو ایک ہی چیز سامنے آئی... میں پچیس برس تک کاؤنٹی شیرف کے فرائض سرانجام دے چکا ہوں... ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد تین برس قبل میں نے یہ پیٹرول پمپ شروع کیا تھا...

''اپنے دور میں ایک آدھ فیڈرل مارشل کو میں نے قیدی ڈھوتے دیکھا تھا... دورانِ سفر ایک رات کا قیام تو لینا ہی پڑتا تھا۔

''ان کا انداز اور تم دونوں کے تیور... مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی تھی۔ تم دونوں کی کلائیوں پر مخصوص شناختی پلاسٹک کے بینڈ موجود نہیں تھے... یہ ایک غیر معمولی بات تھی...''

فیلن نے سر ہلایا۔ ''وہ ان لوگوں نے توڑ ڈالے تھے۔ بینڈز ان کی کلائیوں میں تھے۔ ٹوٹنے کی وجہ سے وہ انہیں ہمارے ہاتھوں میں بھی نہیں پہنا سکتے تھے۔''

''ایک اور بات۔'' بوڑھا مارشل بولا۔ ''انہوں نے تم دونوں کو کچھ کھانے پینے نہیں دیا۔ یہ خلافِ معمول تھا۔ کوئی مارشل ایسا نہیں کرتا کیونکہ یہ بات بدسلوکی کے زمرے میں آتی ہے اور قیدی کے ذریعے اس کے وکیل تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ قانون کے رکھوالے مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔

''مزید یہ کہ گیسولین... وہیل کے پیچھے کورڈ تھا؟''

''ہاں، کورڈ۔''

''ہونہہ، اس نے پیٹرول کی ادائیگی کیش میں کی تھی... فاش غلطی یا لاعلمی۔'' بوڑھا مارشل نکات بیان کرتا رہا۔ ''ادائیگی اسے کریڈٹ کارڈ سے کرنی چاہیے تھی۔ پھر جب میں نے رسید دینی چاہی اور باقی پیسے واپس کرنے کی بات کی تو کورڈ نے سخاوت کا مظاہرہ کیا۔ فیڈرل بے رول پر ٹپ نہیں دی جاتی۔ رسید لینا تو لازمی ہے۔ رسید کے ذریعے وہ سرکار سے اپنی رقم وصول کر لیتے ہیں۔''

بوڑھے مارشل نے سفید بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ ''میری عمر کافی ہوگئی ہے لیکن میں ابھی اتنا سست نہیں ہوا ہوں... اپنے وقت میں بھی میری شہرت ٹھیک ٹھاک تھی۔''

فیلن نے کورڈ اور ٹائلر کی جانب دیکھا۔ دونوں پژمردہ اور خاموش تھے۔

فیلن نے بوڑھے مارشل کو سیلیوٹ جھاڑا۔

''یو آر دی بیسٹ، سر۔''

ادھار کی زندگی

تنویر ریاض

زندگی ہموار سانسوں کا نام ہے... سانس کی یہ ڈور کتنی لمبی ہے... کوئی اس کا ادراک نہیں رکھتا... مگر اس حقیقت کو کوئی ماننے کے لیے تیار نہیں... ہر شخص اپنے آپ کو لمبی ریس کا گھوڑا سمجھتا ہے... جو سرپٹ دوڑتا رہے... سانسوں کی یہ لمبی ڈور اور ریس کا گھوڑا میدان میں اچانک کس طرح گرتا ہے... ان گھڑیوں کی پُراثر حقیقت انگیزی...

چند لمحوں کی مہلت سے فائدہ اٹھانے والے خوش قسمت کا خطرناک داؤ

مئی کا مہینا، ہفتے کا دن اور بارش کا موسم۔ میں اپنے ساتھی آرٹ بوڈری کے ہمراہ نو گیارہ پر ملنے والی ایک کال کے جواب میں لیفٹ ٹاور کی طرف جا رہا تھا۔ یہ گھریلو تشدد کا معاملہ تھا۔ فیرس نامی عورت پر حملہ ہوا تھا اور ہمیں اسے بچانا تھا۔ آرٹ عمر میں مجھ سے دس سال بڑا ہے۔ چھ فٹ چھ انچ قد اور براؤن آنکھوں والا یہ خوبرو شخص بیس سال پہلے ریاست مشی گن میں باسکٹ بال اسٹار تھا۔ اب اس کے تین بچے تھے۔ درمیان سے سر گنجا ہو رہا تھا اور کمر پر

چربی چڑھ گئی تھی۔ وہ خوش اخلاق اور خوش گفتار تھا۔ ہم اچھے دوست تھے اور مل کر کام کرتے تھے۔ وہ بارہ منزلہ عمارت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ البتہ چند ایک اپارٹمنٹس میں روشنی ہو رہی تھی۔ دستک دینے پر ایک گوریلا نما شخص نے دروازہ کھولا۔ اس کا وزن کم از کم تین سو پاؤنڈ ہوگا۔

"یہ کون سا وقت ہے؟" وہ غراتے ہوئے بولا پھر اپنی جگہ پر رک گیا۔ وہ شش و پنج کے عالم میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ ہم اس سے پہلے مل چکے تھے۔ ایک مہینے پہلے اس سے ہمارا ٹکراؤ ہوا تھا۔ وہ ایک گروہ کا سرغنہ تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے کسی اور کے آنے کی توقع تھی۔ وہ ننگے پاؤں اور قمیص کے بغیر تھا۔ اس نے ہاتھ میں شراب کی بوتل پکڑ رکھی تھی اور اس کی چھاتی پر کوبرا گینگ کا ٹیٹو بنا ہوا تھا۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں پر خون کے چھینٹے نظر آ رہے تھے لیکن کسی زخم کا نشان نہیں تھا جس کا مطلب تھا کہ یہ خون اس کا نہیں۔ وہ ہمیں پہچاننے کے بعد بولا۔ "کیا بات ہے؟ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟"

"کسی نے نوگیارہ پر شکایت درج کرائی ہے۔" آرٹ نے نرمی سے کہا۔ "ہمیں تمہاری بیوی سے بات کرنا ہوگی۔"

"یہاں کوئی عورت نہیں ہے۔" وہ نشے میں جھومتے ہوئے بولا۔ "دفع ہو جاؤ۔" نشے میں ہونے کی وجہ سے وہ بمشکل ہم پر اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے تھا۔

میں نے اس کے عقب میں لیونگ روم میں جھانکنے کی کوشش کی۔ وہاں ایک بڑا سا کاؤچ پڑا ہوا تھا اور اس کے سامنے والی دیوار پر ساٹھ انچ کا فلیٹ اسکرین ٹی وی نصب تھا جس پر کوئی فحش فلم چل رہی تھی لیکن اس کی آواز بند تھی۔ کافی کی میز پر چرس بھرے سگریٹ کے ٹکڑے اور خالی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔ ملحقہ کمرے کی چوکھٹ میں ایک سیاہ فام عورت کھڑی ہمیں دیکھ رہی تھی۔ اس کے جسم کا بالائی حصہ عریاں تھا اور وہ بھی ڈیگو کی طرح خون آلود تھی۔ اس کی بائیں آنکھ سوجی ہوئی تھی اور جبڑا ابھی اپنی جگہ سے ہل گیا تھا۔ اس کے جسم پر نظر آنے والا خون یقیناً اس کا اپنا ہی تھا۔

میں ڈیگو کے پاس سے گزرتا ہوا لیونگ روم میں چلا گیا اور اس عورت سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "مس! کیا تم لاشوانا فیرس ہو؟ تم نے ہی فون کیا تھا؟"

ڈیگو نے لپک کر میرا بازو پکڑ لیا لیکن آرٹ نے فوراً ہی جھٹکا دے کر اسے مجھ سے الگ کیا اور عقب سے اس کی کلائی مروڑتے ہوئے بولا۔ "آرام سے کھڑے رہو۔ ہم صرف اس عورت سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

میں نے لمحہ بھر انتظار کیا اور جب اندازہ ہو گیا کہ صورتِ حال ہمارے کنٹرول میں ہے تو اس عورت کی جانب متوجہ ہوا لیکن اچانک ہی نقشہ پلٹ گیا۔

ایک دوسرا بدمعاش لڑکھڑاتا ہوا کچن سے برآمد ہوا۔ اس نے بھی ہاتھ میں شراب کی بوتل پکڑ رکھی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ وہ ایک عظیم الجثہ شخص تھا اور کسی پہلوان کی طرح لگ رہا تھا۔ گول کندھے، چوڑی چھاتی، پھیلی ہوئی کمر اور چہرے پر گھنی مونچھیں۔ ہمیں لیونگ روم میں دیکھ کر اس کی بھویں تن گئیں اور وہ پھاڑ کھانے کے انداز میں بولا۔ "تم دونوں مسخرے یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ہمیں اس گھر سے نوگیارہ پر ایک کال موصول ہوئی تھی۔ ہمیں ایک عورت لاشوانا فیرس سے ملنا ہے۔ کیا وہی عقبی بیڈروم میں ہے؟"

اس نے اپنی نظریں مجھ پر جماتے ہوئے کہا۔ "وہ یہاں نہیں ہے۔ تم نے جسے دیکھا ہے، اس کا نام..." وہ کہتے کہتے رک گیا اور بولا۔ "مجھے یاد نہیں آ رہا لیکن یہ وہ نہیں جس سے تم ملنا چاہ رہے ہو۔"

اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور بولا۔ "مجھے گولی مت مارنا۔ میرے پاس تمہارے لیے ایک چیز ہے۔" یہ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کا ایک بنڈل نکال لیا۔

"یہ کس لیے ہے؟" میں نے اپنے ہتھیار پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

وہ محتاط انداز میں آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "میرا نام جو وارنر ہے۔ میں سراغ رساں ہوں اور پس پردہ رہ کر کام کرتا ہوں۔ تم میرے کام میں مداخلت کر رہے ہو۔ تمہیں فوراً یہاں سے چلے جانا چاہیے۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے لہجے میں مضبوطی تھی۔ مجھے اس کی بات پر یقین کرنا پڑا پھر بھی اسے آزمانے کے لیے پوچھا۔ "کیا تم بتا سکتے ہو کہ پٹرول مین یونین کا سیکریٹری کون ہے؟"

"یہ سوال تم نے کیوں پوچھا؟" وہ غراتے ہوئے بولا۔

"ایسے ہی۔ جاننا چاہ رہا ہوں کہ تمہاری معلومات کتنی وسیع ہیں۔"

"میٹ ڈرسکول۔ وہ دوسری بار اس عہدے کے

لیے منتخب ہوا ہے۔ اب یہ پیسے لو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ میرا حکم ہے۔"

وہ ایک سراغ رساں تھا اور مجھے اس کا حکم ہر حال میں ماننا تھا لیکن اس عورت کو بھی اس حال میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ آرٹ نے ڈیگو کا بازو پکڑ رکھا تھا لیکن اسے قابو کرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے ہماری آنکھیں چار ہوئیں اور میں نے اس کے چہرے پر لکھی تحریر پڑھ لی۔ "ان سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

میں جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ جیسے ہی میں نے جو سے پیسے لیے، مجھے اس کی انگلیوں پر خون نظر آیا۔ میں نے کہا۔ "یہ عورت ہمارے ساتھ جائے گی۔ ہم اسے کسی مناسب جگہ پر اتار دیں گے۔"

اس نے قمیص کے نیچے سے آٹومیٹک ریوالور نکالا اور مجھے دیوار کی طرف دھکیلتے ہوئے بولا۔ "تم اسے نہیں لے جا سکتے۔" اس نے ریوالور کی نال میرے چہرے پر عین آنکھ کے نیچے رکھ دی اور کہنے لگا۔ "تم نہیں جانتے کہ کس سے الجھ رہے ہو۔ ہم نے اس کے ساتھ کچھ نہیں کیا اس لیے فی الحال یہ نہیں جا سکتی۔ البتہ تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے پستول کی نال میرے گال کی ہڈی میں بری طرح چبھ رہی تھی۔ میں نے نظریں جھکا کر دیکھا۔ پستول کا سیفٹی کیچ ہٹا ہوا تھا۔ اس کی انگلی کی ایک جنبش میرے چہرے کے پرخچے اڑا سکتی تھی۔ میں نے تھوڑا پیچھے ہٹ کر اس کا پستول ایک طرف کیا اور مضبوطی سے اس کی کلائی پکڑ لی اور اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اپنے ماتھے سے اس کے چہرے پر زوردار ضرب لگائی جو اتنی شدید تھی کہ اس کے قدم زمین سے اکھڑ گئے اور وہ کمرے کے وسط میں پڑی ہوئی کافی کی میز سے جا ٹکرایا۔ اس کا پستول اور بوتلیں زمین پر گر گئیں۔ وہ زور زور سے سانس لے رہا تھا اور اس کی نظریں پستول کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں جسے میں نے لات مار کر دروازے کی طرف دھکیل دیا تھا۔ ڈیگو پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"مس! باہر آ جاؤ۔" میں نے اس عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اب تم محفوظ ہو۔ کھیل ختم ہو گیا۔"

لیکن کھیل ختم نہیں ہوا تھا۔ جو وارنر کہنیوں کے بل کھڑا ہو گیا اور چہرے سے خون صاف کرتے ہوئے بولا۔

"میں تم دونوں کا خون کر دوں گا لیکن اس سے پہلے تمہارے گھر والوں کو مار ڈالوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو اور کہاں رہتے ہو؟"

میں نے اس کے پیٹ پر زوردار لات جمائی اور بولا۔ "اپنی زبان بند رکھو۔"

وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا اور زور زور سے سانس لینے لگا۔

"آؤ لڑکی... چلیں۔" میں نے لڑکی کی کلائی پکڑتے ہوئے کہا۔

اچانک ہی کمرا فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ جو وارنر نے ٹخنے میں لگے ہولسٹر میں بھی ایک ریوالور چھپا رکھا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اسے باہر نکالا اور وحشیانہ انداز میں فائر کھول دیا۔ پہلی گولی میرے کندھے کو چھوتی ہوئی گزری اور ڈیگو کے گلے میں پیوست ہو گئی۔ وہ گھٹنوں کے بل گرا اور زور زور سے سانس لینے کی کوشش کرنے لگا لیکن چند ہی لمحوں میں اس کی موت واقع ہو گئی۔

میں اس عورت کو دروازے کی طرف دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میری کنپٹی پر ایک زوردار ضرب لگی اور میں آدھے راستے میں ہی لڑکھڑا کر رہ گیا۔ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ میں نے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی اور ایک مدہوش شرابی کی طرح ڈولتے ہوئے جیب سے بریٹا ایم نائن نکال لیا۔ میں بمشکل کھڑا ہو سکا تھا۔ گرم گرم خون میرے گالوں سے بہتا ہوا کالر کو بھگو رہا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے روشنیاں ناچ رہی تھیں اور سر میں دھماکے ہو رہے تھے۔

جو وارنر کا ریوالور خالی ہو چکا تھا لیکن وہ بدستور میرے چہرے کا نشانہ لیے بار بار ٹریگر دبا رہا تھا۔ جب اسے ریوالور خالی ہونے کا یقین ہو گیا تو وہ جھلاتے ہوئے بولا۔ "اگلی بار میں تم دونوں کو ضرور ماروں گا اور تمہارے بچوں کو بھی۔ تمہیں اس کا یقین کر لینا چاہیے۔"

"ہاں، مجھے یقین ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے سر کا نشانہ لیا اور دونوں آنکھوں کے بیچ میں سوراخ ہو گیا۔ وہ سر کے بل زمین پر گرا اور فرش پر چاروں طرف خون پھیل گیا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" آرٹ چلایا۔

"فائرنگ کا تبادلہ۔" میں نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی یوں لگا کہ میرے قدموں کے نیچے سے زمین کھسکتی جا رہی

ہے۔ میں گھٹنوں کے بل جھکا اور زمین پر گر گیا۔ اچانک ہی وہ عورت مجھ پر جھک گئی۔ اس کا چہرہ مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ اوہ میرے خدا! وہ عورت نہیں بلکہ لڑکی تھی۔

''مسٹر!'' اس نے مجھے پکارا۔ وہ رو رہی تھی۔ مجھے دور سے آرٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ میرا نام لے کر چلا رہا تھا۔ میں جواب دینا چاہتا تھا لیکن میری سانس قابو میں نہیں تھی پھر سب آوازیں ایک ایک کر کے معدوم ہوتی چلی گئیں۔

مجھے کچھ معلوم نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ میں آپریشن ٹیبل پر مُردوں کی طرح لیٹا ہوا تھا۔ بہت قریب سے چلائی گئی کولٹ اعشاریہ تین آٹھ کی گولی نے میرے سر کو شدید نقصان پہنچایا تھا۔ اس طرح کے زخم بہت مہلک ہوتے ہیں جبکہ میرا زخم تین گنا زیادہ مہلک تھا۔ آپریشن کے بعد میں کوما میں چلا گیا۔ ای ای جی کے مطابق میرا اعصابی نظام صرف اس حد تک کام کر رہا تھا جو کسی انسان کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔

سراغ رساں جو وارنر اور ڈیگو کی موت کی تصدیق ہو گئی تھی جبکہ وہ عورت جس نے اپنا نام لاشوانا فیرس بتایا تھا، غائب ہو چکی تھی۔ میری ماں دوسری صبح مجھے دیکھنے کے لیے ڈیٹرائٹ اسپتال آئی۔ اس میں ضبط کا مادہ بہت تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بالکل نہیں روئی۔ اس وقت بھی نہیں جب سرجن نے اسے بتایا کہ میں شاید شام تک بھی نہیں بچوں گا۔ وہ ساری دوپہر میرے بستر کے ساتھ بیٹھی آبائی قصبے کی تازہ ترین خبریں سناتی رہی۔ اس نے اسپتال کے پادری سے میرے لیے دعا کرنے کو بھی کہا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ میں اس رات نہیں مرا اور صبح زندہ رہا پھر ایک اور دن گزر گیا۔ اس کے بعد ایک اور۔ ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد بھی میں اسی طرح پڑا ہوا تھا اور گھر جانے کے قابل نہ تھا۔ میری حالت بہت نازک تھی۔ میں کسی حرکت، لمس یا آواز کا جواب دینے سے قاصر تھا۔ ڈاکٹروں کے خیال میں میری موت واقع ہو چکی تھی اور زندگی سے محض برائے نام سا رشتہ باقی رہ گیا تھا۔

آرٹ مجھے اس حال میں نہ دیکھ سکا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میرے چچا نے آبائی قصبے میں ڈیڈی کی قبر کے برابر میں زمین مختص کرا دی اور میری قبر کے سرہانے نصب کرنے کے لیے کتبے کا آرڈر بھی دے دیا۔ اب انہیں سرکاری طور پر میری موت کے اعلان کا انتظار تھا۔ چار دن بعد ڈیٹرائٹ کا میئر ڈیوڈ بین اپنے مصاحبوں اور فوٹوگرافرز کی ایک ٹیم کے ہمراہ مجھ سے ملنے آیا۔ اس نے میری گردن میں تمغہ پہنایا اور چند الفاظ کہے جو کہ میں نہ سن سکا لیکن مقامی خبروں کے لیے ایک زبردست فوٹیج ضرور تیار ہو گئی۔ اس کے علاوہ میرے باس ڈینا گرانٹ نے میری ماں کو ایک طلائی شیلڈ دی اور مجھے سراغ رساں کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ چیف نے ماں کو یقین دلایا کہ میری تدفین پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ ہوگی۔

مجھے کوما میں گئے پانچ ہفتے ہو گئے تھے۔ اس روز میں ہفتہ وار صفائی کے لیے اسٹیل کے باتھ ٹب میں لیٹا ہوا تھا کہ پانی کے اندر میرا سر پھسل گیا۔ میں جلدی سے اوپر آیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے میل نرس کو دیکھنے لگا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ہم دونوں میں کون زیادہ حیران ہوا۔ دوسرے دن اخبارات نے سرخی لگائی۔ ''مُردہ زندہ ہو گیا۔'' ایک اور اخبار کی سرخی تھی۔ ''قبر سے واپسی۔'' یہ سلسلہ ہفتے تک چلتا رہا۔

میں بچ تو گیا لیکن مجھ میں پہلے والی بات نہیں رہی تھی۔ چھ ہفتے تک بے حس و حرکت پڑے رہنے کی وجہ سے میرے اعصاب بُری طرح متاثر ہوئے تھے۔ اب میں پہلے جیسا سخت جان نہیں رہا تھا اور چلتے وقت اپنے آپ کو ایک مُردہ شخص سمجھتا تھا۔ جب آرٹ مجھے دوبارہ دیکھنے آیا تو ہم نے کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کیں۔ وہ میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو پھر اس نے مجھے اشارہ کیا اور ہم کوریڈور سے ہوتے ہوئے ایک چھوٹے کمرے میں آ گئے۔ مئی کے مہینے میں گولی لگی تھی اور اب چار جولائی قریب تھا۔

میں نے اسپتال کے کپڑے پہن رکھے تھے جبکہ آرٹ جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ ہم ایک صوفے پر بیٹھ گئے اور اپنے سر ایک دوسرے کے قریب کر لیے تاکہ کوئی تیسرا شخص ہماری باتیں نہ سن سکے۔

''کیا ہم بہت زیادہ مشکل میں ہیں؟''

''ہاں، ڈیگو ایک گینگسٹر تھا اس لیے اس کے قتل کی تحقیقات گینگ اسکواڈ کر رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم نے ایک درپردہ آپریشن میں مداخلت کی جس پر ڈیگو اشتعال میں آ گیا۔ اس نے تمہیں اور وارنر کو نشانہ بنایا اور ڈیگو تمہاری گولی سے مارا گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے لیے اس اسٹوری پر قائم رہنا بہتر ہوگا۔''

''لیکن وہ جانتے ہیں کہ میں نے وارنر پر گولی چلائی تھی پھر وہ مجھے بچانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟''

''وہ تمہارے لیے کچھ نہیں کر رہے۔ اس طرح محکمے کے دو مُردہ ہیرو مل جائیں گے۔''

''دو مُردہ ہیرو؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''تمہیں بھی مُردہ سمجھ لیا گیا تھا۔ کسی کو تمہارے بچنے کی امید نہیں تھی۔''

''میرا خیال ہے کہ میں کسی کے لیے باعثِ زحمت نہیں ہوں۔''

''ہاں، جب تک تم اس کہانی پر قائم رہو گے۔''

''اس لڑکی کا کیا بنا؟''

''اس کا کوئی مسئلہ نہیں۔'' آرٹ بولا۔ ''وہ مر چکی ہے۔ اس نے زیادہ مقدار میں منشیات لے لی تھی۔''

میں نے اپنا سر ہلایا جیسے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

''اور سنو۔'' آرٹ نے کہا۔ ''ہم دونوں کو فارغ کر دیا گیا ہے۔ میں نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کے لیے کاغذات جمع کرا دیے ہیں۔ وہ میرے لیے دوسری ملازمت کا بندوبست کر رہے ہیں۔ تم بھی معذوری کی بنیاد پر ڈسچارج ہو سکتے ہو۔''

''ایک منٹ۔'' میں نے اسے مزید بولنے سے روک دیا اور کہا۔ ''میں ملازمت چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں اور نہ ہی مجھ سے کسی نے اس بارے میں کچھ کہا ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''وہ اب یہ بات کہہ رہے ہیں اور تم ان کا پیغام لے کر آئے ہو۔ تم سے کس نے کہا کہ ہم ملازمت سے باہر ہو چکے ہیں؟''

''انہوں نے صرف مجھ سے کہا ہے اور میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ وہ صرف اپنے لوگوں کو بچانا چاہتے ہیں لیکن اگر ان کی بات نہ مانی تو اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ تمہیں یہ ڈیل ہر حال میں کرنا ہوگی۔''

''کیوں... صرف اس لیے کہ تم ایسا کر چکے ہو؟''

''نہیں میرے دوست۔ میں تو ہر حال میں یہ جاب چھوڑنے والا تھا۔''

''میرے لیے اس شخص کو مارنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ وہ میرے خاندان کو جان سے مارنے کی دھمکی دے رہا تھا۔''

''میں نے تمہیں تقریباً مُردہ حالت میں فرش پر پڑے ہوئے دیکھا تھا۔ تم خوش قسمت ہو کہ موت کے منہ سے واپس آ گئے لیکن میری رائے میں اب تمہیں یہ ملازمت چھوڑ دینی چاہیے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں اس بارے میں سوچوں گا۔'' میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

اچانک ہی اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس دو آدمی کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ وہ پولیس والے تھے اور میں انہیں جانتا تھا۔ ان میں سے ایک کیپٹن سام جیکب، کرائم ڈویژن کا ہیڈ اور دوسرا اس کا نائب سارجنٹ پیٹر تھا۔ میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا لیکن فوراً ہی میری حیرانی دور ہو گئی کیونکہ کیپٹن جیکب مرنے والے سراغ رساں جو وارنر کا باس تھا۔ پیٹر نے دروازے پر پوزیشن سنبھال لی اور کیپٹن جیکب مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم خاصے بہتر لگ رہے ہو۔ سر کی چوٹ کیسی ہے؟ کیا تمہارا دماغ صحیح طور پر کام کر رہا ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے تفصیل میں جانے سے گریز کیا اور بولا۔ ''میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''کیا کارپورل آرٹ بوڈری نے تمہیں صورتِ حال سے آگاہ کر دیا ہے؟''

''میں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔'' آرٹ جلدی سے بولا۔ ''ڈیلن اس پر تیار ہے۔''

''خوب۔'' جیکب سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نیچے ہال میں کوک مشین لگی ہوئی ہے۔ آرٹ! میرے لیے ایک بوتل لے آؤ۔ کیا تم میں سے کوئی اور کوک پینا پسند کرے گا؟''

کسی نے کچھ نہیں کہا۔ آرٹ اس کا اشارہ سمجھ کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ میرے قریب ہوتے ہوئے بولا۔ ''آرٹ نے تمہیں کیا بتایا ہے؟''

''اس کا کہنا ہے کہ جائے وقوعہ پر کچھ گڑبڑ تھی اور افسران محکمے کو بچانے کے لیے اسے دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''تم بہت خوش قسمت ہو کہ ہم سب سے پہلے وہاں پہنچے اور وارنر کے قتل کا الزام ڈیگو پر لگ گیا ورنہ آج تم جیل میں ہوتے۔''

''ممکن ہے۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''لیکن ہم بے گناہ ہیں۔ وہ آپے سے باہر ہو گیا تھا اور پہلے اس نے گولی چلائی تھی۔''

''جب تمہیں یہاں لایا گیا تو تمہاری جیب میں پانچ ہزار ڈالرز تھے۔ کیا تم عام طور پر اتنی بڑی رقم ساتھ رکھتے ہو؟''

''مجھے یہ رقم وارنر نے دی تھی تاکہ اس کے کام میں مداخلت نہ کروں اور وہاں سے چلا جاؤں۔''

"تم جانتے ہو کہ وہ پسِ پردہ رہ کر کام کر رہا تھا اور اب وہ مر چکا ہے اور تمہاری بات کی تصدیق نہیں کر سکتا۔"

"ہم وہاں ایک عورت کی شکایت پر گئے تھے جس کی پٹائی ہوئی تھی۔"

"لاشوانا فیرس۔" پیٹر نے کہا۔

"شاید، میری اس سے پہلے بات نہیں ہوئی تھی۔ اسے طبی امداد کی ضرورت تھی لیکن جب ہم نے اسے وہاں سے لے جانا چاہا تو صورتِ حال کنٹرول سے باہر ہو گئی۔"

"وہ کیسے؟" جیکب نے پوچھا۔ "ہمیں پوری بات بتاؤ۔ وہاں کیا ہوا تھا؟"

"مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں۔" میں نے محتاط انداز میں جواب دیا۔ "میں چھ ہفتے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ یہ سب باتیں مجھے اخبارات سے معلوم ہوئیں۔"

"اچھا جواب ہے۔" جیکب مسکراتے ہوئے بولا۔ "تم اسی پر قائم رہنا۔ جو وارنر اس دنیا سے ہیرو کی طرح چلا گیا۔ اس کی فیملی کو انشورنس کی مد میں ایک بڑی رقم مل جائے گی۔ تم اور آرٹ بھی تاحیات پنشن لیتے رہو گے۔ سب فائدے میں رہے۔ اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ بقیہ رقم کہاں ہے؟"

"کیسی رقم؟" میں نے پوچھا۔

"ہمیں بے وقوف مت بناؤ۔" پیٹر غرایا۔ "جو اور ڈیگو کے درمیان ایک بڑا سودا ہو رہا تھا اور وہ اس مقصد کے لیے نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس لے کر گیا تھا۔"

"میں نے وہاں ایسا کوئی بریف کیس نہیں دیکھا۔ ویسے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہاں کوئی سودا ہو رہا ہے بلکہ ایک پارٹی کا سا منظر تھا اور وہ دونوں اس لڑکی کو مشقِ ستم بنائے ہوئے تھے۔"

"مجھے یقین ہے کہ یہ سب کھیل کا حصہ تھا۔ کیا تم نے کبھی پسِ پردہ رہ کر کام کیا ہے؟"

"ہاں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اس میں بھی کچھ حدود ہوتی ہیں جن کا خیال رکھنا پڑتا ہے لیکن وارنر نے ایسا کچھ نہیں کیا۔"

"جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ ہم تمہیں بچانے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کے بدلے امید کرتے ہیں کہ تم بھی ہماری مدد کرو گے۔ جو کے پاس ایک لاکھ ڈالرز سے بھرا ہوا بریف کیس تھا۔ مجھے وہ چاہیے۔"

"مجھے اسٹریچر پر وہاں سے لایا گیا تھا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے وہ بریف کیس اس کی چادر کے نیچے چھپا رکھا ہو گا؟"

"تم نے جو کے کام میں مداخلت کی۔ اس وجہ سے تم پر بھی ذمے داری آتی ہے۔ اگر میں چاہوں تو ان پیسوں کی خاطر اس کیس کی دوبارہ تحقیقات شروع کر سکتا ہوں لیکن میرے خیال میں یہ تمہارے حق میں بہتر نہ ہو گا۔"

میری پوری توجہ جیکب پر تھی۔ اس لیے پیٹر کو حرکت کرتے ہوئے نہ دیکھ سکا جو خاموشی سے میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"ہم ابھی تمہارا دماغ درست کر سکتے ہیں۔" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "سر پر لگنے والی ایک ضرب تمہارے دماغ کو ریزہ ریزہ کر دے گی۔"

اس نے میرے زخم کے اوپر والے بال پکڑ لیے اور میری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔

"اسے چھوڑ دو۔" آرٹ بولا۔ اس کی آواز میں غراہٹ تھی۔ اس نے کوک کی بوتلیں میز پر رکھیں اور بولا۔ "میں تم سے دوبارہ نہیں کہوں گا سارجنٹ۔"

اس کے خطرناک تیور دیکھ کر جیکب نے اشارہ کیا اور پیٹر دوبارہ دروازے پر چلا گیا۔ جیکب بولا۔ "میں یہاں کوئی کھیل کھیلنے نہیں آیا۔ تم رقم واپس کر دو۔ ہم ہمیشہ کے لیے یہ کیس بند کر دیں گے۔"

میرے سر میں دھماکے ہو رہے تھے اور میں ان کی باتوں کا جواب دیتے ہوئے بُری طرح تھک چکا تھا اس لیے میں نے کچھ نہیں کہا۔

جیکب نے اپنی نظریں مجھ پر جمائیں اور غصے سے بولا۔ "کیا میں تمہیں کوئی تکلیف دے رہا ہوں؟"

"ہماری طرف سے بھی کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔" آرٹ نے جلدی سے کہا۔

"ہاں، میں جانتا ہوں کہ تمہاری طرف سے کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ تمہیں یاد رہنا چاہیے کہ تمہاری نئی ملازمت کا بندوبست کس نے کیا ہے۔"

"تم نے جو کچھ کیا، ہم اس کی قدر کرتے ہیں۔ بریف کیس کے بارے میں پریشان نہ ہو، ہم کچھ کرتے ہیں۔"

"تمہارے پاس ایک ہفتہ ہے۔ اس سے زیادہ مہلت نہیں مل سکتی۔ اب ہم چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا لیکن پیٹر اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ اس کی نظریں بدستور مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

"کیا کچھ اور کہنا باقی ہے؟" میں نے اس سے

پوچھا۔

"ہاں۔" وہ سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ "وہ عورت لاشوانا فیرس جس کے بارے میں تمہارا کہنا ہے کہ وارنر نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی، مجھے اس کی لاش ملی ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" میں حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی جیکٹ سے ایک تصویر نکال کر مجھے پکڑا دی۔

وہ جائے واردات کی تصویریں تھیں۔ ان میں ایک سیاہ فام عورت ناکافی لباس پہنے ہوئے گلی میں پڑی ہوئی تھی۔ اس عورت کا چہرہ نامانوس تھا البتہ پشت پر اس کے کوائف درج تھے۔ لاشوانا فیرس۔ عمر اڑتیس سال۔ پتا لیفٹ ٹاورز۔ میں نے اس عورت کو کبھی نہیں دیکھا تھا اور میں یہ بات کہنے ہی والا تھا لیکن کچھ سوچ کر رک گیا۔

"اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟"

"یہ عورت منشیات کی عادی تھی۔ زیادہ مقدار لینے سے اس کی موت واقع ہو گئی۔"

میرا ذہن اس عمارت کی طرف چلا گیا جہاں ہم اسی نام کی عورت کو بچانے کے لیے گئے تھے۔ وہ اس تصویر والی عورت کے مقابلے میں کافی کم عمر تھی۔ اس کی جلد صاف اور ملائم تھی۔ اس پر کوئی نشان نہ تھا۔

"کیا تم نے بوبی وڈورڈ نام کی کسی عورت کا نام سنا ہے؟" پیٹر بولا۔

"نہیں، وہ کون ہے؟"

"کوئی نہیں۔" اس نے کہا۔ "پہلے تم رقم تلاش کرو پھر اس بارے میں بات کریں گے۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد آرٹ نے کہا۔ "اوہ میرے خدا! تم کیا سمجھتے ہو کتنی بار تمہیں زندگی ملے گی؟ تم پہلے ہی ادھار کی زندگی جی رہے ہو۔ میں ایک منٹ کے لیے کمرے سے باہر کیا گیا... تم نے اپنے لیے نئی مصیبت مول لے لی۔ تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟"

اس نے کوک کی ایک بوتل میرے حوالے کی اور ہم دونوں اس کے گھونٹ لینے لگے۔

"کیا انہوں نے تمہیں پیسوں کے بارے میں بتایا تھا؟"

"نہیں، میں نے وہاں کوئی بریف کیس نہیں دیکھا۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔"

"میرے گر جانے کے بعد کیا ہوا تھا؟"

جھوٹ بولے کوا کاٹے، بیوی سے ڈریو!

شوہر نے دفتر سے فون کیا اور بیوی سے کہا۔ "جلدی سے میرا فشنگ کا سامان تیار کر دو اور ہاں، میرا نیلا سلیپنگ سوٹ بھی ضرور رکھ دینا۔ میں اپنے باس کے ساتھ ایک ہفتے کے لیے فشنگ پر سوات جا رہا ہوں۔ باس کے کچھ بے تکلف دوست بھی ساتھ ہوں گے۔ بڑا اچھا موقع ہے... میں اپنے پروموشن کی بات کر سکوں گا۔ سامان تیار رکھنا۔ میرے پاس وقت نہیں ہو گا۔ سات بجے پنڈی کی فلائٹ پر سیٹ بک ہے، میں سامان اٹھا کر نکل جاؤں گا۔"

بیوی سعادت مند تھی۔ سب کچھ اسی طرح ہوا۔ ایک ہفتے بعد شوہر نامدار خوش و خرم گھر لوٹے تو بیوی نے پوچھا۔ "ٹرپ کیسا رہا؟ خوب مچھلیاں پکڑی ہوں گی؟"

"زبردست رہا... ٹراؤٹ کے ڈھیر لگ گئے، کبھی تَل کر کھاتے اور کبھی پکا کر... بہت مزا آیا... لیکن ڈارلنگ تم نے میرا نیلا سلیپنگ سوٹ سامان کے ساتھ نہیں رکھا؟"

"وہ فشنگ والے سامان کے تھیلے میں تھا۔" بیوی نے اسے گھورتے ہوئے کہا... "اسے کھولا ہوتا تو نیلا سلیپنگ سوٹ بھی مل جاتا۔"

تھرپارکر سے کندن کا استفسار

محاذ

دنیا میں شیر دل نوجوانوں کی کوئی کمی نہیں۔ وہ ہر لمحے جائز مقاصد کے لیے لڑنے بھڑنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے جواں مرد فوج میں چلے جاتے ہیں، اعلیٰ مقاصد کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں اور پھر باعزت طور پر ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ بیشتر شادی کر لیتے ہیں اور آخری سانس تک اس محاذ پر لڑتے رہتے ہیں، کبھی ریٹائر نہیں ہوتے۔

کراچی سے شاہد حسین کا تجزیہ

”مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ دراصل اس وقت میرے حواس بھی جواب دے چکے تھے۔“

”کیوں؟“

”تمہیں گرتا دیکھ کر میری حالت غیر ہو گئی۔ تمہاری نبض نہیں چل رہی تھی۔ میں نے ایمبولینس کے لیے فون کیا اور تمہیں کندھے پر لاد کر سیڑھیوں کے ذریعے نیچے لے آیا۔“

”تم چوتھی منزل سے مجھے لے کر سیڑھیوں کے ذریعے آئے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”تم مر رہے تھے اور لفٹ کام نہیں کر رہی تھی اس لیے میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا لیکن میں نے کسی کو بریف کیس لے جاتے نہیں دیکھا۔“

”اس لڑکی کے ساتھ کیا ہوا؟“

”جب میں تمہاری نبض ٹٹول رہا تھا تو وہ میرے پاس سے گزرتی چلی گئی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ خالی ہاتھ ہی تھی۔“

”وہ تصویر کس عورت کی تھی؟ یقیناً یہ وہ لڑکی تو نہیں جسے ہم نے اس عمارت میں دیکھا تھا۔“

”جیسا کہ پیٹر نے بتایا کہ وہ چالیس سالہ لاشوانا فیرس کی تصویر ہے جو اسی بلڈنگ میں رہتی تھی۔ وہ بے حد موٹی تھی اور اس کا وزن تین سو پاؤنڈ تھا۔ اس واقعے کے چند روز بعد اس کی لاش گلی میں پائی گئی۔ میں نے اس لڑکی کو غور سے نہیں دیکھا لیکن یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کا وزن تین سو پاؤنڈ نہیں تھا۔“

”نہیں۔“ میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ دبلی پتلی تھی اور اس کی عمر بمشکل بیس سال ہوگی۔ اس کی انگلیوں کے نشانات سے کچھ معلوم ہوا؟“

”اس لڑکی کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ لگتا ہے وہ کوئی بھوت تھی۔ اس کے بارے میں پڑوسیوں سے بھی پوچھ گچھ کی گئی لیکن کسی کو کچھ معلوم نہیں۔“

”اگر اس کا ہمارے سسٹم میں کوئی ریکارڈ نہیں تو وہ کینیڈین بھی ہو سکتی ہے۔ کیا جیکب نے وہاں کی پولیس سے رابطہ کیا؟“

”میں نے یہ تجویز پیش کی تھی لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔“

”پیٹر نے بوبی وڈورڈ کا نام لیا تھا، یہ کون ہے؟“

”یہ ایک فرضی نام ہے جو لاشوانا فیرس نے اپنی جان چھڑانے کے لیے لیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے بوبی وڈورڈ کو وارنر اور ڈیگو کے ساتھ دیکھا تھا۔ پیٹر کو اس کہانی پر یقین نہیں آیا۔ ہم نے پورا ریکارڈ کھنگال لیا لیکن ایسا کوئی نام سسٹم میں نہیں ہے۔“

”اس سے پہلے کہ صورتِ حال مزید خراب ہو، ہمیں اس لڑکی کا پتا لگانا ہوگا اور اگر ہم کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اس بارے میں محکمے کو بتا سکتے ہیں۔“

”تم انہیں کیا بتاؤ گے؟“ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ”اس گمشدہ رقم کی کہانی جو ہم نے نہیں دیکھی یا وارنر کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے اور جیکب اسے پسند نہیں کرے گا۔ کیا اس محکمے میں تمہارا کوئی جاننے والا ہے؟“

”نہیں۔“

”میرا بھی کوئی نہیں ہے لیکن میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ جیکب کے وہاں بہت سے جاننے والے ہوں گے۔ وہ کس کی بات کا یقین کریں گے۔ اگر ہم نے زبان کھولی تو جیل کی ہوا کھانا پڑے گی یا پھر اس عورت کی طرح مار دیے جائیں گے۔ میں بیوی بچوں والا ہوں اور ان لوگوں کی مخالفت مول نہیں لے سکتا۔ جیکب نے میرے لیے دوسری ملازمت کا بندوبست کر دیا ہے۔ ایک پرانی کہاوت ہے کہ حالات کے مطابق چلنا چاہیے۔ میں بھی ایسا ہی کر رہا ہوں۔“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر وہ بولا۔ ”اب تم کیا کرو گے؟“

”میں نہیں جانتا۔ وارنر، ڈیگو اور وہ عورت مر چکے ہیں۔ اگر ہم نے اس لڑکی کو تلاش نہ کیا تو وہ بھی ماردی جائے گی۔ کیا تم اب بھی اپنا راستہ الگ کرنا چاہتے ہو؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کی خاموشی میں ہی جواب پنہاں تھا۔ مجھے اس کے رویے پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ شخص جو میری جان بچانے کے لیے میرے نیم مُردہ جسم کو کندھے پر لاد کر چوتھی منزل سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا جو رو رو کر میری زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا، اب اچانک ہی اجنبی ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے ایک بات بالکل صحیح کہی تھی۔ میں واقعی ادھار کی زندگی گزار رہا تھا۔ ایک مرتبہ میں موت کے منہ سے واپس آ گیا لیکن ضروری نہیں کہ ہر بار ایسا ہو۔ میں اس مصیبت سے جان چھڑانا چاہ رہا تھا لیکن میری حالت ایسی نہ تھی کہ پیٹر یا کسی اور سے ٹکر لے سکوں۔

میں نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں تو اس لڑکی کا چہرہ سامنے آ گیا۔ اگر میں اگلے سو برس بھی زندہ رہتا تو اسے نہیں بھول سکتا تھا۔ پیٹر نے اس کے مغالطے میں غلط عورت کو پکڑ لیا تھا اور اب وہ مر چکی تھی لیکن وہ ایک ہوشیار شکاری تھا اور بالآخر اس لڑکی تک پہنچ جاتا۔ اگر اس لڑکی کے پاس وہ رقم ہوئی تو وہ اسے بھی لاشوانا فیرس کی طرح مار ڈالے گا۔ اس سے پہلے مجھے اس لڑکی کو تلاش کر لینا چاہیے۔

میں اپنے کمرے میں واپس آیا اور الماری سے لیپ ٹاپ نکال کر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے میں نے طوائفوں کا ریکارڈ دیکھنا شروع کیا۔ لاشوانا فیرس کی سرگرمیوں کی فہرست بہت طویل تھی۔ وہ کئی بار جنسی بے راہ روی اور منشیات رکھنے کے الزام میں گرفتار ہو چکی تھی۔ اس کا بوبی وڈورڈ کے ساتھ کوئی تعلق نظر نہیں آیا۔ آرٹ نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس لڑکی کا قانون نافذ کرنے والے اداروں کے پاس کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ لہٰذا میں نے اس کے بارے میں تفصیلات جاننے کے لیے پبلک ریکارڈ کھنگالنا شروع کیا۔ موٹر وھیکل ڈپارٹمنٹ، ٹیلی فون، کیبل سروس، کریڈٹ ریکارڈ... لیکن کہیں سے کچھ معلوم نہیں ہوا۔ میں نے اپنی تلاش کا دائرہ مزید بڑھایا اور اس نام کی دو عورتوں کے بارے میں جاننے میں کامیاب ہو گیا۔ ان میں سے ایک بلوکسی اور دوسری لاس اینجلس میں رہتی تھی۔ پہلی والی کی عمر چھپن سال، شادی شدہ اور چار بچوں کی ماں تھی جبکہ دوسری کے بارے میں تفصیلات نہ مل سکیں۔ وہ طویل عرصے سے لاس اینجلس میں قیام پذیر تھی اور یقیناً یہ وہ لڑکی نہیں تھی جسے میں نے دیکھا تھا۔

اس لڑکی کی وہاں موجودگی سوالیہ نشان بن گئی تھی۔ وہ خود آئی یا لائی گئی، یہ الگ موضوع تھا لیکن پارٹی کے دوران وہ لوگ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے اور انہوں نے لڑکی کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا۔ تب اس نے خوف زدہ ہو کر نو گیارہ کو فون کیا اور اپنا اصلی نام بتانے کے بجائے لاشوانا فیرس کا نام لے دیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پولیس کو بہت سے جعلی فون بھی موصول ہوتے ہیں اور ریکارڈ چیک کرنے کے بعد ایسی شکایات کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے چنانچہ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ پولیس اس کے ٹیلی فون پر کارروائی کرے گی، اس نے ایسی عورت کا نام استعمال کیا جو واقعتاً وہاں رہتی تھی۔

وہ لڑکی پیشہ ور طوائف نہیں تھی پھر وہ وہاں کیا کر رہی تھی؟ اس نے اپنا نام بوبی وڈورڈ بتایا تھا جو کہ ایک مشہور رپورٹر تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

ممکن ہے کہ وہ بھی کوئی شوقیہ رپورٹر ہو اور کسی اسٹوری کی تلاش میں وہاں آئی ہو لیکن وہ بہت کم عمر تھی۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ بیس سال ہوگی... تو وہ کیا کوئی طالب علم تھی؟ مجھے یاد آیا کہ یونیورسٹی اس عمارت سے صرف چھ بلاک کے فاصلے پر تھی۔

میں نے یونیورسٹی کی انتظامیہ کو فون کیا۔ ان کے ریکارڈ میں بوبی وڈورڈ نامی کسی لڑکی کا نام نہیں تھا پھر میں نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ کسی ایسی لڑکی کا نام بتا سکتے ہیں جس نے حال ہی میں جرنلزم ڈپارٹمنٹ چھوڑا ہو، تب انہوں نے مجھے تانیا میتھیو کا نام بتایا۔ وہ دوسرے سال کی طالبہ تھی اور اس کا مستقل پتا ڈیئر بورن کا تھا۔ وہ اسکول چھوڑنے کے بعد کیمپس کے نزدیک ہی اسٹاربک نامی کافی ہاؤس میں کام کر رہی تھی۔ میں نے فون کیا۔ اب وہ وہاں کام نہیں کر رہی تھی لیکن اسٹاربک کی شاخیں چپے چپے پر موجود ہیں اور اس کے گھر کے نزدیک بھی ایک کافی ہاؤس تھا۔ وہ یقیناً کسی ایسی اسٹوری کی تلاش میں تھی جس کے ذریعے صحافت میں اپنا کیریئر بنا سکے۔

دوسری صبح میں کسی کو بتائے بغیر اسپتال سے نکل پڑا۔ گو کہ یہ ڈاکٹر کی ہدایات کے خلاف تھا لیکن میرے پاس انتظار کی گنجائش نہیں تھی۔ وقت تیزی کے ساتھ میرے ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا تھا۔ میں سہ پہر کے وقت اس کافی ہاؤس میں پہنچا۔ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکی مجھے پہلے کے مقابلے میں بہت مختلف لگی لیکن جب اس نے میری طرف دیکھا تو میرے ذہن میں کوئی شبہ باقی نہ رہا۔ یقیناً یہ وہی لڑکی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ زرد اور آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ دروازے کی طرف بڑھنے ہی والی تھی کہ میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور اپنا بیج دکھاتے ہوئے بولا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ میں تم سے صرف ایک منٹ بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم کسی مشکل میں نہیں ہو۔ کیا ہم کہیں بیٹھ سکتے ہیں؟“

وہ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد کھڑکی کے قریب ایک میز پر بیٹھ گئی لیکن انداز ایسا تھا کہ موقع ملتے ہی اٹھ کر بھاگ جائے گی۔ میں نے نرمی سے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ تم سے اس طرح ملاقات ہو رہی ہے۔ تم مجھے بھول تو نہیں گئیں؟“

”تم وہی پولیس والے ہو۔ میں تو سمجھی تھی کہ مر گئے۔ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ ایک پولیس والا مارا گیا۔“

”وہ وارنر تھا۔ میری زندگی باقی تھی اس لیے بچ گیا۔“

''دیکھو مسٹر! میں نے کچھ نہیں دیکھا اس لیے میں تم سے کوئی بات نہیں کروں گی۔''

''میں اس لیے یہاں نہیں آیا۔'' میں نے دھیما لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''یاد کرو، اس رات بھی میں نے تمہیں وہاں سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔''

''ہاں، مجھے یاد ہے۔ تم نے میرا ہاتھ پکڑا تھا۔ اس کے بعد سب کچھ گڑبڑ ہو گیا۔''

''تم وہاں کس لیے گئی تھیں؟''

''میں طوائفوں پر ایک کہانی لکھ رہی تھی۔ میں نے اس سلسلے میں لاشوانا فیرس سے رابطہ کیا تو اس نے تجویز پیش کی کہ میں خود طوائف کا بھیس بدل کر وہاں آجاؤں۔''

''تم نے یہ نہیں سوچا کہ اس کے بعد تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں مطلب کی بات پر آگیا اور بولا۔ ''اس اپارٹمنٹ میں ایک بریف کیس بھی تھا؟''

''ہاں، وہ بریف کیس بیڈروم میں رکھا ہوا تھا۔ اس پولیس والے کے آنے سے پہلے ڈیگو نے مجھے وہ دکھایا تھا۔''

''کیا تم یہ کہہ رہی ہے کہ ڈیگو وہ رقم وارنر کو دینے کے لیے لایا تھا... مگر کیوں؟''

''یہ میں نہیں جانتی۔ شاید ان کے درمیان سودے بازی ہوئی ہوگی۔''

''کیا تم وہ بریف کیس اپنے ساتھ لے گئی تھیں؟''

''کیسی باتیں کررہے ہو مسٹر! مجھے تو اپنے کپڑے پہننے کی مہلت نہیں ملی۔ ایک عورت نے مجھے پناہ دی۔ میں نے اسے فرضی کہانی سنائی اور غلط نام بتایا۔ اس نے ترس کھا کر مجھے بس کا کرایہ دیا اور میں پہلی بس سے کینساس سٹی چلی گئی۔ وہاں میں نے کچھ روز قیام کیا اور جب معاملہ ٹھنڈا ہو گیا تو واپس آگئی لیکن تم یہاں کیوں آئے ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''وہ بریف کیس وہاں سے غائب ہے۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں نے آخری بار اس بریف کیس کو بیڈروم میں ہی دیکھا تھا۔''

''کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ بریف کیس کہاں گیا؟''

''میرے پاس وہ بریف کیس نہیں ہے۔ تمہیں مجھ پر یقین کرنا چاہیے۔''

''میرے یقین کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ صرف میں ہی اس بریف کیس کو تلاش نہیں کررہا، میری طرح دوسرے لوگ بھی تم تک پہنچ سکتے ہیں۔ لہٰذا میں روزانہ دوپہر کو سیل فون پر پیغام بھیجوں گا جب تک یہ معاملہ ختم نہیں ہوجاتا... اور اگر کسی وجہ سے میں تمہیں پیغام نہ بھیج سکوں تو تم غائب ہو جانا۔''

اس نے کوئی سوال یا بحث کیے بغیر اپنا فون نمبر مجھے دے دیا۔ واپس آتے وقت میں نے اس کی باتوں پر غور کیا تو مجھے اس میں سچائی نظر آئی۔ وہ بریف کیس لے کر نہیں گئی تھی مجھے اس پر یقین کرنا پڑا۔ وارنر اور ڈیگو اس دنیا سے جا چکے تھے۔ اب صرف آرٹ باقی رہ گیا تھا۔ میرا دوست اور پارٹنر جس نے میری جان بچائی تھی لیکن اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ وہ بھی بیوی بچوں والا تھا۔ اتنی بڑی رقم دیکھ کر اس کے دل میں بے ایمانی آسکتی تھی لیکن وہ میرا دوست تھا اور مجھ سے زیادہ اسے کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں یہ ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا کہ وہ یہ ناجائز رقم چوری کرسکتا ہے۔ اگر میں دنیا میں کسی ایک شخص پر بھروسا کرسکتا ہوں تو وہ صرف آرٹ ہے لیکن وہاں صرف پانچ آدمی تھے۔ ڈیگو، وارنر، آرٹ، میں اور وہ لڑکی۔ نہیں۔ ایک شخص اور بھی ہوسکتا ہے جسے میں نے نہیں دیکھا کیونکہ میں اس وقت بے ہوش ہوچکا تھا۔

اسے تلاش کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ میں نے اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں فون کرکے جاننا چاہا کہ جب مجھے اسپتال لایا گیا تو آرٹ کے علاوہ میرے ساتھ آنے والوں میں اور کون تھا۔ انہوں نے فوراً ہی مجھے ایسٹ پوائنٹ میں ایک گھر کا پتا دے دیا۔ یہ ایک مضافاتی علاقہ ہے جہاں متوسط درجے کے لوگ رہتے ہیں۔ مجھے اس گھر کو تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں نے دروازے کے باہر ایک نئی چمکتی ہوئی کار دیکھی۔ میں اس کے پیچھے چھپ کر مکان کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے دیکھا کہ کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور وہاں سے کوئی شخص مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں کار کے پیچھے جھک کر بیٹھ گیا اور اپنے دونوں بازو سینے پر باندھ لیے۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس مکان سے باہر آیا لیکن وہ خالی ہاتھ نہیں تھا بلکہ اس نے ایک دو فٹ لمبا پائپ کا ٹکڑا اپنی مٹھی میں پکڑا ہوا تھا۔

اس نے قریب آکر کہا۔

''کار سے باہر آجاؤ۔''

''کیا تم ایلا ڈوگومین ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں لیکن تم کون ہو؟'' اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا پھر اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''تم وہی پولیس والے ہو؟''

''ڈیلن لاکروز۔'' میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور بولا۔ ''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔''

اس نے میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظرانداز کردیا اور بولا۔ ''ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔ شاید تمہیں یاد نہ ہو، تم اسٹریچر پر مُردہ پڑے ہوئے تھے۔ میں ہی تمہیں وہاں لے کر آیا تھا۔ میں نے تمہاری زندگی بچائی تھی۔''

''میں تمہارے احسان کا بدلہ چکانے آیا ہوں۔ تمہیں وہ بریف کیس واپس کرنا ہوگا۔''

''مجھے اندازہ تھا کہ کوئی نہ کوئی اس بریف کیس کو لینے ضرور آئے گا لیکن یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ تم بھی ہوسکتے ہو۔''

''تم نے یہ بریف کیس کس طرح حاصل کیا؟''

''جب تمہارے دوست نے تمہیں اسٹریچر پر ڈالا تو اس کا خیال تھا کہ تم مرچکے ہو۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اوپر دو زخمی اور بھی ہیں۔ میں انہیں دیکھنے گیا تو وہاں دو لاشیں اور یہ بریف کیس پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس وقت اسے چھپا دیا اور بعد میں جاکر لے آیا۔''

''تم نے جو کچھ میرے لیے کیا، اس پر میں تمہارا شکرگزار ہوں لیکن تمہیں یہ رقم واپس کرنا ہوگی۔''

''ممکن ہے کہ پوری رقم اپنے پاس نہ رکھ سکوں لیکن مجھے کوئی انعام یا معاوضہ تو ملنا چاہیے۔ اس کے لیے میں کسی وکیل کی خدمات حاصل کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں جو اس طرح کا کوئی معاہدہ تیار کرسکے۔''

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ تم نے جن لوگوں کی رقم چرائی ہے، وہ تم پر مقدمہ نہیں کریں گے اور نہ ہی تمہیں گرفتار کریں گے بلکہ تمہیں خاموشی سے راستے سے ہٹا دیں گے۔ اس رقم کی وجہ سے تین آدمی اپنی جان سے ہاتھ دھو چکے ہیں اور چوتھے تم ہوسکتے ہو۔''

''لیکن مجھے بھی تو کوئی فائدہ ہونا چاہیے۔'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''میں دو جگہ ملازمت کرتا ہوں۔ اس کے باوجود میرے مالی حالات کچھ اچھے نہیں ہیں۔''

''بیس فیصد کافی ہیں؟'' مجھے خود بھی اس پیشکش پر حیرت ہورہی تھی۔

''کیا؟''

''اسے تم اپنی فیس سمجھ لو۔ ویسے اس بریف کیس میں کتنی رقم تھی؟''

''ایک لاکھ چالیس ہزار ڈالرز لیکن میں نے بلوں کی ادائیگی کے لیے کچھ پیسے خرچ کیے ہیں۔''

''اور یہ کار؟''

''ابھی اس کی ادائیگی نہیں ہوئی ہے۔ میں اسے واپس کردوں گا۔''

''تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا۔ تمہیں چالیس ہزار ڈالرز ملیں گے۔ ان سے تم اپنی زندگی بہتر بنا سکتے ہو۔ وہ بریف کیس میرے حوالے کردو۔''

واپس آتے ہوئے میں نے جیکب کو فون کرکے بتایا کہ ہماری گمشدہ چیز مل گئی ہے۔ ہم نے ملنے کا پروگرام بنایا۔ جب میں مقررہ جگہ پر پہنچا تو پیٹر میرا منتظر تھا۔ وہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ میں نے جان بوجھ کر ایک معروف ترین کونے کا انتخاب کیا۔ جیکب نے وعدہ کیا تھا کہ پیٹر اکیلا ہی آئے گا لیکن مجھے اس پر شک تھا اور ایسا ہی ہوا۔ جیکٹ میں ملبوس اس کا ایک ساتھی ہاٹ ڈاگ کے اسٹال پر کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا جبکہ دوسرا بیس گز کے فاصلے پر ایک بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ پیٹر میری طرف بڑھا اور بریف کیس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''رقم لائے ہو؟''

''ہاں، میں نے صرف اپنی فیس لی ہے۔''

''ایسا طے نہیں ہوا تھا۔'' اس نے برہمی سے کہا۔

''مجبوری تھی۔ اس کے بغیر رقم نہیں ملتی۔''

''کتنے پیسے کم ہیں؟''

''چالیس ہزار۔'' میں نے بریف کیس زمین پر رکھا اور پاؤں سے اس کی طرف دھکیلتے ہوئے بولا۔ ''اسے تم میری محنت کا معاوضہ سمجھ لو۔ باقی رقم تمہاری ہے۔ میں نے اپنا کام کردیا۔''

''نہیں، ابھی وارنر کی موت کا حساب ہونا باقی ہے۔ میں تمہیں اتنی آسانی سے نہیں چھوڑوں گا۔''

''اگر تمہارے اندر ذرا سی بھی عقل ہے تو مجھے جانے دو۔''

''تم جہاں جاؤ گے ہم تمہارا پیچھا کریں گے۔ میں تمہیں مُردہ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''آج تو یہ ممکن نہیں۔ یہاں سیکڑوں لوگ موجود ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے تمہاری خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔ اپنے پیسے لو اور یہاں سے چلے جاؤ۔''

''اس ہجوم کی وجہ سے ہی تم زندہ نظر آرہے ہو۔'' اس

نے بریف کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ ادھار کی زندگی ہے اور کسی بھی وقت اس کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ تم زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہو گے۔“

اس کی دھمکی نے مجھے چراغ پا کر دیا اور میرے قدم اس کی جانب بڑھنے لگے۔ غصے کی کیفیت میں یہ بھول گیا کہ اس کے دو آدمی مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ پیٹر کو بھی شاید صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوگیا تھا۔ اس نے گھوم کر مجھے دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کا ہاتھ تیزی سے اپنے ہتھیار کی طرف بڑھا۔ اس نے ریوالور نکال لیا لیکن اس کے فائر کرنے سے پہلے میں اس کے اوپر جا گرا۔ ہم ایک ساتھ پختہ فرش سے ٹکرائے اور اب دونوں ہی ریوالور پر قابو پانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔

زمین پر گرتے ہی میری جان نکل گئی۔ میں اس حالت میں نہیں تھا کہ پیٹر جیسے درندے کا مقابلہ کرتا۔ میری گرفت اس کے ریوالور پر سے کمزور ہوگئی۔ اس نے جیسے ہی فائر کیا، میں نیچے کی جانب جھک گیا اور گولی میرے کان کے پاس سے گزر گئی۔ اس نے ریوالور میرے سینے پر رکھنے کی کوشش کی لیکن میں نے پوری قوت سے اس کی کلائی پکڑی اور اس کے ساتھ ہی دوسرا فائر ہوگیا۔ ایک لمحے کے لیے یوں لگا جیسے میرا وقت ختم ہوگیا ہو لیکن ریوالور کی نال کا رخ دوسری جانب ہوگیا تھا۔ انتہائی قریب سے چلنے والی گولی نے پیٹر کا جبڑا اکھاڑ دیا تھا۔ اس کا آدھا چہرہ غائب ہوگیا تھا۔ میں نے بمشکل تمام اپنے آپ کو اس سے الگ کیا لیکن ریوالور ابھی تک اس کی مٹھی میں تھا۔ میں نے ریوالور پر لات ماری اور اس کے ہاتھ سے بریف کیس لے کر فضا میں اچھال دیا۔ دوسرے ہی لمحے نوٹوں کی بارش ہونے لگی۔ وہاں موجود لوگوں کے لیے یہ ایک حیرت انگیز منظر تھا۔ دوسرے لمحے وہاں بھگدڑ مچ گئی اور سب لوگ زیادہ سے زیادہ نوٹ سمیٹنے کے لیے اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ عین اس وقت میرے قریب سے ایک گولی گزری جو پیٹر کے ساتھی نے مجھ پر چلائی تھی۔ اب وہ لوگوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا میری طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ دوسری بار مجھے نشانہ بنا سکے۔ اچانک ہی ایک پولیس والا اس کے راستے میں آگیا اور چلاتے ہوئے بولا۔ ”ہتھیار پھینک دو۔“

میں خطرہ محسوس کرتے ہی زمین پر جھک گیا اور اس کا نشانہ ایک بار پھر خطا ہوگیا۔ دوسرے ہی لمحے نوجوان پولیس والے کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی اس کے سینے میں پیوست ہوگئی۔ فائرنگ کی آواز سے مجمع میں خوف و ہراس پھیل گیا اور لوگ اپنی جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ میں بھی ان میں شامل ہوگیا۔

راستے میں مجھے جیکب کا فون موصول ہوا۔ وہ بھرّائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”اس سے پہلے کہ تم مجھ پر شک کرو، یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ پیٹر کا انفرادی فعل تھا۔ میں نے اسے صرف رقم وصول کرنے کے لیے بھیجا تھا لیکن وہ بلاوجہ ہی تم سے الجھ پڑا۔“

”میرے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں نے اپنے حصے کا کام کر دیا تھا لیکن پیٹر کی حماقت سے تمہاری رقم ضائع ہوگئی۔“

”کیا وہ مرگیا؟“

”ہاں اور اس کا ایک ساتھی بھی۔ تم اس وقت کہاں ہو؟“

”اب تمہیں میری تلاش کیوں ہے؟“

”بےفکر ہو جاؤ۔ تمہیں کوئی تلاش نہیں کر رہا اور نہ ہی تمہیں کسی نے جائے واردات پر دیکھا۔ سب ڈالرز لوٹنے میں لگے ہوئے تھے۔ سارا الزام پیٹر پر آئے گا۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنی زبان بند رکھو۔ ورنہ میرے لیے تمہیں اور تمہارے ساتھی کو جیل بھیجنا زیادہ مشکل نہیں۔“

”کیا مجھے تم پر بھروسا کر لینا چاہیے؟“

”اس کی ضرورت نہیں کیونکہ اب ہمارے پاس پانے کے لیے کچھ نہیں رہا۔ ہم صرف ایک دوسرے کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اس لیے بہتر ہے کہ صلح کر لی جائے۔“

”ٹھیک ہے لیکن اگر تم نے اس لڑکی یا آرٹ کو تنگ کیا تو تمہیں بدترین صورتِ حال کے لیے تیار رہنا ہوگا۔“

اس کا جواب سننے سے پہلے میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب مجھے کسی کا خوف نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس رات عمارت میں ہونے والے واقعے کے بعد میں زندہ کیسے بچ گیا۔ شاید یہ میری خوش قسمتی تھی یا قدرت مجھ سے کوئی اور کام لینا چاہ رہی تھی۔ اس رات جو کچھ ہوا، اس نے مجھے بالکل بدل کر رکھ دیا ہے۔ مجھے اس دنیا میں اپنا پڑاؤ عارضی لگتا ہے۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ سانس کی ڈور کب ٹوٹ جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ادھار کی زندگی جی رہا ہوں اور شاید میری طرح سب لوگ لیکن کوئی اسے سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔

غدّار

بشریٰ امجد

قانونی پیچیدگیوں کو سلجھانا آسان نہیں... الجھی ہوئی گتھیوں کو سمجھنا ذہین اور فطین لوگوں کا دردِ سر... یہ... قتل کے ایک ایسے ہی کیس کی روداد... قاتل و مقتول سامنے تھے... مگر قاتل کا معاملہ ہنوز معما بنا ہوا تھا۔

کرپشن کے دریا میں مگرمچھوں کی کھلی اجارہ داری

وہ دبلا پتلا آدمی، ڈسٹرکٹ اٹارنی رینز کا سیکریٹری تھا۔ اس وقت وہ عدالت کے کٹہرے میں اپنی ٹائی کی گرہ سے الجھ رہا تھا۔

اس کا نام ہاسر تھا۔ ہاسر ان دو افراد میں سے ایک تھا جو خونی واردات کے وقت، ڈسٹرکٹ اٹارنی کی قیام گاہ پر موجود تھے۔

میں نے ہاسر سے سوال کیا۔ ”جس روز رینز قتل ہوا، تم اس کی رہائش گاہ پر تھے؟“

''ہاں۔'' اس نے اقرار کیا۔ ''لیکن میں اکیلا نہیں تھا۔''
''جانتا ہوں۔'' میں نے اس کے جواب کے دوسرے حصے کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''اس روز ریئز نے گورڈن کی غلط کاریوں سے پردہ اٹھایا تھا، کیا کہتے ہو؟''
''میں کچھ نہیں سمجھا۔'' ہاسر نے پلکیں جھپکائیں۔
''ریئز نے گورڈن کو تنبیہ کی تھی کہ اس کے پاس اتنا مواد موجود ہے جو بہ آسانی اسے تختۂ دار تک پہنچا سکتا ہے۔'' میری بات ادھوری رہ گئی۔
نکتۂ اعتراض پر یک دم گورڈن کا وکیل سام لوبوک کرسی سے کھڑا ہوگیا۔ ''آبجیکشن یور آنر۔''
''مسترد۔'' جج مارٹن کا ردِعمل فوری نوعیت کا تھا۔ اس نے مسترد کرتے ہوئے سام کی جانب دیکھا تک نہیں۔
مقدمے کی کارروائی کے دوران میں ایسا بار بار ہورہا تھا۔ وکیلِ دفاع جب نکتۂ اعتراض پر کھڑا ہوتا، جج مارٹن فوراً ہتھوڑا بجا کر مسترد کر دیتا۔ عدالت کے باہر پیشانی پر پٹی باندھے خاتون ہاتھ میں ترازو پکڑے شاید ہنستی ہوگی۔ حالانکہ یہ ایک نہایت سنجیدہ مسئلہ تھا۔
وکیل موصوف دانت پیستے ہوئے ایک بار پھر نشست پر ڈھیر ہوگئے۔
میں نے ملزم گورڈن کی نشست کو دیکھا اور اشتعال کی شدید لہر میرے بدن میں دوڑنے لگی۔ میرا چہرہ جیسے جلنے لگا... میں نے ایک بار پھر خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اس مردود نے میرے چیف کو قتل کیا تھا۔ ریئز کی عزت میں پوجنے کی حد تک کرتا تھا۔ ڈان ریئز، کرپشن سے آلودہ معاشرے میں سچائی اور دیانت کا علم تھامے کھڑا تھا۔ لیکن مجھے ثابت کرنا تھا کہ گورڈن ہی قاتل ہے۔ عدالت کو میرے جذبات اور احساسات سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔
گورڈن دنیاوی اعتبار سے ایک کامیاب شخص تھا۔ دولت مند اور بااثر... کسی کو اس بات سے غرض نہیں تھی کہ اس نے یہ دولت زیادہ تر ناجائز ذرائع سے حاصل کی تھی۔ اس کی کھڑی کی ہوئی چاندی کی دیوار میں سیکڑوں لوگوں کا خون پسینا شامل تھا۔
وہ ایک زہریلے سانپ کی طرح تھا۔ اس کے پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ دولت و رسوخ کے باعث بیشتر سیاست داں اس کے ایک اشارے پر ناچنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ دو ماہ قبل ڈان ریئز، ڈسٹرکٹ اٹارنی منتخب ہوا تو یہ ایک غیر متوقع تبدیلی تھی۔ ریئز ایک مختلف انسان تھا۔ اس کو خریدنا اور جھکانا ناممکن نہیں تھا۔
مائنگ گورڈن کے دھندوں میں اسٹاک مارکیٹ سے لے کر نائٹ کلب، جوئے خانے، جسم فروشی کے اڈے... سیاہ سفید سب شامل تھا۔ کم لوگ جانتے تھے کہ وہ انسانی اسمگلنگ کے بین الاقوامی نیٹ ورک کا بھی حصہ تھا۔
تاہم مقتول ڈان ریئز کے سامنے پھینکا گیا اس کا ہر پتا بیکار ثابت ہوا۔ یہ اور بات کہ اکیلا ریئز، گورڈن جیسے مگرمچھوں کے سامنے کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ ریئز کی اپنی ٹیم تھی جس میں مجھ سمیت تین افراد شامل تھے۔ فوج سے ریٹائر، طویل قامت گراہم اس کا دایاں بازو تھا۔ گراہم اسپیشل انویسٹی گیٹر تھا۔
اس کی کارکردگی ہمیشہ مثالی رہی تھی۔ گراہم نے کم وقت میں گورڈن کے خلاف شہادتوں کے ڈھیر لگا دیے۔ اب وہ تمام ثبوت بھی سیف سے غائب تھے جو نہ صرف گورڈن کے گلے کا پھندا بنتے بلکہ اس کے ساتھ نصف درجن مزید پردہ نشیں بھی الٹے لٹک رہے ہوتے۔
میرے ممدوح ڈسٹرکٹ اٹارنی ریئز کو بھی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ لے دے کر گراہم رہ گیا تھا۔ ایک بڑا سوالیہ نشان۔ وہ اس وقت کہاں تھا؟ وہی واحد ہتھیار تھا جو اس کہانی کو منطقی انجام تک پہنچا سکتا تھا۔ میری آخری امید اور یقیناً اکلوتی امید... لیکن اسے تو جیسے زمین نے کھا لیا تھا یا آسمان نگل چکا تھا۔
جج اور وکیلِ دفاع کا ڈراما میں سمجھ گیا تھا۔ ٹرائل کے دوسرے دن ہی مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ ججز کو بھی خرید لیا گیا ہے۔ نیز جج مارٹن کو گورڈن نے بینچ میں شامل کرایا تھا۔ کئی روز کی جدوجہد کے باوجود کوئی نتیجہ نکلتا نظر نہیں آرہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ مارٹن، گورڈن کو بچانے کے لیے قانونی اصولوں کو دوبارہ لکھنے کے لیے تیار ہے۔
دوسری طرف میرا غصہ بڑھتا جارہا تھا۔ گراہم کے بغیر میں کچھ نہیں کر پارہا تھا۔ وہ ظاہر ہوجاتا تو گورڈن کی ساری چالیں الٹی پڑ جاتیں۔ جیوری بھی بے بس ہوجاتی۔
لیکن مجھے شک تھا کہ گراہم کو راستے سے ہٹا دیا گیا ہے۔ مجھے اس بات پر بھی شک تھا کہ اسے خریدا جاسکتا ہے۔ تاہم میں نے عزم کیا ہوا تھا کہ آخری وقت تک اپنی کوششیں جاری رکھوں گا۔
گراہم ہی وہ دوسرا آدمی تھا جو واردات والی رات ڈان ریئز کے گھر پر تھا۔

☆☆☆

گراہم کی غیر موجودگی نے صورتِ حال کو گمبھیر بنا دیا تھا، میں تصور میں بارہا اسے عدالت کے کٹہرے میں دیکھ چکا تھا۔
گراہم اس رات دوسرے کمرے میں تھا اور فائر کی آواز پر متوجہ ہوا تھا۔ پھرتی دکھانے کے باوجود وہ صرف گولی کی طرح فرار ہوتی ایک کار کو ہی دیکھ سکا تھا جبکہ سیکریٹری پر مجھے زیادہ بھروسا نہیں تھا۔ اگر اس نے کچھ اور بھی دیکھا تھا تو وہی بتا سکتا تھا۔
لیکن اب وہ خود ہی کسی نامعلوم دنیا میں تھا۔ میں نے اپنی مٹھیاں سختی سے بھینچ لیں۔ رقم گورڈن کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھی جس کے بل پر وہ گراہم جیسے ہوشیار اور تجربہ کار بندے کی گردن بھی تڑوا سکتا تھا۔
میں جانتا تھا کہ رشوت کی پیشکش بالواسطہ مجھے بھی کی گئی تھی اور وہ مجھے لڑکھڑا سکتی تھی۔ لیکن میں ریئز کے قاتل سے رشوت لینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اگر میں ایسا کرتا تو اپنی موت آپ مرجاتا۔
''قاتل ہتھیار'' کمرے کی کھڑکی سے باہر اچھال دیا گیا تھا۔ یہ پرانے ماڈل کا آٹومیٹک کولٹ تھا جو لاکھوں کی تعداد میں موجود تھے۔ عملی طور پر اس پستول سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ اگرچہ اسے پہلے ہی عدالت کے سامنے پیش کیا جاچکا تھا۔
میں نے گہری سانس لے کر کولٹ اٹھایا اور مقتول کے سیکریٹری ہاسر کی جانب متوجہ ہوا۔
''تم نے جب گولی کا دھماکا سنا اور تم اٹارنی کی اسٹڈی میں داخل ہوئے تو یہ ہتھیار کہاں تھا؟''
سیکریٹری ہاسر نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ ''اسے میں نے مسٹر ریئز کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔'' سیکریٹری کی نظریں نیچے تھیں۔
میں دنگ رہ گیا۔ میں اس کے جواب کا مطلب خوب سمجھ رہا تھا اور سکتے کی حالت میں اسے گھور رہا تھا۔
کیا اسے بھی خرید لیا گیا ہے؟ یقیناً ایسا ہی تھا۔ میرے ذہن نے خود ہی سوال جواب کیے۔
کمرائے عدالت میں بھنبھناہٹ ہونے لگی۔ میں نے گورڈن کی جانب دیکھنے سے پرہیز کیا۔ میں جانتا تھا کہ میں خود پر قابو نہیں رکھ سکوں گا۔
میرا اپنا ہی گواہ، واردات کو خودکشی کا رنگ دینے جارہا تھا۔ اگلا سوال کرنا فضول تھا۔ ہاسر نے کیا جواب دینا تھا، مجھے معلوم تھا بلکہ وہاں موجود ہر ذی ہوش سمجھ گیا تھا۔
معاً ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ دل نے خون سر کی

اشتہاری

اسکول کے بچوں کو ایک مطالعاتی دورے پر پولیس ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا جہاں نوٹس بورڈ پر بہت سے اشتہاری مجرموں کی واضح تصاویر آویزاں تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کی گرفتاری کرانے والے کے لیے انعامات بھی درج تھے۔
ایک بچے نے پولیس افسر سے پوچھا۔ ''کیا پولیس واقعی ان مجرموں کو پکڑنا چاہتی ہے؟''
''بالکل... یہ خطرناک مجرم ہیں، پورا محکمہ ان کی تلاش میں لگا ہوا ہے۔'' افسر نے کہا۔
''آپ لوگوں نے انہیں اس وقت کیوں نہیں پکڑا جب آپ ان کی تصویریں اتار رہے تھے؟'' بچے نے معصومیت سے پوچھا۔

شیر گل خان، لنڈی کوتل

سبب

نودولتیے نے نئی کار خریدی تو شام میں اس کی سواری سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہائی وے پر نکل گیا۔ وہ رفتار بڑھاتا رہا... جب وہ اسّی میل کی رفتار سے جارہا تھا تو اسے اپنے پیچھے پولیس کار کی سرخ اور نیلی روشنیاں آتی دکھائی دیں۔ اس نے رفتار اور تیز کردی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوجائے گا مگر فاصلہ کم ہوتا رہا... آخر اس نے گاڑی کنارے سے لگا کر روک دی۔
سارجنٹ نے آتے ہی اس سے لائسنس لیا اور منہ بنا کر بولا۔ ''آج میں نے ڈبل ڈیوٹی دی ہے۔ تھوڑی دیر میں میری شفٹ ختم ہونے والی ہے۔ ویسے بھی آج 13 کی منحوس تاریخ ہے۔ میں اپنا اور تمہارا ویک اینڈ خراب نہیں کرنا چاہتا۔ اگر تم اپنی تیز رفتاری کا کوئی ایسا عذر بتاؤ جو میں نے اب تک نہ سنا ہو تو میں چالان کیے بغیر تمہیں جانے دوں گا۔''
اس نے لمحہ بھر کے لیے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا پھر بولا۔ ''پچھلے ہفتے میری بیوی ایک پولیس والے کے ساتھ بھاگ گئی۔ تمہاری گاڑی کی روشنیاں دیکھتے ہی میں ڈر گیا کہ وہی پولیس والا میری بیوی کو لوٹانے کے لیے آیا ہے۔''
سارجنٹ نے کھلکھلا کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔

فلک شیر، بسی کی خوش دلی

جانب پمپ کیا۔ میرا چہرہ تپنے لگا۔ پھر وہ ہوگیا جو بہر حال نہیں ہونا چاہیے تھا۔ سب دیکھتے ہی رہ گئے۔

میں چند قدم آگے گیا۔ میرا بھرپور گھونسا سیکریٹری کے منہ پر لگا۔ کمرائے عدالت میں لمحے بھر کے لیے سناٹا اترا پھر شور شرابا بلند ہی ہوتا چلا گیا۔

جج مارٹن غصے سے ہتھوڑا پٹخے جا رہا تھا۔ سام بھی بے قابو ہو رہا تھا۔ دو محافظ مجھے پکڑے ہوئے پیچھے کی جانب گھسیٹ رہے تھے۔ میری نگاہ مسکراتے ہوئے گورڈن پر پڑی۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت مجھے موقع ملتا تو میں وہیں اس کی گردن مروڑ دیتا۔

میں جج کا مخالفانہ تبصرہ سن رہا تھا۔ میں نے معذرت نہیں کی۔ جج ظاہر ہے غصے میں تھا، اسے بھرپور موقع مل گیا تھا۔ میں سیدھا کھڑا تھا اور ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں بہت زیادہ تھکن محسوس کر رہا ہوں۔ اس میں افسردگی اور بے بسی کی آمیزش تھی۔

☆☆☆

کمرائے عدالت میں ایک بار پھر کھلبلی مچ گئی۔ میں نے پلٹ کر عقب میں دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ خون کی نس میری کنپٹی پر تڑپنے لگی۔ مجھے اپنی بینائی پر شبہ ہو رہا تھا۔

ایک گرانڈیل، طویل قامت شخص کمرائے عدالت میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ گراہم تھا۔ اس کی چال عجیب تھی، دونوں ہاتھ سختی سے پہلو میں جمے ہوئے تھے۔ گویا وہ ہاتھ ہلائے بغیر چل رہا تھا۔ ٹانگیں بھی اکڑی ہوئی لگ رہی تھیں۔ چہرہ سپاٹ تھا۔ تاہم میں نے سرخ و سفید چہرے میں پیلاہٹ کے عنصر کو تاڑ لیا۔

''تام گراہم...'' میں نے سرگوشی کی۔

اس نے میری جانب نہیں دیکھا۔ وہ کسی کی طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ مجھے وہ بُری طرح تھکا ہوا لگا۔ وہ سیدھا گواہوں کی کرسیوں کی طرف گیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

گورڈن کے وکیل کا منہ کھلا رہ گیا۔ سیکریٹری ہاسر کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔ خود گورڈن کے چہرے پر میں نے ہراس دیکھا۔

منظر نامہ یک دم کچھ سے کچھ ہوگیا تھا۔ میں نے نئی امید کے ساتھ پھر سے کمر کس لی۔ گراہم کی آنکھوں نے مجھے ڈھونڈ لیا تھا۔ میں نے غور کیا کہ اس کے پورے چہرے پر پسینے کی ہلکی سی تہ تھی۔ اس کی چال... اس کی رنگت اور خاموشی؟ میری چھٹی حس نے کسی گڑبڑ کا اعلان کیا۔

گورڈن، اس کے وکیل اور سیکریٹری ہاسر کے مسخ تاثرات چیخ چیخ کر اعلان کر رہے تھے کہ گراہم کی غیر متوقع آمد ان کے لیے ناقابلِ یقین ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہوا کہ انہیں پتا تھا کہ گراہم کو کہاں ہونا چاہیے تھا۔

میرے لہو کی گردش تیز ہوگئی۔ میں توہین عدالت کا مرتکب ہوچکا تھا۔ قبل اس کے کہ جج مجھے باہر پھنکوانے کا حکم جاری کرتا، میں نے سنسنی خیز صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پھر سے کولٹ آٹومیٹک اٹھایا اور آگے بڑھ کر گراہم کو پکڑا دیا۔

''کیا تم اسے پہچانتے ہو؟'' میں نے سوال داغا۔

اس نے پراسرار انداز میں دھیرے سے ہتھیار کو ہاتھوں میں الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کمرے کا سناٹا اتنا دبیز تھا کہ گھڑیال کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔ تمام آنکھوں نے گراہم کو فوکس کیا ہوا تھا۔

گراہم نے ماہرانہ انداز میں پستول کھول کر خالی چیمبر میں جھانکا۔ پھر ڈھیلے سے انداز میں اسے گود میں رکھ لیا۔ میں اس کے قریب تھا۔ میں نے اس کی گردن پر پسینے کا قطرہ رینگتے دیکھا۔ چھٹی حس نے پھر مجھے ٹہوکا دیا۔

لیکن میں تبدیل شدہ صورتِ حال کے باعث جس ہیجانی کیفیت سے گزر رہا تھا، اس نے پھر میری توجہ اس کی ظاہری کیفیت سے ہٹا دی۔ میں جواب کا منتظر تھا۔

گراہم نے سر اٹھایا۔ ''یہ وہی گن ہے جس سے مسٹر رینز کو ہلاک کیا گیا۔''

کمرائے عدالت کے سناٹے میں پھر سے مکھیوں کی بھنبھناہٹ شروع ہوگئی۔

''تم اس وقت کہاں تھے، جب گولی چلی؟''

گراہم نے عجیب نظروں سے میری آنکھوں میں جھانکا اور بولا۔ ''میں نے اسی وقت اسٹڈی کا دروازہ کھولا تھا۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' میرا ذہن چیخا۔ مجھے پتا تھا کہ گراہم فائر کے وقت اسٹڈی والے کمرے کے قریب نہیں تھا۔ میں نے انتظار کیا کہ سام نکتۂ اعتراض پر اٹھ کھڑا ہوگا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

میرا ذہن الجھنے لگا۔ کیا سب کی طرح گراہم نے بھی قاتل کے حق میں بیان دینا ہے؟ لیکن کیوں؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میرے دونوں ہاتھ بے جان سے ہوگئے۔ کیا یہی گڑبڑ تھی جس کے لیے میری چھٹی حس اچانک بیدار ہوئی تھی۔

اگر وہ آگے خودکشی والی بات ہی کرنے جا رہا ہے تو گورڈن اینڈ کمپنی کا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے؟

میری سانس رکنے لگی۔ میں نے اگلا سوال کیا۔

''تم نے وہاں کیا دیکھا؟'' میری آواز جوش سے

خالی تھی اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

سام اور سیکریٹری ہاسر غیر اختیاری طور پر جواب سننے کے لیے آگے کی جانب جھکے۔ میں نے دیکھا جج مارٹن بھی کشیدگی کا شکار ہے۔ میں امید و بیم کی کیفیت میں تھا۔

گراہم کی نگاہ جیوری پر سے گزرتی ہوئی گورڈن پر رکی پھر وہاں سے ہٹ کر گواہی کے کٹہرے میں کھڑے ہاسر پر جم گئی۔ اس کا انداز بڑا پراسرار تھا۔ میری چھٹی حس نے پھر انگڑائی لی۔

''میں نے دیکھا۔'' گراہم نے دھیمی آواز میں بولنا شروع کیا۔ ''ہاسر کھڑکی کے پاس کھڑا تھا اور یہی گن اس کے ہاتھ میں تھی جس کا رخ مسٹر رینز کی جانب تھا۔'' گراہم نے ڈرامائی انداز میں کولٹ اٹھایا۔ ''اس طرح۔'' اس نے ہاتھ سیدھا کیا، کولٹ کا رخ سیکریٹری کی جانب تھا۔ گراہم نے خالی گن سے نشانہ باندھا۔ سیکریٹری کا منہ لٹک گیا۔

گراہم جب سے اور جس انداز میں وہاں ظاہر ہوا تھا، تب سے متواتر مجھے حیران کر رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ بہت کام کر چکا تھا۔ یہ قطعی اس کا انداز نہیں تھا۔ آج مجھے وہ اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا۔

سام سے بھی میرا کئی بار ٹاکرا ہوچکا تھا۔ اس لمحے میں نے اسے زندگی میں پہلی بار گنگ دیکھا۔ وہ جیسے بولنا اور حرکت کرنا بھول گیا تھا۔

گراہم کی ڈرامائی حرکت نے وہاں موجود ہر ذی روح کو جکڑ لیا تھا۔

اس کی آنکھیں بے تاثر تھیں اور بائیں ابرو سے متصل نس ابھر کر پھڑک رہی تھی۔ اس کے چہرے کا پسینا اب نمایاں ہوچکا تھا۔ اس کی آواز صاف اور سرد تھی۔ ''ہاسر نے فائر کیا... اس طرح...''

☆☆☆

کورٹ روم میں دھماکا ہوا اور میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ ہاسر کی ناک کے اوپر پیشانی میں لہو رنگ سوراخ نمودار ہوا۔ اگلے لمحے وہ زمیں بوس ہوچکا تھا۔

کورٹ روم میں موت کا سناٹا اعصاب کو شل کر گیا۔ پھر سب سے پہلے کسی عورت کی چیخ بلند ہوئی۔ وہاں موجود افراد نے کرسیوں اور میزوں کی آڑ لینا شروع کی۔ شور و غوغا بلند ہوا۔ کچھ افراد نے باہر کی جانب دوڑ لگائی۔ جج مارٹن کا ہتھوڑا بدست بازو خلا میں جم کے رہ گیا۔ سام عالمِ دہشت میں اپنے کلائنٹ گورڈن کو تک رہا تھا۔

گراہم کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے کولٹ نیچے گرا دیا۔ میں نے ابتدا میں اس کے چہرے پر جو پیلاہٹ کی آمیزش دیکھی تھی، وہ اب نمایاں ہوچکی تھی۔

یک لخت مجھے شدید خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے کب اور کس طرح خالی چیمبر میں گولی ڈالی، کوئی نہ دیکھ سکا۔

''یہ کیا کر دیا؟'' میں اسے بازوؤں سے پکڑ کر چلایا۔

''وہ مجھے یہاں دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔'' گراہم کی آواز اور مدھم ہوگئی۔ ''انہوں نے مجھے ایک گودام میں بند کیا ہوا تھا۔''

''گُڈ لارڈ... مین... یہ مرڈر ہے۔'' میں نے اسے جھنجوڑا۔

''یہ رکھو۔'' اس نے کوٹ کی بیرونی جیب سے ایک چابی اور کارڈ نکالا۔ ''دونوں چیزیں تمہیں کاغذات تک پہنچا دیں گی۔ چیف کو گورڈن نے مروایا ہے۔ چھوڑنا مت کتے کو۔''

''تم نے ہاسر کے ہاتھ میں گن دیکھی تھی صرف... اسے فائر کرتے نہیں دیکھا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، نہیں دیکھا تھا لیکن اسے میں نے گودام میں کسی اور کو گولی مارتے دیکھا تھا۔'' گراہم کھانسنے لگا۔

میں اسے گھورتا چلا گیا۔ ''کس کو؟'' میری آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

''مجھ کو...'' اس کی آواز بھی ڈوبنے لگی اور وہ کرسی سے لڑھک گیا۔ اس کا چہرہ پسینے میں نہا چکا تھا۔ اس کا کوٹ سامنے سے کھل گیا۔

میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی لہو رنگ قمیص اور گولی کے سوراخ کو دیکھا۔

''تت... تم... اسپتال کیوں نہیں گئے؟'' میں تڑپ اٹھا۔

''گھر تک... ہی... جا سکا۔'' وہ کراہ اٹھا۔ ''گھر جانا ضروری تھا... پھر اسپتال کا وقت نہیں تھا۔ مجھے یہاں آنا تھا۔ گدھے تھے وہ... مم... م... مجھے جانے میں غلطی کر گئے... چھ... چھوڑ... نا مت۔''

اس کی مسکراہٹ ادھوری رہ گئی۔ آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

گراہم جان دے کر راہِ وفا پر ایک اور چراغ روشن کر گیا۔ وہ خالی ہاتھ نہیں گیا تھا، جان سیکریٹری کی بھی گئی لیکن وہ رشوت لے کر بھی خالی ہاتھ رہا۔ محض غداروں کی فہرست میں ایک اور بدنما اضافہ ہوگیا۔

میری آنکھوں کی نمی، قطرے بن کر رخساروں پر لکیر بناتی... گراہم کے بے جان روشن چہرے کو بھگو گئی۔

جواری

احمد اقبال

دسویں قسط

زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان
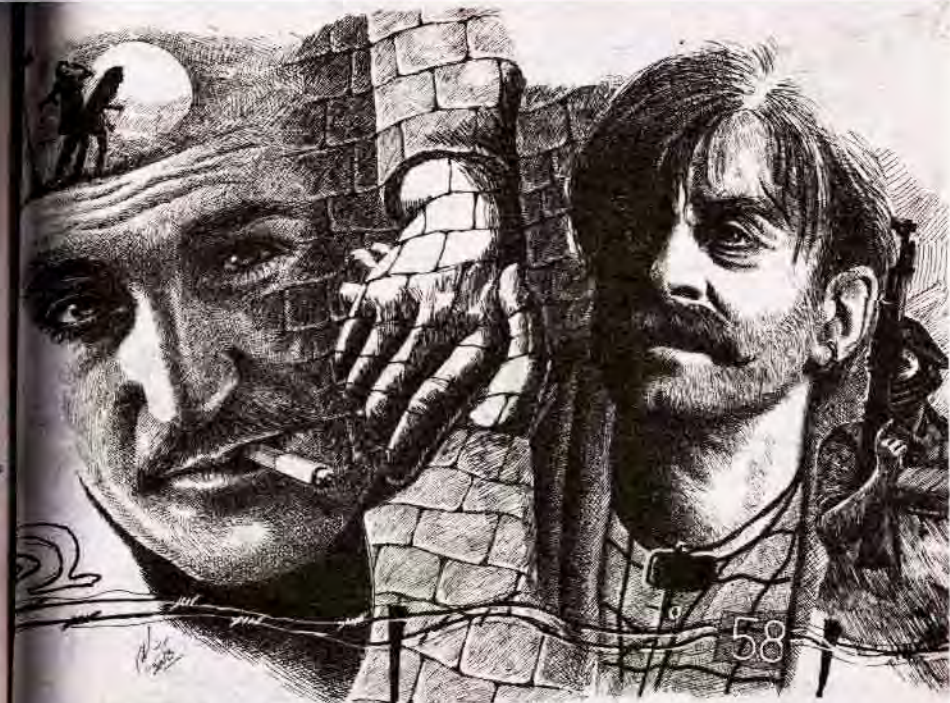
شیکسپیئر کا کہا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں... ہر اداکار زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے... جس میں خطرات اور حادثات کی بازی پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جاری رہتی ہے... تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں... وہ زندگی کے ہر نومولود کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے اور یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتۂ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے... خوشی... غم... نفع... نقصان... دوستی... دشمنی... محبت اور نفرت... سب ہار جیت کے وہ روپ ہیں جن سے ہر انسان ایک جواری بن کے سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے... جواری... انسانی جذبوں کے ردعمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے جو نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر نئی بھی لگتی ہے اور پرانی بھی... آپ بیتی بھی اور جگ بیتی بھی... تجسس اور حیرانی کے سارے رنگ دکھلاتی جادو اثر تحریر...

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ایم اے پاس خاور سکھر جیل میں سزائے موت کا منتظر تھا۔ اس پر قتل کا جھوٹا الزام ایک گینگ لیڈر نادر شاہ کے ایما پر عائد کیا گیا تھا۔ وہیں ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار گاما رستم بھی پھانسی کا منتظر تھا ... اس کے ساتھی جیل پر حملہ کر کے اسے چھڑا لے جاتے ہیں۔ گاما، خاور کو ساتھ لے جاتا ہے۔ خاور ایک پرانی غیر آباد حویلی میں پناہ لیتا ہے۔ خاور کو اس حویلی کے کھنڈر میں نورین ملی جو لباسِ عروسی میں تھی اور اپنے شوہر کو قتل کر کے آئی تھی۔ اس کی پرورش کرنے والے چچا نے نورین کی تمام جائداد اور دولت پر قبضہ کر لیا تھا اور زبردستی اس کو اپنے پاگل بیٹے سے بیاہ دیا تھا۔ پاگل چچازاد کی دست درازی سے بچنے کے لیے نورین نے اسے قتل کر دیا اور کھڑکی کے راستے آسیب زدہ مشہور حویلی میں آ گئی۔ کسی نے اسے دیکھا تو بدروح سمجھ کے بھاگ گیا ... نورین یہاں سلمان خان نامی ایک شخص سے چھپ کر ملتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ وعدے کے مطابق وہ یہاں موجود ہوگا لیکن وہ نہیں آیا تھا۔ نورین پریشان تھی کہ صبح پولیس اسے قتل کے الزام میں گرفتار کر لے گی۔ وہیں اس کی ملاقات خاور سے ہوئی۔ اس کھنڈر کی دوسری منزل پر خاور کو سلمان کی لاش نظر آئی۔ وہ اپنا وعدہ نبھانے پہنچا تھا لیکن قتل ہو گیا تھا۔ تلاشی پر خاور کو اس کی جیب سے دس لاکھ نقد ملے۔ خاور نے اپنے کپڑے اسے پہنائے اور خود اس کے کپڑے پہن کے رقم جیب میں ڈال لی۔ اس نے اپنا حلیہ بدلا اور نورین کو برقع میں چھپا کر لے گیا۔ وہ اکیلا نورین کے گھر گیا تو اسے علم ہوا کہ نورین پر شوہر کے قتل کا الزام ہے جبکہ نورین نے نکاح نہ ہونے کے باعث اسے تسلیم نہیں کیا تھا۔ خاور نے نورین سے جھوٹ بولا کہ سلمان جو پہلے سے بے روزگار تھا، نوکری مل جانے پر دبئی چلا گیا تھا۔ باہر جانے میں خطرہ تھا کیونکہ خاور کے جیل سے فرار کی اطلاع کے بعد نادر شاہ نے اپنے کارندے اسے تلاش کرنے پر لگا دیے تھے جو کتوں کی طرح ہر جگہ اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ دوسرا خطرہ پولیس سے تھا جن کو خاور کے علاوہ نورین کی بھی تلاش تھی۔ خاور، نورین کو لے کر نکلا اور ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ تاہم وہاں غیر محفوظ ہونے اور نورین کی اچانک طبیعت خراب ہونے پر وہ ایک اسپتال میں آ گئے۔ خاور اور نورین وہاں سے نکلے۔ ہر بڑے ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ اور ائرپورٹ پر وہ پکڑے جا سکتے تھے چنانچہ انہوں نے پنجاب کا رخ کیا اور کئی مقامات پر ٹرین بدلتے رہے۔ اس کے باوجود نادر شاہ کے بندوں نے جو ویٹر کی وردی میں تھے، خاور کو پہچان لیا۔ ایک کو خاور نے چلتی ٹرین سے کودنے پر مجبور کر دیا۔ دوسرے نے نورین اور خاور کو حفاظت اور اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ جذباتی نورین اسے اپنا بھائی تسلیم کر چکی تھی۔ خاور بھی اسے معاف کرنے پر مجبور ہو گیا، اس کا اصل دشمن نادر شاہ تھا۔ خانپور کے ویٹنگ روم میں رات گزار کے وہ دونوں ایک پرائیویٹ کیری ڈبے سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ نازی نے انہیں رات بھر کے لیے کسی اجنبی قصبے کے باہر ایک کچے خالی گھر میں رکھا اور انہیں تسلی دی کہ صبح وہ لاہور کے مضافات میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن صبح جاگنے پر نادر شاہ کے آدمی آ گئے اور نورین اور خاور کو لے گئے لیکن راستے میں نورین نے جانے کیا کیا کہ گاڑی حادثے کا شکار ہو گئی۔ خاور بچ گیا مگر نورین کا پتا نہ چل سکا۔ خاور نے رحیم بخش نامی شخص کے گھر میں پناہ لے لی۔ مقامی چودھری رحیم بخش کی بیٹی سے شادی کا خواہش مند تھا۔ رحیم بخش کو قتل کر دیا گیا اور ریشم اور خاور کو چودھری کے گرگے اٹھا کر لے گئے۔ خاور کو قید کر دیا گیا تاہم وہ اکبر کے بھائی انور کے ساتھ رہا ہو گیا اور انور نے حویلی پر اپنا اختیار حاصل کر لیا۔ ریشم بھی حویلی میں ہی تھی۔ چودھری انور نے اکبر کو قید کر دیا۔ اکبر اور خاور کو حویلی سے نکال کے دوسری جگہ پہنچایا گیا۔ تاہم کچھ وقت گزرنے کے بعد دوبارہ حویلی میں قید کر دیا گیا۔ ادھر بڑے چودھری کو دل کا دورہ پڑا لیکن اس نے اسپتال میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ تمام کام گھر پر ہی کیے جائیں۔ خاور اور انور نے اسپتالوں کو ایکوپمنٹ سپلائی کرنے والی کمپنی سے رابطہ کیا۔ وہیں ایک شخص نے خاور کو فرید الدین کی حیثیت سے شناخت کیا تاہم خاور نے انکار کر دیا۔ انور اسے لے کر شناختی کارڈ آفس گیا اور ملک سلیم اختر کے نام سے نیا شناختی کارڈ بنوا دیا۔ ایکوپمنٹ کمپنی کے اہلکار ساز و سامان لے کر حویلی پہنچ گئے اور بڑے چودھری کے کمرے کو اسپتال جیسا بنا دیا۔ کمپنی کے ورکر نے خاور کو فرید الدین کی حیثیت سے پہچان لیا مگر اس بات کو راز میں رکھنے کا وعدہ کیا۔ حویلی میں کوئی سازش ہو رہی تھی، ایک گارڈ کی موت کے بعد انور نے تمام گارڈ بدلنے کا فیصلہ کیا۔ قبرستان میں ایک سرنگ کھودی گئی تھی جو پوری ہونے پر انور کے کمرے میں جا نکلتی۔ تاحال یہ سازش بے نقاب ہو گئی تھی۔ ادھر اکبر کے سسر نے خاور عرف ملک سلیم کو زبردستی اٹھا لیا اور آستانے کے تہ خانے میں قید کر دیا۔ وہیں خاور کو نورین نظر آئی۔ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھی تھی۔ رات کو کچھ نامعلوم لوگوں نے آستانے پر دھاوا بول دیا۔ خاور وہاں سے بھاگ نکلا اور نورین کی تلاش میں نکل گیا۔ لیکن وہ جب نورین کے گھر پہنچا جہاں نورین فاطمہ کے نام سے رہ رہی تھی تو اسے وہاں موجود نہ پایا۔ نورین کا فرضی باپ اسے لے کر شہر چلا گیا تھا۔ خاور نے ایک دیہاتی نور محمد کو ساون خان اور فاطمہ کا کھوج لگانے کا کام سونپ دیا۔ ادھر شاہینہ نے ریشم کو زہر دے کر مارنے کی کوشش کی تاہم بروقت طبی امداد کے سبب اس کی جان بچ گئی۔ پیر اظہر علی کو قتل کے مقدمے کا سامنا تھا اور اپنی بیٹی کی کہیں اور موجودگی ثابت کرنے کے لیے وہ انور سے نکاح نامے پر دستخط کرانا چاہتا تھا۔ انور کو چودھری صاحب نے بلایا۔ خاور نے انور سے سوال کیا کہ کیا وہ دستخط کر دے گا؟ جواباً اس کے چہرے سے بے بسی جھلکنے لگی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

انور اور میرے درمیان ہونے والی اس گفتگو کے دوران میں ریشم سوئی رہی تھی۔ غالباً جو دوائیں اسے صحت یابی کے لیے دی جا رہی تھیں، ان میں سکون بخش یا خواب آور گولیاں بھی شامل تھیں۔ ریشم کے لیے ہماری گفتگو میں کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ وہ پہلے سے سب جانتی تھی چنانچہ اس نے کچھ دیر خاموشی سے سب سنا پھر سو گئی۔

مجھے اس پر غصہ بھی آ رہا تھا اور ترس بھی۔ انور نے اسے پریکٹیکل قرار دے کر اپنے لیے اس مشکل اور پیچیدہ صورتِ حال سے نکلنے کا راستہ بنایا تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ انور کو مصالحت کے سوا تمام راستے مسدود نظر آتے ہیں۔

ریشم سمجھ رہی تھی کہ خود اس کی پوزیشن کتنی نازک اور کمزور ہے۔ اس کی ساری طاقت انور تھا اور وہ کمزور پڑ رہا تھا۔ ریشم نے مکمل شکست سے بچنے کے لیے وہ راستہ اختیار کیا جو اسے ذلت اور دربدری سے بچا سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ انور اس سے کہتا کہ میں مجبور ہوں روزینہ سے شادی پر کیونکہ میں اپنے سارے خاندان سے نہیں لڑ سکتا، ریشم نے اسے خود ہی اجازت دے دی کہ تم میری وجہ سے اپنی جان عذاب میں مت ڈالو۔ اس نے انور کی مجبوری کو اپنی مجبوری بنا لیا۔

اب مستقبل غیر یقینی تھا۔ انور کا ذہن بڑی تیزی سے اس معاشرے کی روایات اور اخلاقی قدروں کو قبول کرتا جا رہا تھا جن کو وہ پہلے باغیانہ خیالات کے باعث مسترد کر چکا تھا۔ اس نے ریشم کے اطمینان کے لیے کہہ دیا کہ پہلی بیوی وہ ہوگی اور شہر میں رہے گی۔ روزینہ دوسری گاؤں میں پڑی رہے... میں تو تمہارے ساتھ رہوں گا لیکن ایسی باتوں سے حقائق تبدیل نہیں ہو سکتے۔

مجھے یقین تھا کہ ریشم کے لیے کچھ عرصے میں وقت بدل جائے گا جب انور کی نظر بدلے گی۔ اسے بیوی کے تمام حقوق جو شروع میں حاصل تھے، رفتہ رفتہ کم ہوتے جائیں گے اور باقاعدگی سے کچھ ملے گا تو خرچہ... وہ بھی انور کو ناراض نہ کرنے کی صورت میں۔ جس دن وہ ہتھے سے اکھڑ گیا، تمام جذبات اور اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کے کہے گا کہ بی بی بس اب اور برداشت کرنا میرے لیے بھی ممکن نہیں اور تمہارے لیے بھی تو پھر پکڑو اپنا راستہ... پروانۂ آزادی لو اور ہرجانہ یعنی حقِ مہر اور خدا حافظ... تم بھی خوش رہو اور میں بھی رہوں گا۔

لیکن یہ سب اس بے وقوف لڑکی کو سمجھانا بہت مشکل تھا جس نے اپنے دماغ کے سب دریچے بند کر لیے تھے۔ وہ مجھ سے بھی صاف کہہ دیتی کہ میری ہمدردی میں میرا باپ بننے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنا بُرا بھلا خود سمجھتی ہوں اور نتائج بھی خود بھگت لوں گی۔ تم جاؤ... چھوڑو میری جان۔

اب شاید فیصلے کی گھڑی میرے لیے آنے والی تھی جب مجھے طے کرنا ہوگا کہ میں صرف اپنے اور نورین کے بارے میں سوچوں... ریشم سے اور انور سے معذرت کروں اور چلا جاؤں۔ بعد میں کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں... اس سے مجھے کیا۔ وقت جو گزر گیا، لوگ جو بچھڑ گئے... بستیاں جو پیچھے رہ گئیں، سب صرف ماضی کا ایک حوالہ ...... نہ لوٹ کے جانا میری ضرورت یا مجبوری... میرے سامنے تو صرف مستقبل ہوگا۔ ایک خادمہ نے اندر آ کے مؤدبانہ کہا۔

"آپ کو بڑے چودھری صاحب نے بلایا ہے۔" یہی خادمہ کچھ دیر پہلے اسی طرح انور کو بلانے آئی تھی۔ میں نے خود کو مضبوط کیا۔ حالات کی جو تصویر میرے سامنے تھی، اس میں مجھے مصلحت کا روگ پالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے وہی کہنا اور کرنا تھا جو اصولی طور پر میرے نزدیک درست ہو جس پر مجھے خود کو کسی اخلاقی جواز دینے کی ضرورت نہ پڑے۔ باقی سب اپنے معاملات پر اپنی سوچ رکھنے کے لیے آزاد تھے... یا مجبور تھے۔

جب میں رسمی طور پر دروازہ بجانے کے بعد اندر گیا تو منظر کسی عدالت جیسا تھا جہاں زندگی اور موت کا فیصلہ درپیش ہو اور اس میں کوئی شک کی بات نہ تھی۔ یہ پیر صاحب کے لیے بھی زندگی اور موت کا مسئلہ تھا اور ان کی بیٹی کے لیے بھی... معاشرتی اور اخلاقی ذمے داری کے طور پر یہ بڑے چودھری صاحب... ان کے بیٹے انور اور بہو شاہینہ کا مسئلہ بھی بن گیا تھا۔ میں کسی طرح کا تعلق نہ ہونے کے باوجود یہ بات منہ پر نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھے کیوں خوامخواہ بیچ میں گھسیٹا جا رہا ہے۔ یہ ایک طرح سے قطع تعلق کا اعلان بن جاتا اور مجھے تان طنبورہ اٹھا کے فوراً کوچ کرنا پڑتا۔

بند کمرے میں ہونے والے اس اجلاس کے شرکاء میں سب سے زیادہ نمایاں تو ڈرامائی کردار کے مالک پیر صاحب تھے جو اب تک تمام معاملات میں ہی نظر آتے تھے۔ بڑے چودھری صاحب کی اکڑفوں جو پہلے عادت تھی، اب فطرت تھی مگر پھر بھی وہ دل سے کسی کے بدخواہ نہ تھے جب تک کہ وہ ان کے مفاد یا خاندانی مفاد کے خلاف نہ ہو۔ چودھرائن کسی گنتی میں نہ تھی۔ ایک شاہینہ تھی جو اپنے شوہر کی رہائی اور زندگی کے لیے وہ جنگ لڑ رہی تھی جس کا کوئی صلہ نہ تھا۔ نہ اس کی توقیر میں اضافہ ہوتا تھا اور نہ شوہر کی طرف سے بعد میں تعریف کے دو بول ملتے تھے۔ اب اس پر چھوٹی بہن کی زندگی کو بحفاظت اس جذباتی اور قانونی گرداب سے نکال کے محفوظ اور باعزت مستقبل تک پہنچانے کی ذمے داری بھی آ گئی تھی۔

بڑے چودھری صاحب بیڈ پر تکیوں کے سہارے نیم دراز تھے اور آج حقہ پی رہے تھے جس کی انہیں اجازت نہ تھی۔ آج دل کے روگ سے بڑا خطرہ ان کے خاندانی وقار کے لیے پیدا ہو گیا تھا چنانچہ وہ ٹینشن میں تھے۔ اصل مجرم... میں پیر صاحب کو مجرم ہی کہوں گا، ایک جھوٹی رعونت اور منافقت آمیز روحانی تکبر میں مبتلا تھا۔ ان

دونوں بڑوں کی نظر کے ساتھ شاہینہ کی نظر بھی مجھ پر جم گئی تھی۔ ہر نظر کا اپنا پیغام تھا۔

پیر صاحب کی نظر مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے جیلر کی نگاہ کسی مفرور قیدی کو دیکھتی ہے۔ پیغام واضح تھا تم وہی کرو گے جو ہم نے کہا تھا ورنہ... جو تمہارے ساتھ ایک بار ہوا... پھر ہو سکتا ہے۔

بڑے چودھری اور اس کی بیوی چودھرائن کی نظریں ایسی تھیں کہ تم نے غیر ہونے کے باوجود ہمارے خاندانی مسئلوں کو بڑی نیک نیتی اور ذہانت سے سلجھایا تھا۔ آج بھی تم انکار نہیں کر سکتے۔

انور کی نظر میں بے بسی اور مظلومیت تھی کہ خاندانی وقار اور محبت کی اس رسّہ کشی میں مجھے ٹوٹنے سے تم ہی بچا سکتے ہو۔

شاہینہ کی نظر کا پیغام سب سے الگ تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کی مسکراہٹ بڑی نحش لگی اور اس کی آنکھوں میں واضح پیغام کہ اس مسئلے کو حل کر دو تو انعام میں میرے حسن و شباب کی پوری فلم کا ٹکٹ جس کا صبح تم نے صرف ٹریلر دیکھا تھا۔ میری رائے غلط ہو سکتی تھی لیکن وہ ایسی ہی عورت تھی۔ مکر و فریب کا خوب صورت جال... سازشی... حصولِ مقصد کے لیے کسی بھی انتہا تک جانے کے لیے تیار... اس احساس سے مسلح کہ وہ ایک بھرپور عورت ہے جو کسی بھی مرد سے کچھ بھی کرا سکتی ہے، میرا یہ وسوسہ جلد ہی حقیقت کا روپ بن کے سامنے آ گیا۔

کمرے میں ایک صوفہ سیٹ تھا۔ سنگل صوفے پر جو آمنے سامنے لگے ہوئے تھے، بڑی چودھرائن اور پیر صاحب براجمان تھے۔ بڑے تین افراد کے صوفے پر انور کے ساتھ شاہینہ پہلے سے موجود تھی۔ اس نے انور کی طرف کھسک کے میری لیے جگہ بنا دی تو میں تذبذب کے باوجود انکار نہ کر سکا۔ میرا خیال تھا کہ انور اپنی بھابی کی طرف کھسک جائے گا تو میں اس کے ساتھ بیٹھ جاؤں گا۔ اب ریشمی شلوار کے اندر شاہینہ کے وجود سے مس ہونے والا میرا جسم اس کے وجود کی حرارت کو بھی جذب کر رہا تھا۔ شانوں پر... پھر اس کے نیچے اور مزید نیچے جہاں اس کی میری چار ٹانگیں ساتھ ساتھ فرش پر رکھی تھیں مگر کچھ اوپر گھٹنوں سے کمر تک جڑی ہوئی تھیں۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بیٹھنے سے پہلے میں انور سے کہہ سکتا تھا کہ تم آگے ہو جاؤ۔ خاندانی بزرگوں کی طرف سے یہ مجھ پر اپنایت اور اعتماد کا اظہار تھا کہ انہیں میرا بھابی سے لگ کر بیٹھنا بُرا نہیں لگا تھا جیسے کہ ہم بھائی بہن ہیں جو کہ ہم نہیں تھے۔

چند سیکنڈ اس تذبذب میں گزرے کہ مجھ سے گفتگو کا آغاز کون کرے اور کیسے کرے۔ پھر شاید نظروں میں یہ اشارہ بڑے چودھری کو مل گیا۔ صاحبِ خانہ کی حیثیت سے وہی اس بحرانی مسئلے پر منعقد ہونے والی کانفرنس کی صدارت کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔

''پتر سلیم اختر!'' انہوں نے حقے کا دھواں خارج فرما کے فرمایا۔ ''تجھے اندازہ تو ہوگا کہ ایک مسئلہ پیدا ہو گیا ہے؟''

انکار کرنا لاحاصل ہوتا۔ انور یا شاہینہ بھابی کی زبانی انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ مجھے اس مسئلے کے ہر نازک پہلو کا علم ہے چنانچہ میں نے فقط سر ہلانا کافی سمجھا۔

بڑے چودھری نے تفصیل میں جانا غیر ضروری سمجھا۔ ''دوسجن دشمن تو سب کے ہوتے ہیں۔ اب خیر سے دو پتر ہیں میرے اور بھائی جی کو اللہ نے دو بیٹیاں دی تھیں۔ ایک یہ تیرے ساتھ بیٹھی ہے شاہینہ... ہمارا انور اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت چلا گیا تھا ورنہ دوسری سے اس کا ویاہ ہو جاتا۔ یہ ہماری آپس کی بات تھی۔ دیر سویر سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن کچھ لوگوں نے غلط سمجھا اور فرض کر لیا کہ انور کو خدانخواستہ رشتہ قبول نہیں۔ ایک بندہ پیغام لے کر پہنچ گیا بھابی جی کے گھر... اپنے بیٹے کے لیے۔''

''وہ تھا میرا سالا... شاہینہ کا ماموں... اور کوئی ایسی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔'' پیر صاحب نے بڑے پُرنفرت لہجے میں کہا۔

بڑے چودھری نے حقے کا کش لینے کے بعد پھر بات کی۔ ''بھائی جی نے غلط فہمی سمجھ کے بُرا نہیں مانا اور کہا کہ میری تیسری بیٹی تو کوئی نہیں، تم یہ جانتے ہو۔ جو بیٹھی ہے گھر میں اس نے تو جانا ہے چودھری اصغر کے گھر... اس نے بڑی غلط اور نامناسب بات کی... یہ کہا کہ زبانی بات کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ آپ پرانی بات کو چھوڑو اور میرے بیٹے مراد کا رشتہ طے کرو۔ اب یہ کتنی نامناسب اور بے عزتی والی بات تھی۔ ہم زبان دے کے پھر جاتے... ایسا تو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔''

''اور کوئی ایسی بات کرتا تو بے عزت ہو کے جاتا مگر میں نے کچھ رشتے کا لحاظ رکھا مگر انکار کو اس نے بے عزتی سمجھ لیا اور خوامخواہ دشمنی پر اتر آیا۔ کم ظرف بندہ تھا، زمینداری کا خاندانی کام چھوڑ کے نو دولتیوں کی طرح دوسرے کاموں میں پڑ گیا۔ چار پیسے آ گئے تو خود کو صنعت کار اور بلڈر کہنے لگا۔'' پیر صاحب نے درمیان میں بات کی تو ان کے لہجے میں نفرت کا آتش فشاں دہک رہا تھا۔

بڑے چودھری صاحب سکون سے حقہ گڑگڑاتے رہے اور پھر بولے۔ ''ابھی کچھ دن پہلے اس کے بدکردار لڑکے کو کسی نے قتل کر دیا۔ بُری صحبت میں پڑ گیا تھا وہ... سارے لوفر اور کم ذات اس کے دوست تھے۔ ہم تو بس سنتے رہتے تھے کہ وہ کیا گل کھلا رہا ہے۔ بُرے کام کا بُرا انجام... مگر اس کے باپ نے بھائی جی سے دشمنی نکالی۔ انہیں قتل میں ملوث کر دیا اور اس سے بڑھ کر یہ... کہ اس معصوم اور شریف بچی پر یہ بے ہودہ الزام عائد کر دیا کہ وہ خدانخواستہ خاندانی رشتے کو چھوڑ کر اس کے بیٹے سے شادی کرنا چاہتی تھی۔''

میں یہ سرکاری وضاحتی بیان بظاہر بڑی توجہ سے سن رہا تھا جس میں ناپسندیدہ اور ناقابلِ بیان حقائق کو بڑی ہوشیاری سے نظر انداز کر دیا گیا تھا یا موزوں حد تک بدل کے قابلِ قبول بنا دیا گیا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں اس کیس کے قانونی پس منظر کے علاوہ جذباتی، نفسیاتی اور معاشرتی اسباب جانتا ہوں مگر ظاہرداری کا پردہ ان کی ضرورت تھی۔ اچانک میں نے.... اپنے دائیں پیر پر دوسرے پیر کا ہلکا سا دباؤ محسوس کیا۔ میرا یہ پیر سینٹرل ٹیبل کے نیچے تھا۔ چار فٹ چوڑائی کی یہ میز تھوڑا سا دائیں طرف تھی جدھر شاہینہ تھی اور پھر ساتھ والے چھوٹے صوفے پر اس کی ساس... انور بائیں جانب تھا اور آگے والے سنگل سیٹر صوفے پر محترم پیر صاحب براجمان تھے۔

میں نے اپنا پیر ہٹا لیا۔ سرکاری وضاحتی بیان ہنوز جاری تھا۔ لیکن اب میری توجہ صرف نظر کی حد تک اور ظاہری رہ گئی تھی۔ میرا ذہن شاہینہ کی اس حرکت سے ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ اس نے بڑی آہستگی سے اپنے پیر کا انگوٹھا میری پنڈلی کے نچلے حصے پر جما دیا۔ صوفے پر بیٹھنے سے میری پتلون چند انچ اوپر ہو گئی تھی۔ اس نے انگوٹھے سے میری پنڈلی کو کھجانا شروع کیا۔ بہت تیزی سے لیکن بہت واضح انداز میں۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے پیر پر کوئی کاکروچ چڑھ گیا ہو مگر یہ سرسراہٹ کچھ اور تھی اور اپنا ایک مفہوم رکھتی تھی۔

میں نے پیر کو تھوڑا سا اِدھر اُدھر کیا لیکن شاہینہ نے نظر سامنے اور توجہ اپنے سسر کے بیان پر رکھتے ہوئے خالص زنانہ انداز کی وہ حرکت جاری رکھی جس کے دو مطلب نہیں نکالے جا سکتے تھے۔ نہ میرے لیے جگہ بدلنا ممکن تھا اور نہ شاہینہ کو روکنا۔ وہ میری خاموشی اور بے بسی کو انجوائے کر رہی تھی اور اس کے لبوں پر خفیف سی شوخ مسکراہٹ میں بے شرمی کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ ایک پُرمسرت فاتحانہ چمک تھی جو اپنی جرأت مندی اور میری گھبراہٹ سے شہ پا رہی تھی۔

اچانک پیر صاحب نے سوال کر دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب تم ساری صورتِ حال کو سمجھ چکے ہو؟''

''جی... جی...'' میں نے سعادت مندی سے کہا مگر یہ میری پریشانی تھی شرافت نہیں۔ شاہینہ کا پاؤں پیچھے ہٹ گیا تھا لیکن اب اس کا بایاں ہاتھ جو میرے .... ہاتھ سے مس ہو رہا تھا، صوفے کی سطح پر کسی کیچوے کی طرح رینگنے لگا تھا اور اس کی ایک انگلی میری ران کے اوپر والے حصے پر گدگدی کر رہی تھی۔ ایک بار میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھنے کی ہمت بھی کی مگر اس کا چہرہ سپاٹ اور نظر سامنے تھی۔ وہ معصوم اور مظلوم بنی اپنا پیغام مجھ تک پہنچانے میں مصروف رہی۔

ابھی موقع نہیں تھا کہ میں شاہینہ کی اس حرکت کا کوئی جواب دے سکتا لیکن میرے لیے اس حرکت کا مطلب سمجھنا دشوار نہ تھا۔ وہ مجھے ورغلا رہی تھی۔ صاف اور بے لاگ الفاظ میں اس کی حرکت کا اور کوئی مطلب نہ تھا۔ اس کا باپ مجھے طاقت کی دھمکی سے ڈرا چکا تھا۔ اس کا سسر مجھے دلیل سے قائل کرنے میں مصروف تھا اور وہ مجھے رشوت دے رہی تھی۔ رشوت میں خود کو پیش کر رہی تھی کہ میں وہ بات مان لوں جو مجھ سے کہی جا رہی ہے تو میرا انعام وہ خود ہو گی۔ واضح اور دوٹوک غیر مشروط پیشکش... کیا میں اتنا احمق ہوں کہ اسے قبول نہ کروں؟ خصوصاً اس نظارۂ ہوش ربا کے باوجود جس میں میری نگاہ نے ایک حسین اور پُرشباب عورت کے وجود کی آتش فشانی کو اتنے قریب سے دیکھا تھا کہ اس کے جلوے نے میری نگاہوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ بے شک میری اس میں خطا بھی بے ارادہ تھی لیکن اس کے درگزر کی ادا میں لطف و کرم کا پورا اشارہ تھا۔ اچانک وہ منظر اپنی تمام رعنائی کے ساتھ میرے تصور میں جاگ اٹھا اور اس کی قربت ہی کم نہ تھی کہ سب کے درمیان مگر سب سے پوشیدہ اشارے نے میرے خیال کو بہکا دیا تھا اور میری عقل کو مفلوج کر دیا تھا۔ میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ اپنی تمام توجہ عدالتی کارروائی پر رکھوں مگر شاہینہ میرے احساس پر غالب آ رہی تھی۔

مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں اس وقت عام

انسانی کمزوری کا شکار بن گیا تھا۔ میرے لیے یہ سوچنا مشکل تھا کہ شاہینہ کا یہ فعل سراسر بے حیائی اور جسم فروشی ہے۔ خود میرا ایمان اتنا مضبوط اور فرشتوں جیسا نہیں تھا کہ میں اس رشوت کو قبول نہ کرتا۔ میں بہرحال ایک مرد تھا اور شاہینہ ایک عورت جس کا جسم شباب کے جذبات کی ندی سے سیراب ہونے کے بعد پھر پیاسا سا تھا... خشک سالی نے اس کو کسی دریا کی تہ جیسا کر دیا تھا جس کی سوکھ جانے والی تہ میں مٹی تڑخ رہی ہو۔

پھر جیسے فلم درمیان سے ٹوٹ گئی اور منظر جو میری نگاہ میں تھا، تصور میں بھی نہ رہا۔ اچانک بڑے چودھری کی آواز نے مجھے خواب سے حقیقت کی دنیا میں گھسیٹ لیا۔ ”اوئے کس سوچ میں پڑ گیا تُو...؟“

اور میں نے پھر اپنے آپ کو اس کمرے میں پایا جہاں میرے سامنے چھوٹے، بڑے چودھری کے بے رحم سخت گیر چہرے تھے۔ جو خاندانی آن بان شان کی دیوار کو گرنے سے بچانے کے لیے ایک اور محلاتی سازش کا غیر اخلاقی، غیر قانونی اور غیر انسانی تماشا کرنے والے تھے اور مجھے اس کا حصہ بنانا چاہتے تھے۔ مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ وہ سوال کیا تھا جس کے جواب کا وہ مطالبہ کر رہے تھے۔

میں ایک دم اٹھا اور معذرت کر کے باتھ روم میں گھس گیا۔ ”میں ایک منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔“

بڑے چودھری نے پُرمزاح انداز میں کہا۔ ”ابھی سے مروڑ اٹھنے لگے تیرے پیٹ میں۔“ لیکن ان ریمارکس پر انور کے یا پیر صاحب کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہ آئی۔ میں نے صرف شاہینہ کو مسکراتا دیکھا۔ وہ میری کم ہمتی اور بزدلی کا مذاق اڑاتی محسوس ہوتی تھی کہ بس... ہمت ہار گئے؟ کہاں گئی تمہاری ساری مردانگی... تم خاک مزاحمت کرو گے۔ ابھی سے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے ہیں... بھاگ گئے میدان چھوڑ کے مگر کہاں جاؤ گے... کب تک بھاگو گے... ہر جگہ پناہ کے لیے باتھ روم نہیں ہوگا۔

میں نے منہ پر پانی کا چھینٹا مار کے تولیے سے صاف کیا اور دو منٹ بعد ارادے کی ساری توانائی اور دماغ کی مکمل سپورٹ کے ساتھ لوٹ کر آیا تو مجھے انور سے یہ بھی نہیں کہنا پڑا کہ وہ کھسک کر شاہینہ کی طرف ہو جائے تو میں کونے میں پیر صاحب کے ساتھ بیٹھ جاؤں... اگر میں ایسا کہتا تو اس بات پر شاہینہ دل ہی دل میں ہنستی اور میرا مذاق اڑانے والی اس کی یہ ہنسی میرے سوا کوئی نہ سنتا... اس اعترافِ شکست کے سوا میرے پاس چارہ نہ تھا۔

لیکن نہ جانے کیوں ایسا پہلے ہی ہو گیا تھا۔ میں شاہینہ کی نظر میں خفیف ہونے سے بچ گیا۔ اب میری جگہ بڑی چودھرائن نے لے لی تھی۔ چور میرے دل میں تھا۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں اس نے شاہینہ کی خفیہ پیش قدمی کو محسوس تو نہیں کر لیا تھا۔ اس کے اور میرے چہرے کے جذبات کی تحریر میں اپنی اپنی نیت کا عکس نظر آ گیا تھا۔ وہ ایک تجربہ کار عورت تھی اور دوسرے مرد نہیں محسوس کر سکتے تھے، وہ جان سکتی تھی۔ ظاہر ہے یہ میرا وہم تھا۔ اسے خیال آیا ہوگا تو یہ کہ میرا اس کی بہو کے ساتھ لگ کر بیٹھنا کچھ نامناسب سی بات تھی۔

اب میں چودھرائن کی جگہ ایک الگ صوفے پر بیٹھا تھا۔ ”معافی چاہتا ہوں میں... ایک دم درد سا اٹھا تھا۔“

”کوئی دل کا مسئلہ تو نہیں۔“ شاہینہ نے بڑی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ تشویش کا اظہار کیا اور میں نے اس کے اصل معانی کو سمجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے کی غلطی کی تو اس نے بڑی صفائی سے سب کی نظر بچا کے مجھے آنکھ ماری... یہ بھی کسی نے نہیں دیکھا۔

”او نہیں پتر... خیر سے جوان بندہ ہے۔“ بڑے چودھری نے بہو کی بات کو غیر اہم قرار دے دیا۔ ”ویسے تو اپنے جلالی صاحب ہیں ادھر...“

بہو نے جواباً... شوخی کے ساتھ کہا۔ ”ان کا معاملہ نہیں ہے یہ اباجی... مجھے پتا ہے۔“

میں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ ”آپ نے کیا پوچھا تھا؟“

”یہی... کہ انور تو راضی ہے اور اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں ہے... تو کیا کہتا ہے؟“

وہ ایک لمحہ تھا جب میں نے مجموعی صورتِ حال کو اپنے ذہن میں اکٹھا کر لیا اور سمجھ گیا کہ مجھ سے اس سوال کا کیا جواب متوقع ہے چنانچہ میں نے کہا۔ ”چودھری صاحب! میری رائے کی کیا اہمیت ہے۔“

”اوئے اہمیت نہ ہوتی تو تجھے بلا کے بات کیوں کرتے... اللہ نے عقل دی ہے تجھے۔“

”مگر یہ آپ کا خاندانی معاملہ ہے۔ اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ میری بات آپ کو بُری لگ جائے۔ میں جو کہوں گا اپنی عقل کے مطابق کہوں گا۔ آپ کی ناراضی کے خیال سے نہ میں غلط مشورہ دے سکتا ہوں اور نہ منافقت سے کام لے سکتا ہوں۔“ میں نے انکساری سے کہا۔

”تو بول... کیا انور کا فیصلہ غلط ہے؟ اس کی جگہ تُو

ہوتا تو یہ انکار کر سکتا تھا؟“ بڑے چودھری نے کہا۔

میں نے انور کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا لیکن وہ مجھ سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔ ”کسی اور کے فیصلے پر میں کیا تبصرہ کروں۔ ظاہر ہے انور نے بھی جو کیا، سوچ سمجھ کے کیا۔ یہ معاملہ خاندان کی عزت سے بھی زیادہ اہم اس لیے ہو گیا تھا کہ سوال ہے زندگی اور موت کا... اور اپنوں کو بچانے کے لیے کوئی جان کی بازی بھی لگا دے تو وہ جواری نہیں ہوتا... جواری نفع نقصان دیکھتا ہے... یہاں صرف ہار جیت ہے... اور ہار میں بھی جیت ہے۔“

میں نے بہت گول مول بات کی تھی لیکن میری سوچ نے بڑے چودھری صاحب اور پیر صاحب دونوں کو متاثر کیا۔ ”یہ ہوئی ہے بھائی جی پڑھے لکھے بندے کی بات... اور ویسے بھی بندہ تقدیر کے فیصلے کو کیسے بدل سکتا ہے۔ جوڑے تو اوپر آسمانوں پر بن جاتے ہیں... چھوٹی نے بھی ہمارے گھر آنا ہی تھا۔“

شاہینہ کی نظر مجھ پر جم گئی۔ ”یہ بات تم ریشم کو سمجھاؤ۔“

میں نے دفاعی لہجے میں کہا۔ ”میں کیوں... فیصلہ انور کا ہے، وہ خود ریشم کو بتائے۔“

”مگر یہ کام تمہیں کرنا ہوگا۔“ شاہینہ بولی۔ ”جیسے انور تمہاری مانتا رہا... ریشم بھی مانتی آئی ہے۔“

”یہ تاثر بالکل غلط ہے میرے بارے میں... میں کیا ہوں... نہ کسی کا بڑا بھائی، نہ باپ نہ پیر و مرشد... یہ دونوں عاقل و بالغ اور اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ اپنے فیصلے خود کرتے ہیں...“ میں نے احتجاج کیا۔ ”میں کچھ نہیں کر سکتا۔“

میرا مطلب بہت واضح اور صاف تھا کہ انور نے اپنے باپ کی نہیں سنی تھی۔ روزینہ نے باپ کے فیصلے کے خلاف بغاوت کی تھی۔ کیا بڑے چودھری صاحب اور پیر و مرشد کا اثر رسوخ کام آیا تھا؟ آج مجھ سے کیوں توقع کی جا رہی ہے کہ میں کسی کو دلیل سے قائل کر سکتا ہوں... جذبات کا منہ زور سیلاب جوانی میں ہر دلیل کی دیوار کو بہا لے جاتا ہے۔

پیر صاحب نے جلالی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”ہم نے تمہیں صاف الفاظ میں سمجھا دیا تھا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔“

میں ان کے لہجے میں نمایاں دھمکی کو ان کی آنکھوں میں بھی پڑھ سکتا تھا۔

”پیر صاحب! وہ سبق میں کیسے بھول سکتا ہوں۔“

”یہی تمہارے اور ریشم کے حق میں بہتر ہوگا کہ باعزت طور پر خود کو ہمارے معاملات سے الگ کر لو۔“ اچانک اپنائیت کا انداز بدل گیا تھا۔ ”اور یہی بات تمہیں ریشم کو سمجھانا ہوگی۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں صرف اپنے معاملات کا ذمے دار ہوں۔ میں ایک اجنبی تھا اور آج بھی ہوں۔ انور کی وجہ سے مجھے یہاں اپنائیت ملی تھی اور اس نے ہی مجھے روک کے رکھا تھا۔ اب اگر اس کی اور آپ سب کی یہی مرضی ہے تو میں یہاں زبردستی نہیں رک سکتا۔ لیکن زبردستی میں ریشم کو اپنے ساتھ بھی نہیں لے جا سکتا... نہ وہ میرے ساتھ آئی تھی۔“

بڑے چودھری صاحب نے پھر صورتِ حال کو سنبھالا۔ ”دیکھو ملک سلیم! اگر وہ لڑکی ضد کرتی ہے تو بے شک کہیں نہ جائے۔“

”اس سے شادی کا وعدہ انور نے کیا تھا۔ وہ خود اس کو بتائے کہ خاندان کی ضرورت پر وہ اس کی محبت کو قربان کر رہا ہے۔ اس سے شادی نہیں کر سکتا اور وہ جہاں چاہے چلی جائے۔ وہ میرے ساتھ جانا چاہے گی تو میں انکار نہیں کروں گا۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

اچانک انور نے سر اٹھایا۔ ”اباجی! آپ لوگ کیوں غلط بات کر رہے ہیں؟ اگر میں روزینہ سے شادی کر رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب کیسے ہوا کہ ریشم سے نہیں کروں گا؟“

پیر صاحب نے صورتِ حال خراب ہوتے دیکھی تو پینترا بدل کے دخل اندازی کی۔ ”ہم نے ایک آسان حل تجویز کیا تھا۔ وہ لڑکی ریشم اس نوجوان ملک سلیم اختر کے ساتھ فرار ہو رہی تھی جب گرفتار ہوئی۔ اس کا مطلب ہے وہ اسے پسند کرتی تھی۔ آسانی اس کے لیے تھی کہ انور کسی مجبوری کی وجہ سے اپنے عہد پر قائم نہیں رہ سکتا تو وہ اپنی زندگی اس کے ساتھ گزار سکتی ہے۔ یہ دونوں یہاں بھی رہ سکتے ہیں...“

میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ ”معاف کیجیے پیر صاحب! ریشم کے لیے میرے جذبات وہی ہیں جو ہر بھائی کے اپنی بہن کے لیے ہوتے ہیں اور خود ریشم بھی ایسا ہی سمجھتی ہے۔“

انور نے برہمی سے کہا۔ ”کیوں معاملات کو الجھانے پر تلے ہوئے ہیں آپ سب لوگ... وہ بات کریں جس پر سب نے اتفاق کیا تھا۔ ہم یہاں معاملات کو سلجھانے کے لیے بیٹھے تھے، مزید الجھانے کے لیے نہیں۔ خاندان کی

عزت داؤ پر لگ گئی تھی اس لیے میں نے کہا تھا کہ میں پہلے روزینہ سے شادی کرسکتا ہوں اور میری مجبوری کو سمجھ لیا تھا ریشم نے بھی۔"

"آرام سے پتر انور آرام سے... یہ وقت آپس کے اختلافات پر لڑنے کا نہیں ہے۔"

"پھر غلط بات کیوں کرتے ہیں پیر صاحب... جبکہ ہم سب انہی کی عزت بچانے کی کوشش کررہے ہیں۔"

"دیکھ انور... یہ میرا بڑا بھائی ہے اور تیرا تایا ہے۔ یہ ہم سب کی عزت کا سوال ہے۔"

انور نے میری طرف دیکھا۔ "ملک! تُو سب جانتا ہے اور تو کیا ساری دنیا جان گئی ہے اب تو... میں خود کو اس خاندان سے الگ نہیں کرسکتا۔ جو ایک کا دشمن ہے، وہ سب کا دشمن ہے اور جنگ میں نہ جھوٹ سچ دیکھا جاتا ہے نہ جائز ناجائز... اس کا انتظام ہوگیا ہے کہ روزینہ کے ساتھ میرا نکاح آج سے ایک ہفتے پہلے کی تاریخ میں ہوجائے۔ یہ صرف قانونی دستاویز کی مدد سے ایک الزام کو غلط ثابت کرنے کے لیے ہے۔"

جانتے بوجھتے میں نے انجان بن کے کہا۔ "یعنی روزینہ صرف اس دستاویز کی حد تک تیری بیوی ہوگی؟"

پیر صاحب نے لال آنکھوں سے مجھے گھورا۔ "وہ یہاں آئے گی جیسے اس گھر کی بہو آتی ہے۔ اس کا مقام اور مرتبہ بھی وہی ہوگا۔"

بڑے چودھری نے مصالحت آمیز لہجے میں کہا۔ "بالکل ٹھیک کہا آپ نے... اور یہی بات ہم نے انور کو سمجھائی تھی کہ خاندانی بہو کا جو درجہ ہے، وہ ریشم کو کبھی حاصل نہیں ہوگا۔ بے شک انور اس کے بعد بھی شادی کرے... چار کی اجازت ہے شرع میں... لیکن ہمارا نام نسب چلے گا روزینہ سے... وہی مالک اور مختار ہوگی یہاں... اگر اب تک یہ بات ریشم کو نہیں سمجھائی گئی ہے تو اب سمجھانا ضروری ہے۔"

"وہ سمجھتی ہے ابا جی۔" انور نے ناگواری سے کہا۔

"پھر الزام لگانے والوں کا مقابلہ ہم کرلیں گے۔ تھانہ کچہری میں سارا کھیل ہی شہادت اور گواہی کا ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں اس کھیل میں حریف کا مقابلہ کیسے کرنا چاہیے۔" بڑے چودھری نے کہا۔

ایک خادمہ نے دروازے میں نمودار ہو کے کہا۔ "جنابِ عالی! مولوی صاحب آئے ہیں۔"

بڑے چودھری نے حقّے کو ایک طرف رکھ دیا۔

پھر وہ عجلت میں مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "ایک مولوی مل گیا ساتھ کے گاؤں کا... اس نے آخری نکاح کا اندراج ایک ہفتہ پہلے کیا تھا۔ یہاں نکاح تو روز ہوتے ہیں، رجسٹریشن کوئی نہیں کراتا نکاح نامہ لینے کے لیے... کسی کو باہر جانا ہو یا قانونی معاملہ ہو تو الگ بات ہے۔"

شاہینہ موقع غنیمت جان کے بولی۔ "دونوں بھائیوں کے آپس کے سمجھوتے کا بھی بتادیں ابا جی۔"

میں نے کہا۔ "وہ معلوم ہے مجھے... اکبر کو ایک بھائی کی جاگیر کا مالک تسلیم کرلیا جائے گا۔ انور کو دوسرے کی جائداد مل جائے گی۔ میں پیر صاحب کے فارمولے سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ انور ان کا داماد ہی نہیں... ایک دن گدی نشین بھی ہوگا... کیا اب میں جاسکتا ہوں؟"

"تُو کہاں جارہا ہے ابھی سے... نکاح کا گواہ تُو ہی ہوگا... بیٹھ جا۔" بڑے چودھری نے حکم دیا۔

"نہیں چودھری صاحب! میں اس عزت افزائی کا مستحق نہیں... میں باہر کا کم ذات آدمی..."

انور نے میرا ہاتھ پکڑلیا۔ "پلیز ملک! مجھے تیری مدد چاہیے... میرے لیے پریشانی مت پیدا کر۔"

اس کی صورت کی مظلومیت نے میرے قدم روک لیے۔ میں ایک سو فیصد جعلی اور غیر قانونی کارروائی میں گواہ بننے کے لیے رک گیا۔ شرعی اعتبار سے نکاح سو فیصد درست فعل تھا، غلط تاریخ کے اندراج کے گناہ کا بار سب پر آتا تھا۔ اس میں بڑے چودھری کے ساتھ پیر صاحب، میں، شاہینہ اور انور سب شریک تھے۔ نکاح خواں اور اندراج کرنے والا قاضی بے بس اور مجبور تھا۔ اس پر جبر کا گناہ بھی بڑے چھوٹے چودھری سب مل کر کررہے تھے لیکن یہ بقا کی جنگ ایسے ہی چل رہی تھی اور آج جو کچھ ہورہا تھا، اس طرزِ فکر اور طرزِ زندگی کا صرف ایک نمونہ تھا۔

مسکین صورت سہما ہوا قاضی اجازت ملنے پر اندر آگیا اور مؤدبانہ سلام کرکے کھڑا ہوگیا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی چودھرائن اور شاہینہ وہاں سے ہٹ گئی تھیں۔ کسی غلام کی طرح حکم کی تعمیل کے لیے حاضر ہوجانے والا یہ باریش شخص اپنی دینی حیثیت میں ہم سب سے افضل تھا۔ وہ شخص تھا جو مہد سے لحد تک ہمیں دین کے راستے پر چلاتا ہے۔ بچے کے کان میں آوازِ اذان پہنچانے سے اس کی نمازِ جنازہ تک زندگی کے ہر اہم لمحے میں اپنا دینی فریضہ دیانت داری سے ادا کرتا ہے۔ اس کی معاشرتی حیثیت اور عزت اس شخص سے کسی طرح برتر نہ تھی جو اس معاشرے میں معاوضہ لے کر اوپر والوں کے لیے ہر خدمت بجا لاتے ہیں۔

"ہاں بھئی آگیا تُو مولوی؟" بڑے چودھری نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "بیٹھ ادھر۔"

"مہربانی جناب۔" مولوی نے مؤدبانہ اپنا رجسٹر پیش کیا۔

"ادھر دے۔" بڑے چودھری نے میری طرف دیکھا۔

رجسٹر میرے سامنے آگیا۔ میں نے اس پر ایک نظر ڈالی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس میں تمام ضروری اندراج پہلے سے کرلیے گئے تھے۔ اس میں دولہا دلہن کے نام، ولدیت اور شناختی کارڈ... حقِ مہر، یہاں تک کہ ان کے دستخط بھی موجود تھے۔ دو گواہوں میں سے ایک نام انور کے بڑے بھائی اکبر کا تھا جو یہیں قید تھا۔ دوسرا گواہ میرے لیے اجنبی تھا مگر میں فرض کرسکتا تھا کہ وہ بھی کوئی فیملی ممبر یا جاں نثار ہوگا۔ میرا نام دلہن کے وکیل کی جگہ لکھا گیا تھا جو یہ گواہی دیتا ہے کہ دلہن نے اس کے سامنے ایجاب و قبول کیا تھا اور نکاح نامے پر اپنے دستخط ثبت کیے تھے۔ اب یہ ہر تقریبِ نکاح میں ہوتا ہے کہ دونوں فریقوں کی رضامندی سے سادہ کاغذی کارروائی پہلے ہی مکمل کرلی جاتی ہے اور شادی کے موقع پر نکاح سب کے سامنے پڑھا کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیے جاتے ہیں۔

یہ نکتۂ اعتراض اٹھانے کی جگہ نہ تھی... میں نے خود پر جبر کرتے ہوئے اپنے دستخط کیے اور اپنے کوائف بھی لکھوائے۔ اب دیکھا جائے تو یہ بھی غلط تھا۔ نہ میرا نام سلیم اختر تھا اور نہ میرا شناختی کارڈ یا اس کے مندرجات صحیح تھے۔ ایک شخص جو پہلے ہی جھوٹ اور غلط بیانی کی دلدل میں اپنی مرضی سے گرا ہو، کیسے اعتراض کرسکتا ہے کہ کسی اور کے دامن پر جھوٹ کا داغ ہے۔

شاک مجھے اس وقت لگا جب مولوی صاحب نے بڑے چودھری سے ایک بند لفافہ وصول کرکے ان کی اور ان کے خاندان کی دین اور دنیا میں فلاح کے لیے دعا کا پورا پیکیج دہرایا اور رخصتی مصافحہ کے لیے باادب ہو کے ہاتھ آگے بڑھایا۔

میں نے کہا۔ "آپ جارہے ہیں مولانا... نکاح کب پڑھائیں گے؟"

ایک دم مولانا کا چہرہ حیرت اور مظلومیت کی تصویر

بن گیا۔ "وہ تو جناب ہوچکا..."

"ہوچکا... کب؟" میں نے برہمی سے کہا۔

بڑے چودھری کے ساتھ پیر صاحب کی صورت پر ناراضی کے آثار نمایاں ہوگئے۔ "آج صبح۔" بڑے چودھری نے درشتی سے کہا۔ "آپ جاؤ ملا جی... کل تک رجسٹریشن کرا کے کاپی دے جانا۔"

"جی حضورِ والا۔" مولوی صاحب نے عجلت میں رجسٹر کو بغل میں دبا کے نکلتے ہوئے کہا۔

میرے لیے اب ضبط اور برداشت سے کام لیے بنا چارہ نہ تھا۔ میرا دل پورے یقین کے ساتھ کہتا تھا کہ نکاح کی رسمی کارروائی ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ اگر میں بحث کرتا تو پیر صاحب دلائل سے ثابت کرسکتے تھے کہ نکاح صرف ایجاب و قبول ہوتا ہے جس کے لیے دو بالغ مرد گواہوں کی موجودگی کافی ہے۔

مولوی صاحب کے رخصت ہوتے ہی بڑی چودھرائن اور شاہینہ بھابی کمرے میں لوٹ آئیں۔ شاید کسی دروازے کی اوٹ سے وہ میرے دستخط کرنے کا منظر بڑی فاتحانہ دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہی ہوں گی۔ سب سے اہم گواہی میری تھی۔ میں نے روزینہ کو دیکھا تک نہیں تھا لیکن میں نے گواہی دے دی تھی کہ اس نے میرے سامنے انور کو قبول کیا اور میرے سامنے دستخط بھی کیے۔ شرعی حیثیت سے الگ اب یہ نکاح نامہ سب سے اہم قانونی دستاویز بھی بن گیا تھا۔ یہی دستاویز اور میری گواہی قتل کے اس کیس کو جھوٹا بناتی تھی جو پیر صاحب اور ان کی دختر نیک اختر روزینہ پر اس کے ماموں نے بنایا تھا۔ میں سچ جانتا تھا مگر سب سے بڑا جھوٹ میں لکھ چکا تھا اور یہ جھوٹ مجھے حلف اٹھا کے عدالت میں بھی بولنا تھا کہ جنابِ والا... وقوعہ والے روز تو میری مؤکل روزینہ دختر پیر اظہر علی جائے واردات پر موجود ہی نہ تھی کیونکہ وہ ایک ہفتہ قبل ہی نکاح کے بعد رخصت ہو کے سسرال جاچکی تھی اور وہیں موجود تھی۔ اس کی گواہی ملزمہ کا شوہر اور سسرال کے سب لوگ دیں گے جن میں حویلی کے تمام ملازمین بھی شامل ہیں۔

یہ میری بے وقوفی اور بے بسی تھی کہ میں نے اپنے دستخط اس دستاویز پر ثبت کردیے تھے جو دنیا سے بھی جھوٹ تھا اور خدا سے بھی۔ اگر نکاح آج صبح ہوگیا تھا تب بھی یہ جھوٹ تھا۔ نکاح کے وقت میں موجود نہ تھا۔ کسی روزینہ نے میرے سامنے کسی انور کو اپنا شوہر قبول نہیں کیا تھا۔ اور بفرضِ محال... نکاح آج ہوتا تب بھی میرا جھوٹ تو جھوٹ ہی

رہتا کیونکہ میں نے تو ثابت کیا تھا کہ یہ تقریب ایک ہفتہ پہلے ہوئی تھی اور روزینہ رخصتی کے بعد وہاں آگئی تھی جہاں میں تھا۔

غصے اور جھنجلاہٹ سے میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ میں ایک دم اٹھا اور پیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ اپنے کمرے میں آ کے میں نے دروازے کو دھڑ سے مارا اور بستر پر گر گیا۔ مجھے غصہ تھا تو اپنے آپ پر... اب میں اس خاندان کا یرغمالی تھا۔ اب میں اپنی مرضی کا مالک نہیں تھا کہ احتجاجاً حویلی سے واک آؤٹ کر جاؤں یا نورین کی تلاش میں نکل جاؤں۔ آج کے بعد سے مجھے سخت حفاظتی تحویل میں رکھا جائے گا۔ اس وقت تک جب تک سیشن کورٹ میں حاضر... ہو کے میں اپنا بیان ریکارڈ نہیں کرا دیتا کہ محترم و مکرم پیر صاحب اور ان کی عفت مآب صاحبزادی پر ایسا گھناؤنا الزام لگانے والے کتنے جھوٹے، بدخواہ اور بدکردار ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ سیاہ کیا ہے اور سفید کیا... مجھے حلف اٹھا کے کہنا ہے کہ سفید ہی سیاہ ہے اور سیاہ واقعی سفید ہے۔ دن درحقیقت رات ہے اور رات کے دن ہونے میں کوئی شک نہیں... کیا ضمیر اور کیا دین ایمان۔

میرا جذباتی ردِعمل یقیناً بہت شدید تھا لیکن رفتہ رفتہ میرے حواس بحال ہونے لگے اور میں نے حقائق کو ان کی تمام بدصورتی کے باوجود اصل صورت میں دیکھنا شروع کیا۔ شک کی اس میں کوئی گنجائش نہ تھی کہ اب دن رات میری حفاظت کی جائے گی۔ ہمارے ملک میں چشم دید گواہ کو ختم کر دینا کیس کو ختم کر دیتا ہے اور عدالت اصل حقائق جانتے ہوئے بھی فیصلہ بدلنے پر مجبور ہوتی ہے۔ مجھ پر اب اس مقدمے میں پیر صاحب کے لیے بے گناہی کے فیصلے کا انحصار تھا۔ لازمی بات ہے کہ جب پیر صاحب کے دشمن اپنی طاقت، اثر رسوخ اور بدمعاشی سے یہ جان لیں گے کہ سچائی کو کیسے اور کس کی مدد سے جھوٹ میں بدلا گیا ہے تو ان کا ردعمل کیا ہوگا۔ ان کے انتقامی ردِعمل سے نہ میں محفوظ رہوں گا اور نہ نکاح خواں... اگر انہوں نے دونوں کو مار دیا تو پھر نکاح نامہ رہ جائے گا کاغذ کا ایک پرزہ... پھر یہ کہنا ممکن ہو گا کہ اس پر دستخط جعلی ہیں۔

یہ میرے لیے انتہائی پریشانی کی بات تھی۔ اپنی بے وقوفی سے میں نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی اور اپنے پاؤں کاٹ دیے تھے۔ اب میں بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک گھنٹے تک میں اپنے کمرے میں کسی پاگل کتے کی طرح چکر لگاتا رہا اور پانی پی پی کے اپنے اندر کی آگ کو بجھانے کی احمقانہ کوشش میں مصروف رہا۔ بڑے چودھری صاحب کے بند کمرے میں اجلاس کی کارروائی نہ جانے کتنی دیر جاری رہی اور میرے اٹھ جانے کے بعد وہاں کیا اہم فیصلے کیے گئے۔ نہ کوئی بتانے آیا اور نہ مجھے بلانے... یکلخت میری اہمیت صرف ایک گواہ کی رہ گئی تھی۔ ملک سلیم اختر اب صرف اپنے ضمیر کا ہی نہیں، حویلی کا بھی قیدی تھا۔

اس کا اندازہ مجھے شام تک ہو گیا۔ ایک خادمہ آئی اور میرے لیے چائے کی ٹرالی چھوڑ گئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”پیر صاحب حویلی میں ہیں یا چلے گئے؟“

”چلے گئے سرکار۔“ خادمہ نے مؤدبانہ جواب دیا۔

”اور چودھری انور کہاں ہے؟“

”مجھے معلوم نہیں سرکار۔“ وہ اسی لہجے میں بولی۔

”معلوم کرواور اسے کہو... ملک صاحب بلا رہے ہیں۔“

”جی سرکار۔“ وہ خاموشی سے چلی گئی۔

انور اس طلبی کے باوجود نہیں آیا۔ ظاہر ہے وہ مجھ سے منہ چھپا رہا تھا اور اس وقت تک میرے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا جب تک اسے یقین نہ ہو جائے کہ میرا غصہ ٹھنڈا ہو چکا ہو گا۔ انور کو ایک نہیں بہت سے الزامات کا سامنا تھا جن کی صفائی میں وہ کسی دلیل سے مجھے قائل نہیں کر سکتا تھا۔ خود مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں ریشم کے پاس جا کے اس کی مزاج پرسی کروں۔ آخر کب تک وہ بے خبر رہ سکتی تھی۔ کسی نہ کسی نے اسے ضرور بتا دیا ہوگا کہ اس کا پرستار انور اب روزینہ کا شوہر ہے۔ یہ نیک کام شاہینہ نے بڑے شوق اور جذبے سے کیا ہوگا۔ یہ اس کی فتح کا اعلان تھا۔ جو وہ چاہتی تھی، ہو گیا تھا۔ اس کی بہن بھی اس گھر کی مالکن کے مرتبے پر فائز ہو چکی تھی۔ ریشم کی پہلے بھی کیا اوقات تھی، ایک کم ذات باہر کی لڑکی... بیوی بن کے بھی وہ داشتہ ہی ہوتی... اب ایسا ہی ہوگا۔ دوسری، تیسری، چوتھی... ساری بیویاں عزت میں روزینہ کا پاسنگ بھی نہیں۔

مجھے انور پر بہت طیش آ رہا تھا۔ آج رہی سہی کسر پوری ہو گئی تھی جب اس نے اپنی محبت کو خاندانی برتری کے اس کمپلیکس کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ انتہائی بے مروتی اور سنگ دلی کے ساتھ اس نے ایک عام محبت کرنے والی لڑکی کے جذبات اور ارمانوں کا خون کر کے خاندان کی ایک لڑکی کو جسے وہ نفرت کی حد تک ناپسند کرتا تھا، شرفِ زوجیت عطا کر دیا تھا۔ اب ریشم کی محبت بے وقعت ہو چکی تھی۔ وہ جاگیردار انور کی زندگی میں پسندیدگی کے باعث جسمانی قربت کی منزل تک ضرور پہنچ سکتی تھی لیکن محبت پر غرور کے

بغیر... عزت مانگے بغیر...

مجھے ریشم کے مصالحت کے رویے پر بھی رنج تھا۔ کتنی آسانی سے اس نے محبت کی یہ رسوائی قبول کر لی تھی یا شاید مجھے یوں لگا تھا کہ اس کے لیے یہ مرحلہ آسان تھا۔ اندر سے وہ نہ جانے کس طرح ٹوٹی ہوگی اور کیسے روح کے کرب سے گزری ہوگی۔ مصالحت اس کی مجبوری تھی۔ اس کے سامنے دوسرا راستہ ہی کہاں تھا... میں اس کی دوطرفہ مجبوری کو سمجھ سکتا تھا۔ ایک مجبوری یہ تھی کہ وہ دل سے انور سے پیار کرتی تھی اور اسے چھوڑنے کا تصور بھی ریشم کے لیے خود کو عذاب کی سولی پر چڑھانے کے مترادف تھا۔

انور خاموشی سے اندر آ کے میرے سامنے بیٹھ گیا۔ کمرے میں اب نیم تاریکی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے لائٹ کا سوئچ دبا دیا۔ کمرا روشن ہو گیا۔ خاموشی کا ایک مطعون کرنے والا وقفہ جو چند سیکنڈوں تک تھا جیسے گھنٹوں پر محیط ہو گیا... وہ مجھے دیکھتا رہا۔

”تو کچھ کہے گا نہیں؟“ انور نے بالآخر سوال کیا۔

”نہیں۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”اب کیا رہ گیا ہے کہنے کو؟“

”میرے پاس بھی کچھ نہیں ہے اپنی صفائی میں کہنے کو۔“ وہ بولا۔

خاموشی کے ایک اور وقفے کے بعد میں نے کہا۔ ”میں جانا چاہتا ہوں انور... کیا میں جا سکتا ہوں؟“

اس نے خلا میں دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ”اسی لیے میں نے تجھ سے سوال نہیں کیا تھا کہ کیوں اور کہاں؟“

”اس لیے کہ اب میں صفائی کا سب سے اہم گواہ ہوں... میری گواہی سے ہی قتل کے اس کیس میں تیری بیوی اور تیرے سسر باعزت طور پر بری ہوں گے؟“

”تو اس مشکل وقت میں میرا ساتھ دینے سے انکار کیسے کر سکتا ہے؟“

”یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ تُو نے بھی میری مدد کی تھی۔ ورنہ شاید فریدالدین آج پھر کسی جیل میں ہوتا... ڈیتھ روم... سزائے موت کے منتظر قیدیوں کے درمیان... مجھے احسان کا بدلہ چکانا چاہیے... ورنہ میں ہر طرف سے خطرے میں گھر جاؤں گا۔ پیر صاحب نے یہی دھمکی دی تھی کہ میری اصلیت اور حقیقت معلوم کر لی جائے گی پھر سرکاری اہلکاروں سے پہلے نادر شاہ کے کارندے مجھے لے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی اب مجھے پیر صاحب پر قتل کا مقدمہ درج کرنے والے بھی زندہ دیکھنے کے روادار نہیں ہوں گے۔ وہ بھی صفائی کے سب سے اہم گواہ کو ٹھکانے لگانا چاہیں گے۔ یعنی صرف مجھے؟“ میں نے تلخی سے کہا۔

”نہیں، گواہی نکاح خواں کی بھی اتنی ہی اہم ہو گی۔“

”اور سیشن کورٹ میں ہم دونوں کی گواہی ریکارڈ ہونے میں تو ابھی بہت وقت ہے۔ ابھی تو مقدمہ ہی درج نہیں ہوا۔ ہائی کورٹ حکم دے گی تو مقدمہ درج ہوگا پھر چالان پیش ہوگا، سیشن جج کی عدالت میں... اس سے پہلے تفتیش کا عمل جاری رہے گا۔ مدعی اپنا پورا زور لگائیں گے کہ یہ عمل طویل نہ ہو مگر پیر صاحب کے مقابلے میں ان کے پاس کیا ہے دولت کے سوا... پیر صاحب کا اثر رسوخ کام کرے گا۔ ہر مرحلہ طویل ہوگا۔ پہلے ہائی کورٹ میں تاریخ پڑتی رہے گی... اس کے بعد عبوری ضمانت اور ضمنی چالان پیش کرنے میں تاخیر ہوگی... اور ضمانت کی توثیق کے بعد سماعت چلے گی برسوں... تاریخ پر تاریخ پڑتی جائے گی۔ میرا اندازہ ہے کہ جب بالآخر میری یا اس نکاح خواں کی گواہی کا وقت آئے گا تو دو تین سال ضرور گزر چکے ہوں گے۔ تب تک ہمیں زندہ رکھنا تمہارے لیے اتنا ہی ضروری ہوگا جتنا مخالف فریق کے لیے ہمیں ٹھکانے لگانا۔“

انور خاموشی سے سنتا رہا۔ ”ہم اتنی آسانی سے تو پھانسی پر چڑھنے والے نہیں ہیں ملک... ہمیں دشمنوں سے نمٹنا آتا ہے۔“

”تمہارے اس قبائلی نظام کی تاریخ میں دوستی نبھانے کی کوئی تاریخی مثال نہیں ملتی۔ دشمنی چلانے کی روایات نسل بعد نسل چلتی ہیں اور سانڈوں کی لڑائی میں حشرات الارض کے روندے جانے کا کوئی ذکر ہی نہیں آتا۔ مجھے نہیں معلوم وہ مظلوم نکاح خواں کیا کرے گا لیکن انور... میں ایک مہرے کے طور پر استعمال ہونے کے لیے یہاں اتنا لمبا عرصہ نہیں رک سکتا۔“

”اب یہ مجبوری ہے ملک۔“

”مجبوری میری کیوں... اگر ضرورت تمہاری ہے...“ میں نے برہمی سے کہا۔

”نہ وہ نکاح خواں محفوظ رہ سکتا ہے اور نہ تُو... اب ہمارے اور اس ٹھیکے دار کے درمیان کھلی دشمنی کا معاملہ ہے... وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے تاکہ ہمارے دفاع کا کیس کمزور ہو جائے۔“

”کیا وہ تمہیں مار کے حساب برابر نہیں کر سکتے؟“

”حساب کبھی برابر نہیں ہوتا لیکن ہم پر ہاتھ ڈالنا

ناممکن ہوگا۔ ہم اپنی حفاظت کر سکتے ہیں اور گولی کا جواب گولی سے بھی دے سکتے ہیں۔ ہم تمہاری حفاظت بھی اسی طرح کریں گے جیسے اپنی... ابھی یہ بات کسی کے علم میں نہیں کہ ہم نے اپنا دفاع کیسے مضبوط کیا ہے۔ نکاح نامے سے ان کے الزام کی نفی ہو جائے گی۔ کم سے کم روزینہ اس سے محفوظ ہو جائے گی۔ پیر صاحب کا حفاظتی حصار بہت مضبوط ہے۔ مقدمہ درج ہونے کے بعد نکاح نامہ تفتیشی افسر کے سامنے پیش ہوگا تو دشمنوں کے لیے اتنا ہی بڑا صدمہ ہوگا جتنا بھارت کے لیے ہمارا ایٹمی دھماکا تھا۔ پھر دشمن معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ یہ ناقابلِ تردید قانونی شہادت ہم نے کہاں سے لی اور انہیں معلوم ہوجائے گا لیکن اس وقت وہ مولوی ہماری تحویل میں ہوگا۔ ان کے فرشتے بھی اس تک نہیں پہنچ سکیں گے۔“

”اور میں؟ ایسا ہی سلوک میرے ساتھ ہوگا... لیکن انور میں صاف بتادوں، میں یہاں قیدی بن کے نہیں رہوں گا۔“

”تُو قیدی نہیں... آزاد ہوگا بس تو جہاں جائے گا حفاظتی انتظامات کے ساتھ جائے گا۔ مسلح گن مین تیرے ساتھ ہوں گے۔“

میں نے چلاّ کے کہا۔ ”بھاڑ میں گئے مسلح گن مین... یہ خونی ڈراما نہ ہوتا تب بھی میں یہاں رک نہیں سکتا تھا۔ میں نے نورین کا سراغ لگا لیا ہے... مجھے اس کو تلاش کرنا ہے۔“

”نورین کا سراغ بھی لگا لیا جائے گا۔ تُو اکیلا وہ کام نہیں کرسکتا جو ہم اپنے وسائل اور طاقت کی مدد سے کرسکتے ہیں۔“

”کوئی مجھے روک نہیں سکتا انور... یہ میرا معاملہ ہے... ایک جذباتی مسئلہ ہے، اس میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کا آنا بھی مجھے منظور نہیں۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں اس معاملے میں بے بس نہ ہوتا تو روزینہ سے شادی کیوں کرتا... لیکن اپنے خاندان سے الگ میں کچھ بھی نہیں... میں بھی مجبور ہوں کہ تجھے جانے نہ دوں۔“

میں نے دہاڑ کے کہا۔ ”تو چیلنج مت کر مجھے انور! میں بھاگ جاؤں گا... ورنہ تُو مجھے بھی ڈال دے قید خانے میں... زنجیروں میں جکڑ کے... اور اس مولوی کو بھی۔“

”یہ بھی کرنا پڑے گا اگر ضروری ہوا... فیصلہ میرا نہیں ہوگا۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور ایک دم اٹھ کے باہر چلا گیا۔

میں بہت دیر تک بے وقوفوں کی طرح وہیں بیٹھا اپنے سامنے دیوار کو گھورتا رہا۔ انور نے لگی لپٹی رکھے بغیر سب بتا دیا تھا۔ ایک دستخط کر کے میں گواہ نہیں، قیدی ہوگیا تھا۔ اکبر کی پھر بھی خاندانی حیثیت تھی۔ میری کوئی حیثیت نہ تھی۔ مجھے اس نکاح خواں سے کیا... وہ تو حکم کا غلام تھا۔ میں نے اپنے پیروں میں خود بیڑی ڈالی تھی۔ چوائس اب میری تھی... میں خاندان سے تعاون کروں اور باعزت طور پر اپنی ذمے داری نبھاؤں... یا بغاوت کروں اور بے عزت قیدی بن جاؤں۔ تہ خانے سے اکبر کو بہت جلد رہائی ملنے کا امکان تھا۔ کیا وہ خلا مجھے پُر کرنا ہوگا... وہ جگہ محفوظ ہے۔ باہر میری زندگی کی ضمانت کوئی نہیں۔ چودھریوں کے خاندانی دشمن میری گھات میں ہوں گے۔ مجھے ٹھکانے لگانا ان کے لیے اتنا ہی بڑا چیلنج ہوگا جتنا مجھے بچانا بڑے چودھری یا پیر صاحب کے لیے ہے۔

پوری حویلی میں خاموشی کا راج تھا۔ خاندان کی عزت کے محافظ اور ٹھیکے دار مطمئن تھے کہ انہوں نے اپنا دفاع مضبوط کرلیا۔ انہیں دوسروں کی زندگی کے بننے بگڑنے سے سروکار نہ تھا۔ اگلا مرحلہ انور اور اکبر کے درمیان سرحدی تنازعہ جیسا جھگڑا ختم کرنے کا تھا اور اس کا بھی حل تلاش کرلیا گیا تھا۔ شاہینہ کے لیے یہ دہری کامیابی تھی۔ اس کی طاقت کا اصل منبع اس کا عیار دماغ تھا جو کامیابی کے لیے ہر سازش کا تانا بانا بڑی مہارت سے بُنتا تھا اور وہ بیک وقت اتنی ہوشیار اور محتاط تھی کہ حصولِ مقصد کے لیے اخلاقی اور غیر اخلاقی تمام حربے پورے اعتماد کے ساتھ آزماتی تھی لیکن معصوم اور مظلوم بھی بنی رہتی تھی۔

اب بہت جلد اکبر کا اقتدار بھی بحال ہونے والا تھا اور سپر پاورز نے اس کا بہت مؤثر اور دیرپا حل نکالا تھا۔ پیر صاحب نے اکبر کو اپنا وارث بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس جیسے شخص کو اپنا روحانی جانشین بنانا بھی مشکل نہ تھا۔ شاید انور اس کے لیے بالکل ناموزوں ثابت ہوتا چنانچہ اب وقت آگیا تھا کہ پُرامن انداز میں معاملات طے ہوں۔ اس طرح کہ مستقبل میں بھی بھائیوں کے درمیان محاذ آرائی کا خطرہ نہ رہے۔ روزینہ آج کل میں انور کی شریکِ حیات کا منصب سنبھالنے کے لیے آسکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اکبر کو پیر صاحب کے حوالے کردیا جاتا اور شاہینہ اس کے ساتھ واپس اس گھر میں پہنچ جاتی جہاں اس کی طاقت اور اس کا اثر رسوخ دو چند ہوگا۔ کیونکہ وہ صرف اس کے شوہر کی نہیں،

اس کے باپ کی بھی سلطنت تھی۔ صرف زمین کی حاکیت نہیں تھی۔ دلوں پر روحانی طاقت کی حکومت بھی تھی۔

حالات نے پیر صاحب کے اس حکم پر عملدرآمد روک دیا تھا کہ میں ریشم کے ساتھ فوراً حویلی سے نکل جاؤں تاکہ روزینہ کا راستہ صاف ہو... اب میرا مصرف اس بات کا متقاضی تھا کہ مجھے باحفاظت یہاں رکھا جائے... ریشم کا مستقبل غیر یقینی تھا۔ اپنی محبت کی رسوائی پر احتجاج کر کے وہ کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

میں ریشم کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا کہ وہ خاموشی سے اندر آ گئی اور میرے سامنے بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔ اس پر بیماری کا اثر باقی تھا لیکن وہ پُرسکون تھی۔ اس کی آنکھوں کی اداسی اور چہرے پر کھنڈی زردی حالِ دل زار بھی خاموشی کی زباں میں کہتی تھی۔

''کیسے ہو تم؟ کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' اس نے کہا۔

''تم یہ پوچھنے آئی ہو... کیا لگتا ہے تمہیں؟ میں بیمار ہوں؟'' میں نے چڑ کے کہا۔

''مجھ سے لڑ کے کیا ملے گا تمہیں؟'' وہ نظر جھکا کے بولی۔

میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔ ''دیکھو... خدا کے لیے رونا شروع مت کر دینا... تمہیں نہیں معلوم میں کس عذاب سے گزر رہا ہوں۔''

''معلوم ہے سب... میں اس دن کو یاد کرتی ہوں سلیم جب میں اور تم فرار ہونا چاہتے تھے اور پکڑے گئے تھے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر ہم نکل گئے ہوتے۔ اب ہمارے اختیار میں کچھ بھی نہیں رہا۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے رخسار پر آ گیا۔

''انور سے بات ہوئی ہے تمہاری؟'' میں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''کیسی عجیب بات ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں مجبور ہوں۔''

''وہ ٹھیک کہتا ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''اختیار تمہارے پاس ہے... جب چاہو اسے اور حویلی کو چھوڑ کے چلی جاؤ۔ راستے تمہارے لیے کھلے ہیں لیکن تمہاری حالت تو بہت قابلِ رحم ہے...''

''تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو...'' وہ سر جھکا کے بیٹھی رہی۔ ''کیونکہ تم مرد ہو... دنیا میں کہیں بھی جا سکتے ہو... اکیلے رہ سکتے ہو... میں کہاں جا سکتی ہوں۔ کہنے کو ایک گھر ہے اپنا مگر اب کون ہے وہاں جس کا ہاتھ میرے سر ہو... جو مجھے ہر طرف منڈلانے والے بھوکے بھیڑیوں سے بچا سکے۔ یہاں انور کے ساتھ اس گھر میں اس کی بیوی... داشتہ یا کنیز... سب کو ایک محفوظ ٹھکانا ضرور میسر ہے۔ کس کی نظر میں میرا مقام کیا ہے اور کتنی عزت ہے... اس کی پروا میں کیوں کروں؟''

اس کی دلیل نے مجھے قائل اور خاموش کر دیا۔ ''شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو، میری نہ کوئی منزل نہ ٹھکانا... سیدھی صاف بات ہے کہ میں اپنی ذمے داری بنا کے تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ ایک بار میں نے یہ غلطی کی تھی اور اس کی سزا نہ جانے کب تک بھگتوں گا۔ میں نے نورین سے جو عہد اور بڑے بڑے وعدے کیے تھے، سب دھرے رہ گئے۔ معلوم نہیں آج وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ فاطمہ بن کے ساون خان جیسے دختر فروش کے ہاتھوں فروخت ہو کے اب کسی اور نام سے کسی اور بازار میں سجا دی گئی ہے... یا اس کے لیے ٹکسال بنی ہوئی ہے۔ تم نے بہت کچھ گنوا دیا ہے مگر سب کچھ نہیں گنوایا ہے۔ اب بھی انور کو تمہارے جذبات کا پاس ہے تو غنیمت جانو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ روزینہ یہاں آ جائے تو تمہاری مشکلات میں اضافہ ہو جائے۔''

''وہ مجھے کہاں برداشت کرے گی حویلی میں... نہ وہ نہ اس کی بہن۔'' ریشم نے ایک آہ بھری۔

''وہ بہت سازشی اور خطرناک عورت ہے۔ یہاں سے اپنے شوہر کے ساتھ باپ کی حویلی جانے کے بعد بھی وہ اس حویلی کے معاملات سے لاتعلق نہیں ہو گی۔ وہاں بیٹھ کے بھی ڈوریاں وہی ہلائے گی اور انور کے ساتھ روزینہ کو کٹھ پتلی کی طرح کنٹرول کرے گی۔ کیا روزینہ بھی ایسی ہی ہے... سازشی اور عیار۔''

''میں نے سنا ہے کہ وہ بہت مختلف ہے۔ مراد کی موت کا اس نے بہت اثر لیا ہے اور اس پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔ باپ نے اسے ملتان کے کسی بہت بڑے اسپتال میں داخل کرا دیا ہے جہاں ڈاکٹر اس کا علاج کر رہے ہیں۔ اسپتال پر کڑا پہرا ہے۔ اندر باہر پیر صاحب کے مرید ہر وقت مسلح پھرتے رہتے ہیں۔ وہ اسپتال کے اسٹاف کی وردی میں رہتے ہیں... کوئی نرس، کوئی وارڈ بوائے... کوئی ڈاکٹر بنا پھرتا ہے۔ اس فلور پر کسی کو بھی جانے کی اجازت نہیں۔ وہ ایک قید خانہ ہے۔''

''پھر روزینہ کا نکاح کب انور سے ہوا... آج میں

نے روزینہ اور انور کے نکاح نامے پر دلہن کے وکیل بن کے دستخط کیے۔''

وہ حیران ہوئی... ''تم نے...؟''

''ہاں میں نے... میری عقل ماری گئی تھی۔ مجھے یہ معلوم ہی نہیں تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ نکاح پہلے ہو چکا ہے۔ یہ کاغذی کارروائی ایک قانونی مسئلے سے نمٹنے کے لیے ہے ورنہ یہاں یہ سب نہیں ہوتا۔''

''ہاں... ہوتا تو نہیں... جب تک کوئی ضرورت نہ پڑے... جو لوگ نوکری کے لیے باہر جاتے ہیں اور بیوی بچوں کو بھی بلانا چاہتے ہیں وہ نکاح نامہ بنواتے ہیں۔ تمہیں گواہ بننے کی کیا ضرورت تھی آخر؟''

''اسے بے وقوفی سمجھو میری کہ میں نے وہ سب سچ مان لیا جو مجھے بتایا گیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ پیر صاحب جیسے بھی نکاح کے مذہبی فریضے میں فراڈ کریں گے، وہ بھی اپنی بیٹی کے معاملے میں... کتنا بڑا دھوکا ہوا میرے ساتھ... انور نے بھی جھوٹ بولا اور مجھے دھوکا دیا... آج تک روزینہ کو دیکھا بھی نہیں ہے میں نے... اور جب وہ ہوش و حواس میں ہی نہیں ہے اور ملتان کے اسپتال میں زیرِ علاج ہے... تو نکاح کیسے ہو گیا اس کا... خوامخواہ اپنایت کا جال بچھا کے مجھے اس گھناؤنی مجرمانہ سازش میں شریک کر لیا گیا۔ میں انور کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔''

میری آواز غصے میں بلند ہوئی تو ریشم نے دروازہ بند کر دیا۔ ''کیوں خود کو ہلکان کرتے ہو... اب جو ہونا تھا ہو چکا۔''

''تم کو اندازہ نہیں ریشم نتائج کا... جانتی ہو اس کے بعد کیا ہو گا۔ میری گواہی ہو گی کہ فلاں تاریخ کو روزینہ کا نکاح انور سے ہوا تو میں موجود تھا۔ میرے سامنے روزینہ نے اسے قبول کیا اور نکاح نامے پر دستخط کیے کیونکہ اس کا وکیل میں تھا۔ اتنا بڑا جھوٹ بولوں گا میں عدالت کے سامنے حلف اٹھا کے... میں بُری طرح پھنس گیا ہوں ریشم... آخرت کے عذاب کا میں کیا کہوں... یہاں وہ میرے جانی دشمن ہو جائیں گے جنہوں نے پیر صاحب پر اپنے بیٹے کے قتل کا الزام عائد کیا ہے۔ وہ جھوٹے بن جائیں گے میرے جیسے جھوٹے کی جھوٹی گواہی سے... ثابت یہ ہو گا کہ جس دن مراد مارا گیا... اس سے ایک ہفتہ قبل ہی روزینہ کا نکاح انور سے ہو چکا تھا اور وہ رخصت ہو کے یہاں آ گئی تھی۔ یہاں سارے گواہ اپنے... دعویٰ جھوٹا ہو گا تو پیر صاحب بھی باعزت بری ہو جائیں گے۔ اگر اس وقت تک میں زندہ رہا... نکاح خواں زندہ رہا... معلوم نہیں کب آئے گا وہ دن... کتنے مہینے یا کتنے سال بعد... اور اس تمام عرصے میں دشمنوں کے نشانے کی زد پر میری جان ہو گی... اور اس بے چارے حکم کے غلام نکاح خواں کی۔''

''اتنا نہ گھبراؤ... یہاں تمہاری حفاظت ہو گی۔''

''حفاظت...'' میں نے چلّا کے کہا۔ ''ہاں جیسے کسی سزائے موت کے قیدی کی ہوتی ہے۔ ابھی تک میں نے کوشش نہیں کی لیکن میں جانتا ہوں کہ میں باہر نہیں جا سکوں گا... محافظ مجھے روک دیں گے۔ اگر میں گیا کہیں تو میرے آگے پیچھے گن مین ہوں گے۔ میں کسی کالے شیشوں والی گاڑی میں جاؤں گا... وہ بھی شاید رات کے وقت... ورنہ مجھے اکبر کی جگہ قید خانے میں رکھا جائے گا۔''

''یہ لوگ اتنے بے مروت نہیں ہو سکتے۔''

''یہ خود غرض اور سفاک لوگ ہیں۔ صرف اپنے لیے جینے والے اور ہم جیسے بے حیثیت لوگ ان کے لیے کالے بکرے ہیں جو زندگی کا صدقہ بنتے ہیں۔ کہاں کی دوستی اور کیسا خلوص... تم انور کو دیکھ لو۔ باپ دادا کا خون کیسے رنگ لایا۔ اس نے تمہاری محبت اور میری دوستی کی کیا قدر کی... لیکن ریشم... میں بتا رہا ہوں تمہیں... میں ان کے ہاتھوں صدقہ ہونے والا کالا بکرا نہیں بنوں گا... میں بھاگ جاؤں گا۔''

وہ گھبرائی۔ ''آہستہ بولو... اعلان کیوں کر رہے ہو ابھی سے کہ تم کیا کرو گے۔''

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''ہاں، مجھے دل کی بات زبان پر نہیں لانی چاہیے۔ تمہیں بھی شریکِ راز نہیں کرنا چاہیے کیونکہ تم بھی تو انور کی نصف بہتر ہو... میرا نہیں اس کا بھلا دیکھو گی۔''

''خدا کے لیے ایسا مت کہو... تم بھی مجھے ذلیل کرو گے تو میں عزت کی بھیک مانگنے کہاں جاؤں گی؟'' وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

''میں سمجھ رہا تھا... آج کل میں دلہن رخصت ہو کے گھر آ جائے گی۔'' میں نے خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد کہا۔ ''شاید ابھی یہ ممکن نہیں... کیا تم معلوم کر سکتی ہو کہ وہ کس اسپتال میں ہے؟''

''مجھے کون بتائے گا؟''

''وہی جس نے بتایا تھا کہ صدمے کا اثر روزینہ کے دماغ پر ہوا ہے اور اس کا علاج ہو رہا ہے۔''

"مجھے سلونی سے معلوم ہوا تھا اور اس نے شاہینہ کو اپنے باپ سے باتیں کرتے سن لیا تھا۔ اتفاق سے وہ اس کمرے میں چلی گئی تھی۔ شاہینہ نے اسے بے عزت کر کے نکال دیا۔ بس اتنا ہی سن پائی تھی وہ... اس پر تو سب پردہ ڈال رہے ہیں۔ میری مانو تو تم بھی کسی پر کچھ ظاہر نہ ہونے دو... جو تمہارے دل میں ہے۔ مجھے عقل سکھاتے تھے، خود بھی کچھ عقل سے کام لو۔ ان جیسے بن کے ان کے درمیان رہو گے تو خطرہ نہیں ہوگا انہیں پورا بھروسا ہونا چاہیے کہ تم ان کے ساتھ ہو۔"

میں نے ریشم کا ہاتھ تھام لیا۔ "تمہاری اس بات نے وہ پتھر ہٹا دیے ہیں جو میری عقل پر پڑے ہوئے تھے۔"

"جب وقت آئے تو وہی کرنا جو تمہارا دل کہے... مگر ابھی وہ کرو جو دماغ سمجھائے... بہت فائدے میں رہو گے۔ اب تک تم ان کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہے ہو۔ اب اپنی ساری محنت ضائع مت کرو... اور کوئی ہو نہ ہو... میں تو تمہارے ساتھ ہوں۔" وہ بولی۔

شاہینہ ایک دم اندر آئی۔ "اوہو... یہاں تو کچھ اور سین چل رہا ہے... حویلی کے بند دروازوں کے پیچھے... میں سمجھی کہ سلیم اکیلا ہوگا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں بھابی..." ریشم نے اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔

بھابی ہنسی۔ "جو میری آنکھوں نے دیکھا... اور جو تمہاری آنکھوں میں مجھے نظر آ رہا ہے... وہ غلط ہے؟ چلو بھئی میں نے کچھ نہیں دیکھا... جیسے کل سلیم نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔"

شاہینہ کے اس حوالے کو ریشم نہیں سمجھ سکتی تھی مگر اس نے میری طرف دیکھا تو میرے کانوں کی لو دہکنے لگی۔

"بھابی! آخر کیا چاہتی ہیں آپ؟"

خوشی اس کے لب و لہجے سے، اس کے چہرے سے اور اس کے انداز سے عیاں تھی۔ "میں تو بس یہ کہنے آئی تھی کہ چلو... سب کھانے پر انتظار کر رہے ہیں تمہارا... ایک اور خوش خبری بھی ہے جو تم سنو گے۔"

وہ ایک ادا سے لہرا کے پلٹی اور غائب ہو گئی۔ گزشتہ چند ہفتوں میں شاہینہ کے انداز و اطوار میں بڑی نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ وہ لباس کے معاملے میں الٹرا ماڈرن ہو گئی تھی۔ لیکن ایسی تبدیلی تو ریشم کے انداز و اطوار میں بھی رونما ہوئی تھی۔ انور کی خواہش پر سلونی نے اسے گروم کیا تھا اور ایک دیہاتی لڑکی سے نئے زمانے کی لڑکی بنا دیا تھا۔ جو فرق میں نے نمایاں دیکھا، وہ رویے کا تھا۔ شاہینہ خود بھی بولڈ ہو گئی تھی۔ اس وقت بھی اس کا لباس کہنے کو ستر پوشی کر رہا تھا مگر میرے سامنے اس نے لہرا کے اور بل کھا کے خود کو ہر زاویے سے عیاں کر دیا تھا۔ اس کی ہر ادا ہیجان خیز بھی تھی۔ ممکن ہے اس تبدیلی کو بڑے چودھری اور چودھرائن نے بھی ناپسند کیا ہو مگر ایک تو شاہینہ شادی شدہ عورت تھی اور اس پر کسی قسم کی روک ٹوک عائد نہیں کی جا سکتی تھی، دوسرے وہ جس انداز سے میرے سامنے آ رہی تھی اس بے باکی کے ساتھ ساس سسر کے سامنے نہیں رہتی تھی۔ ان کے سامنے وہ دوپٹے کو ایسے استعمال کرتی تھی کہ نہ اس کے سر کے بال نظر آتے تھے اور نہ جسم کے نمایاں حصے...

"یہ عورت مجھے مصیبت میں ڈالے گی۔" ریشم نے فکر مندی سے کہا۔

"صرف تمہیں کیوں... یہ مجھے بھی خطرہ نظر آتی ہے۔"

"تمہیں کیوں؟" ریشم کچھ حیران ہوئی۔ "وہ چلی جائے گی اکبر کے ساتھ اپنے میکے... تمہارا ویسے بھی کوئی تعلق نہیں اس سے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "ابھی چلو... ورنہ وہ الٹی سیدھی باتیں پھیلائے گی ہمارے بارے میں۔"

"اس سے اتنا ڈرتے کیوں ہو... بکنے دو اسے جو بکتی ہے... انور کسی بات پر یقین کرنے والا نہیں ہے۔ وہ سمجھتا ہے اس کی فطرت کو۔"

میں ریشم کو کیا بتاتا کہ کل جب میں بلا ارادہ شاہینہ کے کمرے میں چلا گیا تھا تو میں نے کیا دیکھا تھا اور اس پر شاہینہ کا ردِعمل کیا تھا۔ اور آج وہ میرے ساتھ کیا بے شرمی کا کھیل سب کے درمیان بیٹھ کے کھیل رہی تھی۔ معلوم نہیں وہ کیا چاہتی تھی... جب اس کا شوہر بھی اسے ملنے والا تھا۔

بہت عرصے بعد خاندان کے سب افراد بڑے اچھے موڈ میں کھانے کی میز پر جمع ہوئے تھے۔ بڑے چودھری صاحب کھلم کھلا اپنے دشمنوں کے خلاف بول رہے تھے جنہوں نے رقابت میں ان کے بھائی پیر صاحب اور ان کی بہو کے خلاف انہیں بدنام کرنے کے لیے ایک گھناؤنی سازش کی تھی اور خدا نے انہیں سزا بھی کیا دی تھی کہ جوان بیٹا چھین لیا تھا۔ وہ اپنے مستقبل کے جارحانہ عزائم کا اعلان کر رہے تھے کہ اب دیکھنا دشمنوں کا کیسا عبرتناک انجام ہوگا۔ یہ سب ڈاکٹر جلالی کو مرعوب کرنے کے لیے زیادہ تھا لیکن وہ خالص شہری کلچر کا پڑھا لکھا آدمی ان باتوں سے کیا متاثر ہوتا۔ وہ اخلاقاً سب سن رہا تھا۔ بڑی چودھرائن کی خوشی میں صاف زبردستی کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔ جب اس نے کہا کہ اب انشاء اللہ بہت جلد دوسری بہو بھی حویلی میں ہوگی تو وہ اپنے جھوٹ پر سچ کا پردہ ڈالنے میں بالکل ناکام نظر آئی۔ انور کسی سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔ خصوصاً مجھ سے اور ریشم سے... صرف شاہینہ کی خوشی اس کے قابو سے باہر تھی۔ کبھی وہ انور کو روزینہ کے نام سے چھیڑتی تھی تو کبھی ریشم سے وہ مذاق کرتی تھی جس میں تذلیل اور تحقیر کا پہلو نمایاں ہو۔

میں غیر جانب دار فریق ہونے کے باوجود جانب دار نظر آنے کی پوری کوشش کرتا رہا۔ میں نے ظاہر یہ کیا کہ اس خاندانی جنگ میں کسی طرح بھی میں ان سے الگ نہیں ہوں۔ میں بھی دشمنوں کا منہ کالا اور حق کا بول بالا ہونے کے دعوے دُہراتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری غیر مشروط قسم کی حمایت نے ماحول پر ایک خوشگوار اثر ڈالا ہے۔ انور شاید کچھ حیران تھا کہ میرے مؤقف میں اس تبدیلی کے پیچھے کیا ہے۔ ایک بار شاہینہ نے اسے روزینہ کے حوالے سے مذاق کا نشانہ بنایا تو اس نے بظاہر بُرا نہیں مانا اور مسکراتا ہوا اٹھ گیا لیکن وہ ذہنی طور پر اپ سیٹ تھا۔ اس میں میرا یا ریشم کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ مسکراتا ہوا نیند کا بہانہ کر کے اٹھ گیا۔ ریشم نے بڑی بہادری سے سب کی سوالیہ نظروں کا جواب ایک لاتعلق خاموشی سے دیا اور شاہینہ کے زبانی حملے بھی متانت سے جھیلتی رہی۔ اس نے اپنی استقامت سے واضح پیغام دیا کہ حالات کیسے بھی مخالف کیوں نہ ہوں اور دنیا کچھ بھی کہے، وہ بھاگنے والی نہیں ہے۔ غالباً دوسروں کے نزدیک یہ اس کی ڈھٹائی تھی۔

ابھی تک کسی کو اکبر کا خیال نہیں آیا تھا جو ابھی تک قید خانے میں ہی تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی مراعات میں اضافہ ہو گیا تھا اور شاہینہ کی سیاسی سمجھ بوجھ اور برداشت نے بالآخر اس کے لیے پہلے سے بہتر حالات میں بحالی کو یقینی بنا دیا تھا۔ میرے علم کے مطابق نہر کے دونوں طرف دونوں بھائیوں کی زمین برابر اور ایک جیسی تھی۔ لیکن اب نہر کے دوسرے کنارے پر اس کے تایا اور سسر کا وارث بننا زیادہ منافع بخش سودا تھا۔ عام حالات میں اس کو گھر دامادی کا طعنہ دیا جاتا لیکن یہاں جاننے والے جانتے تھے کہ ان حالات میں یہی سب سے بہتر انتظام تھا۔ پُرامن بقائے باہمی کے ساتھ اس انتظام میں مستقبل کا تحفظ دونوں ہی بیٹوں کے حق میں تھا۔ اس بات کا امکان ختم ہو جاتا تھا کہ آئندہ کبھی وہ پھر

جائداد کے تنازعے میں ملوث ہو کے حریف بن سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سسر محترم کی گدی نشینی اکبر کے لیے اس تمام ذلت و اذیت کا ازالہ کرتی تھی جو اس نے معزولی اور قید میں برداشت کی۔ اس میں عیاری و مکاری اور سفاکی و بے ضمیری کی وہ تمام صفات تھیں جن سے پیر صاحب کی ذات کو شرف حاصل تھا۔ وہ اس ڈھونگ کے کاروبار کو زیادہ کامیابی سے چلا سکتا تھا۔

اگر دونوں بھائیوں کی جنگ اور دشمنی ایک حد سے آگے نہیں بڑھی تھی یا کسی نے قانون کا سہارا نہیں لیا تھا یا طاقت کے استعمال کو اپنے حقوق حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا تھا تو اس میں بڑوں کی بردباری کا بھی اتنا ہی دخل تھا جتنا شاہینہ کی سمجھ داری کا... اسی لیے وہ سہاگن تھی اور سرخرو تھی۔

میں نے کبھی پوچھا نہیں تھا کہ اکبر کے روز و شب قید خانے میں کیسے گزرتے ہیں۔ یہ اجازت ماں کو بہت پہلے مل چکی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے خود کھانا پکائے... لے جائے اور چاہے تو اس کے ساتھ کھائے۔ بعد میں انور نے شاہینہ کو بھی اس کی اجازت دے دی۔ پہرا سخت تھا اور پہرے دار جانتے تھے کہ رعایت میں کسی حد سے معمولی تجاوز بھی ان کو زیرِ عتاب لاسکتا ہے۔ اکبر کا ذکر بھی بہت کم ہوتا تھا بلکہ میرے سامنے کبھی نہیں ہوا۔ مجموعی فضا کے اطمینان سے میں اندازہ کرسکتا تھا کہ اسے کوئی تکلیف نہیں۔

اب اچانک ماں کو یاد آیا کہ اسے بیٹے کے لیے بھی کھانا لے جانا ہے۔ شاید اب تک وہ منتظر تھی کہ بیوی کو اپنا فرض یاد آئے مگر شاہینہ نہیں اٹھی تو اس نے یاد دلایا۔ ”بہو... تم نے تو کھا لیا کھانا؟“

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی شاہینہ نے کہا۔ ”ابھی کھا رہی ہوں ماں جی۔“

ماں کچھ خفا ہو کے اٹھی۔ ”اس کا خیال ہی نہیں کسی کو... میں جاتی ہوں۔“

چند سیکنڈ کی ناگوار خاموشی کے بعد بڑے چودھری نے کہا۔ ”چلو اب چند دن کی بات ہے۔“

شاہینہ نے کہا۔ ”چاچاجی! اب چند بھی کیوں؟“

بڑے چودھری نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ ”ہاں، انور چاہے تو کل ہی سب ٹھیک ہوسکتا ہے۔“

”تو آپ نے انور سے بات کیوں نہیں کی اب تک... جب سارے معاملات طے ہوگئے ہیں۔“ شاہینہ نے کچھ تیز ہو کے کہا۔

ڈاکٹر جلالی بہت پہلے اٹھ گیا تھا۔ ظاہر ہے اسے ایک خالص فیملی میٹر میں اپنی موجودگی بھی بے محل محسوس ہوئی تھی۔ اب چودھری نے برہمی سے بہو کو جھاڑا... ”تو سوال جواب کرتی ہے مجھ سے؟ اپنی حد میں رہ کڑیے۔“ اور احتجاجی انداز میں اٹھ کے چلے گئے۔ اب وہاں میرے ساتھ ریشم تھی یا خود شاہینہ... ہم بڑی مستقل مزاجی سے یا ڈھٹائی سے وہاں براجمان رہے تھے۔ میں نے ریشم کی طرف دیکھا تو اس نے محسوس نہ ہونے والا خفیف سا اشارہ کیا کہ اب اٹھ جانا چاہیے۔

”اباجی بھی ایویں ناراض ہوجاتے ہیں۔ کون سی غلط بات کی تھی میں نے؟“ شاہینہ بولی۔

میں اس پر تبصرہ کیے بغیر اٹھا۔ ریشم میرے ساتھ ہی اٹھی۔ کچھ کہنا ضروری نہیں تھا۔ کھانا ختم ہوگیا تھا۔ اب ہمارے بیٹھے رہنے کا جواز نہیں بنتا تھا۔

”سلیم! مجھے کچھ بات کرنا ہے تم سے۔“ شاہینہ نے کہا۔

”فرمایئے؟“ میں پھر بیٹھ گیا۔

اس نے میرے لہجے کے طنز اور تمسخر کو بڑی متانت سے نظر انداز کردیا۔ ”یہاں نہیں... نیند آرہی ہے تمہیں تو کافی پی لینا۔“

”ٹھیک ہے... آپ میرے کمرے میں آجایئے... ریشم بھی ہوگی۔“

اس نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”نہیں... مجھے صرف تم سے بات کرنی ہے اور میرے کمرے میں... ضروری ہوگا تو میں چاچاجی کو بلالوں گی... معاملہ اکبر کا ہے۔“ وہ مجھے جواب کا موقع دیے بغیر باہر چلی گئی۔

میں اپنے کمرے میں گیا اور دس منٹ سوچتا رہا کہ میں جاؤں یا نہ جاؤں۔ پھر یہ خیال آیا کہ ابھی تو سب جاگ رہے ہیں اور شاہینہ نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا ہے تو اس کا ارادہ بھی ملاقات کو خفیہ رکھنے کا نہیں ہے... پھر مجھے اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ خود بھی دروازہ کھلا رکھے گی اور میں بھی اجازت نہیں دوں گا کہ وہ بند کرے۔

اس کے کمرے میں سب کی طرح بیڈ سے ہٹ کے کھڑکی کے ساتھ والے کونے میں صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا۔ ہر بیڈروم کا نقشہ اور فرنیچر، پردے اور قالین ایک جیسے تھے۔ فرق صرف رنگ کا تھا۔ اکبر اور شاہینہ کے بیڈروم میں پردے، قالین نیلے تھے۔ صوفہ کونے میں تھا اور کھڑکی پر پردے پڑے رہتے تھے۔ چنانچہ باہر سے گزرنے والے

کی نگاہ براہِ راست ان کو نہیں دیکھ سکتی تھی جو صوفے پر بیٹھے ہوں، خواہ دروازہ پورا کھلا ہو۔

شاہینہ بڑی تمکنت اور اندازِ دلیری کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھی میرا انتظار کررہی تھی۔ اس کا لباس وہی تھا مگر اس نے میک اپ کو ری ٹچ کیا تھا۔ ”میں تو سمجھی تھی کہ تمہیں کسی کو بھیج کے بلوانا پڑے گا۔“

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”آخر ایسی کیا بات تھی جو تم مجھ سے سب کے سامنے نہیں کرسکتی تھیں؟“

”کرسکتی تھی... لیکن کھانے کی میز پر یہ مناسب نہ ہوتا۔“ اس نے ملازمہ کو آواز دی اور پھر اٹھ کے دروازے تک گئی۔ ”کہاں دھیان ہے تیرا... آواز نہیں سنی تھی میری... جا کافی لے کر آ۔“ اس کے لہجے کے اندازِ تحکم میں میرے لیے حیرانی کی کوئی بات نہ تھی۔ وہ پہلے بھی ملازموں سے ایسے ہی بات کرتی تھی لیکن آج مجھے اس کے انداز اور تیور زیادہ پُراعتماد اور جارحانہ لگے۔ شاید یہ ذہنی انقلاب آنے والے وقت کا پیش خیمہ تھا جب وہ اپنی مملکت میں خودمختار ہوگی۔ وہ باپ کا گھر ہوگا... کسی چاچا یا سسر کا نہیں۔ کچھ دیر پہلے اس کے لہجے کا یہی اعتماد بڑے چودھری کو گستاخی کے برابر لگا تھا اور وہ خفا ہوگیا تھا۔

جب وہ میرے سامنے آکر بیٹھ گئی تو میں نے کہا۔ ”اگر تمہیں اکبر کے بارے میں ہی کسی فیملی میٹر پر بات کرنی ہے تو بہتر ہوگا کہ تم بڑے چودھری صاحب کو بھی بلالو۔“

”میں نے کہا تھا ان سے... لیکن انہوں نے کہا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ اور کس بات پر؟ اس سوال پر جو میں نے تمہارے سامنے کیا تھا۔ کیا اس میں ناراضی والی کوئی بات لگی تمہیں؟“

”شاید تمہارا لہجہ کچھ سخت تھا۔“

”میں نے ہمیشہ ان کا بہت ادب لحاظ کیا ہے۔ دُہرا رشتہ ہے ان سے میرا... وہ چچا پہلے ہیں... سسر بعد میں... اور بزرگ تو بزرگ ہوتے ہیں، کوئی رشتہ نہ ہو پھر بھی... لیکن انہوں نے میرے ساتھ کبھی بزرگوں والا سلوک نہیں کیا۔ یہاں مرد حاکم ہیں۔ عورت کو عزت اس وقت ملتی ہے جب بیٹے جوان ہوجائیں۔ بڑی چودھرائن کو اب حاصل ہوگئی ہے لیکن میری ماں کی وہی حیثیت ہے جو تھی... کیونکہ اس کا بیٹا کوئی نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”یہ تو معاشرتی رویّے ہیں ہمارے۔“

”ہمارا حکم صرف نوکروں پر چلتا ہے... وہ بھی گھر کے معاملات میں۔“

”تم نے یہ بتانے کے لیے تو نہیں بلایا تھا مجھے۔“ میں نے کہا۔

خادمہ نے چائے کی ٹرالی احتیاط سے شاہینہ کے سامنے رکھی، ایک نظر مجھے دیکھا اور دبے پاؤں لوٹ گئی۔

”تم اب اجنبی نہیں رہے۔ انور کی وجہ سے تمہیں اس گھر میں بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔“

”کیا تمہیں اس کا گلہ ہے؟“

اس نے میری بات کا نوٹس ہی نہیں لیا اور میرے لیے کافی انڈیلنے لگی۔ خود اپنے لیے اس نے چائے بنائی تھی۔ ”پلیز، مجھے وہ گولیوں کی ڈبیا پکڑادو۔“

میں نے بیڈ سائڈ ٹیبل پر سے زرد رنگ کی وہ چھوٹی سی ڈبیا اٹھالی جس میں ننھی ننھی سفید گولیاں بھری ہوئی تھیں اور یہ شوگر کے مریض چینی کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ ”تم ڈائبیٹک ہو؟“ میں نے کہا۔

”بدقسمتی سے یہ ہمارا خاندانی مرض ہے۔“

”لیکن اس عمر میں...؟“ میں نے کہا۔

وہ اداسی سے مسکرائی۔ ”ہاں... میرا مسئلہ شادی کے بعد شروع ہوا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یہ پیدائشی طور پر بھی ہوجاتا ہے۔“

میں نے کافی کا مگ لے لیا۔ اس نے ٹرالی کو اپنے سامنے سے ہٹا کے ایک طرف کردیا۔ سینٹر ٹیبل اور صوفے کے درمیان کی جگہ میں ٹرالی آجانے کے بعد وہ پیر پھیلا کے نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اسی لیے اس نے سیکرین کی گولیوں والی ڈبیا اٹھانے کے لیے مجھ سے کہا تھا۔

”تم سے اب کچھ بھی پوشیدہ نہیں... آج چاچاجی نے تمہیں ایک ایسے معاملے میں شریک کیا جو ہمارا خاندانی تھا۔ یہ تم پر اعتماد کا اظہار تھا۔ میں سمجھتی ہوں میری ایک بہن اور ہوتی یا انور کی بھی کوئی بہن ہوتی تو شاید تم اس خاندان کے داماد بھی بن سکتے تھے۔“

میں نے تلخی سے کہا۔ ”خوش فہمی ہے تمہاری... میری اوقات آج بھی کچھ نہیں... یہاں خاندانی نام و نسب ہی سب کچھ ہے۔“

”چاچاجی تمہیں پسند کرتے ہیں۔ اس لیے کہ تم پڑھے لکھے سمجھ دار اور مخلص ہو۔ تم نے ان کا دل جیت لیا ہے۔ انور اور اکبر کے درمیان جو جھگڑا تھا، تمہاری کوشش سے ختم ہوا۔ تم نے اس کا صحیح حل پیش کردیا اور دیکھ لو اس پر عمل بھی ہورہا ہے۔“

"اس کا کریڈٹ مجھے نہیں دیا جاسکتا۔ یہ تو آسان حل تھا اور انور پہلے اس شادی پر رضامند ہو جاتا تو بات بگڑتی ہی کیوں؟"

"یہی تو کہہ رہی ہوں میں... انور کو تم نے قائل کیا۔ اس نے تمہاری مان لی۔ اباجی نے آج مجھ سے کہا کہ اس لڑکے نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ انور کسی کے قابو آنے والا نہیں تھا۔"

میں نے تلخی سے کہا۔ "انہوں نے تو کچھ اور سمجھایا تھا مجھے۔"

"اب ان کو اپنی زیادتی کا احساس ہے۔ وہ خود یہ بات تم سے نہیں کہیں گے مگر میرے سامنے انہوں نے کہا کہ مجھے افسوس ہے اس سے بات کرنے کے لیے میں نے جو طریقہ اختیار کیا، وہ غلط تھا۔ مجھے امید ہے کل پرسوں تک اکبر کو باعزت طور پر وہاں پہنچا دیا جائے گا۔ زمین جائداد کی منتقلی کی قانونی کارروائی پہلے ہی مکمل ہو گئی تھی۔"

"اس کے ساتھ تم بھی چلی جاؤ گی۔ یہ تمہاری بھی بہت بڑی کامیابی ہے۔ تمہاری جگہ لینے کے لیے روزینہ کب آئے گی؟"

اس نے جیسے میرا سوال سنا ہی نہیں۔ اس کی آنکھیں میرے پیچھے خلا میں دیکھ رہی تھیں۔ "سب کی طرح تم بھی سمجھتے ہو گے کہ میں اب بہت خوش ہوں... ہے نا یہی بات؟"

میں چونکا۔ "تو کیا ایسا نہیں ہے؟"

"جب تک اکبر کا حکم چلتا تھا، وہ اکبرِ اعظم تھا۔ طاقت اور غرور کے نشے میں وہ زمین پر ایسے چلتا تھا جیسے وہ زمین کو پھاڑ دے گا اور میں سب سے زیادہ اس کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنتی تھی کیونکہ..." وہ تلخ انداز میں ہنسی۔ "میں تھی اس کے پاؤں کی جوتی... اور وہ تھا میرے سر کا تاج... جوتی اور تاج کبھی برابر ہو سکتے ہیں؟ تمام خدمت، اطاعت اور ذلت کے باوجود میں اس کی شریکِ حیات ہونے پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر بجا لاؤں... یہ میرا فرض تھا۔ فخر کیا غرور کروں کہ مجھے اکبرِ اعظم نے شرفِ قبولیت بخشا... اور وہ مجھے مسلسل کچوکے دیتا رہے کہ میں وہ بدبخت عورت ہوں جس کو ایک مرد ٹھکرا کے چلا گیا۔ میرے منہ پر تھوک کے باہر نکل گیا۔ حالانکہ میں اسی سے منسوب تھی۔ آخر کیا دیکھا اس نے مجھ میں کہ وہ بددل ہوا اور متنفر ہو گیا۔ صورت تو اچھی تھی۔ ضرور سیرت کا عیب تھا۔ کیا تھا وہ عیب... تو بدکردار تھی... وہ مجھ سے پوچھتا تھا۔"

میں نے پریشان ہو کے کہا۔ "شاہینہ! اگر تم نے مجھے یہ سب بتانے کے لیے بلایا تھا تو میں اجازت چاہتا ہوں۔"

اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی اور ایک التجا تھی۔ "اسی بات کی طرف آرہی ہوں میں... لیکن پہلے یہ سب بتانا ضروری تھا جو تمہیں معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر کوئی تمہیں بتاتا تو تم یقین نہ کرتے لیکن آج میں خود بتا رہی ہوں تمہیں... پلیز پوری بات سن لو میری... اور تو یہاں کوئی بھی نہیں جس سے میں دل کی بات کر سکوں۔ اپنے ہونے کے باوجود وہ اتنے غیر ہیں کہ میں خود کو بالکل تنہا محسوس کرتی ہوں۔ جب تک اکبر قید میں تھا، مجھے کچھ ہمدردی حاصل تھی۔ میں بڑی بہو کی حیثیت سے سر اٹھا کے بھی چل رہی تھی۔ لیکن جب مجازی خدا کی بادشاہت آئے گی تو میں وہی غلام رہ جاؤں گی جس کا مقصد ذلت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ خود اپنے گھر میں بھی۔"

"شاہینہ! میں اس معاملے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

"ہمدردی تو کر سکتے ہو... یہ تو کہہ سکتے ہو کہ شاہینہ تمہاری مظلومیت کا دکھ بے جا نہیں... کیسی بدنصیبی اور بے اختیاری تھی میری کہ بچپن سے میں انور کو دل میں بسائے بیٹھی رہی۔ اس کو اپنے مستقبل کا مالک مان کے پوجتی رہی۔ یہ محبت تو نہیں تھی شاید... مگر ایک احساس تھا کہ میں اس کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ وہ یقیناً فطرت اور ذہنیت کے اعتبار سے بہت مختلف تھا۔ لیکن وقت آیا تو کیسی بے رحمی سے انکار کر کے وہ مجھے لاوارث چھوڑ گیا۔ ذرا خیال نہ آیا اسے میرے جذبات کا... میری بچپن سے جوانی تک دل میں جگہ بنانے والی محبت کا... مانا وہ فلمی محبت نہیں تھی... یا وہ جو ہو جاتی ہے، کی نہیں جاتی... مگر اس کی پرورش میں نے بڑی محبت سے کی تھی اور اس کی جڑیں میرے وجود کی گہرائی میں کینسر کی طرح اتر چکی تھیں۔ میرے لیے ناممکن تھا کہ میں اسے نکال پھینکوں۔ کیا کوئی سرجن کینسر کو جڑ سے نکال سکتا ہے... نہیں نا... اور وہ جو میرے لیے فیصلے کرتے تھے... کچھ بھی سوچے بغیر مجھے اکبر کے حوالے کر دیا... میں کیا تھی؟ صرف ایک جانور... گائے جو ایک کھونٹے سے کھول کے دوسرے سے باندھ دی جائے۔"

اب میں خود کو مجبور اور بے بس محسوس کر رہا تھا۔ میں اس کی سن رہا تھا اور مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں اٹھ کے باہر نکل جاؤں۔ کسی مفلوج ہو جانے والے شخص کی طرح میرا جسم میرے ارادے کی تعمیل نہیں کر رہا تھا۔

وہ خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ اس کا ریشمی دوپٹا

پھسل کر نیچے گر گیا تھا اور میں اسے نہیں اس کے کھلے گریبان کے اندر دیکھ رہا تھا جو کسی آتش فشاں کے دہانے کی طرح تھا۔

"میں نفرت کرتی ہوں اس سے... پہلے بھی کرتی تھی۔ اگر وہ چاہتا تو اپنے سلوک سے میری نفرت کو محبت میں بدل سکتا تھا۔ میں بار بار محبت کا لفظ استعمال کر رہی ہوں... یہ جانتے ہوئے بھی کہ محبت وہ پھر بھی نہ ہوتی... قناعت ہوتی... لیکن اس نے تو نفرت کی ایک چنگاری کو الاؤ بنا دیا۔ میں خود اپنی نظر سے گر گئی۔ وہ پوچھتا رہتا تھا کہ شادی سے پہلے میرے کرتوت کیا تھے جن کا انور کو پتا چلا تو وہ تجھ پر تھوک کے بھاگ گیا تھا۔ کاش میں بدکردار ہی ہوتی۔ پھر یہ الزام سہہ لیتی... مگر بدکرداری کی گنجائش کہاں تھی اس قید خانے میں... جو میرے باپ کا گھر تھا۔ یہ سہولت... سعادت یا آزادی صرف مرد کو حاصل ہے کہ وہ شادی سے پہلے اور بعد میں جتنا عیاش، ہوس پرست، بدکردار ہو سکتا ہے اس کا حق ہے۔"

اس کی آواز اب کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ یہ ناطاقتی بے سبب نہیں تھی۔ دماغ نے اس کا سبب تلاش کر لیا تھا۔ اس نے کافی میں کچھ ملا دیا تھا۔ جب میں اس کی چائے کو میٹھا بنانے والی گولیاں لینے اٹھا تھا، اسی وقت شاہینہ نے میرے مگ میں کچھ ڈال دیا تھا۔ اس نے جھوٹ بولا تھا کہ اسے شوگر کی شکایت ہے۔ مقصد مجھے ذرا سی دیر کے لیے وہاں سے ہٹانا تھا۔

"تم کہو گے بے شرم اور بے حیا مجھے... ہاں میں فاحشہ ہوں... جو عزت دار نہ ہو وہ اور کیا ہوتا ہے؟ تم کہتے ہو میں بدکردار ہوں تو چلو میں بدکردار بن کے دکھاتی ہوں۔ کب سے میں تمہاری توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہوں سلیم... میں مرمٹی ہوں تم پر... کسی دوسرے مرد پر فریفتہ ہونے کا یہ پہلا تجربہ ہے میرے لیے... اور میں بہت خوش ہوں... شرمندہ نہیں... آخر کیوں دیوانے ہو تم نورین کے خیال میں... مجھے دیکھو... میں تمہارے سامنے ہوں... ایک بھرپور عورت... میرے ساتھ رہو... میرے ساتھ چلو... تم نے انور کا اعتماد حاصل کیا، تم اکبر کا اعتماد بھی حاصل کر سکتے ہو۔"

"یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے... یہ نہیں ہو سکتا۔" مجھے خود اپنی آواز کسی کنوئیں کی گہرائی سے آتی محسوس ہوئی۔

وہ مجھ پر جھک آئی۔ "ہو سکتا ہے... سب ہو سکتا ہے۔ اگر تم چاہو... اور میں چاہوں... کچھ بھی ناممکن نہیں ہے سلیم۔"

اس کے وجود کی آنچ دیتی نرم خوشبو میرے حواس پر طاری ہو کے مجھے مزید بے دست و پا کرنے لگی۔ میں نے اس کے سحر سے آزاد ہونے کی آخری ناکام کوشش کی... "یہ... یہ غلط ہے... تم آگ سے کھیل رہی ہو اور بارود کے ڈھیر پر بیٹھی ہو... اکبر کو پتا چلے گا تو..."

"اکبر... وہ میرا پالتو کتا ہے۔ نہ وہ شوہر ہے میرا... نہ میں اس کی بیوی... ہر عورت اس کی بیوی ہے۔ مجھے تو رسم و رواج کی زنجیروں سے اس کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے اور وہ لالچی کتا... مجھے بیوی کا درجہ دینے پر مجبور ہے... کیونکہ میں عورت نہیں... بہت بڑی جاگیر ہوں۔ اپنے باپ کی آدھی جائداد میری ہے... اسے وہ نہیں چھوڑ سکتا۔"

"خدا کے لیے... مجھے جانے دو..." میں گڑگڑایا۔

"تم جانے کے لیے تو نہیں آئے تھے میرے پاس..." اس نے میرا ہاتھ تھام کے اپنی طرف کھینچا اور میں ایسے اٹھتا چلا گیا جیسے ہوا کے رخ پر پتنگ کو ڈور تھامنے والے ہاتھ کی خفیف سی جنبش اٹھا دیتی ہے۔ "ڈرتے کیوں ہو... یہاں کوئی نہیں آسکتا... کسی کو کچھ نظر نہیں آسکتا... کچھ معلوم نہیں ہو سکتا... بس میں دیکھ سکتی ہوں تمہیں... اور تم..."

میں اس کیفیت کو اب کسی ہپناٹائز ہو جانے والے شخص کی طرح سمجھ سکتا ہوں... میرا نہ اپنے ذہن پر اختیار تھا اور نہ جسم پر... مجھے معلوم نہیں کہ کافی میں اس نے جو دوا مجھے دی، وہ کیا تھی۔ ایسی دوائیں بہت ہیں جو عقل اور ارادے کو مفلوج کر دیتی ہیں۔ تفتیش کرنے والے ادارے ان دواؤں کو ایسے ملزمان پر آزماتے ہیں جو غیر معمولی قوتِ ارادی کے مالک ہوں اور تشدد کا کوئی بھی حربہ ان کی زبان کھلوانے میں کارگر نہ ہو۔ ایسی دوا ان کی ذہنی مزاحمت ختم کر دیتی ہے پھر وہ سب جو ان کے ذہن میں ہو، یوں ان کے منہ سے نکلنے لگتا ہے جیسے سیلاب کو روکنے والے شیشے میں ایک شگاف سے پانی بہتا ہے۔

اس رات کے نقش "ٹوٹوں" کی طرح ہیں۔ کسی فلم کے ٹکڑے جو بے ترتیب ہونے کے باوجود ایک فلم کا حصہ ہوں۔ وہ سب بیان بھی نہیں کیا جاسکتا... لیکن اس رات کی صبح مجھے یاد ہے۔ وہ صبح میرے اپنے بیڈ روم میں بڑی دیر سے آئی تھی۔ میں ایک بار جاگا اور کچھ بھی مختلف نہ پا کے پھر سو گیا۔ دوسری بار آنکھ کھلی تو مجھے کچھ یاد آیا لیکن غنودگی

غالب تھی۔ میں نے خود کو قائل کیا کہ وہ خواب تھا۔ تیسری بار عقل نے مجھے جھنجوڑا... اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی... اور میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔ میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ سب کچھ وہی تھا، ویسا ہی تھا جیسا ہوتا تھا پھر وہ منظر جو اڑتے بادلوں کی طرح یا دوں کے افق سے گزر رہے ہیں... کچھ آوازوں کی سرگوشیاں ہیں... ان کا پیغام واضح ہے۔ خوشبو کے جھونکے میں جو ریشم کی طرح میرے وجود پر سرسراتے ہیں... اور ایک ہی چہرہ ہے، ایک ہی جسم ہے... انجانا بھی اور جانا پہچانا بھی... اپنا بھی پرایا بھی...

حقیقت کا ادراک بڑی سفاکی کے ساتھ اترا اور میں رفتہ رفتہ خواب کے منظر سے احساس کی حقیقت کو اخذ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑا۔ یہ کسی جگ سا پزل کی طرح تھا۔ گتے یا پلاسٹک کے بے ترتیب مختلف ٹیڑھی میڑھی شکلوں والے ٹکڑے جن کو ذہانت سے صحیح جگہ بٹھا کے جوڑ دیا جائے تو ایک واضح صورت یا تصویر بن جاتی ہے۔

رگوں میں میرا لہو سرد ہونے لگا۔ یا میرے خدا... آخر میرا ایسا کیا گناہ تھا جس کی پاداش میں تو مجھے بار بار موت سے بدتر اذیت دیتا ہے۔ میں پھانسی کے تختے تک پہنچا اور قریب آتی موت کی ساری اذیت کا تجربہ کر کے پھر زندگی کی طرف لوٹ آیا۔ نورین کے ساتھ ایک حسین شب کے خواب کا انجام یہ ہے کہ وہ فاطمہ بن کے مجھے پہچانتی بھی نہیں اور آج نہ جانے کہاں ہے؟ کس کے ساتھ ہے اور کس عذاب میں ہے... میں پھر ایک قیدی ہوں جس کے تین طرف آتشیں اسلحہ بردار قاتلوں کے ہاتھ ٹریگر پر ہیں۔ ایک ان کے جو مجھے چشم دید گواہ کی حیثیت سے زندہ نہیں دیکھنا چاہتے۔ دوسرے وہ جو جانتے ہیں کہ میں فریدالدین ہوں اور اب تیسرے اس حویلی کی عزت کے رکھوالے ہیں جو بالآخر جان جائیں گے کہ ان کے حفاظتی حصار کو توڑ کے ان کی آبرو پر شب خون مارنے والا میں تھا۔

جیسے جیسے دن چڑھتا گیا، میرے اشتعال کا الاؤ بھڑکتا گیا۔ میں نے غسل کیا پھر ناشتا... دیوانگی کی ایک خواہش بار بار مجھے اکساتی تھی کہ میں سیدھا شاہینہ کے کمرے میں جاؤں اور اس کی نازک گردن کو اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں دبا لوں اور اس وقت تک دبائے رکھوں جب تک کہ اس کا شیطانی دماغ اور حیوانی جسم بے جان نہ ہو جائیں اور پھر مجھے قتلِ عمد کا مرتکب ٹھہرانے والوں کو بتاؤں کہ پاگل اکیلا میں نہیں... یہ عورت سب کو پاگل بنا چکی تھی۔ میں نے تو سب کو اس کے شر سے بچا لیا ہے۔

لیکن ایسے سب خیال زنگ خوردہ ناکارہ پرانے ہتھیاروں سے زیادہ بے مصرف تھے۔ شاہینہ نے جو جال رات کی تاریکی میں میرے لیے بچھایا، وہ صبح کا اجالا اترنے سے پہلے سمیٹ لیا تھا اور وہ غائب ہو جانے والا جال تھا جس کے وجود کو ثابت بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ ایک جادوگرنی تھی جس نے رات کی سیاہی میرے اور اپنے جسم پر مل دی تھی لیکن دن کے اجالے میں کوئی دیکھ سکتا تھا تو اس کا پاک شفاف وجود اور میرا وہی اجلا روپ... سیاہی کا ایک ذرہ اب کہیں نہ تھا...

میں یہ سوچ رہا تھا کہ شاہینہ میرے سامنے آئے گی تو میں کیا کہوں گا... کیا کروں گا... وہ کیا کہے گی اور کیا کرے گی... کہ حویلی میں شورِ محشر بپا ہو گیا۔ میں نے بڑی چودھرائن کو سینے پر دوہتڑ مار کے چلاتا اور دیوانہ وار دوڑتے ہوئے دیکھا۔ ایک ساتھ انور اور شاہینہ دیوانہ وار بڑے چودھری کے کمرے کی طرف دوڑتے دکھائی دیے۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ گو غیر متوقع کچھ بھی نہ تھا لیکن توقع کا سلسلہ بالآخر منقطع ہو گیا تھا۔ بڑے چودھری کا بیمار دل ہر مسیحائی کے جھنجٹ سے آزاد ہو کے خاموش ہو گیا تھا۔

میرا بڑے چودھری کے کمرے کی طرف لپکنا بھی غیر ارادی عمل تھا۔ کمرے میں پہنچنے سے پہلے ہی میں نے شاہینہ کی چیخ سنی۔ جب میں اندر داخل ہوا تو عجب وحشت کا عالم تھا۔ بڑی چودھرائن اپنے بال نوچ رہی تھی اور چیخ چیخ کے منہ پر دوہتڑ مار رہی تھی۔ ''ہائے میرا پتر... ہائے میرا پتر۔'' بڑے چودھری پر ڈاکٹر جلالی جھکا ہوا تھا اور اسے کوئی انجکشن لگا چکا تھا۔ اس کے سارے مانیٹر آن تھے... وہ زندہ تھا... فرش پر شاہینہ بے سدھ پڑی تھی اور انور اسے اٹھانے کی کوشش میں ناکام تھا۔ اس کی مدد میں نے کی اور ہم نے شاہینہ کو اٹھا کے صوفے پر ڈال دیا۔

مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دنیا کے لیے قیامت نہ جانے کب آئے... اس حویلی میں آ چکی تھی۔ اکبر مر گیا تھا... اپنی اسیری کے آخری دن اسے قیدِ حیات سے رہائی مل گئی تھی یا دے دی گئی تھی۔ سرِدست کیوں اور کیسے کا سوال کہیں نہ تھا۔ ہزار صبر آزما مرحلے اور تھے۔

میں نے انور کو دیکھا۔ اب وہ ماں کو سنبھال رہا تھا جو دیوانگی کی کیفیت میں دیوار سے سر ٹکرا کر رو رہی تھی۔ اس نے وحشت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''بھائی کو

لے جا اس کے کمرے میں۔''

''اٹھا کے لے جاؤں؟'' میں نے بے وقوفوں کی طرح دہرایا اور بڑی مشکل سے تھوک نگلا۔

انور چلّایا۔ ''صوفہ خالی کر... ماں جی کو لٹانا ہے یہاں۔''

میں ایک دم جھکا اور میں نے بے سدھ پڑی شاہینہ کے نرم گداز ڈھیر کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹ لیا۔ مجھے وہ بھرے بدن کی ہونے کے باوجود کھوکھلی محسوس ہوئی کیونکہ اسے اٹھانا مجھے ذرا مشکل نہیں ہوا تھا۔ برآمدے سے گزر کے میں نے چند قدم کے فاصلے پر بیڈروم کا دروازہ ٹھوکر مار کے کھولا اور شاہینہ کو اس کے بستر پر لٹا دیا جہاں اب مجھے ملامت کرنے والی کوئی شکن نہ تھی۔

سلونی اسی وقت نمودار ہوئی۔ ''سلیم! یہ کیا ہوا؟'' اس نے پُروحشت لہجے میں پوچھا۔

''تم اسے دیکھو۔'' میں نے کہا اور پھر باہر نکل گیا۔

بڑے چودھری کے کمرے میں ڈاکٹر جلالی بھی اب انور کی ماں کو دیکھ رہا تھا۔ ہر شاک کا علاج ایک ہی ہے۔ سکون... ٹھہراؤ... ہوش سے بیگانگی... دماغ بھی جب صدمہ یا اذیت برداشت نہیں کر پاتا تو بے ہوشی کی پناہ میں چلا جاتا ہے۔ یہ نظامِ قدرت ہے۔ انجکشن دورانِ خون میں شامل ہوتا ہے اور تین منٹ میں اپنی گردش پوری کرنے والا خون سب کو سلا دیتا ہے۔ تمام جسم کو دماغ کنٹرول کرتا ہے۔ دماغ کے لیے پہلا علاج بے خبری ہوتا ہے۔ بڑے چودھری کے دلِ ناتواں نے یہ صدمہ سہار لیا تھا۔ اب وہ سکون میں تھا۔ دیوانگی میں حد سے گزر جانے والی چودھرائن بھی اب بے حس و حرکت پڑی تھی۔

انور نے ایک گہری سانس لے کر اپنے سر کو جھٹکا۔ پھر میز پر سے بوتل اٹھا کے غٹ غٹ پانی پیا۔ ''آ میرے ساتھ۔'' وہ بولا اور باہر نکل گیا۔

میں اس کے پیچھے لپکا۔ اسی وقت میں نے ریشم کو شاہینہ کے کمرے میں جاتے دیکھا اور رک گیا۔ ''ڈاکٹر جلالی... شاہینہ ادھر ہے۔''

''آئی نو... آئی نو۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں پھر انور کے پیچھے گیا۔ اب وہ تہ خانے کے دروازے پر تھا۔ وہ پھر رکا اور پلٹ کے بولا۔ ''گل چاچا کو بلا۔'' اور پھر نیچے اتر گیا۔

میں واپس ہوا۔ چند منٹ کے بعد میں گل چاچا کے ساتھ تہ خانے کی سیڑھیاں اترا تو مجھے اکبر نظر آیا۔ وہ اپنے بیڈ پر بالکل سیدھا پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں اور صورت پر نزع کے کرب کی ساری کیفیت ٹھہر گئی تھی۔ بیڈ پر اور نیچے وہ سب پڑا تھا جو قے کی صورت میں اس کے حلق سے نکلا تھا۔ کمرے میں اس کی ہلکی سی بو یہ ظاہر کرتی تھی کہ پیٹ سے نکلنے والا یہ مواد کافی دیر سے پھیلا ہوا ہے۔

یہ قید خانہ میرے لیے اجنبی جگہ نہیں تھی۔ انور نے تو ڈیڑھ سال اس زمین دوز کمرے میں پابہ زنجیر رہ کے گزارا تھا۔ اکبر کے لیے حالات اتنے سخت نظر نہیں آتے تھے۔ اس کے ہاتھ آزاد تھے... صرف ایک پیر میں زنجیر کا حلقہ ابھی تک موجود تھا لیکن اس زنجیر کے سوا اکبر کے لیے تکلیف کی بات کوئی نہ تھی۔ اس کا بیڈ بہت آرام دہ تھا۔ وہاں کارپٹ اور فرنیچر نئے لگتے تھے۔ فریج اور ٹی وی موجود تھے۔ ایک اے سی اس وقت بھی کام کر رہا تھا چنانچہ زیرِ زمین نہ گھٹن تھی اور نہ گرمی۔ ادھر پیچھے والے محافظ ابھی تک اپنی جگہ موجود تھے لیکن جانتے تھے کہ سیکیورٹی کا مسئلہ اب نہیں رہا۔ وہ حکم کے غلام تھے... اکبر کو اتنی ہی رعایت دیتے تھے جتنی انور سے اجازت تھی۔

انور بے حس و حرکت بیڈ کے پاس کھڑا بھائی کی لاش کو گھور رہا تھا۔ یہ بے یقینی اور یقین کی رسہ کشی بالکل فطری تھی۔ چاچا گل کو دیکھ کر اس نے سر اٹھایا۔ ''چاچا گل! سارے گارڈز ہٹا کے باہر بھیج دو... حویلی کے چاروں طرف پہرا بڑھا دو۔''

''جی سر۔'' چاچا گل نے کہا۔ ''آپ خود کو سنبھالیں...''

''اور دیکھو... ابھی نہ کوئی حویلی سے باہر جائے گا اور نہ اندر آئے گا۔ گیٹ بند کر دو... جاؤ۔'' وہ دہاڑ کے بولا اور پھر میری طرف دیکھنے لگا۔ ''تو پوچھے گا نہیں کہ یہ کیسے مر گیا؟''

''نہیں، زیادہ پریشانی کی بات ہے کہ یہ مر گیا۔''

''اس کو کسی نے زہر دیا تھا کھانے میں... خدا کی قسم میں نے نہیں۔'' وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ ''میں اتنا بُرا نہیں ہوں ملک۔''

میں نے اس کے کندھے کے گرد بازو پھیلا دیا۔ ''میں جانتا ہوں۔''

''مگر اور سب تو نہیں جانتے... وہ بھی جو میرے اپنے ہیں۔''

''یہ ٹھیک ہے کہ شک تجھ پر کیا جائے گا لیکن ابھی ہم

کیا کریں گے... کیسے دیں گے یہ خبر دنیا کو؟''
اس نے اپنے آنسو صاف کیے۔ ''کچھ چھپانا ناممکن ہے۔''

''کیا کھانے میں زہر دینے کی تصدیق ہوگئی ہے؟''

''یار! تصدیق کردی ہے ڈاکٹر جلالی نے... پوسٹ مارٹم ہوگا تو زہر کی نوعیت بھی سامنے آجائے گی... پولیس کیس تو ہوگا۔''

''زہر کھانے میں دیا گیا؟'' میں نے قریب ہی میز پر رکھے کھانے کے برتنوں کو دیکھا۔

انور نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''کھانا ماں لائی تھی۔ تُو نے بھی دیکھا تھا۔ وہ کھانے کی میز پر سے اٹھ گئی تھی۔ وہ منتظر تھی کہ شاہینہ اٹھے... پھر وہ خود اٹھ گئی۔ اس نے بھی یہی کھایا تھا، اکبر کے ساتھ۔''

''اگر اسے معلوم نہیں تھا تو... صرف اکبر کیوں؟'' میں نے کہا۔

''یہ سارے سوالات تفتیش کرنے والوں کے لیے چھوڑ دے۔ وہ مجھ سے بہت کچھ پوچھیں گے... ابھی تو اسے اوپر لے جانا ہے... پھر ان کو اطلاع دینی ہے، پیر صاحب کو... پولیس کو بلانے کا سارا کام وہ کریں گے۔ ان کا داماد تھا آخر... اور میں اس کا دشمن... وہ سب کو بتائیں گے... شاہینہ بھی گواہی دے گی۔''

''گھبرا مت... میں تیرے ساتھ ہوں... اور تیرے ماں باپ...''

''نہیں سلیم! اب نہیں ہوں گے۔''

''ہوں گے۔'' میں نے سختی سے کہا۔ ''وہ پاگل نہیں ہیں کہ ایک مرجائے تو دوسرے کو خود مروا دیں... اور پیر صاحب کا داماد تو اب تو بھی ہے... اتنا مایوس مت ہو... یہی سب لوگ تجھے بچائیں گے۔''

''مگر ان کی نظر میں قاتل رہوں گا میں... ہمیشہ... کیسے مانے گی شاہینہ جو بیوہ ہوگئی... اور اس کی بہن۔''

''انور! یہ فکریں چھوڑ۔''

چاچا گل پھر سیڑھیوں پر نمودار ہوا اور گھبراہٹ میں گرتے گرتے بچا۔ ''جنابِ عالی! وہ جو کچن میں کام کرتی تھی... صغراں...''

''کیا ہوا اسے؟'' انور نے پُروحشت لہجے میں پوچھا۔

''وہ بھی مری پڑی ہے... اپنے کوارٹر میں... ابھی پتا چلا ہے۔''

''وہ کیسے مرگئی... یہی سب کھا کے؟'' انور نے میز پر رکھے بچے ہوئے کھانے کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ تو معلوم نہیں سرکار۔''

انور نے فریادی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''یہ کیا ہے ملک؟ اگر زہر اس نے ملایا ہوتا تو یہ کھانا وہ خود کیوں کھاتی؟''

''شاید اسے بھی معلوم نہیں تھا۔ زہر کسی اور نے ملایا۔ الزام صغراں پر آتا... ملزم وہ بنتی... جس نے یہ سازش کی، اس نے صغراں کو بھی راستے سے ہٹا دیا۔ خیر، اب معاملات پولیس کے ہینڈل کرنے کے ہیں۔ ہمیں اس میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ گھبرا مت... اگر تو بے گناہ ہے تو خود پر اور خدا پر اعتماد رکھ... تفتیش کی زد میں تو میں بھی آؤں گا اور پولیس اگر بال کی کھال نکالے گی تو معلوم ہوجائے گا کہ میں کون ہوں۔ میرے لیے کتنا بڑا رسک ہے... مگر اب حالات کا مقابلہ تو کرنا پڑے گا۔''

اکبر کی لاش کو ملازموں کی مدد سے اوپر پہنچایا گیا اور صاف ستھرا کر کے انور کے کمرے میں رکھ دیا گیا۔ جب انور اپنے پیر سسر کو فون پر یہ خبر دے رہا تھا تو میں نے موقع غنیمت جانا اور ڈاکٹر جلالی سے بات کی۔ وہ چپ چاپ بڑے چودھری صاحب کے کمرے میں ایک کرسی پر اکیلا بیٹھا تھا۔

''تم ذمے دار ہو اس سب کے۔'' اس نے خالی خالی نظر سے مجھے دیکھا۔

''میں؟'' میں نے حیرانی سے کہا۔

''یس... تم نے مجھے دھکیلا اس دلدل میں... یہ دلدل ہے... تم ایک پُرسکون زندگی سے مجھے یہاں لائے۔''

''غیب کا علم ہوتا تو میں خود یہاں کیوں آتا ڈاکٹر؟''

''اب بتاؤ میں کیا کروں... کیا میں جا سکتا ہوں؟ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے کچھ معلوم نہیں... بیان... گواہی... سب سے گزرنا پڑے گا مجھے۔''

''آئی ایم سوری... بعض اوقات نیکی بھی گلے پڑ جاتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ ہم نیکی سے بدظن ہوجائیں اور نیکی نہ کریں۔ آپ کی ایک بیان کے بعد گلوخلاصی ہوجائے گی۔ پھر آپ جانے کے لیے آزاد ہوں گے... مگر میں ہر طرف سے محصور ہوں... کہیں نہیں جا سکتا۔''

''میں جانتا ہوں تم ایک اچھے آدمی ہو... میری

جگہ...“

”ڈاکٹر! کیا ایک معاملے میں میری راہنمائی کریں گے؟ یہ میری ذہنی الجھن ہے... آپ نے لاش دیکھی... کیا ایک نظر میں آپ کو زہر کی نوعیت کا کچھ اندازہ ہوا؟“

”آریو میڈ... یہ ناممکن تھا... اس کے بہت پیچیدہ ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ ہاں، اسے مرے ہوئے کم سے کم دس گھنٹے ہو چکے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”کھانا پکا کے دینے والی عورت بھی مر گئی ہے یا ماردی گئی ہے... وہ خود زہر کہاں سے لاتی... جس نے اسے زہر فراہم کیا، بعد میں اسے بھی ماردیا۔“

”تم نے دیکھا، ان کے لیے کام کرنے والے، آس پاس رہنے والے... غریب اور محنت کش... کتنے پُرسکون ہیں... کیونکہ ان کی زندگی ایسی نفرتوں سے اور سازشوں سے خالی ہے۔ وہ ہل چلا رہے ہیں ان کے لیے... باغوں میں پھل اگا رہے ہیں... ان کی دولت مندی میں اضافے کے لیے... ان کی زندگی میں ہوس، لالچ اور نفرت نہیں ہے۔ اب اس آدمی کو دیکھو... تمام عمر کیا کرتا رہا اور اب مر رہا ہے تو کیا دیکھ رہا ہے۔ وہ جتنا بیمار نہیں ہے، اتنا دکھی ہے اور بے بس ہے۔ خوف زدہ ہے۔“

”خود کو تمام معاملات سے الگ رکھنا ڈاکٹر! لاعلم اور بے خبر رہنے میں ہی عافیت ہے... تم صرف علاج کرتے تھے۔“

اس نے ایک آہ بھری۔ ”ہاں، چودھری اپنا دل ہلکا کرنے کے لیے مجھے سب بتاتا تھا۔ اس کا دوست جو نہیں ہے یہاں کوئی... مگر تم ٹھیک کہتے ہو۔“

”چودھری زندہ رہے گا؟“

اس نے ہاتھ پھیلا کے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ”خدا بہتر جانتا ہے۔ یہ مر گیا تو کیا اور زندہ رہا تو کیا... اس کا وجود تھوڑی بہت جذباتی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ بھی بیوی کے لیے۔ اس کی افادیت سب کے لیے ختم ہو چکی ہے... جیسے میری...“

باہر ایک شور سا اٹھا۔ میں نے پیر صاحب کی شاہی سواری کو حویلی کے اندر آتا دیکھا۔ پیچھے دوسری باپردہ گاڑی سے ان کی بیوی اور بیٹی روتی پیٹتی اتریں اور سیدھی شاہینہ کے کمرے میں چلی گئیں۔ پیر صاحب چند منٹ اندر رہے پھر باہر آئے تو سیدھے بھائی کے کمرے میں پہنچ گئے۔ انہوں نے ایک سرد، سفاک، سپاٹ نظر مجھ پر ڈالی اور جھک کر اپنا ہاتھ بھائی کی پیشانی پر رکھا۔ غالباً وہ اس کی شفایابی کے لیے کوئی وظیفہ یا روحانی عمل کر رہے تھے۔ نہ انہوں نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور نہ اس سے کوئی سوال کیا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ پیر صاحب نے حکم دیا اور باہر نکل گئے۔

میں اٹھ کے ان کے پیچھے چل پڑا۔ ”مجھے آپ سے بھی تعزیت کرنی چاہیے... اور یہ بھی کہنا چاہیے کہ مجھے واقعی بہت صدمہ ہے... اب جبکہ ہم نے تمام مسائل کا ایک قابلِ قبول حل تلاش کر لیا تھا...“

انہوں نے نظر جما کے مجھے دیکھا۔ ”انور کہاں ہے؟“

”حویلی میں ہی تھا ابھی... وہی سب سنبھال رہا تھا۔“

ان کے لبوں پر ایک زہریلی خطرناک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”ہاں، سنبھالنے والا اب وہی تو رہ گیا ہے... بلاؤ اسے۔“

وہ میرے بیڈروم میں داخل ہو کے صوفے پر گر گئے تھے۔ صاف نظر آتا تھا کہ اندر سے وہ کتنے دکھی، اپ سیٹ اور مشتعل ہیں۔ مگر بے بسی نے انہیں مغلوب کر لیا ہے۔ وہ سب کچھ ہار جانے والے جواری سے زیادہ دل برداشتہ اور مایوس تھے مگر اس کا اعتراف نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ان پر ذمے داریوں کا وہ بارِ گراں تھا جسے اتار پھینکنا ممکن نہ تھا۔

انور ان کے سامنے بیٹھ گیا تو انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”دروازہ بند کر دو۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔“

میں بھی ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”کیا آپ نے پولیس کو اطلاع دی ہے؟“

”ابھی نہیں... تم نے دی؟“

ہم نے ایک ساتھ انکار میں سر ہلا دیے۔ ان کی بڑی بڑی لال جلالی آنکھیں مجھ پر اور انور پر مرتکز تھیں۔ ”بہت اچھا کیا۔“

”لیکن پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔“ انور بولا۔

”ہم اس قانونی معاملے کو خاندانی معاملہ قرار دے کر اس پر پردہ نہیں ڈال سکتے۔“ میں نے کہا۔

پیر صاحب نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ ”یہ کس نے کہا؟“

میں اور انور خاموش بیٹھے خلا میں دیکھتے رہے۔ پھر انور بولا۔ ”نام تو میرا ہی لیا جائے گا۔ اس کی بہت معقول وجہ ہے۔ میں اس انتظام سے ناخوش تھا۔ اب میں اکیلا وارث ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ اس لیے تمہاری حفاظت ضروری ہے۔ میں کسی طرح بھی تمہیں قانون کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔“

”قانون بھی مجھے نہیں چھوڑ سکتا... میں جانتا ہوں۔“

انہوں نے خفگی سے کہا۔ ”تم کچھ نہیں جانتے۔ چودھری کی حالت ایسی نہیں کہ اس کا آخری سہارا بھی نہ رہے۔ ابھی وہ زندہ ہے، کچھ کر نہیں سکتا تو کیا... میں ہوں نا۔“

”اس یقین کے باوجود کہ یہ عمل میرا تھا...“

”جو ہو چکا اس کو دیکھوں میں یا جو ہو سکتا ہے اس کی فکر کروں؟ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ قرض چکانے کا وقت بھی اچانک آجائے گا۔“

”کس قرض کی بات کر رہے ہیں آپ...؟“ انور بولا۔

”کل تم نے مجھے قانون کی نظر میں رسوا نہیں ہونے دیا۔ اگر تم ایسا نہ کرتے تو معلوم ہے کیا ہوتا؟“

میں اور انور نظروں میں سوال لیے بیٹھے رہے۔

”مجھے روزینہ کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے خاموشی سے دفن کرنا پڑتا۔ الزام کا سارا کیچڑ اسی کی ذات پر گرا تھا۔ تم نے اسے بھی محفوظ کیا اور مجھے بھی رسوائی سے بچایا... کبھی تو مجھے احسان کا یہ قرض اتارنا ہی تھا۔ اب تم میری گاڑی میں نکل جاؤ۔“

”میں نکل جاؤں... کہاں...؟“ انور ٹپٹایا۔

”گاڑی تمہیں میرے ایک مرید کے گھر پہنچا دے گی۔ تم چار دن سے وہاں تھے۔“

”لیکن تایا... کل تو دستخط کیے میں نے۔“

”دستخط کیے کس تاریخ میں... ایک ہفتے پہلے تم یہاں ضرور تھے، گزشتہ روز نہیں تھے۔ ہم بتا دیں گے سب کو... تم آؤ گے شام کو تدفین سے پہلے... میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

انور نے سر ہلایا۔ ”جی... اور پولیس...؟“

”پولیس کا کیا کام یہاں... پولیس کیوں آئے گی بے وقوف... کیا ہم خود اپنی رسوائی کا اسٹیج سجائیں گے؟ اکبر میرا داماد تھا۔ شاہینہ کا شوہر تھا۔ میرا دل خون کے آنسو روتا ہے اپنی بیٹی کے لیے... بہت عمر ہے ابھی اس کے سامنے اور وہ اکیلی رہے گی جب تک زندہ رہے گی مگر اکبر کی موت کو قتل بنا کے اسے یا مجھے یا کسی کو بھی کیا فائدہ ہو گا؟ نقصان تو ہو گیا... اب رسوائی بھی ہو... یہ کہاں کی عقل مندی ہے؟ تم جاؤ... یہاں کے معاملات مجھ پر چھوڑ دو۔“

انور اٹھا۔ اب وہ انہیں طنز... تمسخر یا حقارت سے پیر صاحب نہیں کہہ رہا تھا۔ ”میں جاتا ہوں تایا... مگر ایک بات بتا دیں مجھے... آپ کیا سمجھتے ہیں، کسے بچا رہے ہیں؟ اپنے داماد کو یا ایک مجرم بھتیجے کو؟“

وہ دہاڑ کر بولے۔ ”کیا فرق پڑے گا اس سے؟“

”فرق مجھے پڑے گا۔ کیا میں مجرم ہوں؟“

”مجھے نہیں معلوم... کسی کو بھی نہیں معلوم... اور کبھی معلوم ہو گا بھی نہیں۔ جلدی جاؤ... تمہیں واپس بھی آنا ہے عصر تک۔“

انور نکل گیا۔ میں نے اسے ایک گاڑی میں سیاہ شیشوں کے پیچھے غائب ہوتا اور گاڑی کو حویلی سے جاتا دیکھا۔ اچانک میرے دماغ پر سے فکر اور پریشانی کی بھاری چٹان ہٹ گئی تھی۔ جو مسائل قانون کی مداخلت سے پیدا ہوتے، اچانک بے وجود ہو گئے تھے۔ پیر صاحب نے اپنی عملی دانش سے قانون کو دخل اندازی کا موقع ہی نہیں دیا تھا اور سب کچھ سنبھال لیا تھا۔ سب کو سنبھال لیا تھا۔

”میرے لیے کیا حکم ہے؟“ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

”کیا خدا نے تمہیں عقل نہیں دی ہے؟ فیملی میں ایک موت ہو گئی ہے۔ تمام انتظامات کرنا اب تمہاری ذمے داری ہے۔ سب معمول کے مطابق ہو گا۔ کچھ لوگ تدفین میں شریک ہوں گے۔ ان سے کہا جائے گا کہ اکبر کئی مہینے سے بیمار تھا۔ اسی لیے ڈاکٹر یہاں رہتا تھا۔ یہ باپ بیٹے دونوں کا علاج کر رہا تھا۔ انور نے تمام معاملات سنبھال رکھے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے ڈاکٹر ایسا نہ کہے۔“

”تم دیکھو گے کہ وہ یہی کہے گا۔“

”اور... شاہینہ... یا اکبر کی ماں...“

”یہ کیا بے وقوفی کے سوال کر رہے ہو؟“ پیر صاحب نے برہمی سے کہا۔ ”وہ ایسا کیوں نہیں کہیں گی؟ ابھی صدمے کا اثر ہے، کچھ دیر بعد میں انہیں سمجھا دوں گا۔ وہ بھی انور کو بچائیں گی ورنہ اس خاندان کا وارث کہاں رہے گا... نسل کیسے چلے گی... تم نہیں سمجھ سکتے یہ باتیں... اس لیے جاؤ... نوکروں کو سمجھا دو... ریشم سے اور سلونی سے کہہ دو... جاؤ۔“

سارا دن میں نے ایک ناقابلِ یقین آسانی کے ساتھ

اکبر کی آخری رسوم کو عقیدت اور احترام سے تعمیل کے مراحل طے کرتے دیکھا۔ اکبر کے ماں باپ صدمے سے بے حال تھے۔ ان کے ساتھ سوگواروں اور تعزیت کرنے والوں کو بیٹھنے ہی نہیں دیا گیا۔ تایا کی حیثیت سے تمام ذمے داریاں پیر صاحب نے سنبھال لی تھیں۔ وہ محترم ہی نہیں معتبر بھی تھے۔ مستند تھا ان کا فرمایا ہوا۔ اکبر کی بیماری کے بارے میں کسی نے سوال ہی نہیں کیا۔ وہ چھ مہینے شہر میں زیرِ علاج رہا۔ پھر وہاں ڈاکٹروں نے جواب دیا تو اسے واپس حویلی میں لے آئے اور ایک ڈاکٹر جو چودھری کے دل کا علاج کررہا تھا، اس کی آخری وقت تک دیکھ بھال کرتا رہا لیکن... موت سے کس کو رستگاری ہے۔ اللہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔

تعزیت کے لیے آنے والوں اور تدفین میں شریک ہونے والوں میں سے چند ایک کے سوا میں کسی کو بھی نہیں پہچانتا تھا لیکن میں نے یہ دیکھا کہ وہ پیر صاحب سے بڑی عقیدت کے ساتھ ملتے تھے۔ ان کے ہاتھ چومتے تھے اور چند ایک نے قدم بوسی بھی کی۔ پیر صاحب ایک کرسی پر بڑی تمکنت سے براجمان تھے۔ آگے ایک طرف صرف ان کی کرسی تھی۔ ان کے پیچھے ایک طرف انور تھا اور دوسری طرف میں۔ انور شام چار بجے ہی یہ افسوسناک اطلاع ملنے کے بعد لوٹا تھا۔ دکھ اور غمزدگی کے بھرپور تاثرات انور کے چہرے پر بھی عیاں تھے۔ سامنے لمبائی کے رخ قناتیں لگائی گئی تھیں اور سائے کے لیے شامیانہ تان دیا گیا تھا۔ لمبائی کے رخ دونوں طرف کرسیاں تھیں۔ درمیانی جگہ پر سفید چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ لوگ آتے تھے اور کچھ دیر بیٹھ کے چلے جاتے تھے۔ ایسے ہی حویلی کے اندر زنان خانے میں ہو رہا تھا۔ خواتین بدقسمت بیوہ اور ماں سے رسمی انداز میں تعزیت کرتی تھیں اور وہی الفاظ تھے جو مسلسل دہرائے جارہے تھے۔ مجھے ریشم نے بعد میں بتایا کہ خاندان کی دونوں غم زدہ خواتین نے اپنے غم کو حالات کی ضرورت سمجھتے ہوئے قبول کیا تھا اور نوشتۂ تقدیر کو صبر کی بھاری چٹان تسلیم کر لیا تھا جس کے نیچے ان کا دل سسکتا رہے اور خون کے آنسو روتا رہے مگر ان کو پیر صاحب کی ہدایت کے مطابق آگے دیکھنا تھا... وہ نہیں رہا تھا اُسے رونا حق بجانب مگر جو بچا ہوا تھا، اس کی حفاظت بھی انہی کو کرنا تھی۔

میں حیران بھی تھا کہ کس طرح ایک سرکاری بیان کی صداقت کو بے چون وچرا تسلیم کیا جارہا تھا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ شک کا اظہار کرے۔ یہ کہیے کہ ہم نے تو چھ مہینے سے اکبر کے بارے میں ایسی کوئی بات کسی کے منہ سے نہیں سنی۔ افواہیں تو کچھ اور کہتی تھیں۔ سچ وہی تھا جو پیر صاحب نے فرمایا۔ جتنا میں قانونی نتائج سے پریشان تھا، اتنا ہی یہ معاملہ قانون کی مداخلت کے بغیر آسانی سے طے ہوگیا تھا۔ تدفین تک مقامی پولیس اور تھانے کا عملہ اور افسران بھی آئے لیکن ان کا رویہ عام عقیدت مندوں سے مختلف نہ تھا۔ پیر صاحب کے روحانی حلقۂ عقیدت سے باہر کوئی نہ تھا۔ شاید اکبر کا باپ اس معاملے کو اتنی عمدگی سے نہ سنبھال پاتا جیسا کہ پیر صاحب نے فرمایا تھا۔ خود ڈاکٹر جلالی نے متعدد مواقع پر اکبر کی علالت اور اپنے علاج سے اسے بچانے کی پوری کوشش کا اعتراف کیا۔ بیماری کی نوعیت کے بارے میں پیر صاحب نے پہلے ہی فرمادیا کہ شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بس وہ کمزور ہوتا جارہا تھا۔

شام کو جب تدفین مکمل ہوگئی تو حویلی پر ایک گہرا پُرآسیب سناٹا مسلط ہوگیا۔ آج زنداں کی دیواریں شرمسار ہیں۔ محافظوں کی اب کسے حاجت... زنجیر وسلاسل کا کیا کام... ایک فیصلہ انسانوں نے یقین اور اتفاق کے ساتھ کیا تھا کہ اس کی آزادی اور خودمختاری اور حاکمیت بحال کی جائے۔ دوسرا فیصلہ دستِ اجل نے بہت پہلے تحریر کردیا تھا اور جب وقت آیا تو کسی نامعلوم ہاتھ نے فرشتۂ اجل کی تعمیل کی اور اسے زہر دے دیا۔

میں اکیلا لیٹا سوچتا رہا۔ بے خواب آنکھوں سے وہ سارے مناظر دیکھتا رہا جو میری آنکھوں نے نہیں دیکھے تھے۔ کون تھا وہ... کس کو یہ منظور نہ تھا کہ وہ پھر زندگی کی طرف لوٹے اور انور کے ساتھ مل کے زر، زن، زمین کے فساد کو ختم کرے۔ دو نام ترازو کے دو پلڑوں میں مساوی وزن رکھتے تھے اور کوئی دلیل نہ تھی جو اس توازن کو کسی ایک کے حق میں یا دوسرے کے خلاف کرسکے۔ انور نے بھائی کی رہائی کو جبر کے ساتھ قبول کیا تھا یا شاہینہ نے شوہر کو؟

ایسی کوئی دلیل نہ تھی کہ میں ایک کے حق میں یا دوسرے کے خلاف کسی بھی نتیجے پر پہنچ سکوں۔ یہ مجھے ناممکن بھی نظر آتا تھا اور ممکن بھی... اگر ان دونوں میں سے کسی نے یہ کام کیا تھا تو اس کی ہمت بھی قابلِ داد تھی اور مہارت بھی۔ اس نے اپنی زبان سے کہنے والے ایک لفظ سے نادانستہ بھی اپنے عزائم کا کبھی اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔ کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس سے اب میں کوئی نتیجہ اخذ کرسکتا۔

ان کا ضبط... اداکاری اور مکاری... عزم اور حوصلہ... پلاننگ اور عمل درآمد میں رازداری... سب قابلِ تعریف تھے۔ بالکل صحیح وقت پر اس نے اپنے پلان پر عمل درآمد کیا اور نہ کسی کو کانوں کان خبر ہونے دی اور نہ شک کا امکان چھوڑا۔ یہ بہت مکمل منصوبہ تھا جس کے عواقب ونتائج پوری طرح قاتل کے سامنے تھے۔ کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا... اسے سب معلوم تھا۔

مجھے یہاں رائے عامہ اور سماجی شعور پر بھی حیرانی تھی۔ کتنی آسانی سے سارے ملازم نوکر چاکر سب کی زبان پر کنٹرول حاصل کرلیا گیا تھا کہ وہ سب وہی بولتے رہے جو انہیں سکھایا گیا تھا۔ پیر صاحب پر اعتماد اور ان سے عقیدت اپنی جگہ، کیا اس آبادی میں پہلے سے کوئی افواہ نہیں تھی؟ اور کیا اب درِ پردہ سرگوشیوں میں حقیقت بے نقاب نہیں ہو گی... سامنے سر جھکانے اور قدم بوسی کرنے والے پیٹھ پیچھے باتیں تو کریں گے۔

اچانک بہت بڑا انقلاب آگیا تھا۔ انور کی اہمیت اس خاندان میں سب سے زیادہ ہوگئی تھی۔ اس کی زندگی کا تحفظ سب کے لیے سب سے اہم فریضہ بن گیا تھا۔ سوال خاندان کی بقا کا تھا۔ نسل کو بڑھانے کا تھا۔ یہ سب سے اہم کام اب صرف انور کرسکتا تھا۔ اسی مناسبت سے روزینہ ٹاپ پر آگئی تھی۔ شاہینہ کی حیثیت ثانوی ہوگئی تھی۔ شاید اب اس بات کا کوئی امکان نہ تھا کہ اس زندگی میں دوبارہ اس کو سہاگن کہلانا نصیب ہو۔ خاندان میں اس کا ہم مرتبہ کوئی لڑکا نہ تھا جس کی وہ دوسری بیوی بن سکے۔ وہ باپ کی آدھی زمین جائداد کی وارث تھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ اس سے دستبردار ہوجائے تو کوئی اس کا ہم پلہ رشتہ قبول کرلیا جائے۔ اب سب کی مالک روزینہ تھی اور انور تھا۔

میں نے دماغ کو جھٹکا اور پلٹ کر پھر سونے کی کوشش کی۔ کمرے میں اندھیرا تھا لیکن میں کل سے اب تک کے واقعات کے عکس اندھیرے سینما ہال میں چلنے والی فلم کی طرح دیکھ رہا تھا۔ شاید اپنے اپنے کمروں میں سب ایسے ہی رات آنکھوں میں کاٹ رہے تھے۔ اپنے اپنے خیالوں اور اندیشوں کے ساتھ۔

اچانک میں نے مکمل خاموشی میں بھونکنے والے کتوں اور دور چلّانے والے گیدڑوں کی آواز سے الگ ایک آواز سنی۔ نہ جانے کون لوگ تھے جو باہر باتیں کررہے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے دو بجے تھے۔ پھر دھم سے ایسی آواز آئی جیسے زمین پر کچھ گرا ہو۔ خاموشی بہت گہری تھی۔ میرے اعصاب بہت کشیدہ اور احساس بہت بیدار تھا۔ میں کسی دوسری آواز کا منتظر رہا۔ کچھ لوگ بول رہے تھے۔ کسی نے غصے میں انہیں کہا... ”خاموشی سے کام نہیں کرسکتے۔“

یہ آواز انور کی تھی چنانچہ میرے لیے اٹھ کر باہر جانا اور یہ جاننا ضروری ہوگیا کہ آدھی رات کے بعد وہ کس کارروائی میں مصروف ہے۔ میں اپنے کمرے سے دبے پاؤں نکلا۔ برآمدے میں ہر روز کی طرح لائٹس روشن تھیں اور پہرے دار بے جان مجسموں کی طرح مستعد کھڑے تھے۔ حالات نے ان کی کارکردگی کو بھی متاثر کیا تھا۔ دروازہ اپنے پیچھے بند کرکے میں گیٹ تک گیا تو وہ مقفل تھا۔ بڑے میں بنایا گیا چھوٹا دروازہ بھی بند تھا۔ میں نے اندر سے دروازہ بجایا تو گارڈ نے باہر سے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”میں... ملک سلیم اختر... گیٹ کھولو۔“

چند سیکنڈ کے توقف سے اس نے باادب ہوکے کہا۔ ”سوری ملک صاحب! گیٹ کھولنے کا آرڈر نہیں ہے۔“

میں نے بگڑ کے کہا۔ ”کس کا آرڈر ہے یہ؟“

”چھوٹے چودھری صاحب کا۔“

”خواہ رات کو کچھ بھی ہوجائے... کوئی باہر نہیں جا سکتا یا یہ پابندی صرف میرے لیے ہے؟“ میرا پارا چڑھ گیا تھا۔

میرے سوال کا کوئی جواب نہیں آیا۔ گارڈ مجھ سے گستاخی نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے خاموشی میں عافیت جانی۔ میری عقل نے کہا کہ اس کا مطلب مجھے خود سمجھ لینا چاہیے۔ اب میں اپنی مرضی سے کہیں بھی آجا نہیں سکتا۔ یہ جو میں حویلی کے اندر کہیں بھی آجاسکتا ہوں، یہ بھی غنیمت ہے۔ خفت اور احساسِ تذلیل کے ساتھ میں لوٹا تو میرے دماغ میں ایک اور خیال آیا۔ ریشم کو جو بیڈروم ملا ہوا تھا، وہ دونوں طرف کے برآمدوں کا نقطۂ اتصال تھا۔ کونے کے اس کمرے کی ایک کھڑکی سے اس طرف دیکھا جاسکتا تھا جدھر سے آوازیں آرہی تھیں۔

میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ برآمدے میں کھڑے محافظوں نے دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ اندر سے ایک خوف زدہ سرگوشی سنائی دی۔ ”کون ہے؟“

میں نے آہستہ سے کہا۔ ”ریشم... دروازہ کھولو۔“

اس نے آواز پہچان کے دروازہ کھول دیا۔ اندر تاریکی تھی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹی تو میں نے دروازے کو بند کردیا۔ ”تم جاگ رہی ہو؟“

"تم بھی تو جاگ رہے تھے۔ یہاں کیوں آئے ہو؟" وہ بولی۔

"پابندی باہر جانے پر ہے، تم سے ملنے پر نہیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"آہستہ بولو۔" کسی تیسری آواز نے سرگوشی کی تو میں چونکا اور کھڑکی کی طرف دیکھا۔ سلونی ایک پٹ کھولے کھڑی تھی۔

"لائٹ مت جلانا۔" اس نے کہا۔

"کیا دیکھ رہی ہو تم؟" میں نے کہا۔

"تم اس وقت باہر کیوں جانا چاہتے تھے؟ میں نے گارڈ کی آواز سنی تھی۔"

"باہر کیا ہو رہا ہے؟" میں نے کہا اور اس کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔

"چپ چاپ دیکھو یہاں سے۔" ریشم نے کہا۔

تقریباً پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر اندھیرے میں کچھ سائے سے حرکت کر رہے تھے۔ "میں نے ابھی انور کی آواز سنی تھی۔"

"وہی نگرانی کر رہا ہے۔ باقی سب مزدور ہیں۔" ریشم بولی۔

"او مائی گاڈ... یہ قبرستان میں آدھی رات کے بعد کیا ہو رہا ہے؟" سلونی نے سرگوشی میں کہا۔ "انہوں نے اکبر کی قبر کھودی ہے۔"

مجھے شاک سا لگا۔ "اکبر کی قبر... وہ کس لیے؟"

"معلوم ہو جائے گا۔ یہاں چپ چاپ کھڑے رہو۔ ہم بھی دیکھ رہے ہیں، تم بھی دیکھو۔" ریشم بولی۔

میں نے نظر جما کے دیکھا۔ تازہ قبر کو پھر کھودنا آسان تھا۔ اب وہ تین فٹ نیچے رکھے گئے پتھروں کے سلیب ہٹا رہے تھے۔ باہر کھڑے ہوئے دو مزدور یہ تختے ایک طرف رکھ رہے تھے۔ اب انہوں نے اکبر کی لاش تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ جو احترام تدفین کے وقت میت کو دیا جاتا ہے، وہ اس وقت ممکن نہ تھا۔ وہ احساسِ جرم و گناہ سے نروس تھے۔ انہوں نے کفن سمیت لاش کو کھینچا ہوگا۔ یہ ایک مشکل کام تھا۔ غالباً ایک بار کفن سلپ کر جانے سے اکبر دوبارہ نیچے جا گرا۔ انور نے غصے میں دانت پیس کر دونوں مزدوروں کو گالیاں دیں۔ وہ کیا بولتے۔ انہوں نے دوسری کوشش میں لاش کو اوپر پہنچا دیا۔ اوپر کے دونوں مزدوروں نے اسے سنبھال لیا۔ اکبر کو اٹھا کے وہ کچھ دور چلے گئے جہاں اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ وہ غائب ہو گئے۔

"یہ کہاں لے گئے ہیں اکبر کو؟" میں نے کہا۔

"ابھی سوال مت کرو، ہم بھی دیکھ رہے ہیں... تم بھی چپ کھڑے رہو۔"

انور دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اس سمت دیکھ رہا تھا جدھر مزدور اکبر کی لاش لے گئے تھے۔ برگد کے پھیلے ہوئے پرانے درخت کے تاریک سائے سے وہ پھر لاش اٹھائے نمودار ہوئے۔ ریشم نے ایک ہلکی سی چیخ ماری اور پھر منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے پلٹ کر پیچھے سے پانی کا گلاس اٹھایا اور دو گھونٹ لیے۔ "اکبر کو پھر وہیں دفنانا تھا تو نکالا کیوں تھا؟"

سلونی نے کہا۔ "بے وقوفی کی بات مت کرو۔ یہ اکبر نہیں ہے جو اکبر کی جگہ لٹایا جائے گا۔"

"کون ہے یہ؟" ریشم خوف زدہ سرگوشی میں بولی۔

"یار! مجھے بھی اتنا ہی نظر آ رہا ہے جتنا تمہیں... ہوگا آج کل میں کوئی مرنے والا... اکبر کو اس کی قبر میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔"

"میں بتا سکتا ہوں ایسا کیوں کیا گیا؟" میں نے نظر باہر جما کے کہا۔ "قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے۔ خدانخواستہ کبھی قانونی مسئلہ کھڑا ہوا اور پوسٹ مارٹم کی نوبت آئی... تو قبر کھودنے پر جو لاش نکلے گی یا جو ڈھانچا برآمد ہوگا، اس سے کسی زہر خورانی کا پتا نہیں چلے گا۔ وہ اکبر نہیں ہوگا مگر اس کا پوسٹ مارٹم اکبر کی حیثیت سے ہوگا۔"

"اس کا قیامت تک کوئی خطرہ نہ تھا۔" سلونی نے کہا۔

"ایسا مت کہو بی بی... یہ دور اندیش لوگ ہیں۔ آج اکبر کی موت کا جو سبب بیان کیا گیا، سب نے سر جھکا کر مان لیا۔ مگر شکوک کچھ لوگوں کے دلوں میں ہوں گے جن کا انہوں نے آج اظہار نہیں کیا... باتیں پہلے بھی گردش میں ہوں گی۔ میرا مطلب ہے افواہیں... جن ملازموں اور خادماؤں کی ایک حکم سے زبان بندی کر دی گئی تھی، ان میں سے کسی نے آج کچھ نہیں کہا لیکن کیا ضمانت ہے کہ کسی کی زبان کل کچھ کہہ دے یا کوئی دشمن ان سے اگلوا لے اور ان کی گواہی خرید لے۔ دشمن تو ہیں چھوٹے بڑے چودھری کے... پیر صاحب کے... اور وہ بھی طاقتور ہیں... اثر رسوخ رکھتے ہیں... تو اسے محتاط رہنا ضروری ہے۔"

خاموشی کے ایک طویل وقفے میں ہم سب اکبر کی جگہ کسی نامعلوم شخص کو اس کی قبر میں لیٹتا دیکھتے رہے۔ بڑی عجلت میں قبر پھر بھر دی گئی۔ سب کچھ ویسا ہی ہو گیا جیسا کہ

تھا۔ "اب کبھی پولیس نے دخل اندازی نہ کی تو پھر صورِ اسرافیل پر عرصۂ محشر میں جانے کے لیے یہاں سے اکبر نہیں کوئی اور نکلے گا۔" میں نے کہا۔

انور نے کھودی جانے والی قبر کے برابر کیے جانے کا سارا کام خود اپنی نگرانی میں کرایا۔ میں اس کی آواز نہیں سن سکتا تھا مگر اس کو ہاتھ کے اشارے سے سب کو ہدایات دیتا دیکھ رہا تھا۔ قبر پھر ویسی ہی بن گئی جیسی کہ تھی۔ اس پر تمام پھول پھر اسی طرح بچھا دیے گئے جیسے تدفین کے وقت ڈالے گئے تھے۔ آخر کل بھی تو وہ لوگ تعزیت اور فاتحہ خوانی کے لیے آئیں گے جن کو دیر سے خبر پہنچے گی یا جو دور ہیں۔ چھوٹے گاؤں قصبوں میں دنیاداری کی ساری رسمیں شہر کے مقابلے میں مذہبی فریضے کی طرح ادا کی جاتی ہیں۔

"سلونی! یہاں کس کو گاڑا ہے اب؟"

"میرا صرف اندازہ ہے۔ اس میں صغراں آ گئی۔ وہ بھی تو اکبر کے ساتھ ہی مری تھی اپنے کوارٹر میں... وہی زہر تھا۔"

"آخر اس نے کیوں کھا لیا زہر... کھانا تو ایک ہی تھا جو اس نے پکایا تھا۔"

"تو بہت بے وقوف ہے ریشم... کھانا پکایا ضرور تھا اس نے... زہر کسی اور نے ڈالا۔ وہ کھانا اکبر کو بھی چلا گیا اور صغراں نے بھی کسی شک کے بغیر کھا لیا۔ وہ قاتل بھی بنی اور مقتول بھی۔"

میں نے انور کو مطمئن ہونے کے بعد دوسری طرف جاتا دیکھا۔ قبرستان کے آخری حصے میں برگد کا پیڑ آ گیا تھا۔ اس کے آگے جنگل تھا۔ شاید یہ جگہ جنگل صاف کر کے نکالی گئی تھی۔ برگد کے پیڑ کو پرانا سمجھ کے چھوڑ دیا گیا۔ اس کا سایہ شاید سو گز کے دائرے پر تھا۔ اس وقت وہاں تاریکی زیادہ گہری تھی۔ میں بھی قیاس کر سکتا تھا کہ اب انور اپنے بھائی کو صغراں کی خالی کردہ قبر میں لٹا رہا ہوگا۔ یہ آخری گوشہ گمنام تھا۔ یہاں ایک صدی پہلے کے وہ لوگ مدفون تھے جنہوں نے اس قبرستان کو سب سے پہلے آباد کیا ہوگا۔ اب تک ان کی ہڈیاں بھی خاک ہو چکی ہوں گی۔ یہ پرانی قبریں پردادا کے دادا جیسے حوالے رکھتی تھیں جو اب کسی کو یاد نہ تھے۔ قبریں پرانی اور شکستہ حال تھیں اور ان کے کتبے بھی پڑھے نہیں جاتے تھے۔

اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ "سلونی! یہ صغراں تو صرف ایک خادمہ تھی۔"

"ہاں، بہت پرانی تھی۔ ساٹھ سال عمر ہوگی۔ پہلے اس کی ماں تھی یہاں۔ یہ یہیں بچی سے جوان ہوئی۔ میں نے اس کی شادی کا نہیں سنا۔ ہوتی تو بچے بھی ہوتے اور حویلی میں کام کرتے نظر آتے یا گاؤں میں گھر ہوتے تو کبھی ماں سے ملنے آتے۔ وہ اکیلی تھی۔" سلونی نے بتایا۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس نے شادی نہ کی ہو یا اسے کرنے نہ دی گئی ہو۔ اتنے خصم ہیں تو ایک اور کی کیا ضرورت ہے۔ رکھے گا وہ بھی پاؤں کی جوتی بنا کے۔ یہ آزادی اچھی ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

سلونی نے سر ہلایا۔ "تھی تو اب بھی اچھی... گوری چٹی اور صحت مند... بہت بن سنور کے رہتی تھی۔ جوانی میں سب کا دل للچاتی ہوگی۔"

"میرے سوال کا مقصد کچھ اور تھا۔ ایک ملازمہ کو اس خاندانی قبرستان میں جگہ کیوں ملے گی اور وہ بھی آباؤ اجداد کے درمیان؟ ان کی روحیں کس قدر تڑپیں گی اس بے عزتی پر۔"

"یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔ خاندان کا تو اور کوئی نہیں مرا کافی دن سے... پھر یہ کس کی لاش تھی؟"

"قبرستان کی حد کے باہر بھی جگہ ہے، اس کے گرد احاطہ کوئی نہیں۔ وہاں حویلی کے کسی کسی خاص نمک خوار کو جگہ مل جاتی تھی۔ وہاں کسی نئی قبر کی جگہ نہیں تھی۔ صغراں کو کہاں دفن کیا گیا تھا، معلوم ہو جائے گا۔" سلونی بولی۔

میں نے کہا۔ "اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اکبر گیا خاندانی قبرستان سے باہر... نہیں... یہ نہیں ہو سکتا۔"

"آخر یہ خیال آیا کس کے دماغ میں؟"

"سب کے دماغ ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں اس وقت ہر فیصلہ یا تو پیر صاحب کر رہے تھے یا انور... پیر صاحب عیاری میں انور سے بہت آگے ہیں۔ ان کا دماغ کرمنل ہے۔ اسے میں دور اندیشی نہیں، مجرمانہ دفاع کہوں گا۔ ان کی نظر میں وہ امکانات اور اندیشے ہوں گے جن کی طرف انور کا خیال نہیں جا سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے، پیر صاحب نے کہا کہ صغراں کو یہاں دفنا دو تاکہ رات کو تبادلے میں آسانی ہو؟" ریشم بولی۔

"ہاں، صغراں کو شہید کا درجہ دینے میں کیا جاتا ہے۔ وہ کھانا پہلے خود کھا کے ثابت کرتی تھی کہ اس میں کوئی خطرے کی بات نہیں۔ دراصل جب انور قید میں تھا تو اسے سلو پوائزن دینے کا ایک شیطانی منصوبہ خود اکبر نے بنایا تھا۔ مگر ایک باضمیر جاں نثار نے انور کو خبردار کر دیا اور منصوبہ

ناکام رہا۔ اب اکبر نے ماں یا بیوی سے کہا ہوگا کہ جو کھانا بنائے وہ خود کھا کے دکھائے پہلے... ایسا ہوتا ہے جہاں سیکیورٹی چیک ضروری ہوں... تو اب وفادار صغراں کو جان کی قربانی کا انعام یوں دیا گیا کہ باہر جگہ نہیں تھی تو خاندان کے بزرگوں کے پیروں میں اس کے لیے جگہ بنا دی گئی۔ کتنا بڑا اعزاز حاصل ہوا اسے... اصل مدعا کچھ اور تھا۔ صغراں کی یہاں تدفین کے فیصلے پر اعتراض کرتا تو انور کا باپ مگر اسے ہوش کہاں ہے۔ وہ سویا پڑا ہے۔ ڈاکٹر جلالی نے اسے صرف آخری وقت میں بیٹے کا منہ دیکھنے کی اجازت دی تھی۔

اس وقت بھی وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ پیر صاحب اور ان کے نئے داماد نے اپنی سہولت دیکھی۔ فائدہ یہ بھی ہوا کہ اکبر خاندانی قبرستان میں رہا۔ اب کتبہ لگے گا صغراں کی قبر پر... اکبر کے اصل مدفن کو ابھی اسی حالت میں برقرار رکھا جائے گا، بے نام و نشان... یا صغراں کا کتبہ ہی اس کی نشانی ہوگا۔ اب سے دو چار ماہ بعد جب قانون کی دخل اندازی کا اندیشہ نہ رہے یا قانونی کارروائی کی خانہ پُری ہو جائے تو دوبارہ مدفن بدلے جا سکتے ہیں... احتیاط کے تقاضے نظر انداز تو نہیں کیے جا سکتے۔“

”اب تو کوئی آواز نہیں آرہی ہے۔“ ریشم نے کہا۔

”ہم کیا دیکھ رہے ہیں اندھیرے میں اندھیرے کے سوا؟“

ہم کھڑکی سے ہٹ گئے۔ ریشم نے آہستہ سے پٹ بند کیے اور چٹخنی چڑھا کے پردے برابر کر دیے۔ ریشم کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور تھکن اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ گزرے ہوئے دن نے سب کو ذہنی اور جذباتی طور پر یکساں متاثر کیا تھا۔ میں بھی نیند کی اشد ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ ریشم نے سلونی کو اپنے ساتھ رکھا تھا۔ میں انہیں چھوڑ کے اپنے کمرے میں آ گیا۔

نیند آنے سے پہلے میرا دماغ کچھ دیر اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا مثلاً میں نے یہ سوچا کہ آخر اس سیکرٹ مشن میں جو چار مزدور شامل تھے وہ کون تھے؟ کہاں سے لائے گئے تھے؟ انہیں کیا بتایا گیا تھا اور کتنا معاوضہ ادا کیا گیا تھا؟ اور کیا انہیں ایک کی جگہ سو یا ہزار دینے کے باوجود رازداری کا اعتبار کیا جا سکتا تھا؟ کہ وہ کبھی کسی سے کچھ نہیں کہیں گے... شاید اعتبار کا رسک بہت بڑا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان چاروں کو انعام میں موت ملے گی۔ جب وہ اس خیال میں ہوں گے کہ صبح واپس گھر جاتے ہوئے ان کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوئی ہوں گی اور دولت کی دیوی کا کیا ہے جہاں چاہے مہربان ہو جائے۔ وہ سوچ نہیں پا رہے ہوں گے کہ اچانک ہاتھ آ جانے والے اس خزانے سے اپنے اور اپنے خاندان کے لیے وہ کیسی کیسی خوشیاں خرید لیں گے۔ موت کا سفاک ہاتھ ان کو گمنامی کی موت عطا کر دے گا۔ ان کے مردہ جسم مختلف سمتوں میں بکھرے پڑے ملیں گے یا نہیں ملیں گے۔ چودھریوں کے رازدار قیامت تک ان کے راز کو افشا نہ کر پائیں گے۔

میں صبح پھر دیر سے اٹھا۔ ماتم والے گھر میں سوگواری کی فضا برقرار تھی۔ نہ جانے کہاں سے حویلی والوں کے لیے کھانے پینے کا بندوبست ہوا تھا۔ حویلی کے چولہے ابھی ٹھنڈے تھے کیونکہ سوئم ابھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے انور کو دیکھا۔ وہ باہر خیمے لگوا رہا تھا۔ اس سے میں نے اندازہ کیا کہ شاید سوئم کی تقریب آج نمازِ جمعہ کے بعد شروع ہوگی۔ اس پر گزر جانے والی رات کے اندھیرے میں کیے جانے والے حفاظتی اقدامات کا کوئی اثر نہ تھا۔ وہ بڑی مستعدی اور حاکمانہ اعتماد کے ساتھ انتظامات کو آخری شکل دے رہا تھا۔

وقت نے ایسی کروٹ لی تھی کہ رشتوں کی آبرو بھی نہ رہی تھی۔ اب انور اپنی ذات میں تنہا ہو گیا تھا اور اس کے میرے درمیان خلوص اور اعتماد کے تعلق کو حالات کی دیمک لگ گئی تھی۔ رات کے آخری پہر میں وہ جو کچھ کر رہا تھا، بڑی رازداری سے کر رہا تھا۔ اس نے نہ مجھ سے مشورہ کیا تھا اور نہ مجھے بتانے کی ضرورت سمجھی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے فوراً ہی ہو گیا۔ میں کمرے سے نکل کے اس کے پاس گیا۔

”یہ سوئم کے انتظامات ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں یار! دنیاداری ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے جگا دیا ہوتا۔ لگتا ہے رات سو نہیں سکا تُو۔“

”دماغ پر ڈسٹرب کرنے والے خیالات کا بڑا پریشر تھا۔ میں نے ڈاکٹر جلالی سے درخواست کی تو اس نے کوئی گولی دے دی تھی مجھے... چار پانچ گھنٹے کی نیند سے فرق پڑا ہے... جا کچن میں ناشتا کرلے... میں نے بھی وہیں کیا تھا... معلوم نہیں کہاں کہاں سے آ گیا۔“

”مجھے تو بس چائے کافی کی طلب ہے۔“

”چائے پڑی ہے تھرماس میں... چولہا نہیں جل سکتا مائیکرو ویو اوون چلا لیا میں نے۔ تو بھی یہی کر... رسم دنیا میں سب کرنا پڑتا ہے ورنہ یار... دکھ سے زیادہ یہ نقصان ہے... ناقابلِ تلافی اور ہم سب کا... میں اکیلا ہوں اپنے پشیمانی کے احساس میں... زندگی بھر کی سزا بن گئی ہے میرے لیے یہ خیال کہ دیر مجھ سے ہوئی۔“

”ہم تقدیر کے لکھے کو جان سکتے تو پھر کیا تھا۔“ میں نے کہا اور کچن کی طرف چل پڑا۔ حسب توقع انور نے گزشتہ شب کی خفیہ کارروائی پر جھوٹ کا پردہ ڈال دیا تھا اگر اس نے ڈاکٹر جلالی سے نیند کی گولی لی ہوگی تو محض ثبوت حاصل کرنے کے لیے کہ وہ رات بھر سوتا رہا۔ اس نے گولی کھائی نہیں ہوگی۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ رازداری کے بھی آداب ہیں، حدود ہیں اور مصلحت کے تقاضے ہیں۔ توقعات کی بھی حد ہونی چاہیے۔

کچن میں بہت سے تھرماس رکھے تھے جن میں چائے بھری ہوئی تھی۔ میں نے انور سے حاصل کردہ اجازت نامہ استعمال کیا، تھوڑی سی تلاش سے کافی مل گئی۔ پانی گرم کرنے میں چند منٹ لگے۔ ایک چنگیر میں دوسری چنگیر سے ڈھکے ہوئے پراٹھے رکھے تھے۔ میں نے آدھا پراٹھا مکھن کے ساتھ کھایا۔ میں خود کو آنے والے وقت کے مقابل تنہا محسوس کرنے لگا تھا۔ اکبر کی موت ایک واقعہ تھی جس سے میری زندگی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ میں منافقت کے ساتھ سوگوار نظر آنے کی اداکاری میں ضرور مصروف تھا لیکن مجھ پر اس کا اثر نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کی ذات سے میرے لیے خیر کا کوئی خیال وابستہ نہ تھا۔ جو کچھ اس نے ریشم کے اور میرے ساتھ کیا تھا، وہ میں بھول نہیں سکتا تھا۔

آنے والا وقت میرے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ چودھریوں کے اس خاندان نے مجھے نظریۂ ضرورت کے تحت قبول کیا تھا اور میرے لیے ممکن نہ رہا تھا کہ ان کے کام نہ آؤں۔ یہ ضروری تھا کہ اب میں ان کے ساتھ اس رشتے پر جو اپنائیت کا نام رکھتا تھا، بہت خوشی اور فخر محسوس کروں اور یہ ظاہر کروں کہ اس عالی نسب خاندان کا ایک حصہ بن کے رہنا میرے لیے کتنے فخر اور کتنی خوشی کی بات ہے۔ میں اب انہیں چھوڑ کر جانے کا کیسے سوچ سکتا ہوں۔

کافی میں نے وہیں کھڑے کھڑے ختم کی اور پھر بڑے چودھری صاحب کی طبیعت کا حال پوچھنے چلا گیا۔ پیر صاحب رات بھر یہیں تھے ان کے لیے صوفہ ہٹا کے دوسرا بیڈ لگا دیا گیا تھا۔ میں اسپتالی بیڈ پر بیٹھ گیا چودھری صاحب کی حالت ایک رات میں قابلِ رحم ہو گئی تھی۔

”ملک... خدا کو ایک کی جان لینا تھی تو میری لیتا... یہ اس کے لیے مشکل تو نہیں تھا۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ تقدیر کے فیصلے بھی بدل سکتا ہے... بدل سکتا ہے نا؟“ وہ مایوسی، صدمے اور احساسِ جرم میں خدا سے بھی شکوہ کر رہے تھے اور انہیں اندازہ نہ تھا کہ وہ کیا بول رہے ہیں۔

حاصل مطالعہ

☆ بگ ایپل (BIG APPLE) نیویارک کو کہتے ہیں۔

☆ مصر کے فرعون توت کا اہرام 482 فٹ بلند اور 876 مربع فٹ پر مشتمل ہے۔

☆ ایئر فرانس کے کنکارڈ طیارے نے اگست 1995ء میں نیویارک سے پرواز کے بعد 31 گھنٹے 27 منٹ اور 49 سیکنڈ میں دنیا کا چکر لگا کر واپس نیویارک پہنچ کر عالمی ریکارڈ قائم کیا۔

☆ 1812ء کی جنگ کے دوران امریکی صدر کی رہائش گاہ کو زبردست نقصان پہنچا۔ عمارت کے بدنما داغوں کو چھپانے کے لیے اس پر سفید رنگ کر دیا گیا جس کی وجہ سے لوگوں میں وائٹ ہاؤس کہنے کا رجحان ہوا۔ تاہم اس بات کی تصدیق سرکاری طور پر 1902ء میں ہوئی۔

☆ مسجد عمرؓ بیت المقدس کے احاطے میں تحریک پاکستان کی نامور شخصیت مولانا محمد علی جوہر دفن ہیں۔

☆ سونے کے پانی سے قرآن مجید سب سے پہلے جناب قطبہ نے لکھا۔

(محمد شاہان سعید کی عرق ریزی)

مریض ڈاکٹر سے: ”ڈاکٹر صاحب میں بہت خوش رہتا ہوں۔ نیند سکون سے آتی ہے، زندگی میں امن ہی امن ہے۔ ہر کام میں دل بھی لگتا ہے، کوئی پریشانی نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے؟“

ڈاکٹر: ”میں آپ کی بیماری سمجھ گیا۔ آپ کی زندگی میں وٹامن شی (She) کی کمی ہے۔“

☆☆☆

ایک بوڑھے کسان نے اپنے بے گناہ بیٹے کو جیل میں خط لکھا۔

”پیارے بیٹے! میں اس سال آلو کی فصل نہیں بو سکتا۔ مجھ سے کھیت میں کھدائی نہیں ہو سکتی۔ کاش تم میری مدد کر سکتے۔“

بیٹے نے جواب دیا: ”بابا! کھیت مت کھودنا کیونکہ وہاں میں نے اسلحہ چھپایا ہوا ہے۔“

اگلے دن پولیس نے سارے کھیت کی کھدائی کر ڈالی لیکن انہیں کچھ نہ ملا۔ بیٹے نے پھر باپ کو خط لکھا۔

”بابا! اب آپ آلو کی فصل بو سکتے ہیں۔ میں یہاں سے آپ کے لیے اتنا ہی کر سکتا تھا۔“

(سحرش افضل، رتیڑہ)

میں نے رسماً کہا۔ ”چودھری صاحب! خود کو سنبھالیں۔ انور کو آپ کی بڑی ضرورت ہے۔“

وہ تلخی سے مسکرائے۔ ”اچھا؟ مگر کیا اسے بھی میری ضرورت ہے؟ تو نے پوچھا نہیں تو اب پوچھ کے دیکھ۔“

”میں جانتا ہوں۔ آپ کے سوا اب کون ہے اس کا؟“

”اب تو یہ سب ہیں... اس کی بیوی... اس کا سسر جو پیر بھی ہے۔ ان کے مقابلے میں ایک مجرم باپ کی کیا حیثیت ہے۔“

”خود کو مجرم سمجھنا چھوڑ دیں چودھری صاحب۔“

”کیوں؟ اور کون ہے مجرم؟ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں میرے سامنے... تو بھی جانتا ہے کہ فساد کا بیج بونے والا میں تھا۔ میں نے حق اور انصاف سے کام لیا ہوتا تو یہ نوبت کیوں آتی۔ میں منافق اور بزدل ہوں۔ بہت پہلے میں اڑ جاتا تو برابر کی تقسیم کر سکتا تھا۔ بھائی کو بھائی کا دشمن بنانے والا میں تھا۔ پہلے اکبر سے ڈر گیا، پھر انور سے... شیر بن گیا چوہا... میری دہشت سے کانپنے والے میرے سامنے دہاڑنے لگے اور میں ڈر گیا۔ کیوں ڈر گیا؟“ وہ چلاتے چلاتے رونے لگے۔

باتھ روم سے پیر صاحب برآمد ہوئے۔ ”کچھ کہا ہے تم نے اس سے؟“

”میں اتنا احمق نہیں ہوں۔ یہ خود ہی بولنے لگے۔“ میں نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ ”یہ احساسِ جرم کی پشیمانی کا شکار ہیں۔ شدید ڈپریشن میں مبتلا ہیں۔“

پیر صاحب نے مجھے ناگواری سے گھورا... ”ساری تشخیص کر لی تم نے۔“

”آپ خود سن لیں یہ کیا کہہ رہے ہیں... ہو سکتا ہے ان پر جن آیا ہو۔“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دینا ضروری سمجھا۔

اس نے خشم ناک لہجے میں کہا۔ ”جاؤ اور ڈاکٹر کو بلا کے لاؤ۔“

چودھری صاحب کی خود کلامی جاری تھی۔ یہ اس کے طویل مجرمانہ ماضی کا غبار تھا جو اس کے لاشعور میں گندگی کے ڈھیر کی طرح جمع ہوتا رہا تھا لیکن اس پر وہ اپنی حاکمیت اور خاندانی برتری کا پردہ ڈالتا رہا تھا۔

آج چودھری کے صبر و ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ وہ سینسر کا دروازہ ٹوٹ گیا تھا جو اس نے جھوٹ اور بنائے ہوئے سچ کو ایک جیسا قابلِ احترام ثابت کرنے کے لیے دنیا پر بند کر رکھا تھا۔ بیماری... آخری وقت کے قریب آنے کا خوف... اعصابی کمزوری اور اب احساسِ جرم... ان سب نے مل کر اس کے عزم اور حوصلے کو شکست دے دی تھی۔ تمام عمر وہ اپنی ناکامیوں، کوتاہیوں، غلطیوں، گناہوں اور مجرمانہ زیادتیوں سے اکیلا لڑتے لڑتے بالآخر اب اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ وہ سب جو پھوڑے کے اندر پیپ بن کے پکتا ہے... پھوٹ کے بہہ نکلا تھا۔

پیر صاحب کو بھائی کے پاس پیار سے تسلی دیتا سمجھاتا... حوصلہ دلاتا چھوڑ کے میں ڈاکٹر جلالی کو بلانے نکل گیا۔ وہ اپنے کمرے میں تھا اور اپنا اسباب پیک کر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”آپ جا رہے ہیں؟“

اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”ہاں۔“

”لیکن کیوں؟“

میرا سوال مکمل ہونے سے پہلے وہ برہمی سے پلٹا۔ ”اس لیے کہ میں اب نہ گیا تو اس پاگل خانے میں پاگلوں کے ساتھ رہنے سے میں خود پاگل ہو جاؤں گا۔“

”یہ آپ کے پیشہ ورانہ اخلاقی اصولوں کے خلاف ہوگا۔“

”مجھے حیرانی ہے کہ تم اخلاقیات کی بات کر سکتے ہو یہاں... میں نے خود پر جبر کر کے بڑی کوشش کی کہ میں صرف اپنی ذمے داری کو یاد رکھوں اور اپنے مریض کو بہتری کی طرف لے جاؤں... لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کام لہروں کا رخ موڑنے کی کوشش سے زیادہ مشکل ہے۔ کتے کی دم کو سیدھا کرنے کی مثال ایک مریض کے لیے نامناسب ہوگی۔“

”کیا آپ ہمت ہار گئے ہیں؟“

”میں مجرموں کا علاج کر سکتا ہوں... لیکن ہمدردی میں ان کے ساتھ خود مجرم نہیں بن سکتا۔ تم جانتے ہو یہاں دن رات کیا غیر انسانی تماشا ہوتا رہا ہے۔ تم اسے فرار کہہ لو۔“

”آپ کا مریض مر جائے گا۔“

”ہاں، ایک دن ہم سب مر جائیں گے۔ چودھری بہت جی لیا۔ میں بھی بہت جی لیا۔ اسے مزید زندہ رکھنے کی کوشش سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تم پڑھے لکھے آدمی ہو۔ ایک حقیقت پر غور کرو تو سمجھ سکتے ہو۔ عام بات یہ ہے کہ انسان کو اس کے گناہوں کی سزا بھی اسی دنیا میں مل جاتی ہے۔ جرم کی سزا قانون دیتا ہے لیکن ایک سزا انسان خود کو

دیتا ہے، غیر ارادی اور لاشعوری طور پر... اس کا احساسِ جرم اسے اندر سے کچوکے دیتا ہے... کوڑے مارتا ہے، کچھ لوگ خودکشی کر لیتے ہیں۔ تم نے ہارٹ کے مریضوں کو دیکھا ہوگا جو ڈاکٹر کی ساری ہدایات کے برعکس ہر کام کرتے ہیں۔ سگریٹ، شراب، غصہ، سیڑھیاں چڑھنا... یہ سب اس کے لیے مہلک ثابت ہو سکتی ہیں لیکن وہ کچھ نہیں چھوڑتا۔ یہ بے پروائی نہیں... وہ خود کو مارنا چاہتا ہے، خودکشی کرنا چاہتا ہے، خواہ زبان سے وہ کہتا رہے کہ حرام ہے۔“

”میں سمجھ گیا... اب پلیز آپ چودھری کو دیکھ لیں۔ میں آپ کو بلانے کے لیے آیا تھا۔“

”کیا اسے دورہ پڑا ہے؟“

”نفسیاتی دورہ... ہسٹریا... وہ پتا نہیں کیا بول رہا ہے۔“

”وہ وہی بول رہا ہوگا جو اس کے دماغ میں جمع تھا۔“ اس نے اپنا چھوٹا سا میڈیکل باکس مجھے پکڑایا اور میرے ساتھ چل پڑا۔ ”ایک بات ایمان داری سے بتاؤ... چودھری مر جائے... تمہیں کیا فرق پڑتا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے کہا۔

”پھر تم کیوں اپ سیٹ ہو؟ یہاں سب لوگ انتہائی خود غرض ہیں صرف اپنے لیے اور صرف خود زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خوشی کہاں مل سکتی ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم بھی نکل جاؤ اس نمک کی کان سے... ایک فارسی محاورے کے مطابق... جو نمک کی کان میں رہے گا نمک بن جائے گا۔“

”میں بھی سوچ چکا ہوں۔ مجھے تھوڑا سا وقت اور چاہیے۔“

اس نے چودھری کے کمرے میں پہنچتے ہی اپنا موڈ اور لہجہ بدل لیا۔ ایک اچھے ڈاکٹر کے لیے دوا، علاج کے ساتھ مریض کا اعتماد اور اس کی ہمدردی حاصل کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ”چودھری... چودھری... یہ کیا ہو رہا ہے... کیوں پریشان کر رہے ہو سب کو؟“ اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

چودھری نے کہا۔ ”مجھے میرے حال پر چھوڑ دے ڈاکٹر... تو جا... مجھے مرنے دے... میرے دکھوں کو لمبا مت کر۔“

ڈاکٹر نے مانیٹرز کو دیکھا مگر چہرے سے کوئی تشویش ظاہر نہیں ہونے دی۔ ”تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

”تو پاگل ہے... تو نے مجھے شادی کا مشورہ دیا تھا۔“

ڈاکٹر نے انجکشن بھرا۔ ”ہاں، ایک جوان خوب صورت لڑکی ہوتی تیرے پاس تو تجھے جوان کر دیتی۔“ اس نے چودھری کا ہاتھ پکڑ کے انجکشن گھونپ دیا۔

”تو نے کیوں نہیں کی تھی شادی؟“

”میرا کام اس کے بغیر زیادہ اچھا چل رہا تھا۔ مجھے خوشی اور مزہ مل رہا تھا چودھری... مزہ نہ ہو تو کھانا بیکار... جینا بیکار۔“

پیر صاحب نے بُرا مانتے ہوئے خفگی سے ڈاکٹر کو گھورا۔ ”یہ کس قسم کے فضول مشورے ہیں ایک ڈاکٹر کے منہ سے۔“

”کیا تم مجھ سے بڑے ڈاکٹر ہو...؟“ وہ بُرا مانے بغیر بولا۔ وہ بیگ بند کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”شاہینہ کا اور چودھرائن کا کیا حال ہے؟“

”بس... سنبھلنے کی کوشش کر رہی ہیں۔“

اس نے بیگ مجھے تھمایا اور میرے ساتھ میرے کمرے میں آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔“

میں نے بیڈ کے نیچے سے ریشم کی اسپتال والی فائل نکالی۔ ”اس پر بس ایک نظر ڈال کے مجھے بتائیں... کہ اس میں کیا لکھا ہے؟“

”اس میں لکھا ہے کہ مریض کو زہر دیا گیا تھا۔“

”بالکل ٹھیک... زہر کیا تھا؟“

اس نے غور سے آخری پیراگراف پڑھا۔ ”یہ ذرا ٹیکنیکل ہے میاں... میرا مطلب ہے دیہات میں خودکشی کے کیس ہوتے ہیں۔ عموماً عورتوں کے کچھ قتل بھی ثابت ہو جاتے ہیں۔ یہاں سب سے آسانی سے حاصل ہونے والا اور مؤثر ترین زہر ہے۔ وہ گولیاں جو گندم کے ذخیرے میں ڈالی جاتی ہیں۔ ان کے اثر سے گندم کو کیڑا نہیں لگتا۔ نمی، تازہ ہوا کی کمی یا روشنی نہ ملنے سے کچھ بیکٹیریا اور جراثیم وغیرہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ گولیاں ویسی ہی رہتی ہیں۔ گندم محفوظ رہتی ہے۔“

میں پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ ”رپورٹ میں کسی خواب آور دوا کا ذکر نہیں ہے؟“

اس نے فائل مجھے دے دی۔ ”بالکل نہیں۔“

”مانع حمل گولیاں... اور کوئی ابارشن میں استعمال ہونے والی دوا بھی نہیں تھی... جو پرانی ہو گئی ہو؟“

”رپورٹ میں جو لکھا ہے، وہ میں نے بتا دیا۔ اب تم

جس سے چاہو پڑھوالو اگر مجھے اَن پڑھ سمجھتے ہو۔‘‘ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

’’نہیں، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ آپ پلیز بیٹھیے۔ آپ نے میرے ذہن کی الجھن دور کر دی۔ ایک بات اور سمجھنا چاہتا ہوں میں۔ اگر کسی قبر سے لاش نہ ملے... یا وہاں کسی اور کی لاش ہو... تو کیا ایسا کوئی طریقہ ہے کہ اصل لاش کے بارے میں معلومات حاصل ہو جائیں؟‘‘

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ ’’طریقہ یہاں نہیں ہے۔ ڈی این اے کے ثبوت مل جائیں گے مٹی سے... مگر یہ صرف اسکاٹ لینڈ یارڈ والے کر سکتے ہیں۔ تمہیں اتنی دور کی کیسے سوجھی؟‘‘

میں نے ٹالنے کے لیے کہا۔ ’’ایک جاسوسی ناول میں تھا۔‘‘

وہ بیگ اٹھا کے بولا۔ ’’اوکے... مت بتاؤ... میرا کوئی انٹرسٹ بھی نہیں... پلیز بیٹھو... یہ بیگ اٹھا سکتا ہوں میں۔‘‘

ڈاکٹر کی ایک بات میرے دل کو لگی تھی۔ اس نے کہا تھا میں اس پاگل خانے سے نہ نکلا تو خود بھی پاگل ہو جاؤں گا اور تم بھی نکل جاؤ۔ میں اسے کیا بتاتا کہ میں حالات کا اسیر ہوں جس کے پیروں میں بیڑیاں نظر نہیں آتیں مگر موجود ہیں۔

اس روز میں نے پہلی بار شاہینہ کی چھوٹی بہن روزینہ کو دیکھا۔ صرف اپنا تجسس دور کرنے کے لیے میں شاہینہ کے کمرے میں گیا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ سہاگن سے بیوہ کے عہدے پر فائز ہو جانے کے بعد اس کے غم کا ردِعمل آج کیا ہے۔ گزشتہ روز صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے سب کے سامنے وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ کیا وہ بے ہوشی جینوئن تھی؟ یا مثالی ٹریجڈی کی اداکاری کا ایسا سین جس پر سال کی بہترین حزنیہ اداکاری کا ایوارڈ دے دیا جائے۔ یہ خیال میرے علاوہ کسی کے ذہن میں کیسے آ سکتا تھا چنانچہ تصدیق کا سوال ہی نہ تھا۔ بس اسے پُرسکون رہنے کا انجکشن لگا دیا گیا اور وہ سکون سے سو گئی تھی۔ یہی وہ چاہتی بھی ہو گی جو بے ہوشی کا ڈراما کیے بغیر ممکن نہ تھا۔

وہ سچ مچ غم زدہ اور دکھی تھی۔ وہ اجاڑ صورت اپنے بیڈ پر سیدھی بیٹھی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں رونے سے لال تھیں۔ اس وقت بھی نمی کسی آنکھ سے قطرۂ اشک بن کر ٹپک پڑتی تھی۔ اس نے ویران نظروں سے مجھے دیکھا لیکن کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ روزینہ اس کے سامنے پانی کا گلاس اور ہاتھ میں دو گولیاں لیے بیٹھی تھی جو ظاہر ہے سکون آور تھیں۔ شاہینہ نے گولیاں کھانے سے انکار کر دیا تھا۔

روزینہ بھی خوب صورت تھی لیکن بڑی بہن کے مقابلے میں ایک مختلف تاثر رکھتی تھی۔ روزینہ بھی غم زدہ تھی اور متفکر بھی۔ اس کی آنکھوں میں جو ذہانت کی چمک تھی وہ بھی شاہینہ کی آنکھوں کی پراسراریت سے مختلف تھی۔ اس کی نظروں نے مجھے تولا کہ بیک وقت باہر کا اور اندر کا آدمی ہونے سے میں کس حد تک قابلِ اعتماد ہوں اور کتنا جانتا ہوں جو دوسرے نہیں جانتے۔

میں نے اسے براہِ راست مخاطب کیا۔ ’’باجی کی طبیعت کیسی ہے اب؟‘‘

’’کیسی ہونی چاہیے آپ کے خیال میں؟‘‘ اس نے تلخی سے کہا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ’’شاید میں نے یہاں آ کے غلطی کی۔‘‘

’’باجی عدت میں ہیں اور کسی بھی نامحرم کے سامنے نہیں جائیں گی۔ ابا کو پتا چلا تو وہ ناراض ہوں گے۔‘‘ روزینہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

’’آئی ایم سوری... مجھے خیال رکھنا چاہیے تھا۔‘‘

’’سلیم! بیٹھو یہاں۔‘‘ میں نے شاہینہ کی آواز سنی۔ میرے دروازے کی طرف بڑھتے قدم رک گئے۔

’’روزینہ ٹھیک کہتی ہے۔‘‘

’’باجی! آپ جانتی ہیں، وہ کتنی سختی سے شرع کی پابندی کرتے ہیں... سلیم صاحب غیر ہیں۔‘‘

’’یہ نکاح میں تمہارا وکیل تھا۔ تم نے اس کے سامنے ایجاب و قبول کیا تھا۔ نکاح نامے پر دستخط کیے تھے...‘‘ شاہینہ آہستہ سے بولی۔

احساسِ ذلت سے روزینہ کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس نے گولیاں اور پانی کا گلاس ٹیبل پر رکھے۔ ’’ٹھیک ہے پھر میں جاتی ہوں۔ تم سے کم میں گواہ نہیں بن سکتی اس معاملے میں... یہ دوا کھا لینا۔‘‘

بیٹھنے کے بعد میں نے پھر اٹھنا چاہا۔ ’’یہ واقعی نامناسب ہے۔‘‘

’’ابا جی نے پوچھا تو جواب میں دوں گی۔‘‘

میں چونک گیا۔ ’’اچھا کہیے جلدی سے کیا کہنا ہے۔‘‘

’’کیا ڈاکٹر جلالی چلا جائے گا؟‘‘

’’یس... میں نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہا تھا۔‘‘ میں نے کہا۔

’’تم مجھے اکبر کی قبر پر لے جا سکتے ہو؟‘‘

میں گھبرا گیا۔ ’’تم کیا کہہ رہی ہو؟ عورتوں کا قبرستان میں جانا ممنوع ہے۔‘‘

’’معیوب ہے۔‘‘ اس نے میری تصحیح کی۔

’’میرے لیے یہ ناممکن ہے۔‘‘

’’آج رات کسی وقت... ابھی نہیں۔‘‘ وہ بولی۔

’’سوری شاہینہ... مجھے ہر طرف سے سازشوں میں شریک کیا جا رہا ہے۔ میں کس کس کا رازدار بنوں... اور کیوں... مجھے تو تم معاف ہی رکھو۔‘‘

’’میری بات تمہیں ماننا ہو گی... ورنہ۔‘‘

میں پھر رک گیا۔ ’’ورنہ... کیا تم کوئی دھمکی دے رہی ہو مجھے شاہینہ؟ کیا مطلب ہے آخر اس ورنہ کا؟‘‘

اس نے سر جھکا لیا۔ ’’ورنہ کچھ نہیں... کسی اور سے تو آس نہیں اور ہر ایک سے کہہ بھی نہیں سکتی میں۔‘‘

میں باہر نکل گیا لیکن شاہینہ کے جواب نے مجھے مطمئن نہیں کیا تھا۔ میرے لیے تشویش پیدا کر دی تھی۔ واضح طور پر اس کے الفاظ اور لہجے میں میرے لیے دھمکی تھی لیکن وہ بڑی عیاری سے پیک آؤٹ کر گئی تھی۔ کیا تھا یہ آخر... وہ سچ مچ تڑپ رہی تھی کہ اپنے محبوب شوہر اپنے مجازی خدا کے مرقد سے لپٹ کر روئے؟ یہ ظاہر کرے کہ اسے صبر نہیں آ رہا... ورنہ دنیا میں ہر روز شوہروں کو کھونے والی بیویاں غم کے بھاری پتھر کے نیچے سسکتی ہیں اور برداشت سے کام لیتی ہیں۔ مذہب، معاشرے اور خاندان کی روایات کو پامال نہیں کرتیں۔ وہ پھر مجھے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ میں کیا تھا اس کے لیے آخر؟ ہر درد کا درماں... ایک مٹی پر پڑو وجود... ہر مرض کی دوا... ہر ضرورت میں کام آنے والا بے ارادہ انسان... ایک روبوٹ... حکم کا غلام... میرا غصہ بڑھتا گیا۔

باہر آتے ہی مجھے انور نے بلا لیا۔ سوئم کے شرکاء آ گئے تھے اور مولانا صاحب نماز کی صف بندی کرا رہے تھے۔ جنازے کے مقابلے میں آج زیادہ لوگ تھے۔ ان میں اکثریت پیر اظہر علی شاہ کے عقیدت مندوں کی تھی جو گرد و پیش کے دیہات سے آئے تھے۔ وہ آ کے الیہ اداکاری کا ایک سا مظاہرہ کرتے تھے۔ ضرورت سے زیادہ سوگواری کے جذبات چہرے پر طاری کیے وہ جھک کر دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرتے تھے اور عقیدت سے بوسہ دے کر الفاظ کے تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ ایک ہی بات دہرا دیتے تھے۔

پیر صاحب منافقانہ دوغلی اور ظاہر و باطن میں الگ شخصیت رکھتے تھے اور اس فن کے ماہر تھے۔ ان کی تعلیمات ...... سب سے بڑا ڈھکوسلا تھیں۔

انور میرے سامنے ... خاندان کی عزت کی بات کرتا تھا۔ شرافت اور انسانیت کی بات کرتا تھا۔ ریشم سے وہ سچی محبت جتاتا تھا۔ گزشتہ رات میں نے ریشم کے ساتھ اس کو انتہائی سنگ دلی سے اکبر کو قبر کھود کے برآمد کرتا اور دوسری جگہ گاڑتے دیکھا تھا۔ لیکن وہ ذرا پریشان یا پشیمان نہ تھا اور اپنے بزرگوں کے شانہ بشانہ بڑے فخر اور غرور کے ساتھ کھڑا تھا۔ ان کا صحیح جانشین بنا ہوا۔ اپنے کردار پر ایک قابلِ نفرت پردہ ڈالے۔ یہ یقین کہ ہم کچھ نہیں جانتے اور میں پہلے کی طرح اس کا دوست ہوں اور ریشم پہلے کی طرح اس

چوٹ

لمبی مسافت نے اسے تھکا دیا۔ وہ ایک سستے سے موٹیل میں رک گیا اور کاؤنٹر پر ایک سنگل روم کی فرمائش کی۔ اسی لمحے اس کی نظر ایک خوب رو دوشیزہ پر پڑی جو اس کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔ وہ لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ اس کا گرم جوشی سے استقبال ہوا۔

چند منٹ بعد وہ دونوں کاؤنٹر پر تھے۔ اس نے ڈبل روم کی فرمائش کی تو کلرک نے حیرت سے کہا کہ آنے پر اس نے ایک بستر والا کمرا مانگا تھا۔ اس نے بے نیازی سے کہا۔ ’’یہ بیوی ہے میری... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھ سے پہلے یہاں پہنچی ہوئی ہے۔ تم اب ڈبل روم دے دو۔‘‘

ڈبل روم مل گیا۔ ساری تکان دور ہو گئی۔ دوشیزہ کو رخصت کر کے وہ کاؤنٹر پر گیا تو بل دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ ’’صرف ایک رات کے بائیس ہزار روپے... تمہارا دماغ تو درست ہے۔‘‘

’’سر! آپ بے شک ایک رات ٹھہرے ہیں لیکن آپ کی بیگم پچھلے دو ہفتوں سے یہاں مقیم تھیں... یہ آپ دونوں کا اکٹھا بل ہے۔‘‘ کلرک نے ادب اور رسانیت سے اسے آگاہ کیا۔

کوٹ غلام محمد سے وقار شیخ

کے عشق کی اسیر۔

کیا ان حالات میں اور اپنی آنکھوں سے ایک خونی انقلاب کو دیکھنے والی ریشم اب بھی اس کی محبت میں مجبور ہو گی؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب وہ پہلے روزینہ کا شوہر ہے پھر خاندان کا گدی نشین جیسا نام لیوا۔۔۔ اور آخر میں ریشم سے بھی محبت کرنے والا۔ سب سے محبت کرنے والا جو اس کو اچھی لگیں۔

ڈاکٹر جلالی نہ جانے کس وقت خاموشی سے نکل گیا۔ سوئم کی گہما گہمی میں کسی نے اسے جاتے نہیں دیکھا۔ یا شاید دیکھا تو روکا نہیں۔ چودھری کو اپنا ہوش نہ تھا۔ وہ بے بسی کے ساتھ مصنوعی بے حسی کی پناہ میں سویا پڑا تھا۔ وہ کسی موقع پر سامنے نہیں آیا تھا اور نہ اس کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن شام ہوئی تو اس نے بیٹے کی قبر پر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ گھر میں اب دو چار رہ گئے تھے جو گھر کے افراد شمار ہوتے تھے۔ ان میں تازہ ترین اضافہ روزینہ کا تھا۔ پیر صاحب اور بہت سے دوسرے رشتے دار عصر کے بعد یوں روانہ ہو گئے تھے جیسے اولمپک گیمز کی کلوزنگ کی تقریب کے بعد شرکاء روانگی پکڑتے ہیں۔ انور نے باپ کو سمجھا کے اپنے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش میں ناکامی کے بعد سر تسلیم خم کر دیا۔

میں بھی انور کے ساتھ گیا۔ بیماری سے زیادہ کمزوری اور صدمے سے چودھری کا یہ حال تھا کہ اس کے قدم لڑکھڑاتے تھے مگر انور یا میں اسے سہارا دینے کی کوشش کرتے تھے تو وہ بگڑ جاتا تھا کہ تم کیا سمجھتے ہو، میں اپنے پیروں پر چل بھی نہیں سکتا۔ ہم اتنے فاصلے پر اس کے ساتھ رہتے کہ وہ گرنے لگے تو اسے سنبھال لیں۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ پھر بھی اس کی سانس پھول گئی۔ دوپہر کے بعد سے اکبر کی قبر کو پختہ کرنے اور ٹائلوں سے مزین کرنے کا کام غیر ضروری عجلت میں جاری تھا۔ یہ کام سوئم کے بعد بھی کیا جا سکتا تھا۔ بار بار کام کرنے والے سب کچھ چھوڑ کے ایک طرف باادب کھڑے ہو جاتے تھے اور فاتحہ کے لیے آنے والے افراد یا وفود چلے جاتے تھے تو پھر مصروف ہو جاتے تھے۔ سرہانے کا کتبہ انہوں نے پہلے ہی نصب کر دیا تھا۔

چودھری اپنے عصا پر زور ڈالے چپ چاپ کھڑا کتبے کو دیکھتا رہا۔ اس وقت وہ مجھے صرف ایک مظلوم اور دکھی باپ لگا۔ ظلم اس پر یہ ہوا تھا کہ اسے صغراں کی قبر کو اکبر کی بتا کے فاتحہ کے لیے لا کھڑا کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ یہ دھوکا خود اس کے اپنے بیٹے نے کیا تھا جو باپ کی طرح ہی معصوم اور مظلوم بنا کھڑا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ دوسری طرف کھڑا ہوا شخص یعنی میں اس مجرمانہ کارروائی کا عینی گواہ ہوں۔ آنسو چودھری کی آنکھوں سے خودبخود بہہ رہے تھے۔

"او مینوں معاف کر دیمیں پتر۔" اس نے زیر لب کہا اور پلٹ گیا۔ انور نے اسے یاد دلایا کہ فاتحہ خوانی رہ گئی ہے مگر اس نے سنی کو ان سنی کر دیا۔ معلوم نہیں یہ احساس جرم کی سنگینی تھی۔

اچانک اس نے چلتے چلتے پوچھا۔ "وہ ڈاکٹر کہاں ہے؟ اسے کہو میرے ساتھ شطرنج کھیلے۔"

میں نے مؤدبانہ عرض کی۔ "وہ تو چلا گیا چودھری صاحب۔"

وہ گرجا۔ "چلا گیا... کس کی اجازت سے چلا گیا؟" آگے غصے میں بھری ناقابلِ اشاعت گالیاں تھیں۔ "کیوں چلا گیا... اور تجھے پتا تھا... تو مجھے کیوں نہیں بتایا تو نے؟"

"آپ سو رہے تھے۔"

"سو رہا تھا۔ مر تو نہیں گیا تھا... اب جا ابھی جا... اس کمینے کو گردن سے پکڑ کے لا... کہہ کہ چودھری کا حکم ہے۔"

میں نے کہا۔ "جی ابھی جاتا ہوں۔"

چند منٹ بعد ایک معجزے جیسا ناقابلِ یقین واقعہ رونما ہوا۔ میں نے ڈاکٹر جلالی کی لدی پھندی جرمن فاکس ویگن کو حویلی کے گیٹ میں داخل ہوتا دیکھا۔ پتا نہیں وہ کیوں لوٹ آیا تھا۔

"بکواس کر رہا تھا مجھ سے۔ ڈاکٹر تو ادھر ہی ہے۔ ابھی جا... جو میں نے کہا تھا اس کو بول۔"

میں چودھری کو انور کی تحویل میں چھوڑ کے ڈاکٹر جلالی کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اس نے اپنی فاکس ویگن روکی ہی تھی اور کمرے میں داخل ہو کے لائٹ جلائی تھی کہ میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "آپ واپس آ گئے سر؟"

"ہاں۔" اس نے مختصراً کہا۔ "میرا سامان اتار کے لاؤ۔"

"ابھی لاتا ہوں... لیکن میں پوچھ سکتا ہوں سر کہ کس بات نے آپ کو واپسی پر مجبور کیا؟"

"پوچھ کیا سکتے ہو تم پوچھ چکے ہو... اور میرا جواب ہے کہ مجھے ضمیر نے بہت ملامت کی۔ ڈاکٹر کا کام مریض کو مرتا چھوڑ کے بھاگنا نہیں... اسے آخری وقت تک اپنی

کوشش جاری رکھنی چاہیے۔"

"یو آر گریٹ سر... میں آپ کا کیا شکریہ ادا کروں... چودھری نے ابھی آپ کو یاد کیا۔ وہ آپ کے ساتھ شطرنج کی بازی لگانا چاہتا ہے۔"

وہ بیٹھا اور پھر کھڑا ہو گیا۔ "اچھا... میرے لیے وہیں کافی بھیج دینا اور اس کے بعد سامان ترتیب سے رکھ دینا... تم جانتے ہو کیسے..."

کچھ دیر بعد کافی میں خود لے کر گیا تو چند سیکنڈ تک اس منظر کو حیرانی سے دیکھتا رہا۔ وہ بساط پر درمیان میں مہرے بچھائے بازی شروع کر چکے تھے۔ وہ نہ لڑ رہے تھے، نہ شکوہ شکایت کر رہے تھے۔ ان کے لیے جیسے سب کچھ وہی اور ایسا ہی تھا۔ میں نے کافی رکھی تو کسی نے نظر اٹھا کے بھی مجھے نہیں دیکھا۔ میں خاموشی سے اپنے کمرے میں آ کے لیٹ گیا۔ حویلی میں خاموشی تھی لیکن اندر سے نہیں... جیسے زمین کی سرد سطح کی گہرائی میں پگھلی ہوئی آگ میں لاوا رہتا ہے مگر نہ دیکھا جا سکتا ہے اور نہ محسوس ہوتا ہے۔ میری موجودگی میں دونوں بہنوں کی اور میری ایک بظاہر پُرسکون جھڑپ ہو چکی تھی جس نے سب کی پوزیشن واضح کر دی تھی کہ کون کہاں کھڑا ہے۔ ابھی تک میرے شکوک کا پنڈولم اسی طرح دو سمتوں میں حرکت کر رہا تھا۔ انور یا شاہینہ...

اچانک کمرا روشن ہوا تو مجھے رات کی تاریکی کے محیط ہونے کا احساس ہوا۔ یہ ریشم تھی۔ اس نے ٹرے میرے سامنے رکھی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ٹرے میں وہ اپنے لیے چائے لائی تھی اور میرے لیے کافی۔

"کیسی ہو؟" میں نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

اس نے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ "ٹھیک ہوں۔"

"دیکھ رہی ہو یہاں حویلی میں جو کچھ ہو رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں، تم بھی دیکھ رہے ہو... کیا سوچا ہے تم نے؟"

"سوچنے کا اختیار نہیں ہے میرے پاس۔" میں نے کہا۔

"میں نے سوچ لیا ہے، میں یہاں نہیں رہوں گی۔" وہ بولی۔

میں نے کہا۔ "یعنی انور سے بھی بات ہو گئی تمہاری؟"

"مجھے انور سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ تنک کر بولی۔

"اس نے وعدہ کیا تھا نا کہ شادی کے بعد تمہیں الگ رکھے گا شہر میں... میرا خیال بھی یہی ہے کہ روزینہ اس مزاج کی لڑکی نہیں ہے کہ تمہیں حویلی میں برداشت کر سکے اور اب شاہینہ بھی یہاں ہو گی تو..."

"میں انور سے شادی نہیں کر رہی ہوں۔" اس نے تیز لہجے میں میری بات کاٹ دی۔ "میری سنے بغیر بولے چلے جا رہے ہو۔"

"آئی سی... یہ واقعی خبر ہے۔ کیا اس فیصلے سے انور کو بھی مطلع کر دیا ہے تم نے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اسے بھی بتا دوں گی۔"

"میں تو خیر پہلے ہی اس شادی کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن تمہارا خیال اچانک کیسے بدل گیا؟" میں نے کہا۔

"تم بھی دیکھ رہے ہو حویلی کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ سب کچھ بدل گیا ہے۔ انور بھی... اور کوئی امید نہیں کہ سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔ میں کہاں تک خاموش رہ سکتی ہوں، کب تک برداشت کر سکتی ہوں؟"

میں کچھ دیر خاموش رہا۔ موجودہ حالات میں ریشم کا جذباتی ردِعمل ایسا ہی ہو سکتا تھا۔ "تمہیں یقین ہے کہ اس فیصلے کو انور بھی آسانی سے قبول کر لے گا؟"

"جو پہلے مجھے ناممکن لگتا تھا، اب ممکن نظر آتا ہے۔ وہ حالات کچھ اور تھے جب میں نے ایک فیصلہ کیا تھا۔ بے شک وہ جذباتی فیصلہ تھا لیکن میری بے وقوفی نہیں تھی۔ مجھے اپنا مستقبل انور کے ساتھ محفوظ نظر آتا تھا۔ اب ایسا نہیں ہے تو میں بھی انور کی طرح اپنا فیصلہ بدلنے کے لیے آزاد ہوں۔"

"تم بالکل آزاد ہو لیکن آزادی کا اعلان کرنے کے بعد تمہارا مستقبل کیا ہو گا؟ تم کہاں جاؤ گی؟" میں نے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔" اس نے خالی مگ میز پر رکھ دیا۔

میں نے ہنس کے کہا۔ "یہ تم نے کیسے فرض کر لیا کہ میں جا رہا ہوں کہیں؟"

"فرض کرنے والی کیا بات ہے؟ پہلے بھی تم اپنی مرضی کے خلاف رک گئے تھے۔ انور نے روک لیا تھا تمہیں... ورنہ تو نورین کے لیے پاگل ہو... تم اس کی تلاش کے جنون میں مبتلا تھے اور اب بھی ہو۔"

"یہ بالکل ٹھیک ہے۔"

"ان حالات میں تم بھی کیسے رہ سکتے ہو یہاں... تم بھی مجبوراً سب برداشت کر رہے ہو۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”ڈیئر ریشم! حویلی میں جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے... یقیناً میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے، قابلِ نفرت ہے۔ اور مجھے اپنا خاموش رہنا بھی ایک مجرمانہ فعل لگتا ہے لیکن میرے بولنے سے کچھ بھی نہیں بدلے گا۔ الٹا میرے لیے خطرات بڑھ جائیں گے۔ اسے تم جو چاہو کہو... میری بزدلی یا بےوقوفی... میں نے انور کے نکاح نامے پر دلہن کا وکیل بن کے دستخط کر دیے۔ انور نے مجھے مجبور کیا اور دوستی کے واسطے دیے۔ حقائق کا مجھے علم نہ تھا۔ میں سمجھا کہ نکاح ہو چکا۔ تمہارے اور انور کے درمیان بھی ایک سمجھوتا ہو گیا تھا۔ تم نے میرے سامنے اعتراف کیا کہ تم انور کی مشکل آسان کرنے کے لیے اس کی مدد کر رہی ہو۔ وہ مجبور ہے اور بہت پریشان ہے۔ یہ تمہارا خلوص تھا اور محبت تھی اور فراخ دلی تھی ورنہ کون عورت محبت میں ایسی قربانی دیتی ہے؟ کون اپنی محبت کی خودمختاری میں دوسری عورت کو دخل اندازی کا حق دے سکتی ہے؟ تو سمجھو ایسے ہی جذبات میرے تھے کہ میں نے دستخط کر دیے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ نکاح تو ابھی ہوا ہی نہیں... اب ہو گا۔“

”نکاح نامے پر جو دستخط تھے... روزینہ کے تھے؟“

”اسی کے ہوں گے۔ وہاں روزینہ کے باپ اور خود انور کے یقین میں شک و شبہے کی کوئی بھی بات نہیں تھی۔ ایک دستخط اکبر کے بھی تھے... پھر میرا دھیان ادھر کیسے جاتا؟“

”دستخط روزینہ نے نہیں کیے تھے۔“ ریشم نے یقینِ کامل سے کہا۔

”تمہیں کس نے بتایا... شک ہے تمہیں یا...؟“

”یہ خود روزینہ نے کہا اور میں نے سنا... وہ بڑی بہن سے بات کر رہی تھی اور بہت غصے میں تھی۔ شاہینہ نے ہاتھ جوڑ کے اسے چپ کرایا کہ ابھی وقت نہیں ہے ایسی باتوں کا اور اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ روزینہ نے صاف کہا کہ وہ سب کچھ کر سکتی ہے، کوئی خوش فہمی میں نہ رہے۔“

”اور تم نے یہ ساری گفتگو کیسے سن لی؟ کیا تمہیں سنانے کے لیے روزینہ یہ کہہ رہی تھی؟“

”میں برآمدے میں شاہینہ کے کمرے کے دروازے پر تھی جب روزینہ کے اونچا بولنے کی آواز سنی۔ میں رک گئی۔ میں نے صرف اتنا ہی سنا اور لوٹ گئی۔ انہیں معلوم نہیں کہ میں نے بھی ان کی باتیں سنی ہیں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ کرنے والی ہوتی تو اب تک کر گزرتی۔“

”شاید ایسا موقع نہیں آیا۔“

”آئندہ بھی نہیں آئے گا۔ وہ مراد کے ساتھ نہیں جا سکی، اسے بچا نہیں سکی۔ اب انور کی بیوی بن کے حویلی میں آ گئی ہے تو یہ بھی روایت کے مطابق ہی ہو گا کہ ڈولی آئی ہے تو جنازہ ہی نکلے گا۔“

”یہی میں بھی کہہ رہی تھی۔ یہ زبردستی کی رخصتی تھی۔ نہ اس کی کسی نے سنی اور نہ اسے کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے کا موقع ملا۔ لیکن ابھی اس کے پاس مہلت ہے۔ ابھی اس کی سہاگ رات نہیں آئی اور اکبر کے چہلم تک نہیں آئے گی۔“

”اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے وہ کیا کرے گی آخر؟ انور کو انکار کر دے گی؟ بتا دے گی کہ اس نکاح پر وہ بالکل راضی نہیں تھی اور اس کے دستخط کسی اور نے کیے ہیں... کیا وہ انور کو دھمکی دے گی کہ اس جعلسازی کے خلاف قانون سے مدد لے گی؟ دماغ خراب ہے تمہارا ابھی اگر تم ایسا سمجھتی ہو۔“

”یہ سب روزینہ نہیں کر سکتی... مگر خودکشی کر سکتی ہے۔“

میں بھونچکا رہ گیا۔ ”خودکشی... ناممکن... یہاں لڑکیاں ہر غلط یا زبردستی کے فیصلے کو بھی اللہ کی مرضی اور نوشتۂ تقدیر سمجھ کے قبول کرتی آئی ہیں۔ ایسی ہوتی وہ تو اسی دن خودکشی کر لیتی جس دن مراد کا قتل اس کی نظروں کے سامنے کیا گیا تھا۔ یہاں بھی اسے کوئی مرنے نہیں دے گا۔“

”زندگی کے راستے بند ہیں لیکن موت کا راستہ کون بند کر سکتا ہے؟ اگر ایسی ہو گی وہ تو جب چاہے گی جہاں چاہے گی مرنا اس کے اختیار میں ہو گا۔ ایک سبزی کاٹنے والا چاقو کافی ہوتا ہے ورنہ زہر دستیاب ہے۔“

میں چونکا۔ ”کون سا زہر؟“

”چوہے مار گولیاں ہیں، اناج کے لیے تہ خانوں میں اور گندم کو محفوظ رکھنے والی گولیاں تو عام دستیاب ہیں۔ یہاں دو تین عورتوں نے وہی کھا کے جان دی تھی۔ اسی گاؤں میں۔“

میں خوف سے اس کی صورت دیکھتا رہا۔ اسے یہ بتانا تو ممکن نہیں تھا کہ شاہینہ نے اسے بھی یہی گولیاں دی تھیں۔ ایک چھوٹے سے گاؤں کی لڑکی کو جینے کے طریقے چاہے نہ آتے ہوں، مرنے کے ضرور آتے ہیں۔ اس بات کا رخ موڑنے کے لیے میں نے کہا۔ ”فرض کرو ایسا ہی ہوتا ہے پھر تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہاری پریشانی ختم... راستہ صاف... انور پھر صرف تمہارا۔“

”روزینہ رہے یا نہ رہے... مجھے انور اب کسی صورت قبول نہیں۔ سچ پوچھو تو مجھے نفرت ہو گئی ہے اس سے۔ میں تصور نہیں کر سکتی تھی کل رات کے منظر کا۔ مجھے پھر نیند آئی ہی نہیں۔ خوف سے کانپتی رہی۔ بار بار وہی منظر دکھائی دیتا تھا انور کتنی بےحسی کے ساتھ بھائی کی جگہ ایک خادمہ کو گاڑ رہا تھا اور خادمہ کی جگہ بھائی کو... اس شخص کے ساتھ رہ سکتی ہوں میں؟“

”روزینہ رہے گی... شرط لگا لو۔“

”رہے... اس کی بہن بھی اکبر کے ساتھ خوش تھی۔ وہ اس سے بھی بڑا شیطان اور گناہ گار تھا۔ توبہ توبہ... کیسے اپنے جرائم پر پردہ ڈالتے ہیں، سب لوگ مل کے... باپ، بیٹا... سسر، داماد... اتنی بڑی داڑھی کے ساتھ وہ پیر بنا پھرتا ہے۔“

”تم یہ سب فرض کر چکی ہو اور یہ بھی مان لیا ہے کہ جیسا تم سوچ رہی ہو ویسا ہی ہو گا۔ پاگل لڑکی... انور نے تمہیں نہ چھوڑا... پھر؟“

”میں بتا چکی ہوں تمہیں... انور کی محبت شرافت سب دھوکا تھی۔ میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ وہ بہت بدل گیا ہے۔ آگے جا کے اور بدلے گا۔ اکبر اور اپنے باپ جیسا بنے گا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔ وہ بن چکا ہے ویسا ہی۔“

”پھر؟ کیا تم بھی اس جیسے بن کر اس کا ساتھ دو گے؟ اس کے ہر جرم میں شریک بنو گے اور اس کی مدد کرو گے؟ تم بھی انور جیسے بن جاؤ گے؟ میرا خیال ہے یہ ناممکن ہے تمہارے لیے... پھر کیسے گزارہ کرو گے... تم بھی نکل جاؤ گے... پھر کیوں نہ ہم ایک ساتھ چلے جائیں... ہم سب...“

”ہم سب؟“

”ہاں سلونی بھی سخت پریشان ہے۔ ویسے تو یہاں میرا گھر ہے مگر ہم وہاں نہیں رہ سکتے۔ سلونی کہتی ہے شہر میں رنگیلا ہے۔ وہ اس سے شادی کر لے گی۔“

”یار خدا کے لیے چپ ہو جاؤ... کیا فضول منصوبے بنا رہی ہو اور مجھے شامل کر کے... بابا! تم جو چاہو کرو... جاؤ جہاں چاہو... میں نہیں جا سکتا۔“

”تم نہیں جانا چاہتے؟“ وہ مایوس نظر آنے لگی۔

”میں نے کہا ہے میں نہیں جا سکتا۔ جانا چاہوں تب بھی... کیونکہ میں ہوں ایک قیدی... حیران مت ہونا اگر مجھے اکبر کی جگہ قید کر دیا جائے۔“

اس کا چہرہ خوف اور حیرانی کی تصویر بن گیا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“

مجھے اپنی پوزیشن سمجھانے میں پندرہ منٹ لگے۔ میں نے اسے تفصیل سے بتا دیا کہ چشم دید گواہ کی حیثیت سے میری کتنی اہمیت اور ضرورت ہے۔ وہ خوف، پریشانی اور حیرت سے سنتی رہی مگر کچھ بولی نہیں۔ شاید اپنے طور پر اس نے میرے ساتھ اس اسیر کر لینے والے سازشی اور گناہ گار ماحول سے نکل جانے کا جو منصوبہ بنایا تھا، وہ میرے انکشاف کے زلزلے سے خاک میں مل گیا تھا۔ اس نے مجھ پر انحصار کیا تھا کیونکہ اسے مجھ پر اعتماد تھا۔ وہ سلونی کے ساتھ نکل جانے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی جو دنیا کے سرد گرم کا تجربہ رکھتی تھی لیکن ریشم اس جہاں گرد عورت سے یکسر مختلف تھی۔

باہر سے سلونی نے اسے پکارا تو وہ ٹرے اٹھا کے نکل گئی۔ ریشم کی مایوسی کا ردِعمل غلط نہ تھا۔ انور اس کے اعتماد پر پورا نہیں اترا تھا۔ اس نے ریشم کو محبت کے جو سنہرے خواب دکھائے تھے وہ بکھر گئے تھے۔ وہ ایک عام مرد ثابت ہو رہا تھا۔ روزینہ سے میری ایک ملاقات سے مجھے آنے والے دنوں کے ماحول کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ اس کے وجود میں جبر کے ردِعمل سے پیدا ہونے والی نفرت کا زہر بھرا ہوا تھا۔ پہلے صرف شاہینہ تھی جو اپنی مرضی کے خلاف اکبر سے باندھی گئی تھی اور اکبر نے اس کو خوشی کے ساتھ قبول نہیں کیا تھا۔ اس پر ٹھکرائی ہوئی عورت ہونے کا داغِ رسوائی ایک طعنہ بلکہ گالی بن گیا تھا جو وہ سنتی تھی اور برداشت کرتی تھی۔ پھر اس رشتے میں محبت کہاں سے آئی۔ اب یہی کھیل پھر کھیلا جانے والا تھا۔ روزینہ کو یقین تھا کہ انور بھی ایک مرد ہے۔ وہ تمام عمر اسے معاف نہیں کرے گا اور مراد سے اس کے یارانے... ناجائز تعلق... آشنائی و دل لگی کے طعنے وہ بھی تمام عمر سنے گی۔

دونوں بہنوں کی مختصر گفتگو سے میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ ان کے درمیان پیار محبت کا کوئی رشتہ نہیں۔ روزینہ بڑی بہن کو اس زبردستی کا ذمے دار سمجھتی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ بڑی بہن انور کو چاہتی تھی اور اب اسے نہ اکبر ملا نہ مراد... اسے انور تھما دیا گیا تھا۔ ابھی اس کا مزاج انتقامی ہو رہا تھا۔ نہ جانے آگے چل کے نفرتوں کے یہ رشتے کیا رنگ لائیں۔ ریشم کا فیصلہ بالکل درست تھا۔ انور قطعی ناقابلِ اعتبار تھا اور اسے کم سے کم اتنی سزا تو ملنی ہی چاہیے

تھی۔ اپنے طور پر میں بھی تہیہ کر چکا تھا کہ میں یہ دنیا چھوڑ دوں گا جہاں میری زندگی ہر طرف سے غیر محفوظ بنا دی گئی ہے۔ میں حفاظتی قید میں نہیں جیوں گا... لیکن قبل از وقت میں اپنے عزائم کی کسی کے کان میں بھنک بھی پڑنے دینا نہیں چاہتا تھا۔ ریشم میرے ساتھ تھی لیکن وہ ایک عورت تھی جس میں راز کو راز رکھنے کی صلاحیت ہمیشہ سے مشکوک سمجھی گئی ہے اور میں افشائے راز کا کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔

حویلی کے ماحول پر بدستور سوگواری کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ رات کے کھانے کے لیے ٹھنڈے پڑے ہوئے چولہے پھر جلائے گئے کہ زندگی یونہی رواں دواں رہتی ہے۔ جو نہ ہوں، ان کی جگہ خالی رہ جانے سے فرق نہیں پڑسکتا۔ دی شو مسٹ گو آن... مجھے اندازہ تھا کہ اس گھر میں سب سے زیادہ دکھی وہ ماں تھی جس کے دو بیٹوں میں سے ایک نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے باہر ہی نہیں آئی تھی۔ چودھری جب دواؤں کے سکون آور اثرات سے باہر آتا تھا تو تمام عمر کے احساسِ جرم کا بار اسے حواس باختہ کر دیتا تھا۔ ریشم اور سلونی نے کھانا اپنے کمرے میں منگوا لیا تھا۔ صرف میں نے اور انور نے ایک جگہ بیٹھ کے خاموشی سے کھانا کھا لیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اب ہمارے درمیان بات کرنے کے لیے کچھ نہیں رہا اور جو ہے اس پر بات نہیں کی جا سکتی۔

کھانے کے بعد میں اپنے کمرے کی طرف آ رہا تھا تو شاہینہ کے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر رک گیا۔ وہ کمرے کے وسط میں بت بنی کھڑی تھی اور خلا میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ اس نے لباس بدل لیا تھا اور بال بھی سنوار لیے تھے لیکن میک اپ کی جگہ اس کے چہرے پر حزن و ملال تھا۔

وہ چونک کے میری طرف پلٹی۔ ”سلیم! کہاں جا رہے ہو؟“

”اس وقت کہاں جاؤں گا... ظاہر ہے سونے کے لیے۔“ میں نے کہا۔

”نیند آ جاتی ہے تمہیں؟ ایک منٹ رکو... مجھے تم سے بات کرنی تھی۔“ اس نے التجا کے انداز میں کہا۔

اس میں شک نہیں کہ اس عورت کی سازشی فطرت سے پوری طرح واقف ہونے اور خود اس کا شکار بننے کے باوجود نہ جانے اس میں ایسی کون سی بے بس کر دینے والی قوت تھی کہ میری ساری نفرت اور مزاحمت دم توڑ دیتی تھی۔

اسے بے عزت کر کے دل کی بھڑاس نکالنے اور یہ بتانے کی خواہش کہ میں اس کی حیا سوز حیوانی فطرت کو سمجھ گیا ہوں، میں اس سے کچھ بھی نہیں کہہ پاتا تھا اور میرے اندر اٹھنے والے غصے کی لہر جھاگ بن کے دم توڑ دیتی تھی۔

میں ایک بار پھر اندر چلا گیا۔ ”ایسی کون سی ضروری بات ہے جو صرف مجھ سے کی جا سکتی ہے اور صبح نہیں ہو سکتی؟“

وہ میرے سامنے آ کے بیٹھ گئی۔ ”حویلی کے لوگ بڑے ظالم اور بدلحاظ ہیں۔ کسی کو میرے دکھ کا احساس نہیں۔ میں سب کے درمیان رہ کے بھی تنہا ہوں۔“

”یہ تھی وہ ضروری بات؟“

”آج میری ساس نے مجھے بلا کے کہا کہ میں اب رنگین کپڑے نہ پہنوں... کسی قسم کا میک اپ نہ کروں... اور یہ چوڑیاں توڑ دوں۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کے اپنی گداز کلائی کے گرد لپٹی ہوئی رنگین کھنکتی چوڑیوں کو دکھایا۔

”اگر یہ حویلی کی روایت ہے تو تمہیں اس کی پاسداری کرنی چاہیے۔“

”روایت... حویلی کی روایات دیکھ لی ہیں تم نے... سب عورت کو پاؤں کی جوتی کا درجہ دینے کے ڈھکوسلے... میں نے انکار کر دیا۔ میں نے کہا کہ میرا دکھ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ساری عمر اکیلے پن کا عذاب صرف میرے لیے ہے... مجھے اور اذیت مت دو... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

”دیکھو، یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔“

وہ بولتی گئی۔ ”چار ماہ دس دن کے لیے اس کمرے میں قیدِ تنہائی تو مجھے ہی کاٹنی ہے نا۔“

اچانک انور دروازے میں نمودار ہوا۔ اس نے خاموشی سے مجھے اور شاہینہ کو دیکھا۔ ”تم کیا کر رہے ہو یہاں؟“

”میں اپنی مرضی سے نہیں آیا... شاہینہ نے روک لیا ہے۔“

”بھابی! آج دوسرا دن ہے۔ ماں نے سمجھا دیا تھا آپ کو... عدت کے زمانے میں آپ کو کسی نامحرم کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔“

”کون نامحرم ہے یہاں...؟“ وہ بولی۔

”ملک سلیم اختر کیا ہے؟“

”یہ نامحرم تمہارے نکاح میں تمہاری بیوی کا وکیل بنا تھا۔ تب یہ نامحرم نہیں تھا؟“ وہ سفاک سرد لہجے میں بولی۔

میں نے کہا۔ ”انور بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے، میں جاتا ہوں۔“

”شاہینہ!“ انور غرایا۔ ”زبان کو لگام دو۔“

”نامحرم تو تم بھی ہو۔ مجھ سے نہیں کسی مولوی سے فتویٰ لے لو کہ دیور اور جیٹھ نامحرم ہوتے ہیں یا نہیں۔“ وہ ترخ کے بولی۔

”انور... آئی ایم سوری... میری بھی غلطی تھی۔ مجھے نہیں آنا چاہیے تھا یہاں... بھابی خیال رکھیں گی آئندہ... تو چل میرے ساتھ۔“ میں نے اسے زبردستی گھسیٹ لیا۔

انور نے مزاحمت نہیں کی۔ شاہینہ کی دلیل نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔ میرے سامنے اس حویلی کے مالک اور خاندان کے اکلوتے وارث کو ایک عورت نے بے توقیر کر دیا تھا۔ عورت کے لیے بغاوت کا اس حویلی میں کوئی تصور نہ تھا لیکن اس وقت وہ کچھ بھی کرتا زیادہ خرابی ہوتی۔ شاہینہ سے اس کا رشتہ ہی ایسا تھا۔ چودھری صاحب کے سامنے وہ زبان نہیں کھول سکتی تھی مگر انور کے لیے وہ بڑی بھابی تھی اور وہ لاوارث نہیں تھی۔ روزینہ کی تائید و حمایت سے بڑھ کر اپنے پیر باپ کی حیثیت اس کی اصل طاقت تھی۔ وہ شاہینہ کی سازشی فطرت کو مجھ سے زیادہ سمجھتا تھا۔ وہ کسی بھی جگہ انور پر بدنیتی کا الزام لگا دیتی تو ہزار قسموں کے باوجود اس کی بے گناہی پر کوئی اعتبار نہ کرتا... حویلی کے مرد سمجھتے تھے کہ ایسا تو ہوتا ہے۔

برآمدے میں آ کے انور نے اپنا بازو چھڑایا اور دوسری طرف چلا گیا۔ وہ مجھ سے بھی بدظن تھا۔ اس کا دماغ خراب ہو رہا تھا۔ آنے والے دنوں میں مجھے ایک جارحانہ طرزِ عمل اپنانے کی ضرورت تھی۔ میں کمزور فریق بن کے اپنا دفاع نہیں کر سکتا تھا۔ بھابی کے معاملے میں اس کا موقف اس لیے درست تھا کہ کوئی بھی بھابی کی منطق سے اتفاق نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اکیلی سب سے نہیں لڑ سکتی تھی۔ وہ عدت کو قیدِ بامشقت سمجھے یا فرض... اسے یہ وقت اکیلے ہی گزارنا تھا۔

زندگی کو معمول پر آنا ہی تھا۔ یہ کوئی سرکاری سوگ کا رسمی طریقہ نہیں تھا کہ چالیس دن قومی پرچم سرنگوں رہتا۔ بے شک دسواں چالیسواں سب ہوگا اور برسی بھی سال کے سال ہوگی۔ لیکن اس سے زندگی کے معمولات متاثر نہیں ہوں گے۔ اگلے دن خلافِ توقع آزمائش کا وہ لمحہ آ گیا جو ناگزیر تھا۔ خیال یہ تھا کہ شاید سوگ تک قانون حرکت میں نہ آئے مگر دشمن تو دشمن ہی ہوتا ہے۔ جس کا بیٹا اتنی بے رحمی

سے قتل کر دیا گیا تھا۔ اس باپ سے رحم دلی کی یا رعایت کی توقع کیسے کی جاسکتی تھی۔ سفاکی بھی اس کے انتقام کا حصہ تھی۔

یہ مراد کے باپ کا دباؤ یا پیسا ہی ہوگا کہ پولیس نے شرافت، انسانیت، رسم دنیا اور اخلاق کو نظر انداز کرتے ہوئے قانونی مجبوری کی آڑلی اور اکبر کی موت کے تیسرے دن صبح ایک ڈی ایس پی اپنے تین فرض شناس ماتحتوں کے ساتھ وارد ہو گیا۔

مہمان خانہ اب بھی تعزیت کے لیے آنے والوں سے آباد تھا گو ان کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی۔ ڈی ایس پی کو بھی وہیں بٹھا دیا گیا اور اس کی اطلاع انور کو دی گئی۔ اس نے چودھری سے کوئی مشورہ نہیں کیا کیونکہ اوّل تو مقدمے سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ دوسرے تمام امور میں اب فیصلہ کن کردار انور ہی کو ادا کرنا تھا۔ جب وہ میرے پاس آیا تو گزشتہ رات بھابی کے سامنے روتے میں پیدا ہو جانے والی تلخی آج کے روتے میں نظر نہ آتی تھی۔ وہ میرے ساتھ پہلے جیسا انور ہی تھا۔

میں نے کہا۔ ''پریشان ہونے کی کون سی بات ہے اس میں؟''

''وہ روزینہ کا بیان لے گا۔''

میں نے کہا۔ ''دیکھ، ٹھنڈے دماغ سے کام لے۔ تیرے پاس بیان ریکارڈ نہ کرانے کے بہت سے بہانے ہیں... بیان کون لے گا۔ وہ سامنے تو آئے گی نہیں۔ پردے کے پیچھے وہی ہے یا کوئی اور یہ تصدیق کرنے کے لیے کسی لیڈی پولیس کا ہونا ضروری ہے۔''

''میری وکیل سے بات تو ہو گئی تھی لیکن یہ آج ہی آدھمکے۔ وکیل سے مشورے کے بغیر میں کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا۔''

''پھر کہہ دے کہ میری وائف بیمار ہیں اور آئندہ آپ آئیں تو وقت اور تاریخ پہلے بتا دیں ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو حاصل کچھ نہ ہو... وہ کہیں گئی ہوئی ہو۔''

''تو بھی آ میرے ساتھ۔''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''بلاوجہ خود کو پولیس کے سامنے لانا کوئی عقل مندی نہیں ہوگی۔''

''اسے کیا معلوم کہ تو کون ہے۔ ملک سلیم اختر بھی اس حویلی میں اور بہت سے لوگوں کی طرح ہے۔''

اس کے اصرار پر میں ساتھ جانے پر تیار ہو گیا۔ مجھے کچھ اطمینان یہ بھی تھا کہ اس وقت ڈی ایس پی کا ذہن صرف ایک کیس میں الجھا ہوگا اور اس کا دھیان کسی اور طرف نہیں جائے گا۔ فریدالدین کا کیس پولیس کے ریکارڈ سے چاہے نہ نکلا ہو، عام لوگ فراموش کر چکے تھے اور خود پولیس کے لوگوں کو ماضی کی ایک واردات کے طور پر ہی یاد ہوگا۔ وہ تفتیش پس منظر میں چلی گئی تھی اور کچھ عرصہ مزید گزرا تو سرد خانے کی نذر ہو جائے گی۔

ڈی ایس پی نوجوان اور خوش اخلاق تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ ڈائریکٹ پولیس سروس میں اے ایس پی بنا تھا اور دو چار سال میں ترقی پا کے ڈی ایس پی ہو گیا تھا۔ ایسے نوجوان افسر جوشیلے اور فرض شناس ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، ان پر پولیس کی روایتی کام چوری... بدعنوانی اور بے رحمی غالب آتی جاتی ہے۔

تعارف کے بعد اس نے رسمی طور پر اظہارِ تعزیت کیا۔ ''آپ کے بڑے بھائی کے انتقال کا سن کے افسوس ہوا۔''

''وہ چھوٹا بھائی تھا۔'' انور نے رواں انگریزی میں بات کی۔ ''ان دنوں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر گیا ہوا تھا۔ میں نے آرکیٹیکٹ میں ڈگری لی۔ اس دوران وہی تمام معاملات سنبھالتا تھا۔''

ڈی ایس پی متاثر نظر آنے لگا۔ ''یہ ایک خوش گوار حیرت کی بات ہے۔ آرکیٹیکٹ تو شہر میں بھی نایاب ہیں۔ سب باہر چلے جاتے ہیں اور آپ یہاں گمنامی میں بیٹھے ہیں۔'' اس نے شستہ انگریزی میں کہا۔ ''آپ کے چھوٹے بھائی بیمار تھے؟''

''جی... کافی عرصہ بیمار رہے... آپ نے کیسے زحمت کی؟'' اس سے پہلے کہ ڈی ایس پی بیماری کی نوعیت اور علاج کی تفصیلات میں جاتا، انور نے اسے یاد دلا دیا کہ یہاں وہ کام سے آیا ہے۔

''جی... مجھے ایک کیس میں ابتدائی تفتیش کے لیے مامور کیا گیا ہے اگرچہ موقع مناسب نہیں ہے لیکن اوپر والے کہتے ہیں ڈیوٹی از ڈیوٹی۔''

''کس کیس کی بات کر رہے ہیں آپ؟'' انور انجان بن گیا۔

''ایک مرڈر کیس ہے جو آپ کے تایا کے خلاف درج کرایا گیا ہے۔ پیر اظہر علی شاہ کے خلاف۔''

''میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟'' انور بولا۔

''آپ وہاں جا کے تفتیش کریں... ان کا بیان لیں۔''

''میں ان سے ملنے گیا تھا لیکن مل نہیں سکا۔ ان کے مرید خاص نے کہا کہ وہ چلہ کاٹ رہے ہیں اور ان کی

عبادت میں دخل اندازی نہیں کی جاسکتی۔ قانونی طور پر یہ عذر قابل قبول نہ ہوتا لیکن پبلک انٹرسٹ میں تھا کہ میں کوئی کارروائی نہ کروں ورنہ بے اطمینانی اور ڈس آرڈر کا مسئلہ پیدا ہو سکتا تھا۔ مجھے پتا چلا ہے کہ ان کی بیٹی یہاں ہے۔''

''ہاں... وہ میری بیوی ہے۔''

''اور مقدمہ درج کرانے والوں نے اسے ہی وجہ قتل بتایا ہے۔ اگر کیس آپ جاننا چاہتے ہیں تو میں آپ کو ایف آئی آر کی نقل فراہم کر دیتا ہوں اور مدعی کے بیان کی بھی۔''

''میرا خیال ہے اس کی نقل مجھے ملنی چاہیے۔''

ڈی ایس پی تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے فائل کھول کے چند فوٹو کاپی صفحات نکالے جو اسٹیپل کر دیے گئے تھے۔ ''یہ لیجیے... میرے حاضر ہونے کا مقصد آپ کی وائف کا بیان لینا تھا۔''

''پہلی بات تو یہ کہ وہ علیل ہیں۔ ڈاکٹر جلالی جو ہمارے فیملی کے معالج ہیں اور بہت نامور اسپیشلسٹ... وہ حویلی میں ہی رہتے ہیں کیونکہ میرے فادر ہارٹ پیشنٹ ہیں، وہی میری وائف کا ٹریٹمنٹ بھی کر رہے ہیں چنانچہ میڈیکل سرٹیفکیٹ اگر قانونی ضرورت ہے تو نو پرابلم۔''

''نہیں... مجھے اعتبار ہے آپ کا... میں یہی لکھ دوں گا۔''

''دوسری بات یہ کہ آئندہ آپ آئیں تو پلیز مجھے پہلے بتا دیں تاکہ وہ موجود ہو اور تیار رہے... میں پولیس سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ اپائنٹمنٹ لیں... میرا مقصد ہے آپ کا چکر نہ لگے... اور تیسری بات یہ کہ اپنے ساتھ لیڈی پولیس کو لائیں۔''

''وہ کس لیے... خدانخواستہ سرچ کا مسئلہ تو نہیں ہے۔''

''اگر میں پردے کے پیچھے اپنی خادمہ کو ایک بیان رٹا کے بٹھا دوں اور وہی اس پر دستخط بھی کر دے... آپ کے سوالات کا جواب بھی دے دے تو کیا آپ مطمئن ہو جائیں گے؟ دراصل میں خود قانون کی مدد کرنا چاہتا ہوں ورنہ میری ہاؤس کیپر اتنی پڑھی لکھی اور ذہین ہے کہ ابھی آپ کے سامنے آ کے خود کو روزینہ کے نام سے متعارف کراتی اور پورا بیان لکھوا دیتی۔''

''تھینک یو سر...'' ڈی ایس پی کھڑا ہو گیا۔

''ایسے نہیں جا سکتے آپ۔ تفتیش سے پہلے آپ ڈیوٹی پر تھے، اب مہمان ہیں۔ کم سے کم چائے پی کے جائیں گے۔''

ایک فلمی یا ڈرامائی سین کی طرح انور کے یہ کہتے ہی ایک ملازم چائے کی ٹرالی اندر لے آیا۔ ڈی ایس پی کو انکار پر قائم رہنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اس کے ماتحتوں نے بڑھ چڑھ کر لوازمات پر ہاتھ صاف کیے۔ ڈی ایس پی صرف ایک چائے کی پیالی پی کے رخصت ہو گیا۔

''تو نے دیکھا، پیر صاحب کی دفاعی حکمتِ عملی۔ چلّہ پورا ہونے تک ٹال دیا سب کو۔'' انور بولا۔

''ہاں، مگر وہ خود بھی تو پبلک میں نظر نہ آنے کے پابند ہو گئے۔ کیا وہ یہاں بھی نہیں آئیں گے؟''

''یار! اس بندے کا دماغ بہت تیز ہے۔ مشکل پیدا ہونے سے پہلے وہ اس کا حل تلاش کر لیتا ہے۔ سالا ٹھیکے دار بھی صدمے اور غصے سے پاگل ہو رہا ہے۔ مقدمہ شروع ہوگا تو اسے دن میں تارے نظر آ جائیں گے۔ اتنے چکر دے گی پولیس اور ذرا ذرا سی بات کو اتنا پکائے گی کہ وہ خود ہی بھاگ جائے گا۔ اس کا غم اپنی جگہ مگر اس نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ پیر صاحب اپنی روحانی قوت سے کام لیں گے تو اس پر بھی جن آنے لگیں گے اور اس کی گھر والی پر بھی۔ یہ مرید جن ہی تو ہیں سارے... اس کا جینا مشکل کر دیں گے۔ وہ جو کالونی بنا رہا ہے، بھوت کالونی مشہور ہو جائے گی۔''

میں حیرانی سے انور کو دیکھتا رہا۔ قانونی طور پر بیوی کا دفاع اس کا حق اور اس کی ذمے داری تھی لیکن وہ ایک جارحانہ طرزِ عمل سے انصاف مانگنے والے کو ذلت کے ساتھ پسپا کر دینے کی حمایت کر رہا تھا۔ اس کے سسر نے انتہائی سفاکی کے ساتھ جوان بیٹے کو مار کے اس کی لاش باپ کے دروازے پر پھنکوا دی اور اب اسے داد فریاد کا حق بھی دینے کو تیار نہیں۔ ایک باضمیر پڑھے لکھے آدمی کی حیثیت سے وہ پیر صاحب کے فعل کو غلط قرار دے کر اس کی مذمت کرتا۔ یہ کہتا کہ جرم کیا ہے تو اسے سزا ملنی چاہیے۔

میں نے کہا۔ ''پہلا کام یہ کر کہ وکیل کو بلا لے۔ کون ہوگا تیرا وکیل اس کیس میں؟''

''وہ ہے ایک بہت سینئر وکیل... ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتا ہے۔ اسے بلا لیں گے۔ ویسے ایک بیان ریکارڈ کرانے سے زیادہ روزینہ کی کوئی ذمے داری نہیں۔ اس کا نام لیا گیا ہے اس لیے وہ کہے گی کہ میں وہاں تھی ہی نہیں تو مجھے کیا معلوم... مراد میرے ماموں کا بیٹا ضرور تھا مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں... کزن تو ہوتے ہیں، خوامخواہ کسی سے تعلق جوڑنا بدنیتی ہے۔ اور وجہ یہ کہ میرے والد نے اس

کے ٹھیکوں کے کاروبار کو فنانس کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ دشمن ہو گیا۔ اس کا لڑکا بگڑا ہوا اور بدکردار تھا۔ اس کا یہ انجام کوئی غیر متوقع بات نہیں۔''

''انور! کیا روزینہ نے کہا ہے کہ اس کا یہ بیان ہوگا؟''

''اس کا یہی بیان ہوگا۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

واپس آکے میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور سوچتا رہا کہ ابھی تک انور کو روزینہ کے جارحانہ موڈ کا اندازہ نہیں۔ شاید وہ اس شخص کے خلاف بدکرداری کا الزام عائد کرنے پر راضی نہ ہو جس سے وہ محبت کرتی تھی اور اس حد تک کہ جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کے ساتھ جانے پر تیار تھی۔ اس جانباز عاشقِ صادق کی راہِ محبت میں شہادت پر وہ ایسا رسوا کن الزام کیسے عائد کر سکتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ اس سے کہلوایا جا سکتا تھا کہ مجھے نہیں معلوم، میرے یہاں آجانے کے بعد وہاں کیا ہوا۔ لیکن انور ایک شوہر کی حیثیت سے اپنے ارادے میں ابھی سے مضبوط نظر آتا تھا کہ مراد پر کیچڑ اچھالنا ہی دفاعی حکمتِ عملی کو مضبوط کرے گا اور ایک فرمانبردار بیوی کو شوہر کی مرضی کا بیان دینا پڑے گا۔

انور نے اپنی ازدواجی زندگی کے مستقبل کا جو نقشہ اپنے ذہن میں تیار کیا تھا، وہ روایتی تھا۔ یہ عجیب ستم ظریفی تھی کہ اس کی نظر وہ سب نہیں دیکھ سکتی تھی جو آج میری نظر میں تھا۔ وہ اس خاندان کا نام لیوا اور تمام روایات کا امین تھا۔ میری یہاں کوئی حیثیت نہ تھی مگر میں نے پہلے شاہینہ بھابی کے ردِعمل کا مشاہدہ کیا تھا اور اب روزینہ کا موڈ دیکھ سکتا تھا۔ اس سے آنے والے وقت کی ایک مختلف تصویر بنتی تھی جو بہت اچھی نہیں تھی۔ طوفان کی آمد سے پہلے کے آثار مجھے نظر آرہے تھے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ جو سب کو ناممکن اور بعید از قیاس لگتا ہے وہی ہو جائے... جیسے اکبر کا قتل تھا۔

ابھی روزینہ کا نکاح نہیں ہوا تھا۔ وہ نکاح سے صاف انکار کر سکتی تھی۔ یہ بیان دے کر دھماکا کر سکتی تھی کہ اس نے کسی نکاح نامے پر دستخط نہیں کیے تھے اور اگر ہیں تو وہ جعلی ہیں۔ وہ منحرف گواہ ... بن سکتی تھی۔ کہہ سکتی تھی کہ مراد کے قتل کا الزام غلط نہیں۔ یہ اس کے سامنے ہوا۔ وہ چشم دید گواہ ہے۔ قتل اس کے باپ کے حکم اور ایما پر ہوا۔ گولی فلاں فلاں مریدوں نے چلائی۔ وہ مراد سے محبت کرتی تھی اور اس کے ساتھ جا کے اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ یہ اس کا شرعی اور قانونی حق ہے وغیرہ وغیرہ۔

ایسا بیان دے کر وہ چودھری فیملی اور اپنے پیر باپ کی عزت اور زندگی تو داؤ پر ضرور لگاتی۔ خود اپنے لیے بھی مرگِ ناگہانی کو یقینی بنا لیتی۔ عدالتی گواہ کی حیثیت سے اس کی حفاظت کون کرتا؟ بے شک اسے قتل نہ کیا جاتا، وہ طبعی موت مر جاتی۔ جیسے اکبر مرا۔ پہلے بھی بیویاں، داشتائیں اور کنیزیں ماری گئی ہوں گی۔ روزینہ باغیانہ جذبات میں ڈیسپریٹ تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ مراد کے سامنے اس سے پہلے مارا جانا قبول کرتی۔ آج بھی جان دینا اس کے نزدیک وفا کا تقاضا ہوا تو وہ موت کے خوف سے مراد کی قربانی کو حرام موت کیوں بنائے گی۔ وہ اپنی جان دے کر محبت کی آبرو رکھے گی۔

تاہم یہ میرے خیالوں کی جذباتی پرواز تھی۔ زندگی میں سب کچھ فلمی اور آئیڈیل نہیں ہوتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان بدل جاتے ہیں۔ ایک بات پھر بھی یقینی تھی اور وہ تھا انور کا طرزِ عمل۔ جیسے اکبر نے اپنی بیوی کو ایک مفروضے پر ٹارچر کیا، تمام عمر طعنے دیتا رہا کہ تو ایک ٹھکرائی ہوئی عورت تھی جسے قبول کر کے میں نے احسان کیا... انور اسے ٹارچر کرے گا اور اس کے پاس گراؤنڈ بھی ہوں گے۔ تب بھی روزینہ کے پاس کیا چارہ ہوگا اس کے سوا کہ خود مر جائے یا انور کو مار دے۔

اچانک مجھے اس نکاح نامے کا خیال آیا جو اس کیس کی سب سے اہم دستاویز بن گیا تھا۔ پیر صاحب کے لیے... روزینہ کے لیے... میرے لیے اور ظاہر ہے مدعی کے لیے... نکاح خواں نے کل آنے کا کہا تھا کہ وہ رجسٹریشن کرا لائے گا وہ کل بھی کل گزر چکی تھی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میں تقریباً سو چکا تھا جب ریشم نے آواز دے کر مجھے جگایا۔ ''سلیم... سو رہے ہو؟''

میں اٹھ بیٹھا۔ ''نہیں، خیریت ہے نا سب؟''

''وہ جو نکاح پڑھانے والا مولوی تھا، اسے کسی نے قتل کر دیا ہے۔'' وہ بریکنگ نیوز کے لہجے میں بولی۔

مجھے لگا جیسے میں نے غلط سنا۔ یہ بہت انقلاب لانے والی اطلاع تھی۔ ''تم سے کس نے کہا؟''

''ابھی انور نے بتایا چودھری صاحب کو... سلونی وہاں سے کھانے کے برتن لے کر نکل رہی تھی۔''

''اور نکاح نامہ... وہ ملا کہ نہیں؟''

ریشم میری صورت دیکھتی رہی۔ شاید اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

> ہر محاذ پر ایک نئے داؤ کی منتظر
> جواری کی تدبیریں اگلے ماہ پڑھیے

اتوار کی رات نو بجے لیورینس ٹاور کی عمارت پر اندھیرے اور خاموشی کا راج تھا۔ ساڑھے نو بجے عمارت کے سپروائزر روپر نے گراؤنڈ فلور پر واقع سازوسامان والے کمرے کا بغلی دروازہ کھولا جو ایک گلی میں کھلتا تھا۔ ایک سایہ لپک کے آگے بڑھا اور تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ روپر نے دروازے سے جھانک کر گلی میں دائیں بائیں دیکھا اور مطمئن ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

منگل کی صبح سیکنڈ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر میں سراغ رساں

تفتیش و سراغرسی کی باریکیاں... مغربی انداز کی ایک اور جھلک...

لالچ

سکندر علیم

عرق ریزی اور جاں فشانی سے کیا جانے والا کام کم وسائل کے باوجود اعلیٰ معیار کا حامل ہوتا ہے... کیونکہ نیت میں کسی قسم کا فتور شامل نہیں ہوتا... انسانی جان کا نعم البدل کوئی نہیں... مگر ذرا سے لالچ کے لیے اس سے یہ غلطی سرزد ہو چکی تھی...

سارس اوبرن اپنی کرسی پر بیٹھا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اس کی نظریں مانیٹرنگ اسکرین پر تھیں اور وہ بیزاری کے عالم میں اس سوال نامے کو پڑھ رہا تھا جس میں محکمے کی جانب سے کچھ ایسے سوالات پوچھے گئے تھے جن کا تعلق جذباتی طور پر منتشر شہریوں سے تھا۔ دوسری میز پر سارجنٹ ڈونلگر ٹیلی فون پر حال ہی میں ہونے والے ایک قتل کے بارے میں معلومات حاصل کررہا تھا۔ استقبالیہ کلرک ماریا نے ایک ادا کے ساتھ گردن گھما کر اوبرن کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”کیپٹن آرتھر جاننا چاہتے ہیں کہ کیا تمہیں آج ڈیڑھ بجے ہونے والی میٹنگ کے بارے میں پیغام مل گیا؟“

”ہاں، کیا وہ بھی میرے ساتھ جانا چاہتا ہے؟“

”نہیں۔ صرف تم ہی جاؤ گے۔“

حال ہی میں ہونے والی ترقیوں کے نتیجے میں اوبرن لیفٹیننٹ بن گیا تھا جبکہ اس کے سابق سپروائزر سالومن کی کیپٹن کے عہدے پر ترقی ہوگئی تھی۔ وہ ڈاؤن ٹاؤن ہیڈ کوارٹر میں بیٹھتا تھا۔ اوبرن جب وہاں پہنچا تو اسے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ یہ میٹنگ صرف سالومن اور اس کے درمیان تھی۔ اس میں کوئی تیسرا فرد موجود نہیں تھا۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوا، سالومن نے دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دی۔ یہ دیکھ کر اوبرن کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے اور وہ سمجھ گیا کہ اسے کسی خاص کام کے سلسلے میں طلب کیا گیا ہے۔ سالومن نے ایک دو رسمی جملے ادا کیے پھر فوراً ہی مطلب کی بات زبان پر لاتے ہوئے بولا۔

”کل صبح سوا تین بجے براؤن اور ولیم کو لیورینس ٹاور اور پوسٹ آفس کی درمیانی گلی میں ایک لاش ملی ہے جو بہت بری حالت میں ہے۔ بظاہر تو یہی لگتا ہے جیسے کوئی بلندی سے گرا ہے جبکہ پوسٹ آفس کی عمارت صرف ایک منزلہ ہے.....“

”تم نے کہا کل صبح۔“

سالومن نے ہاتھ سے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تاکہ اپنی بات مکمل کر سکے۔ ”گلی کی طرف واقع ٹاور کی کوئی کھڑکی نہیں کھولی جا سکتی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ چھت سے گرا ہوگا۔ مائیکل اطلاع ملنے کے بیس منٹ بعد ہی جائے وقوعہ پر پہنچ گیا اور اس نے لاش کو مردہ خانے پہنچا دیا ورنہ علی الصباح کوڑا اٹھانے والے ٹرک اسے کچلتے ہوئے گزر جاتے۔“

سالومن نے ہاتھ سے لکھا ہوا کاغذ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”مرنے والے کا نام ڈینسٹن روپر اور عمر اکتالیس سال ہے۔ بیوی سے طلاق ہو چکی ہے۔ کبھی جیل نہیں گیا۔ وہ ڈی واٹر کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتا تھا اور گزشتہ پانچ سال سے لیورینس ٹاور میں بلڈنگ سپروائزر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس کی چابیوں کے گچھے میں سے ایک چابی کے ذریعے ٹاپ فلور کے ہال وے کا وہ دروازہ کھولا جا سکتا ہے جو چھت کی طرف کھلتا ہے۔ وہاں لفٹ کا سامان اور کولنگ سسٹم کے کنڈینسر نصب ہیں لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آدھی رات کے وقت روپر وہاں کیا کرنے گیا تھا؟ لگتا یہی ہے کہ قاتل نے اسے چھت سے گرانے کے لیے یہ چابی استعمال کی ہوگی۔“

”قاتل.....“ اوبرن کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

سالومن نے اسے ایک بار پھر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”گو کہ چھت پر سے گرائے جانے کی وجہ سے لاش کی حالت بہت خستہ ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود پیتھالوجسٹ کو پورا یقین ہے کہ کسی نے اس کے بائیں کان میں سلاخ گزاری جس سے اس کی نسیں مجروح ہوگئیں اور دماغ کا قیمہ بن گیا۔“

”کیا اس کی کوئی چیز غائب ہے؟“ اوبرن نے پوچھا۔

”بظاہر تو نہیں لگتا۔ اس کے پرس میں چالیس یا پچاس ڈالرز تھے اور اس کی پیٹی کے ساتھ ایک چابیوں کا گچھا تھا جس میں عمارت کے ہر کمرے کی چابیاں تھیں۔“

”اس کی سابقہ بیوی کہاں ہے؟“

”غالباً لاس اینجلس میں۔ مائیکل ابھی تک اس سے رابطہ نہیں کر سکا۔ روپر کا لڑکا سینٹ لوئیس کے کالج میں پڑھتا ہے اور وہ یہاں آرہا ہے لیکن ابھی اسے پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر سالومن نے برابر والے شیلف میں سے ایک خاکی لفافہ اٹھایا اور اوبرن کو دیتے ہوئے بولا۔ ”اسے یہاں مت کھولنا اور احتیاط سے لے کر جانا۔“

اوبرن نے اس لفافے کو ہاتھ میں لے کر تولا تو وہ خاصا وزنی تھا۔ وہ حیرت سے بولا۔ ”یہ تو لیپ ٹاپ ہے۔“

”لاش کو وہاں سے ہٹانے کے بعد مائیکل اس ورک شاپ میں گیا جسے اوپر اپنے دفتر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں موت کی وجہ کیا بتائی جائے گی تاہم خودکشی کے امکان کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ کسی ایسے خط کی تلاش میں تھا جو مرنے سے پہلے روپر نے لکھا ہوگا۔ اسی دوران میں اس کی نگاہ اس لیپ ٹاپ پر گئی جو سرکٹ بریکر باکس کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ اس پر گرد یا مٹی نہیں تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ وہاں کافی عرصے سے نہیں تھا۔ عمارت کا دروازہ کھولنے والے لڑکے کا بھی یہی کہنا ہے کہ اس نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ ممکن ہے کہ یہ ٹیلی فون ٹھیک کرنے والے کا ہو جو پچھلے ہفتے وہاں کام کرنے آیا تھا لیکن اس کے کور پر جو عبارت کندہ ہے، اس سے لگتا ہے کہ یہ ہماری ملکیت ہے۔“

”گویا اس معاملے کا تعلق ہمارے محکمے سے ہے؟“

”ممکن ہے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ دو سال پہلے ہمارے محکمے نے بیس عدد ایسے لیپ ٹاپ فروخت کیے تھے جنہیں ناکارہ قرار دے دیا گیا تھا۔ یہ انہی میں سے ایک ہے۔ یہ پہلے آیئے پہلے پایئے کی بنیاد پر فروخت کیے گئے تھے اور ہمارے پاس اس کا کوئی ریکارڈ نہیں کہ یہ کن لوگوں کو بیچے گئے تھے۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ خریدنے والے بھی محکمے کے لوگ تھے۔“

”اس لیپ ٹاپ میں جو ڈیٹا ہے، اس سے کچھ اندازہ ہوتا ہے؟“

”نہیں، تمام فائلیں صاف کر دی گئی ہیں۔ لگتا ہے کہ اس کے مالک نے تمام ریکارڈ دوسری جگہ منتقل کر دیا ہے۔“

”کیا ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ لیپ ٹاپ اب بھی اسی شخص کی ملکیت ہے جس نے اسے خریدا تھا؟“

”نہیں، اسی لیے تمہیں بلایا گیا ہے۔“

”میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں جبکہ اس میں کوئی ڈیٹا نہیں ہے۔“

”تم سراغ رساں ہو اس لیے تمہیں یہ ذمے داری دی جا رہی ہے لیکن انگلیوں کے نشان تلاش کرنے کی زحمت نہ کرنا۔ یہ کوشش پہلے کی جا چکی ہے اور ہمیں کچھ نہیں ملا۔“

”اس کی کار کہاں ہے؟“ اوبرن نے پوچھا۔

”روپر کے اپارٹمنٹ کے گیراج میں۔ عام طور پر وہ پیدل ہی کام پر آیا کرتا تھا۔“

”اس کے گھر سے کوئی ثبوت ملا؟“

”نہیں، فی الحال ہمارے پاس صرف یہ لیپ ٹاپ ہے جو اس محکمے کے کسی شخص کی ملکیت ہے۔“

”تمہارا نظریہ ہے کہ روپر کو کسی پبلک سیفٹی آفیسر نے قتل کیا؟“

”نہیں لیکن ہمیں اس پر غور ضرور کرنا چاہیے کہ جس شخص نے دو سال پہلے یہ لیپ ٹاپ خریدا تھا وہ کسی نہ کسی طرح اس قتل میں ملوث ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس نے یہ لیپ ٹاپ کہاں چھوڑا یا یہ اب ہمارے پاس ہے۔ اسی لیے تم اس بارے میں کسی سے گفتگو نہیں کرو گے۔“

”کیا میں ڈونلگر کو اپنے ساتھ شامل کر سکتا ہوں؟“ اوبرن نے پوچھا۔

”نہیں، وہ بھی مشتبہ ہے۔“

”کیا میں اسٹینلے سے پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بارے میں رابطہ کر سکتا ہوں؟“

”وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں تمہیں ابتدائی رپورٹ کی نقل بھیج دوں گا۔ تم اس کیس کے سلسلے میں براہِ راست مجھے رپورٹ کرو گے۔ مجھ سے پوچھے بغیر کسی مشتبہ شخص سے الجھنے یا اس کے وارنٹ جاری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اس کے علاوہ میں کن لوگوں سے بات کر سکتا ہوں؟“

”تم روپر کے نائب ہیری سے مل سکتے ہو۔ اسے صرف یہی بتانا کہ معمول کی تحقیقات کر رہے ہو تاکہ فیصلہ کیا جا سکے کہ روپر نے خودکشی کی یا اس کے ساتھ حادثہ پیش آیا۔ یہی بات تم عمارت کے مالک اور دوسرے متعلقہ لوگوں سے بھی کہو گے۔“

”اس کی سابقہ بیوی کے بارے میں کچھ معلومات درکار ہوں گی۔“ اوبرن نے کہا۔

”مائیکل کی رپورٹ سے تمہیں اس کا نام، پتا اور فون نمبر مل جائے گا۔ جب اس کا لڑکا آئے گا تو تم اس سے بھی ملاقات کر سکتے ہو۔ کوئی اور سوال؟“

”نہیں۔“ اوبرن نے کہا اور وہاں سے اٹھ گیا۔

اس نے اپنی کار پارکنگ لاٹ میں ہی چھوڑ دی اور لیورینس ٹاور کی طرف پیدل ہی چل دیا جو چند بلاک کے فاصلے پر تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ عمارت لیورینس کیمیکل کارپوریشن کی ملکیت ہے اور اس کی بالائی تین یا چار منزلیں ان کے استعمال میں ہیں۔ یہ فرم وسیع پیمانے پر کیمیائی کھاد، لبریکنٹس، ڈائی، سیاہی اور ادویات تیار کرتی تھی۔ استقبالیہ کلرک نے ناک سکیڑتے ہوئے اوبرن کا شناختی کارڈ دیکھا اور ہیری کو اس کے سیل فون پر اطلاع دے دی جو دس منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔

وہ ایک لمبے قد کا سنجیدہ سا شخص تھا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ رہا ہے۔ اوبرن جانتا تھا کہ ایسے لوگوں سے کس طرح نمٹا جاتا ہے۔ اس نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”جانتا ہوں کہ تم بہت مصروف ہو لیکن یہ محض ایک معمول کی کارروائی ہے۔ ہمیں روپر کے سلسلے میں کچھ مزید معلومات درکار ہیں تاکہ ضابطے کی کارروائی مکمل کر کے اس کیس کو بند کر دیا

جائے۔ تم کتنے عرصے سے اس کے ساتھ کام کررہے تھے؟"
"تقریباً تین سال سے۔"
"میرا اندازہ ہے کہ تم ایک دوسرے سے کافی قریب تھے؟"
"میں یہ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ ہم ساتھ کام کرتے تھے اور ہمارے درمیان کوئی رنجش نہیں تھی۔"
"تمہارے علاوہ اس کے ساتھ کتنے لوگ کام کرتے تھے؟"
"کوئی نہیں کیونکہ صفائی اور کوڑا اٹھانے کا کام ٹھیکے دار کے سپرد ہے۔"
"کیا تمہیں معلوم ہے کہ اتوار کی رات روپر چھت پر کیوں گیا تھا؟"
ہیری نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"ائر کنڈیشنرز اور لفٹ کی دیکھ بھال بھی ٹھیکے دار کے ذمے ہے اس لیے روپر کا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔"
"کیا وہ موڈی تھا یا اسے کوئی پریشانی تھی کہ اس نے آدھی رات کے وقت عمارت کی چھت سے چھلانگ لگادی؟"
"کچھ نہیں کہہ سکتا۔ عام طور پر وہ ٹھنڈے مزاج کا شخص تھا جب تک کہ اسے چھیڑا نہ جائے۔"
"کیا وہ شراب یا منشیات کا عادی تھا؟"
"میں نے اسے کبھی یہ چیزیں استعمال کرتے نہیں دیکھا۔"
سوال وجواب کا سلسلہ ختم ہوا تو اوبرن نے چھت پر جانے کی خواہش ظاہر کی جہاں سے روپر گرا تھا یا اس نے چھلانگ لگائی تھی۔ وہ دونوں لفٹ کے ذریعے بالائی منزل پر گئے۔ ہیری نے لوہے کا مضبوط دروازہ کھولا جس سے گزر کر چھت پر جایا جاسکتا تھا۔ اس کے عقب میں وہ گلی تھی جہاں روپر کی لاش پائی گئی تھی۔ گلی کی طرف والے عقبی حصے میں کنکریٹ کی ایک مضبوط دیوار بنی ہوئی تھی۔ اوبرن نے غور سے دیوار کا معائنہ کیا۔ اسے کوئی ایسا نشان نظر نہیں آیا جس سے ظاہر ہوتا کہ کسی شخص نے اس پر چڑھ کر چھلانگ لگانے کی کوشش کی ہو۔
وہ واپس جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھے تو لفٹ کے پاس ایک شخص نے ان کا راستہ روک لیا اور بولا۔ "معاف کرنا۔ مہمانوں کو چھت پر جانے کی اجازت نہیں ہے۔"
اوبرن نے اپنا شناختی کارڈ دکھایا اور بولا۔ "میں روپر کی موت کے بارے میں معمول کی تحقیقات کررہا ہوں۔"
"رسل جیک مین، آفس منیجر۔" اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا لیکن مصافحہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔
"کیا تم روپر کو جانتے ہو؟"
"ہاں، وہ مجھے ہی رپورٹ کیا کرتا تھا۔"
"کچھ اندازہ ہے کہ اس کی موت کیسے ہوئی؟"
جیک مین کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "ظاہر ہے، اس نے چھت پر سے چھلانگ لگائی۔ وہ آدھی رات کو تتلیاں پکڑنے تو وہاں نہیں گیا ہوگا۔"
"کیا تم نے کبھی سوچا کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی ہوگی؟"
"وہ متلون مزاج شخص تھا۔ اسے طلاق ہوچکی تھی اور وہ شراب بھی پیتا تھا۔ ایسے لوگ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ دفتر کی جانب جانے لگا پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو۔ وہ مڑتے ہوئے بولا۔
"اس کے پاس عمارت کی چابیاں تھیں۔"
"میں سمجھتا ہوں لیکن فی الوقت اس کی ذاتی اشیا طبی افسر کی تحویل میں ہیں۔"
"وہ چابیاں اس کی ذاتی ملکیت نہیں ہیں۔" منیجر نے کہا۔ "اگر وہ واپس نہ ملیں تو ہمیں عمارت کے تمام دروازے تبدیل کرنا ہوں گے۔"
"ٹھیک ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہیں وہ چابیاں ایک دو روز میں واپس مل جائیں۔"
نیچے آنے کے بعد اوبرن نے روپر کے دفتر کا معائنہ کرنا بھی ضروری سمجھا جو مشین روم میں ہی تھا۔ وہاں مختلف اقسام کی مشینری نصب تھی جن میں بوائلر، کمپریسر، بجلی کے کیبلز اور مختلف نوعیت کے پائپ شامل تھے۔ کنکریٹ کے فرش پر جابجا تیل کے دھبے، خالی ڈبے اور سگریٹ کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے جن سے روپر کی سلیقہ مندی کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔
اس نے مشینوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ مائیکل کی رپورٹ سے وہ جان گیا تھا کہ اسے لیپ ٹاپ سرکٹ بریکر کے اوپر رکھا ہوا ملا جو دروازے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کے اردگرد کی جگہ قدرے صاف نظر آرہی تھی اور فرش کا کوڑا سمیٹ کر ایک کونے میں کردیا گیا تھا۔ وہیں دیوار کے ساتھ ایک جھاڑو بھی نظر آئی۔ اوبرن ایک دروازے پر جاکر رکا جہاں لکھا تھا۔ "داخلہ ممنوع ہے۔ خطرہ۔ ہائی وولٹیج۔"

"اندر نہیں جاسکتے۔" ہیری نے کہا۔ "یہ ٹرانسفارمر روم ہے اور اس کی چابی بجلی کمپنی کے پاس ہے۔"
مشین روم کے ایک کونے میں پارٹیشن کرکے روپر کا دفتر بنایا گیا تھا جسے ورکشاپ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کی ایک دیوار کے ساتھ الماری تھی جس میں مختلف نوعیت کے اوزار رکھے ہوئے تھے۔ پرانی لوہے کی میز پر ایک کمپیوٹر تھا اور اس کے ساتھ ہی بہت سے کیٹلاگ، نقشے، اخبارات اور کچھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ اوبرن کو امید تو نہیں تھی کہ اسے اوزاروں کی الماری میں کوئی خون آلود سلاخ مل جائے گی لیکن ایک نظر دیکھنے میں کوئی حرج نہ تھا۔
وہ ہیڈ کوارٹر واپس پہنچا تو چار بج چکے تھے۔ اب وہ میڈیکل آفیسر کے دفتر میں اسٹینلے سے روپر کی چابیوں اور دیگر ایک دو معاملات پر بات کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے فون پر بات کرنے کے بجائے خود اس سے ملنا مناسب سمجھا۔ اسٹینلے خود بھی سابق پولیس سراغ رساں تھا اور اس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ تاہم وہ چاہ رہا تھا کہ ان چابیوں کو جیک مین کے حوالے کرنے سے پہلے ایک نظر دیکھ لے۔
اسٹینلے اپنی میز پر بیٹھا ہوا کمپیوٹر پر کام کررہا تھا۔ اوبرن کو دیکھ کر اس نے کام روک دیا۔ اوبرن نے کہا۔ "مجھے روپر کے کپڑوں اور اس کی جیب سے برآمد ہونے والی اشیا کا معائنہ کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی عمارت کی چابیاں بھی چاہئیں تاکہ اس کے مالک کو واپس کی جاسکیں۔"
"اس کا پرس، سیل فون اور دیگر ذاتی اشیا سیف میں رکھی ہوئی ہیں۔ اس کا بیٹا کل تک آجائے گا تو یہ چیزیں اسے دے دی جائیں گی۔ اس کے کپڑے بھٹی میں ڈال دیے جائیں گے کیونکہ وہ خون، مٹی اور تیل سے لتھڑے ہوئے ہیں۔"
"کیسا تیل؟" اوبرن نے پوچھا۔
"ظاہر ہے ورک شاپ میں زیتون کا تیل تو ہوگا نہیں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ لبریکنٹ آئل ہے جو مشینوں میں ڈالا جاتا ہے۔"
روپر کے پرس میں چند کرنسی نوٹ کے سوا کچھ نہیں ملا جبکہ اس کا سیل فون ناکارہ ہوچکا تھا۔ اوبرن نے چابیوں کے بارے میں پوچھا تو اسٹینلے بولا۔ "تم ایک رسید پر دستخط کرکے وہ چابیاں لے سکتے ہو۔"
چابیاں ایک سربمہر لفافے میں بند تھیں۔ اوبرن لفافہ لیتے ہوئے بولا۔ "کیا تم نے اس کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی؟"
"ہاں اور اس کی کار کی بھی لیکن کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی۔"
رات کے کھانے کے بعد اوبرن نے لیپ ٹاپ نکالا جس کے کور پر زرد رنگ سے پبلک سیفٹی کی ملکیت لکھا ہوا تھا۔ اوبرن نے اس کا بغور معائنہ کیا لیکن اس میں نہ تو کوئی ڈیٹا فائل تھی اور نہ ہی ای میل۔ وہ آدھ گھنٹے تک کوشش کرتا رہا پھر اس نے اپنی ایک دوست راکیل ہیرس کو فون کیا۔ وہ کمپیوٹر انسٹرکٹر تھی۔ اس نے راکیل کو مختصراً لیپ ٹاپ کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ "میں اس کے مالک کی شناخت کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔ کیا تم اس سلسلے میں کچھ مدد کرسکتی ہو؟"
"مجھے تو یہ معاملہ کچھ پُراسرار لگ رہا ہے۔ کیا تم اسے لے کر میرے پاس آسکتے ہو؟"
"میں بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔"
راکیل نے لیپ ٹاپ کا اچھی طرح معائنہ کیا اور پھر اسے آن کردیا۔ پانچ منٹ اسی طرح گزر گئے۔ وہ ایک کے بعد دوسرے مینیو میں جاتی رہی پھر مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "یہ تو بالکل بیکار ہے۔ اس کی میموری تو میرے ٹوسٹر سے بھی کم ہے اور جو ہے وہ بھی بالکل خالی۔"
"ایسے کمپیوٹر کو رکھنے کا کیا فائدہ جس میں کوئی ڈیٹا نہ ہو۔" اوبرن نے ناگواری سے کہا۔
"ضروری نہیں۔ ممکن ہے کہ اس کا ڈیٹا دوسرے کمپیوٹر میں محفوظ کرلیا گیا ہو۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ کام ختم ہونے کے بعد سارا ڈیٹا صاف کردیتے ہیں۔"
"میں بحث نہیں کروں گا لیکن ایسا کوئی عادی مجرم ہی کرسکتا ہے۔"
"جانتی ہوں کہ مجھے یہ نہیں پوچھنا چاہیے لیکن ہم کس قسم کے مجرم کو تلاش کررہے ہیں؟"
"تم اخبارات تو پڑھتی ہوگی اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ کمپیوٹر کے ذریعے کس قسم کا مواد پہنچایا جاتا ہے اور اس کے مالک کو جیل کی ہوا کھانا پڑتی ہے۔ کیا تم مجھے اس کی شخصیت کے بارے میں کچھ نہیں بتاسکتیں؟"
"ضرور بتاتی اگر یہ کمپیوٹر کام کررہا ہوتا۔ کیا تم کافی پیو گے؟"
"ضرور لیکن تم اپنا کام جاری رکھو۔ میں کافی بنا کر لاتا ہوں۔"
جب وہ کافی لے کر کچن سے واپس آیا تو اس نے

دیکھا کہ راکیل بہت سے چھوٹے چھوٹے کاغذوں کا معائنہ کررہی تھی۔ اس نے انہیں میز پر پھیلا دیا تھا اور ایک ایک کرکے پڑھتی جارہی تھی پھر اس نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ”اس کی جلد کا رنگ سفید ہے۔ کمر کا سائز بڑا اور کریڈٹ کارڈ نمبر......“

اوبرن کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

وہ کافی کی پیالیاں میز پر رکھنا بھول گیا اور بولا۔

”تمہیں یہ چیزیں کہاں سے ملیں؟“

”اسی کیس میں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ سب خریداری کی رسیدیں ہیں۔ ان میں زیادہ تر فاسٹ فوڈ لنچ کی ہیں جبکہ ایک رسید سن بلاک کی بھی ہے۔ اس سے اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ رنگ دار شخص نہیں ہے۔“

”مجھے تو لگ رہا ہے کہ میری جگہ تم اس کیس میں سراغ رسانی کررہی ہو۔ تم نے ابھی کریڈٹ کارڈ نمبر کی بات کی تھی؟“

”ہاں لیکن ساری خریداری نقد ادائگی پر ہوئی ہے۔ آخری رسید چھ روز پہلے کی ہے۔“

”کیا یہ بھی اسی کیس سے ملی ہیں؟“ اوبرن نے سرخ گلابی اور سبز پلاسٹک کے چھلّوں کی طرف اشارہ کیا جو دیکھنے میں ربر بینڈ کی طرح لگ رہے تھے۔

”ہاں، یہ پونی ٹیل باندھنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔“

اوبرن نے کافی ختم کی۔ تمام رسیدیں اور پلاسٹک کے چھلّے ایک لفافے میں رکھے اور گھر چلا گیا۔

جیسا کہ راکیل کا اندازہ تھا کہ یہ لیپ ٹاپ کسی رنگ دار شخص کا نہیں ہوسکتا اور سور کے گوشت سے بنے ہوئے برگر کی خریداری کی رسید یہ ظاہر کررہی تھی کہ اس لیپ ٹاپ کا مالک کوئی مسلمان یا یہودی نہیں بلکہ سفید فام شخص ہے جو اپنے بالوں کو پونی ٹیل کی شکل میں باندھ کر رکھتا ہے۔

گوکہ یہ ساری رسیدیں ایک ہی ریستوران کی تھیں لیکن ان سے خریدار کی شناخت نہیں ہوسکتی تھی البتہ ان پر خریداری کی تاریخ اور وقت درج تھا۔ ان رسیدوں پر سروس کرنے والی لڑکی کا نام تو پتا لکھا ہوا تھا لیکن اس کو تلاش کرنے کے لیے اوبرن کو صبح کا انتظار کرنا پڑتا۔ پھر اسے روپر کی چابیوں کے گچھے کا خیال آیا۔ اس نے لفافے میں سے وہ گچھا نکالا اور اس کا بغور معائنہ کرنے لگا۔ وہ تعداد میں سو سے زیادہ تھیں اور ان پر مختلف نمبر زپڑے ہوئے تھے البتہ ایک چابی پر کوئی نمبر نہیں تھا جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہ چابی گلی کی طرف کھلنے والے دروازے کی ہے۔

رات گیارہ بجے اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ایک ٹارچ، ایک کیمرا اور کچھ دوسرا ضروری سامان رکھا اور باہر جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ لیورینس ٹاور کی طرف جاتے ہوئے اس کے ذہن میں ڈولنگر کا نام آیا جسے سالومن نے مشتبہ قرار دیا تھا۔ ڈولنگر اس کے ساتھ کئی برس سے کام کررہا تھا اور اس وقت وہی اس کا اکلوتا ماتحت تھا لیکن اس کی پونی ٹیل نہیں تھی لیکن وہ کھانے پینے کا شوقین تھا اور اسے شہر کے کم از کم دس پیزا ہاؤس کے فون نمبر زبانی یاد تھے۔ کیا اسے ڈولنگر کا ریکارڈ چیک کرنا چاہیے کہ وہ رسیدوں پر دیے گئے اوقات کے دوران کیا کام کررہا تھا یا اس سے براہِ راست پوچھ لے کہ کہیں اس کا سیکنڈ ہینڈ لیپ ٹاپ تو نہیں کھو گیا؟

رات کے ان اوقات میں شہر کی سڑکیں سنسان پڑی تھیں اور رات بھر چلنے والی فارمیسی کے علاوہ سبھی دکانیں بند ہوچکی تھیں۔ اس نے اپنی گاڑی ٹاور کے سامنے پارک کی اور پیدل چلتا ہوا گلی میں داخل ہوا۔ ہلکی ہلکی چاندنی پھیلی ہوئی تھی لیکن گہرے بادلوں نے اسے ڈھانپ لیا تھا۔ اوبرن کو دروازے تک پہنچنے کے لیے دو مرتبہ ٹارچ روشن کرنا پڑی کیونکہ دروازے کے ساتھ کوئی کی ہول نہیں تھا۔ اس لیے اس نے فرض کرلیا کہ دروازے میں الارم نہیں ہے۔

اس نے مختلف چابیوں کے ذریعے اسے کھولنے کی کوشش کی اور وہ پسینے پسینے ہوگیا۔ بہرحال تھوڑی سی جدوجہد کے بعد دروازہ کھل گیا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کردیا۔ پھر اس نے ٹارچ جلا کر بجلی کا بٹن تلاش کیا۔ اسے وہاں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ ہیری نے بتایا تھا کہ انتظامیہ کے پاس ٹرانسفارمر روم کی چابی نہیں ہے لیکن اس نے اپنے طور پر تصدیق کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایک ایک کرکے ساری چابیاں آزمائیں لیکن دروازہ کھولنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

اس کی نگاہ روپر کے کمپیوٹر پر گئی جس کے کی بورڈ اور ماؤس پر گرد کی ہلکی سی تہ جم گئی تھی۔ اس نے کمپیوٹر آن کیا تو نیلی اسکرین خالی تھی۔ غالباً اس کمپیوٹر کو کئی دنوں یا مہینوں سے استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ اوبرن نے ایک بار پھر غور سے اس جگہ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہ تو وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا کہ الیکٹریکل باکس کے آس پاس کے حصے کی صفائی کی گئی ہے جبکہ بقیہ فرش پر چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ اس نے ہاتھوں پر ربر کے دستانے چڑھائے اور ایک تھیلی میں فرش پر پڑا

ہوا تیل اکٹھا کرنے لگا۔ پھر اس نے پاؤڈر کی مدد سے جھاڑو کے دستے پر انگلیوں کے نشانات محفوظ کیے۔ اس نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر تمام بکھری ہوئی اشیا رکھیں اور انہیں احتیاط سے الگ کرنے لگا۔ ان میں تیل لگے ہوئے نٹ بولٹ، واشر اور دھات کے چھوٹے ٹکڑے شامل تھے۔ اس کے علاوہ ایک خون آلود قالین کا ٹکڑا اور چار ملی میٹر قطر کی لمبی ڈرل بھی ملی جس پر خون کے نشان تھے۔ اس نے یہ سب چیزیں پانچ پلاسٹک کی تھیلیوں میں رکھیں پھر لفٹ کے پاس جاکر زمین کو غور سے دیکھنے لگا۔ اسے وہاں بھی خون کے دھبے نظر آئے جو خشک ہوچکے تھے جس سے یہ شبہ تقویت پکڑنے لگا کہ روپر اپنے پیروں پر چل کر چھت پر نہیں گیا تھا۔

اس کی واپسی رات ڈیڑھ بجے کے قریب ہوئی۔ گھر آنے کے بعد بھی وہ اسی کیس کے بارے میں سوچتا رہا۔ سالومن کا کہنا تھا کہ وہ لیبارٹری کے کسی فرد کو اس انکوائری میں شامل نہیں کرسکتا کیونکہ ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی اس معاملے میں ملوث ہو۔ اوبرن سوچ رہا تھا کہ اس نے جو شواہد جمع کیے ہیں، وہ خود انہیں سرکاری لیبارٹری میں پہنچائے یا اپنے طور پر ان کا تجزیہ کرے۔ جیسا اس نے لیپ ٹاپ پر انگلیوں کے نشان حاصل کرنے کے لیے کیا تھا۔

بدھ کی صبح معمول کے مطابق وہ اپنے دفتر پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے سالومن نے بلا بھیجا اور دو رپورٹیں اس کے حوالے کردیں۔ ان میں سے ایک مائیکل کی تحقیقاتی رپورٹ اور دوسری پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ تھی۔ قاتل نے کوئی مضبوط نکیلی چیز روپر کے بائیں کان میں داخل کی جس سے اس کے دماغ کی رگیں پھٹ گئیں پھر پلاسٹک کے تار کی مدد سے ایک پھایا اندر گھسیڑ دیا تاکہ خون باہر نہ آنے پائے۔

مائیکل کی رپورٹ میں کوڑے کے اس ڈھیر کا کوئی ذکر نہ تھا جہاں سے اوبرن نے ممکنہ آلۂ قتل دریافت کیا تھا۔ اس نے فون کرکے مائیکل سے اس بارے میں بات کی تو اس نے اعتراف کرلیا کہ اس ڈھیر کو اس نے بھی دیکھا تھا لیکن اسے چھیڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

دس بجے کے قریب اسے معلوم ہوا کہ متوفی کا بیٹا کیون روپر پہنچ گیا ہے اور اس نے مردہ خانے میں باپ کی لاش شناخت کرلی ہے۔ روپر کی ذاتی اشیا اس کے حوالے کردی گئیں اور وہ اپنے باپ کے اپارٹمنٹ چلا گیا ہے۔

...مدد آپ کی

”میرے گھر میں چور گھس آئے ہیں... جلدی کسی کو بھیجو۔“ اس نے پولیس اسٹیشن فون کیا۔

”سب گشت پر گئے ہوئے ہیں، یہاں کوئی دستیاب نہیں ہے۔“ اس جواب کے ساتھ فون بند ہوگیا۔

”وہ تین ہیں، تینوں مسلح ہیں۔ میں نے کھڑکی سے انہیں دیکھ لیا ہے۔“ چند منٹ بعد اس نے گھبرا کر دوبارہ فون کیا۔

”اپنے دروازے مقفل کرکے اندر چھپے رہو... کوئی آیا تو اسے تمہاری طرف بھیج دیں گے۔ اس وقت کوئی نہیں ہے۔“ فون پھر بند ہوگیا۔

”میں مارا جاؤں گا... وہ گرل اکھاڑ رہے ہیں۔ کسی بھی لمحے اندر گھس سکتے ہیں۔“ تیسری بار اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”مسہری کے نیچے یا الماری میں چھپ جاؤ... مزاحمت بالکل نہ کرنا۔ بچنے کا یہی ایک طریقہ ہے... تھانے میں اس وقت تمہاری مدد کے لیے کوئی دستیاب نہیں ہے۔“

فون بند ہونے کے چند ثانیوں بعد اس نے چوتھی بار تھانے فون کیا اور کہا۔ ”اب کسی کو آنے کی ضرورت نہیں... میں نے ان تینوں کو شوٹ کردیا ہے۔“ جواب سنے بغیر اس نے فون بند کردیا۔

چند ہی منٹ میں تین موبائلوں میں بیس سپاہی وہاں آپہنچے اور تینوں چوروں کے ساتھ اسے بھی گرفتار کرکے لے گئے کیونکہ اس نے جھوٹ بول کر ”بلاوجہ“ ان کی دوڑ لگوائی تھی۔

جواب درست ہے

ایک کریانہ فروش اپنے نالائق بیٹے کو سمجھا رہا تھا۔

”ارے نالائق، نپولین جب تمہاری عمر کا تھا تو فوجی جرنیل تھا اور تو ابھی تک کھیل کود میں رہتا ہے۔“

لڑکے نے جواب دیا: ”نپولین جب آپ کی عمر کا تھا تو بادشاہ تھا اور آپ ابھی تک لوبیا بیچ رہے ہیں۔“

امتیاز احمد، کراچی کی حوصلہ مندی

اوبرن نے اس سے وہیں ملنے کا فیصلہ کرلیا۔

کیون ایک روایتی کالج بوائے تھا۔ وہ غالباً ساری رات نہیں سو سکا تھا اور صبح ہی صبح اسے باپ کی مسخ شدہ لاش دیکھنا پڑ گئی۔ اس لیے اس وقت اس کے چہرے پر صدمے یا غم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس نے بے دلی سے اوبرن کا استقبال کیا جیسے وہ کوئی ناخوشگوار فریضہ سرانجام دے رہا ہو حالانکہ اسٹیلے نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ کسی وکیل سے رابطہ کرنے سے پہلے اوبرن سے ملاقات کرے جو اس کے باپ کی موت کی تحقیقات کر رہا ہے۔

اوبرن نے اپارٹمنٹ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی لیکن اسے وہاں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ وہ ایک چھوٹا اور بے ترتیب سا اپارٹمنٹ تھا جس میں ہر جانب کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ کیون اس بارے میں کچھ بتانے سے قاصر تھا کہ اس کے باپ نے خودکشی کیوں کی۔ اس نے تسلیم کیا کہ روپر کچھ عرصے سے افسردگی کا شکار تھا اور اسے شراب پینے کی بھی عادت تھی جس کی وجہ شاید بیوی کی جدائی ہو جو اب کورین کولڈرن بن چکی ہے اور لاس اینجلس کے مضافات میں اپنے دوسرے شوہر کے کاروبار کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ اس کا روپر کی آخری رسومات میں شرکت کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اوبرن نے اس کا پتا اور ٹیلی فون نمبر لینے کے بعد کیون کا شکریہ ادا کیا اور اس سے رسمی تعزیت کر کے واپس چلا آیا۔

اب اسے نویتا سے مل کر لیپ ٹاپ کیس کے مالک کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھیں۔ اس نے رسید پر ایک نگاہ ڈالی اور گے ہاگن اسٹریٹ پر واقع اسٹیک این ٹاک ریستوران پہنچ گیا۔ دوپہر کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے اور ریستوران گاہکوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس نے ہجوم کا بغور جائزہ لیا۔ شاید کوئی شناسا چہرہ نظر آ جائے۔ تقریباً سبھی گاہک کالج کے طالب علم لگ رہے تھے۔ ان میں کچھ بوتھ میں بیٹھے لنچ کر رہے تھے اور جنہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں ملی، وہ کاؤنٹر کے قریب کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کرنے پر مجبور تھے۔

وہ ہجوم میں سے راستہ بناتا ہوا کسی خالی نشست کی تلاش میں آگے بڑھتا گیا۔ شاید اسے کچھ انتظار کرنا پڑتا لیکن عین اسی وقت ایک لڑکا اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بل ادا کیا، رسید جیب میں رکھی اور وہاں سے چل دیا۔ اوبرن نے اس نشست پر بیٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ اب اس کی نظریں نویتا کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہاں کئی ویٹرز گاہکوں کی خدمت میں مصروف تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی سے نویتا کے بارے میں پوچھتا، وہ خود ہی اس کے پاس آ گئی۔ شاید اسے توقع تھی کہ کوٹ ٹائی میں ملبوس یہ گاہک عام طالب علموں کے مقابلے میں زیادہ ٹپ دے گا۔ اس نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے پوچھا۔ ”تم کیا پسند کرو گے؟“

”بلیک کافی۔“ وہ نسبتاً ایک الگ تھلگ گوشے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنا شناختی کارڈ نکالا اور بولا۔ ”جانتا ہوں کہ تم بہت مصروف ہو لیکن مجھے تمہارے ایک مستقل گاہک کی تلاش ہے۔ یہ تم ہی ہو نا؟“

اس نے اسے وہ رسیدیں دکھائیں جو لیپ ٹاپ کے کیس سے برآمد ہوئی تھیں۔ لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ ”میں ہی نویتا ہوں۔“

”تم اس گاہک کے بارے میں کیا بتا سکتی ہو؟ وہ غالباً کالج کا طالب علم نہیں ہے اور اس کے پاس ایک لیپ ٹاپ بھی ہوگا۔“

نویتا نے غور سے رسیدیں دیکھیں اور بولی۔ ”یہ کوئی بزرگ شہری نہیں ہے کیونکہ اس سے پوری قیمت وصول کی گئی ہے۔ یہ شخص ہمیشہ تنہا آتا ہے اور بوتھ نمبر سات میں بیٹھا کرتا ہے۔“

”ذہن پر زور دو۔ کوئی ایسا شخص جو ہمیشہ چیز برگر اور ڈبل فرائی کا آرڈر دیتا ہو؟“

اس نے آنکھیں بند کر لیں پھر بولی۔ ”ہاں، یاد آ گیا۔ وہ دبلا پتلا اور تقریباً تمہاری عمر کا سفید فام شخص ہے۔“

”اس کا نام جانتی ہو؟“

نویتا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”کپڑے کیسے پہنتا ہے؟“

”میں نے اسے کبھی ڈھنگ کا لباس پہنے نہیں دیکھا۔ اس کا شیو بھی ہمیشہ بڑھا رہتا ہے اور بالوں کو پونی ٹیل کی طرح باندھ کر رکھتا ہے۔“

نویتا نے جو حلیہ بتایا، وہ ہوبہو گیری کوپر کا تھا۔ اوبرن نے مطمئن ہو کر چیز برگر کا آرڈر دیا اور مزے لے کر کھانے لگا۔ ہیڈ کوارٹر کی طرف واپس آتے ہوئے اس نے راستے سے ہی روپر کی سابقہ بیوی کو فون کیا۔ گو کہ روپر سے اس کے تعلقات اچھے نہیں تھے لیکن اس کی موت پر وہ افسردہ تھی۔ کیون اپنے باپ سے رابطے میں تھا لیکن میاں

بیوی کے درمیان گزشتہ سات سال سے بات چیت نہیں ہوئی تھی اس لیے وہ اوبرن کو اپنے سابق شوہر کے بارے میں کوئی بات نہ بتا سکی۔

گیری کوپر گزشتہ کئی سالوں سے پسِ پردہ رہ کر کام کر رہا تھا اور ہیڈ کوارٹر میں سارجنٹ سے کم عہدے کا شخص اسے نہیں پہچان سکتا تھا۔ ویسے اس کا کام اس نوعیت کا تھا کہ اسے ہیڈ کوارٹر آنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی۔ کسی کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ملے گا۔ اوبرن کو بس اتنا معلوم تھا کہ وہ کسی کو رپورٹ نہیں کرتا اور نہ ہی اسے کسی سے ہدایات لینے کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے طور پر ہی فیصلہ کرتا تھا کہ اسے کس طرح کام کرنا ہے۔ وہ ہمیشہ تنہا ہی کام کرتا تھا اور معاشرے کے نچلے طبقے کے درمیان گھل مل کر منشیات فروشوں، جرائم پیشہ گروہوں اور دیگر اخلاقی جرائم میں ملوث افراد کے بارے میں معلومات حاصل کرتا۔ وقتاً فوقتاً وہ ان لوگوں کے بارے میں ثبوت کسی بااختیار فرد کو پہنچاتا اور خود غائب ہو جاتا۔ ان ثبوتوں کی بنیاد پر باوردی پولیس آفیسر سادہ کپڑوں میں ملبوس سراغ رساں یا فیڈرل ایجنٹ چھاپا مارتے، گرفتاریاں ہوتیں، مقدمے چلتے لیکن گیری کا نام کہیں نہیں آتا۔ وہ کبھی کسی عدالت میں پیش نہیں ہوا۔ نہ ہی سرکاری ریکارڈ میں اس کا نام آیا۔

اب تک اوبرن اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔ گیری کوپر کا نام بیچ میں آ جانے کے بعد وہ مزید الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ کیا سالومن کے سامنے گیری کوپر کا نام لینا مناسب ہوگا؟ ممکن ہے کہ وہ اور دوسرے افسران پہلے سے جانتے ہوں کہ کون سا آفیسر اپنا لیپ ٹاپ جائے وقوعہ پر چھوڑ آیا تھا اور انہیں یہ بھی معلوم ہو کہ روپر کو کس نے قتل کیا تھا۔ شاید اسی لیے مائیکل اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ خفیہ رکھی گئی اور نئے نئے ترقی پانے والے سراغ رساں لیفٹیننٹ اوبرن کو قربانی کا بکرا بنا دیا گیا اور ساتھ ہی اسے پابند کر دیا گیا کہ وہ کسی سے اس معاملے میں کوئی بات نہ کرے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا کہ تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد اوبرن اپنے ہاتھ کھڑے کر دیتا اور اس طرح یہ کیس داخلِ دفتر ہو جاتا۔

اوبرن نے یہ ترقی اپنی صلاحیت کی بنیاد پر حاصل کی تھی اور وہ کسی لابی کا حصہ بننا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے لیے یہ جاننا بہت ضروری تھا کہ گیری کوپر اس عمارت میں لیپ ٹاپ سمیت کیوں گیا اور ایسے کیا حالات ہو گئے تھے کہ وہ لیپ ٹاپ چھوڑ کر چلا آیا۔ چنانچہ اس نے سالومن کو رپورٹ

ماڈل

ڈاکٹر نے اپنی نئی نویلی کار میں چند معمولی کام کروانے کے بعد میکینک کا بل دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ ”ذرا سے کام کے ساٹھ ہزار روپے... یہ تو ہم لوگوں کی فیس سے بھی کئی گنا زیادہ ہے۔“

”آپ درست کہہ رہے ہیں سر! لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ ہمیں ہمیشہ نت نئے ماڈل کی گاڑیوں پر کام کرنا پڑتا ہے... آپ لوگ تو ہمیشہ سے ایک ہی ماڈل پر کام کر رہے ہیں۔ حضرت آدم سے آج تک اس ماڈل میں کچھ بھی نہیں بدلا۔“

کوئٹہ سے حسن سردار کا جواب

کرنے سے پہلے اپنے طور پر گیری سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔

گیری کوپر نے ہیڈ کوارٹر میں آنے کے لیے خوراک کا سامان مہیا کرنے والے سپلائر کا روپ دھار رکھا تھا۔ اس کے علاوہ وہ...... کورٹ یارڈ اسکوائر کے احاطے میں جگہ جگہ لکڑی کے بنے ہوئے الو بھی نصب کرتا تھا تاکہ کبوتر اور دوسرے پرندے خوف زدہ ہو کر درختوں پر بسیرا نہ کریں۔ اوبرن نے اس کا نمبر ملایا اور آنسرنگ مشین پر پیغام ریکارڈ کروا دیا کہ عمارت کے جنوبی حصے میں دو درجن الو نصب کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد وہ دفتر میں آ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ بیس منٹ بعد اسے گیری کی جوابی کال موصول ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”اوبرن! کیا مسئلہ ہے؟“

”مجھے تمہارا لیپ ٹاپ ملا ہے۔ اگر اسے واپس لینا چاہتے ہو تو تمہیں میرے دو سوالوں کے جواب دینے ہوں گے۔“

”تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ میرا لیپ ٹاپ ہے؟“

”اس کے کیس میں اس ریسٹورنٹ کی رسیدیں ملی ہیں جہاں تم برگر کھانے جاتے ہو۔“

کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ بولا۔ ”ممکن ہے کہ تمہارے پاس میرا لیپ ٹاپ ہو۔ تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

”میرا پہلا سوال یہ ہے کہ ہم بقیہ سوالوں پر بات کرنے کے لیے کہاں مل سکتے ہیں؟“

”میں اس ملاقات کا مقصد جاننا چاہتا ہوں۔“ گیری

نے کہا۔

"میں ایک موت کی تحقیقات کر رہا ہوں جس کے بارے میں شبہ ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ کیا اس کے علاوہ بھی مجھے کچھ کہنے کی ضرورت ہے؟"

"نہیں لیکن میں ہیڈ کوارٹر نہیں آسکتا۔ تم مجھے ایک گھنٹے بعد ایرینا کی پارکنگ لاٹ میں ملو۔ میں سرخ رنگ کی پک اپ میں آؤں گا۔"

اوبرن مقررہ وقت پر پارکنگ لاٹ پہنچا تو اس نے گیری کو پسنجر سیٹ پر بیٹھے ہوئے دیکھا جس کا دروازہ ایک رسی کے ذریعے مضبوطی سے بند کر دیا گیا تھا۔ اوبرن نے اپنی گاڑی اس کے برابر میں کھڑی کر کے شیشہ نیچے کر دیا لیکن خود کار میں ہی بیٹھا رہا۔ گیری نے سبز رنگ کا سویٹر اور بیس بال کیپ پہن رکھی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ اوبرن کی طرف دیکھا اور درختوں پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"لیپ ٹاپ کہاں ہے؟"

"فی الحال تو وہ سرکاری تحویل میں ہے۔" اوبرن نے کہا۔

"یہ تمہیں کہاں سے ملا؟"

"تم نہیں بلکہ میں سوال کروں گا۔" اوبرن بولا۔ "تم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہ تمہارا لیپ ٹاپ ہے جو روپر کی موت کے دو گھنٹے بعد اس عمارت کے مشین روم سے ملا۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ مشین روم تھا یا اسٹور۔ البتہ اس کا ایک دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔"

"تم وہاں کس وقت موجود تھے؟"

"اتوار کی رات ساڑھے نو بجے۔"

"روپر بھی تمہارے ساتھ تھا؟"

"اس نے مجھے بتایا تھا کہ میں وہ عمارت ایک ہزار ڈالرز میں خرید سکتا ہوں۔"

"صاف صاف بات کرو۔ اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"مطلب یہ کہ پانچ سو ڈالرز کے عوض وہ مجھے ایسی معلومات فراہم کرے گا جو لیورینس کیمیکل کے چیف اور بورڈ آف ڈائریکٹرز کو جیل پہنچا سکتی ہیں۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ لیپ ٹاپ ساتھ لے کر آؤں کیونکہ وہ معلومات ایک... یو ایس بی میں ہیں اور وہ مجھے صرف کاپی کرنے کے لیے وہ... یو ایس بی دے گا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"میں وہاں پہنچا۔ وہ بھی موجود تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ مجھے کچھ دیتا، ایک تیسرا شخص بھی وہاں آگیا۔"

"کون؟" اوبرن نے پوچھا۔

"یہ میں کیسے جانتا کہ وہ کون تھا۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا اور گرمی بھی بہت تھی۔ جیسے ہی روپر نے مجھے اندر بلایا، میں نے لیپ ٹاپ شیلف پر رکھا اور اپنی جیکٹ اتارنے لگا۔ پھر ہمیں یوں لگا کہ کوئی شخص اندرونی دروازہ کھول رہا ہے۔ روپر نے مجھے واپس گلی میں دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔"

"تم نے اندر آنے والے کو نہیں دیکھا اور نہ ہی باہر سے کوئی آواز سنی؟"

"میں نے دو گھنٹے انتظار کیا پھر مایوس ہو گیا۔"

"تم گلی میں دو گھنٹے تک اپنی جیب میں ایک ہزار ڈالرز رکھے کھڑے رہے۔"

"ہزار نہیں پانچ سو اور وہ بھی میری جیب میں نہیں تھے۔" کوپر نے تصحیح کی۔

"ٹھیک ہے، پانچ سو ڈالرز ہی سہی۔ کیا تمہیں اندازہ تھا کہ اس کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جس کی اتنی قیمت ادا کی جائے؟"

"تم میری جگہ خود کو رکھ کر کھلے ذہن سے سوچو۔ روپر کے پاس عمارت کے ہر کمرے کی چابی تھی۔ اس نے یہ معاملہ طے ہونے سے پہلے مجھے کچھ اشارے دیے تھے۔"

"کیا وہ نشے میں تھا؟"

"یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن میں نے اسے ہمیشہ نشے کی حالت میں ہی دیکھا۔"

وہ دونوں مزید دس منٹ تک گفتگو کرتے رہے لیکن کوئی کارآمد بات معلوم نہیں ہوئی۔ دفتر پہنچنے پر اسے پیغام ملا کہ وہ فوراً سالومن کو فون کرے۔ وہ سمجھ گیا کہ اس تحقیقات کا فیصلہ کن موڑ آگیا ہے۔ کیا وہ تنہا ہی یہ کھیل کھیلتا رہے؟ کیا وہ سالومن کے سامنے سارے ثبوت رکھ دے؟ جب وہ سالومن کے دفتر پہنچا تو وہ اسے دیکھتے ہی بولا۔

"ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ کچھ معلوم ہوا؟"

"کچھ چیزیں مجھے گزشتہ روز عمارت سے ملی ہیں۔ میں صبح ہی لے کر آنے والا تھا لیکن لیپ ٹاپ کے مالک کو تلاش کرنے میں دیر لگ گئی۔"

"کچھ کامیابی ہوئی؟"

اوبرن نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور بڑبڑاتے ہوئے جیسے خود سے سوال کیا۔ "کیا گیری کوپر اب بھی اس ڈپارٹمنٹ میں ہے؟"

سالومن اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "تم نے یہ کیوں کہا؟"

"اس لیے کہ میں اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور کرو۔" سالومن مسکراتے ہوئے بولا۔ "لیکن ذرا احتیاط سے۔ وہ خاصا خطرناک شخص ہے۔"

گیری کوپر سے دوسری ملاقات کے لیے اوبرن نے اپنے نائب ڈولنگر کو بھی ساتھ لے لیا۔ اس بار ملاقات کا اہتمام سالومن نے کیا تھا اور یہ گیری کے گھر پر ہوئی۔

گیری کوپر پہلی نظر میں سادہ کپڑوں میں ملبوس ڈولنگر کو نہیں پہچان سکا۔ جب اوبرن نے اس کا تعارف کروایا تو گیری طنزیہ انداز میں بولا۔ "کیا بات ہے اوبرن.... تم اسے بھی کام پر لگانا چاہتے ہو یا اپنی مدد کے لیے ساتھ لے کر آئے ہو؟"

"دونوں ہی باتیں ہیں۔" اوبرن نے کہا۔ "ہم دوبارہ وہ کہانی سننا چاہتے ہیں کہ تم روپر سے کچھ معلومات حاصل کرنے کے عوض پانچ سو ڈالرز کی ادائیگی کرنے والے تھے۔"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ ڈیل مکمل نہیں ہو سکی۔"

"تمہارے پاس وہ رقم کہاں سے آئی؟"

"تم اسے نامعلوم ذریعہ کہہ سکتے ہو۔ کبوتروں کو دانہ ڈالنے کے لیے اس طرح کے فنڈ استعمال کیے جاتے ہیں۔"

"گیری! میں جانتا ہوں کہ تم اس مد میں کچھ رقم خرچ کر سکتے ہو لیکن حقائق اس سے مختلف ہیں۔ تم نے کسی مخبر کو رقم کی ادائیگی کے لیے کوئی درخواست نہیں دی اور نہ ہی تمہیں اس ضمن میں نقد رقم دی گئی اور یقیناً تم نے یہ رقم واپس بھی نہیں کی۔"

گیری اپنی کرسی میں بل کھا کر رہ گیا اور جھلاتے ہوئے بولا۔ "اتوار کی دوپہر میں رقم کا انتظام کیسے کرتا؟ وہ میرے اپنے پیسے تھے۔ میرا خیال تھا کہ بعد میں دفتر سے لے لوں گا۔"

"تمہارا کہنا ہے کہ تم اس مشین روم میں چند سیکنڈ کے لیے ہی رکے لیکن اس جگہ کی صفائی کر کے کوڑا ایک جگہ جمع کیا گیا اور جھاڑو دیوار کے ساتھ رکھ دی گئی۔ اس جھاڑو پر تمہاری انگلیوں کے نشانات ہیں۔"

"تم لوگ کچھ پینا پسند کرو گے؟"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔" اوبرن نے کہا۔ "ہم جھاڑو کی بات کر رہے تھے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے.... بتاتا ہوں۔ روپر پانچ سو ڈالر کے عوض سودا کرنے پر تیار نہیں تھا۔ اس نے مجھے وہ یو ایس بی بھی نہیں دیکھنے دی۔ اس پر ہمارے درمیان جھگڑا ہو گیا اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ وہاں فرش پر تیل پڑا ہوا تھا۔ وہ پھسلا اور اس کا سر توپ کے گولے کی طرح زمین سے ٹکرا گیا۔"

"تم نے نو گیارہ کو اطلاع دی؟"

"وہ مر چکا تھا۔ میں اس کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ نائن الیون کو فون کرنے کا مطلب اپنے آپ کو مشکل میں ڈالنا تھا۔ اس وقت مجھے اپنے بچاؤ کی فکر تھی۔ اس کے بارے میں سب جانتے تھے کہ وہ افسردگی کا شکار تھا چنانچہ میں اسے خودکشی کا رنگ دینے کے لیے اس کی لاش کو اٹھا کر چھت پر لے گیا اور وہاں سے نیچے پھینک دیا۔"

"تم لاش کو وہاں چھوڑ کر بھی آسکتے تھے؟" اوبرن نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہرگز نہیں۔ انگلیوں اور قدموں کے نشانات سے

میری وہاں موجودگی ثابت ہو جاتی اور میرے لیے یہ واضح کرنا مشکل ہو جاتا کہ وہاں کیا کرنے گیا تھا بلکہ عین ممکن ہے کہ اس کی موت کا الزام بھی مجھ پر آ جاتا۔"

"روپر کی جیب سے ایک نائیلون کی ڈوری ملی ہے جو عام طور پر یو ایس بی کو گلے میں لٹکانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ ہمارے پاس سرچ وارنٹ ہے لیکن بہتر ہوگا کہ تم وہ یو ایس بی ہمارے حوالے کر دو۔"

گیری نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اپنی جیب سے ایک سیاہ رنگ کی یو ایس بی نکالی اور اسے میز پر رکھ دیا۔ اوبرن نے اسے اٹھا کر دیکھا اور بولا۔ "بہت خوب..... تمہارا کام تو ہو گیا لیکن روپر پانچ سو ڈالرز کی خاطر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔"

"اگر وہ بدعہدی نہ کرتا تو ہاتھا پائی کی نوبت نہ آتی۔" گیری نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"اس یو ایس بی میں ایسی کیا خاص معلومات ہیں؟" اوبرن نے پوچھا۔

"مجھے ابھی تک اسے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ تمہیں یاد ہونا چاہیے کہ میرا لیپ ٹاپ تمہارے پاس ہے۔"

"مجھے یاد ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ اسے تم وہاں چھوڑ کر کیوں چلے آئے؟"

"اسے میری حماقت سمجھ لو۔ میں نے روپر کی بیلٹ سے چابیوں کا گچھا نکالا اور دروازے کا تالا کھول کر سامان لے جانے والی لفٹ سے اس کی لاش کو چھت پر لے گیا۔ لاش کو نیچے پھینکنے سے پہلے میں نے چابیوں کا گچھا دوبارہ اس کی جیب میں رکھ دیا۔ اب میں اس لفٹ سے واپس نہیں آ سکتا تھا چنانچہ میں نے نیچے آنے کے لیے پسنجر لفٹ استعمال کی جو لابی میں آ کر ختم ہوتی تھی۔ وہاں سے میں رینگتا ہوا گیٹ تک آیا اور اسے پھلانگ کر عمارت سے باہر آ گیا۔ اس طرح وہ لیپ ٹاپ اندر ہی رہ گیا۔ میں چابیوں کا گچھا لینے کے لیے روپر کی لاش کے پاس جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔"

"شاید اسی لیے تم وہ ڈرل بھی وہیں چھوڑ آئے۔" اوبرن کے لہجے میں تلخی آ گئی۔

گیری کا چہرہ زرد ہو گیا جیسے کسی نے اس کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

"روپر زمین پر پھسلنے کے بعد بھی زندہ تھا اور اس کی سانس چل رہی تھی۔ پھر تم نے اس کے ٹول باکس میں سے وہ ڈرل اور چند دوسری اشیا نکالیں اور کسی ڈراؤنی فلم کی طرح بڑی بے رحمی کے ساتھ اس کے کان میں گھسیڑ دی۔"

گیری کی حالت غیر ہو گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا ہو۔ اوبرن اور ڈونگر کے لیے یہ بڑے اذیت ناک لمحات تھے کہ انہیں اپنے ایک ساتھی افسر کی گرفتاری کا ناخوشگوار فریضہ انجام دینا پڑ رہا تھا۔ اوبرن نے ایک بار پھر اس یو ایس بی کو دیکھا جس کی وجہ سے ایک بے گناہ انسان کی جان گئی اور گیری کو اپنی آزادی سے محروم ہونا پڑا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس میں ایک پرانے معمے کا حل موجود ہے۔ یعنی یہ کہ عوام و خواص میں مقبول ہونے والا مشروب "لونر فاگ" کہاں بنتا ہے۔

اس غیر قانونی شراب کی زیرِ زمین نقل و حرکت بہت بڑے پیمانے پر ہو رہی تھی۔ حکام کو دھوکا دینے کے لیے کبھی اسے الکحل کا نام دے دیا جاتا تو کبھی صنعتی محلول جو کہ زہریلا مادہ ہوتا ہے لیکن حقیقت میں اس غیر قانونی شراب کو ایک مشروب کے طور پر فروخت اور استعمال کیا جا رہا تھا۔ اس کا مقبول نام لونر فرگ تھا لیکن بوتلوں پر یہ لیبل نہیں لگایا جاتا تھا۔ لیوریس کیمیکل کارپوریشن کے پاس کمپنی سے ایتھونول بنانے کا لائسنس تھا۔ اس کی آڑ میں وہ غیر قانونی شراب تیار کر کے زیرِ زمین پائپ لائن کے ذریعے دوسرے پلانٹ تک پہنچاتے جہاں اس شراب کو بوتلوں میں بھرا جاتا۔ اس مشروب کو شاہ بلوط کی لکڑی کے پیپوں میں رکھنے کے بجائے براہِ راست بوتلوں میں بھر دیا جاتا۔ اس میں وہ زہریلے مادے بھی موجود ہوتے جو پیداواری عمل یا پائپ لائن سے گزرتے ہوئے اس میں شامل ہو جاتے تھے۔

حکام کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ دس لاکھ گیلن غیر قانونی شراب کا کیا کیا جائے۔ وہ اسے گٹر میں بہانا چاہ رہے تھے لیکن ماحولیات والوں نے اس کی مخالفت کی۔

گیری نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا اور جیوری نے اسے قتل کا مجرم گردانتے ہوئے سزائے موت کی سفارش کر دی۔

اوبرن اور ڈونگر اپنے دفتر میں پتھر کے بت بنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اوبرن سوچ رہا تھا کہ گیری نے صرف پانچ سو ڈالرز بچانے کی خاطر ایک معصوم شخص کی جان لے لی اور اگر اس کی رحم کی اپیل منظور ہو گئی تب بھی وہ عمر قید سے نہیں بچ سکے گا۔ اس کا ارادہ روپر کو قتل کرنے کا نہیں تھا لیکن لالچ نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور اس سے وہ جرم سرزد ہو گیا جس کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔

بعض تعلق بہت جلد گہری دوستی میں بدل جاتے ہیں... غیر محسوس طور پر ایک دوسرے کے اتنے قریب آ جاتے ہیں کہ پھر دوری ناقابلِ برداشت صورت اختیار کر لیتی ہے... مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہر روز کی ملاقات کے باوجود لوگوں کے درمیان اجنبیت کی ایسی دیوار استادہ رہتی ہے کہ صورت آشنائی کے سوا کچھ نہیں جانتے... ایسے ہی کرداروں کے درمیان گھومتی کہانی... جہاں ہر شخص دوسرے کو جانتا تھا... مگر نہیں جانتا تھا...

مشتبہ ملاقاتی

جمال دستی

اس مشتبہ شخص کی تلاش جو ہر ایک کی نظر سے اوجھل تھا...

کانفرنس روم میں اسٹیٹ اسٹریٹ چرچ کی مالیاتی کمیٹی کی میٹنگ معمول کے مطابق جاری تھی۔ پادری ہنری آسٹن خاموش بیٹھا میٹنگ کی کارروائی دیکھ اور سن رہا تھا۔ وہ کم گو تھا اور بولنے سے زیادہ سننے پر دھیان دیتا تھا جبکہ اس کی سیکریٹری اگنس کرافٹ ہی تمام معاملات دیکھتی تھی۔ اس کے فرائض میں اراکین کے لیے کافی اور دیگر لوازمات کا اہتمام کرنے کے ساتھ ساتھ نوٹس لینا اور موقع بہ موقع کمیٹی کے اراکین کو حقائق سے آگاہ کرنا بھی تھا۔ وہ

ایک باوقار عورت تھی اور سبھی لوگ اس کے رکھ رکھاؤ اور سلیقے سے بہت متاثر تھے۔ میٹنگ کی صدارت طویل قامت ایڈن روز کر رہی تھی جس کا تعلق ایک امیر اور معزز خاندان سے تھا۔

"میں جاننا چاہتا ہوں۔" کمیٹی کے ایک رکن آرتھر بالمر نے چیلنج کرنے والے انداز میں کہا۔ "ساری دنیا میں بھوک، بے روزگاری اور کساد بازاری بڑھتی جارہی ہے اور ہم چرچ کے فنڈ سے باسکٹ بال ٹیم کے لیے وردیاں خرید رہے ہیں۔"

"اس ٹیم نے گزشتہ برس لیگ چیمپئن شپ جیتی تھی اور مقابلے میں حصہ لینے والی تمام ٹیموں کو شکست دی تھی۔" ویرون گلیٹ نے وضاحت پیش کی۔

"یہ کوئی جواز نہیں ہے۔" آرتھر نے کہا۔ "میرا سوال اب بھی یہی ہے کہ کیا ہمارے فنڈز کو خرچ کرنے کا یہ مناسب طریقہ ہے؟"

"سوری آرتھر۔" ایک اور رکن چارلس رینڈن نے کہا۔ "میں گلیٹ کی بات سے متفق ہوں۔ یہ لڑکے اپنے لیے نئی یونیفارم نہیں خرید سکتے اور ان کے والدین میں بھی اتنی استطاعت نہیں لہٰذا لیگ میں حصہ لینے اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ہم انہیں ہر قسم کی پریشانی سے دور رکھیں۔"

"تم اس کے نتیجے میں پیش آنے والی مشکلات کو نظر انداز کر رہے ہو۔"

"فی الحال ہمارے لیے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم ان بچوں کے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ کریں اور انہیں سکون سے لیگ میں حصہ لینے کا موقع فراہم کیا جائے۔ لہٰذا میں ان اخراجات کی منظوری کی تحریک پیش کرتا ہوں۔"

"میں تائید کرتا ہوں۔" گلیٹ نے کہا۔

چارلس نے آرتھر کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تم کیا کہتے ہو؟"

"مجھے جو کہنا تھا، وہ کہہ چکا۔" آرتھر منہ بناتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے پھر اس کا فیصلہ رائے شماری کے ذریعے ہونا چاہیے۔" چارلس نے تجویز پیش کی۔

"جو لوگ اس تحریک کے حق میں ہیں، وہ اپنا دایاں ہاتھ کھڑا کر دیں۔" ایڈن نے کہا تو چارلس اور گلیٹ نے فوراً ہی ہاتھ کھڑے کر دیے لیکن آرتھر نے اس کے خلاف ووٹ دیا۔ ایڈن نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ اس طرح دونوں جانب سے ووٹوں کی تعداد برابر ہوگئی۔ ایڈن نے کہا۔

"اس قرارداد کا فیصلہ کاسٹنگ ووٹ سے ہوگا جس کا حق ہنری آسٹن کے پاس ہے۔"

"تم کیا کہتے ہو ہنری؟" گلیٹ نے پوچھا۔ "تمہیں تو باسکٹ بال کا بہت شوق ہے اور تم کبھی کوئی میچ نہیں چھوڑتے۔"

ہنری نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "کیا وہ لڑکے گزشتہ برس کی یونیفارم نہیں پہن سکتے کیونکہ ٹیم تو وہی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔"

"بچے بڑے ہوگئے ہیں۔" چارلس نے یاد دلایا۔ "پرانی یونیفارم انہیں پوری نہیں آئے گی۔"

آرتھر اب بھی بحث سے باز نہیں آیا اور بولا۔ "پتلونوں میں الاسٹک ہوتا ہے اور ویسے بھی ان کی لمبائی کافی زیادہ تھی اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسئلہ ہوگا۔"

"یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس سے چرچ کا وقار وابستہ ہے۔ تھوڑی سی بچت کے لیے ہم خدا کو ناراض نہیں کر سکتے۔" چارلس نے کہا۔

یہ بات پادری کے دل کو لگی۔ وہ خدا کو ناراض کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اس نے قرارداد کے حق میں ووٹ دے دیا۔ میٹنگ بڑے خوشگوار ماحول میں ختم ہو گئی۔ ایجنڈے کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد کافی کا دور چلا اور وہ سب خوش گپیوں میں مصروف ہوگئے۔ ان کے درمیان کسی قسم کا کوئی اختلاف نظر نہیں آرہا تھا البتہ ہلکی پھلکی نوک جھونک چلتی رہی۔ آرتھر اور گلیٹ ایک ساتھ ہی میٹنگ روم سے باہر آئے۔ وہ عموماً ایک ہی کار میں آیا کرتے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ آج تمہاری باری تھی۔" آرتھر نے شکوہ کیا۔

"تم بھول رہے ہو میری باری اگلی مرتبہ ہوگی۔" گلیٹ نے جواب دیا۔

"آئندہ یاد رکھوں گا۔" آرتھر نے کہا۔ "کیا تم ایک ڈرنک کے لیے رکنا پسند کرو گے؟"

"ضرور۔" گلیٹ نے کہا پھر وہ چارلس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "کیا تم ہمارا ساتھ دو گے؟"

"نہیں۔ بارش ہونے والی ہے۔ میں گھر جاؤں گا اور اگر موسم بہتر ہوا تو مچھلیاں پکڑنے چلا جاؤں گا۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہفتے میں ایک مرتبہ یہ شوق ضرور پورا کرتا ہوں۔"

"کیا تمہاری بیوی بھی ساتھ جائے گی؟" ایڈن ان کی گفتگو میں شریک ہوتے ہوئے بولی۔

"نہیں، وہ گھر پر ہی رہے گی۔ اسے مچھلیاں پکڑنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"بلکہ وہ تو خوش ہوگی کہ کچھ دیر کے لیے تم سے نجات مل گئی۔" آرتھر نے فقرہ کسا۔

اس مذاق پر ہنری بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا لیکن اس نے اس نوک جھونک میں شامل ہونے سے گریز کیا۔ وہ گرجا سے باہر محتاط رہتا تھا اور اس کے سماجی تعلقات محدود تھے تاہم غیر شادی شدہ ہونے کی وجہ سے وہ گرجا میں آنے والی خواتین کی توجہ کا مرکز بنا رہتا تھا۔ ان میں ایک دولت مند بیوہ ایڈن بھی تھی جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کے دل میں پادری کے لیے روحانی جذبات ہیں۔ اسی لیے وہ چرچ کے معاملات میں دلچسپی لیتی ہے۔

پادری کی سیکریٹری اگنس کرافٹ بھی غیر شادی شدہ تھی لیکن اس کا مزاج قدرے مختلف تھا اور وہ اپنے کام پر زیادہ توجہ دیتی تھی۔ اس وقت بھی میٹنگ ختم ہونے پر اس نے کاغذات سمیٹے اور اپنے دفتر کی جانب چل دی۔ اس کا کہنا تھا کہ گھر جانے سے پہلے وہ میٹنگ کی روداد ٹائپ کر کے کمیٹی کے اراکین کو ای میل کر دے گی۔ اگر اس کے علاوہ کوئی پروگرام تھا تو اس نے اس بارے میں کوئی اشارہ نہیں دیا۔

جب وہ کانفرنس روم سے چلی گئی تو ایڈن نے کہا۔ "میں اکثر یہ سوچ کر حیران ہوتی ہوں کہ اس بے چاری کی چرچ سے باہر بھی کوئی زندگی ہے۔"

"یقیناً مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔" ہنری آسٹن نے کہا۔ "صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس نے ہمیں بہت سے کاموں سے آزاد کر دیا ہے۔ وہ تمام بل ادا کرتی ہے۔ تمام ریکارڈ اپنے کمپیوٹر میں محفوظ رکھتی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کے بغیر کیا کر سکوں گا۔"

ایڈن نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں نے حالیہ دنوں میں اس میں معمولی سی تبدیلی دیکھی ہے۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس کی ایک محبت ناکام ہو چکی ہے۔"

پادری نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اسے ایسی افواہیں سننا پسند نہیں تھا۔ اس لیے اس نے ایڈن سے یہ پوچھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی کہ اگنس کے کس مرد کے ساتھ تعلقات تھے لیکن ایڈن خاموش رہنے والی نہیں تھی۔ اس نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جانتی کہ وہ کون تھا لیکن سمجھتی ہوں کہ وہ دلبرداشتہ ہے اور اس سے انتقام لینے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ تم نے یقیناً غور کیا ہوگا کہ اس نے آج کیسا لباس پہن رکھا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ عام دنوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ ہی اچھا لباس پہنتی ہے۔"

"آج اس نے اونچی ایڑی کے سینڈل پہن رکھے تھے۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اسے ان جوتوں میں نہیں دیکھا۔ وہ ضرور کسی سے ملنے جاتی ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ تم نے اسے چرچ کے مالی معاملات میں بہت آزادی دے رکھی ہے۔ بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ سارے فیصلے ہم کرتے ہیں لیکن ہمیں ریکارڈ دیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ وہ سب اس کے چھوٹے سے لیپ ٹاپ میں ہوتا ہے۔"

ہنری پہلے بھی یہ سب باتیں سن چکا تھا۔ اس نے ٹالنے کے لیے کہا۔ "وہ صرف بلوں کی ادائیگی کرتی ہے۔"

وہ ایک عام سی میٹنگ تھی اور اس ایک ناخوش گوار افواہ کے علاوہ کوئی غیر معمولی بات دیکھنے میں نہیں آئی لیکن شام تک صورتِ حال بدل گئی جس نے چرچ کے پرسکون ماحول کو ہلا کر رکھ دیا..... جس کے نتیجے میں شریک ایک شخص قتل جیسے سنگین جرم کا ملزم ٹھہرایا گیا اور اسے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ایک طویل قانونی جنگ لڑنا پڑی۔

☆☆☆

کمرائے عدالت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وکیلِ صفائی گورڈن مون نے مجمع پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ ان میں زیادہ تر نشستوں پر میڈیا کے لوگ براجمان تھے، اسی طرح مدعا علیہ کے خاندان اور قریبی دوستوں کے لیے بھی کچھ نشستیں مخصوص تھیں اور چند ایک ان لوگوں کے لیے چھوڑ دی گئی تھیں جنہیں عدالتی کارروائی سننے کا شوق ہوتا ہے اور وہ اس مقصد کے لیے صبح سے ہی لائن میں لگ جاتے ہیں۔ اس مقدمے میں لوگوں کی غیر معمولی دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مدعا علیہ کوئی معمولی شخص نہیں بلکہ ایک بڑے چرچ کا پادری تھا جس پر اس کی سیکریٹری کے قتل کے الزام میں مقدمہ چل رہا تھا۔

گورڈن نے اپنے موکل کی جانب دیکھا۔ ہنری اپنے سیاہ سوٹ میں ہمیشہ کی طرح باوقار اور پرسکون نظر آرہا تھا۔ وہ ایک ممتاز شخصیت تھا۔ اس پر زیادہ سے زیادہ چرچ کے مالی معاملات میں بے قاعدگیوں کا شبہ کیا جاسکتا تھا لیکن اس کا وکیل یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ وہ قتل جیسے سنگین

جرم کا ارتکاب بھی کرسکتا ہے۔

جج کی کرسی پر سفید بالوں والی اسٹیلے مور گن براجمان تھی۔ دیکھنے میں وہ ایک شفیق دادی کی طرح نظر آتی تھی اور اس کے انداز سے لگتا تھا کہ ابھی وہ لوگوں میں چاکلیٹ بانٹنا شروع کردے گی لیکن اپنے فرائض کے معاملے میں وہ بڑی سخت گیر تھی۔ اگر کوئی وکیل پوری تیاری کر کے نہ آتا یا دورانِ سماعت کمرائے عدالت میں بدسلوکی کرتا تو وہ اس سے بہت بُری طرح پیش آتی۔

گورڈن کی نظریں استغاثہ کی میز کا جائزہ لے رہی تھیں جہاں ڈسٹرکٹ اٹارنی پیٹرک ونسٹن نخوت سے سینہ پھلائے بیٹھا تھا۔ وہ چہرے سے ہی مغرور اور بددماغ نظر آتا تھا۔

ونسٹن چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ سجائے جیوری بکس کی جانب بڑھا۔ اس نے پرانے دوستوں کی طرح جیوری کے ارکان کا استقبال کیا۔ پھر وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

"میں آپ کو ایک چھوٹی سی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ آج سے تقریباً بیس سال پہلے اگنس کرافٹ نامی ایک نوجوان عورت انگلستان سے یہاں آئی۔ وہ اس وطن میں ایک نئی زندگی شروع کرنے کی خواہش مند تھی۔ اس میں بے پناہ انتظامی اور تنظیمی صلاحیتیں تھیں اور مذہب پر بھی پختہ یقین رکھتی تھی چنانچہ اسے ملازمت حاصل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور وہ اسٹیٹ اسٹریٹ چرچ میں پادری کی سیکریٹری بن گئی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ ایک اہم اور ذمے داری کا کام ہے۔ کم از کم میرا تجربہ تو یہی ہے جس دن سیکریٹری نہیں آتی، میرے دفتر کا کام رک جاتا ہے۔ کچھ سیکریٹریز سے انتظامی معاون کے طور پر بھی کام لیا جاتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ باس ان پر کتنا اعتماد کرتا ہے۔"

وہ چند لمحوں کے لیے رکا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ایک عشرے تک اگنس نے کاپر گراہم کے ساتھ کام کیا جو ہمارے شہر کی ایک ہردلعزیز شخصیت تھی اور آپ میں سے کئی لوگ اسے جانتے ہوں گے۔" اس پر کئی عمر رسیدہ ارکانِ جیوری نے تائید میں سر ہلا دیا۔ "کاپر گراہم کے ریٹائر ہو جانے کے بعد بھی اگنس نے نئے پادری ہنری آسٹن کے ساتھ کام جاری رکھا لیکن یہ شراکت نسبتاً کم خوش گوار رہی حالانکہ اگنس اپنے فرائض کے سلسلے میں بے حد مخلص تھی۔ وہ پچاس سال کی ہونے کے باوجود غیر شادی شدہ تھی اور ملازمت کے سوا اس کی کوئی سماجی زندگی نہیں تھی۔ اس نے اپنی زندگی چرچ کے لیے وقف کر دی تھی اور اسی کی خاطر اس نے اپنی جان دے دی۔

"اسٹیٹ اسٹریٹ چرچ ایک عبادت گاہ ہے۔ اس لیے اس کے انتظامی اور مالی معاملات میں ہمیشہ شفافیت کی توقع کی جاتی ہے لیکن اگنس نے محسوس کرنا شروع کردیا تھا کہ کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔ اسے اس نے عطیات اور اخراجات کے ریکارڈ میں عدم مطابقت دیکھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ چرچ کے فنڈ میں خورد برد کی جارہی ہے۔ وہ اس بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہو گئی۔ اس نے اس غبن کے ذمے دار شخص کا پتا لگانے کے لیے شام کو دیر تک کام کرنا شروع کر دیا اور بالآخر وہ اس میں کامیاب ہوگئی۔

"بارہ دسمبر کی شام اس نے اپنی ایک دوست کو بتایا کہ وہ اسٹیٹ اسٹریٹ چرچ میں ہونے والی مالی بدعنوانیوں کے بارے میں حکامِ بالا کو آگاہ کرنے والی ہے۔ وہ چرچ کی مالیاتی کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہوئی لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ اگلے روز اپنی معلومات کا انکشاف کرے گی لیکن وہ دن اس کی زندگی میں نہیں آیا۔

"دسمبر کی اس سرد صبح کو اگنس کی لاش چرچ کے دفتر میں ملی۔ اس کی موت چاقو کے مہلک وار کے نتیجے میں واقع ہوئی۔ اگنس کے قتل کے فوراً بعد یہ بات سامنے آئی کہ اسٹیٹ اسٹریٹ چرچ اپنے بلوں کی ادائیگی نہیں کرسکتا کیونکہ ہزاروں ڈالرز کا کوئی حساب نہ تھا۔ چرچ کا تمام مالی ریکارڈ اگنس کے لیپ ٹاپ میں محفوظ تھا اور اسے کسی دوسری جگہ محفوظ نہیں کیا گیا تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ قتل کی رات وہ لیپ ٹاپ بھی غائب ہو گیا اور کئی روز بعد ایک دوسری جگہ پر پڑا ہوا مل گیا۔ اس جگہ کا نام میں بعد میں بتاؤں گا۔

"سب سے پہلے ہم اس قابلِ تعریف عورت کی لاش کی بات کرتے ہیں جو خون میں لت پت اس دفتر میں پڑی ہوئی تھی جہاں اس نے چرچ، سماج اور مذہب کے لیے شاندار خدمات انجام دیں۔ حملہ آور شاید کوئی آواز سن کر وہاں سے فرار ہو گیا اور یہی سمجھا کہ اگنس کی موت واقع ہو گئی ہے۔ یقیناً وہ زخم مہلک تھا لیکن ثبوت سے پتا چلتا ہے کہ اس وقت تک اگنس زندہ تھی اور فرش پر پڑے ہوئے خون کے نشانات کی لکیر بتاتی ہے کہ اس نے گھسٹ کر اپنی میز تک کا فاصلہ طے کیا۔ اس میز پر رکھی ہوئی دو چیزیں ثبوت کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان میں سے ایک پادری آسٹن کی آٹھ ضرب دس سائز کی تصویر ہے جبکہ دوسری ایک لفافہ کھولنے والی چھری ہے۔ اس جاں بہ لب عورت نے غیر معمولی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی میز کی دراز سے پادری کی تصویر نکالی جو فرش پر اس کے برابر ہی گری ہوئی تھی۔ اس نے اپنے کمزور ہاتھوں سے لفافہ کھولنے والی چھری نکالی اور مرنے سے پہلے سماج کے لیے ایک عظیم کارنامہ انجام دے دیا۔ اس نے قاتل کو شناخت کرلیا اور مضبوطی سے چھری تصویر میں گھونپ دی۔ اس طرح وہ ہمیں یہ پیغام دینے میں کامیاب ہوگئی کہ یہی وہ شخص ہے جس پر میں نے بھروسا کیا جس کے ساتھ کام کیا۔ یہی وہ شخص ہے جس پر عبادت کے لیے آنے والے اور علاقے کے لوگ اعتماد کرتے تھے لیکن اس نے اسے مجروح کردیا۔ یہی وہ شخص ہے جس نے مجھے قتل کیا یعنی پادری ہنری آسٹن۔"

یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور حاضرین پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بعد بولا۔ "ایک بات اور ..... میں نے جس لیپ ٹاپ کے غائب ہونے کے بارے میں بتایا تھا، وہ ہنری آسٹن کے گھر کے عقب میں واقع کوڑے دان سے مل گیا ہے لیکن اس کا سارا ریکارڈ ضائع کردیا گیا ہے۔" اس دھماکا خیز انکشاف کے بعد ونسٹن اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

وکیلِ صفائی گورڈن موئن نے سرکاری وکیل کے برعکس انداز اختیار کیا اور ڈرامائی لہجہ اپنانے کے بجائے حقائق پر توجہ مرکوز رکھی۔ اس نے جیوری سے صرف اتنا کہا کہ استغاثہ کی جانب سے پیش کیے جانے والے ثبوت و شواہد میں کوئی جان نہیں ہے اور یہ دوسرے مشتبہ لوگوں کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں۔ دوسرے روز اس کے موکل کے خلاف ثبوت پیش کردیے گئے لیکن وہ سب واقعاتی شہادتیں تھیں۔ وقوعہ کا کوئی چشم دید گواہ نہیں تھا، نہ ہی ڈی این اے یا کوئی اور جسمانی ثبوت پیش کیا گیا جو جیوری کے اراکین کو متاثر کرسکتا۔ اگنس کی ایک سہیلی نے گواہی دی کہ اگنس نے چرچ کے حسابات میں گڑبڑ کا پتا لگایا تھا اور وہ اس معاملے کی رپورٹ اعلیٰ حکام کو کرنا چاہ رہی تھی لیکن گورڈن کے سوال پر اس نے تسلیم کیا کہ اگنس نے اس سلسلے میں کسی کا نام نہیں لیا تھا۔ ایڈن کے بیان سے اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اگنس نے اس رات معمول سے ہٹ کر مختلف لباس پہن رکھا تھا۔ یقیناً وہ پادری ہنری آسٹن سے سامنا کرنے کے لیے ایسا لباس نہیں پہن سکتی تھی جس سے وہ اس روز دن میں بھی ملاقات کرچکی تھی۔

گورڈن سوچ رہا تھا کہ کیا کوئی شخص اگنس ..... سے سازباز کیے بغیر چرچ کے حسابات میں گڑبڑ کرسکتا ہے؟ یہ نکتہ ایڈن نے اٹھایا تھا جو پادری کے دفاع میں بول رہی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ کسی مضبوط بنیاد کے بغیر مدعا علیہ پر اس طرح کا الزام عائد کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوسکتا۔

ڈسٹرکٹ اٹارنی نے بحث کے دوران میں سارا زور اس نکتے پر دیا کہ اگنس کا لیپ ٹاپ پادری کے گھر کے عقب میں واقع کوڑے دان سے برآمد ہوا تھا۔ اس کے جواب میں گورڈن نے یہ موقف اختیار کیا کہ اگر اس کا موکل اتنا ہوشیار ہوسکتا ہے کہ وہ لیپ ٹاپ سے بدعنوانی کے تمام ثبوت مٹا دے تو اس سے اس حماقت کی بھی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اسے اپنے گھر کے کوڑے دان میں پھینک دے گا۔ یقیناً اصلی قاتل کی جانب سے اسے پھنسانے کے لیے ایسا کیا گیا ہے۔ یہ اتنا مضبوط نکتہ تھا کہ اس کے بعد ہنری کے خلاف کیس بہت کمزور نظر آنے لگا۔

گورڈن نے بحث کی ابتدا کرتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ وہ دوسرے مشتبہ شخص کو تلاش کرے گا لیکن مقدمہ شروع ہونے کے چوتھے روز ہی اسے پوری طرح یقین نہیں تھا کہ وہ دوسرا مشتبہ شخص کون ہوسکتا ہے تاہم اسے امید تھی کہ وہ بہت جلد اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔

استغاثہ کی جانب سے پیش ہونے والی پہلی گواہ تحقیقاتی افسر سراغ رساں میلنڈا چاؤ تھی۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی نے اس سے پوچھا۔ "اس کمرے میں ہنری کی تصویر اور لفافہ کھولنے والی چھری کی موجودگی کیا ظاہر کرتی ہے؟"

"ہمیں یقین ہے کہ مرنے والی مس اگنس ہمیں یہ بتانے کی کوشش کررہی تھی کہ اسے کس نے قتل کیا۔ وہ اپنے مالک پادری ہنری کی جانب اشارہ کررہی تھی۔"

ونسٹن نے معنی خیز انداز میں جیوری کی طرف دیکھا اور واپس آکر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اب گواہ پر جرح کی باری گورڈن کی تھی۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"صبح بخیر! تمہیں یہاں دیکھ کر ہمیشہ کی طرح خوشی محسوس ہورہی ہے۔"

"صبح بخیر۔" چاؤ نے کہا اور گورڈن کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ 'کاش میں بھی تم سے یہی کچھ کہہ سکتی۔'

"تم نے اس تصویر کے ساتھ لفافہ کھولنے والی چھری دیکھ کر اپنی تحقیقات ہنری آسٹن تک محدود کردیں؟"

"اس سلسلے میں اُس کی دلچسپی خارج از امکان نہیں۔ ویسے بھی اس کے خلاف بہت کچھ سننے میں آیا ہے اور میں یہ کہنا چاہوں گی کہ مرنے والی کا پیغام بڑا واضح ہے۔"

"تم ایک تجربہ کار افسر ہو۔ یہ بتاؤ کہ ماضی میں تم نے کتنی مرتبہ کسی کو اس انداز میں اپنے قاتل کی نشاندہی کرتے ہوئے دیکھا ہے؟"

"میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ ایسا پہلی بار ہوا ہے۔"

"مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ میں اس طرح کے واقعات کئی مرتبہ دیکھ چکا ہوں لیکن صرف جاسوسی ناولوں میں۔ تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ مس اگنس اتنا پیچیدہ راستہ اختیار کرنے کے بجائے محض قاتل کا نام بھی لکھ سکتی تھی۔"

"ممکن ہے کہ اس کی یہی نیت ہو۔ شاید وہ کاغذ قلم کی تلاش میں اپنے آپ کو میز کی جانب گھسیٹ رہی تھی لیکن جب اس کی ہمت جواب دینے لگی تو اس نے یہ طریقہ اختیار کیا۔"

"کیا اس تصویر پر کسی فوٹو گرافر کا نام درج ہے؟"

"ہاں۔ اس کا نام تصویر کے دائیں کونے میں نیچے کی جانب درج ہے۔ ہارٹن ڈولی۔"

"کیا تم نے اس پر غور کیا کہ مس کرافٹ اس فوٹو گرافر کو لپیٹ میں لینا چاہتی ہو؟"

"لفافہ کھولنے والی چھری کا رخ تصویر کے چہرے کی جانب ہے۔ فوٹو گرافر کے نام پر نہیں۔"

"تمہیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مرنے سے پہلے مس اگنس کا کافی خون بہہ چکا تھا۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ چھری کی نوک فوٹو گرافر کے نام پر گھونپنا چاہ رہی ہو لیکن ناکام رہی۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتی۔" سراغ رساں نے کہا۔

"گویا تمہیں یقین ہے کہ اس نے اسی جگہ پر چھری کی نوک رکھی جہاں وہ چاہ رہی تھی؟"

"میری رائے میں ایسا ہی ہے۔"

"تم سمجھتی ہو کہ جس جگہ چھری گھونپی گئی، اس کی خاص اہمیت ہے؟"

"یقیناً۔" سراغ رساں نے اکتاہٹ کے عالم میں جواب دیا۔ وہ اس غیر ضروری جرح سے بیزار نظر آرہی تھی۔

"میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ اب مجھے ایک سوال کا جواب دو۔ یہ چھری تصویر کے کس حصے میں گھونپی گئی تھی؟"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟ یہ چھری پادری کی تصویر کے عین درمیان میں اس کی ناک پر گھونپی گئی تھی۔"

"کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مرنے والی کا اشارہ پادری کے چہرے پر نہیں بلکہ صرف ناک پر تھا۔ کیا تم نے اس کے علاوہ بھی پادری کی تصویریں دیکھی ہیں؟"

"ہاں۔"

"کیا تم نے اس امکان پر غور کیا کہ کسی اور نے یہ تصویر اور چھری وہاں رکھ دی ہو؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"کسی قاتل کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ مس اگنس کو گھسیٹتا ہوا میز تک لے جائے اور چھری کو اس کی انگلیوں کے نشانات مٹائے بغیر استعمال کرے۔ پھر اپنی موجودگی کا کوئی نشان چھوڑے بغیر وہاں سے چلا جائے۔"

"مقتولہ اور پادری کے علاوہ کن لوگوں کو چرچ کے مالی ریکارڈ تک رسائی حاصل ہے جو ان مبینہ بے قاعدگیوں کا مرتکب ہوسکتا ہے؟"

"چرچ کی مالیاتی کمیٹی میں کئی لوگ شامل ہیں لیکن وہ سب جاچکے تھے۔"

"کیا تم ان کے جانے کا بالکل صحیح وقت بتا سکتی ہو؟"

"ہمارے پاس ایسی کوئی شہادت نہیں جس سے ان لوگوں کا تعلق اس جرم سے جوڑا جاسکے۔"

"پادری کی طرح ان میں سے کوئی اور بھی بہ آسانی اس جرم کا ارتکاب کرسکتا ہے جس کے بارے میں تمہیں یقین ہے کہ اس نے اپنی مالی بدعنوانی چھپانے کے لیے اگنس کو قتل کیا۔"

"میں نہیں جانتی۔"

"لیکن تم ابھی کہہ چکی ہو کہ کمیٹی کے تمام اراکین میٹنگ ختم ہونے کے بعد وہاں سے جاچکے تھے؟"

"ہماری تحقیقات کے مطابق ان پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔" سراغ رساں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "جہاں تک ہمیں معلوم ہے کہ اگنس کرافٹ روزمرہ کی آمدنی اور اخراجات کی تفصیل خود ہی مرتب کرتی تھی اور کمیٹی کے اراکین کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ صرف پالیسی بناتے ہیں اگر تمہارے پاس اس کے علاوہ کوئی اور معلومات ہیں تو ہم ضرور جاننا چاہیں گے۔"

گورڈن نے کوئی جواب نہیں دیا اور سراغ رساں کا شکریہ ادا کر کے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد ڈسٹرکٹ اٹارنی نے گواہ سے چند سوالات کیے جن کا مقصد محض اس کی شہادت کو مضبوط بنانا تھا۔ عدالت کا وقت ختم ہونے میں آدھا گھنٹا باقی تھا۔ جج نے گورڈن سے پوچھا کہ

کیا وہ اگلے روز صبح اپنے دلائل دوبارہ شروع کرنے پر تیار ہے؟ گورڈن فوراً ہی راضی ہوگیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے اسلحہ خانے میں کسی چیز کی کمی ہے جسے تلاش کرنے کے لیے اسے مہلت درکار ہے۔

گھر جاتے ہوئے اسے یاد آیا کہ اس کے گھر رات کے کھانے پر مہمان آنے والے ہیں۔ وہ اس کی بیوی کے رشتے دار تھے اور گورڈن کو ان کا میزبان بننے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اس کے پاس بچت کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید بیوی کے رشتے داروں سے ہلکی پھلکی گفتگو کرنے کے بعد اسے ذہنی سکون مل جائے جس کی شدید ضرورت تھی۔

دوسری صبح اس نے کمیٹی کے اراکین کو گواہوں کے کٹہرے میں بلایا۔ پہلا نمبر آرتھر بالمر کا تھا۔ گورڈن نے اس سے پوچھا۔ "کیا تمہارے علم میں تھا کہ کوئی چرچ کے فنڈ میں خورد برد کر رہا ہے؟"

"نہیں!"

"کیا کبھی اگنس نے تمہیں کسی مالی بدعنوانی کے بارے میں بتایا؟"

"نہیں۔ کاش وہ بتا دیتی تو شاید میں اس کی زندگی بچا لیتا۔"

دوسری گواہ ایڈن روز تھی۔ وہ دبلی پتلی، طویل قامت اور وضع قطع سے ہی مال دار عورت لگ رہی تھی۔ گورڈن نے اس سے بھی یہی سوال کیا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ پادری ہنری آسٹن چرچ کے فنڈ میں غبن کر رہا تھا؟"

"بالکل نہیں۔ میں کبھی یقین نہیں کرسکتی کہ آسٹن ایسی حرکت کرسکتا ہے۔"

"کیا تمہارے خیال میں کمیٹی کے کسی رکن کو موردِ الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے؟"

"کس جرم میں..... قتل یا چوری؟" ایڈن نے پوچھا۔

"کسی ایک میں لیکن یہ قتل کا مقدمہ ہے۔"

"میں نہیں سمجھتی کہ کمیٹی کے کسی رکن کے لیے چرچ کے فنڈ میں خورد برد کرنا ممکن ہے اور جہاں تک قتل کا تعلق ہے تو میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ میں نے اگنس کو نہیں مارا۔ اسی طرح دوسرے اراکین بھی معزز اور شریف لوگ ہیں۔ وہ کیوں ایک معصوم عورت کو قتل کریں گے؟"

"کمیٹی کا کون سا رکن چرچ کے مالی معاملات میں بہت زیادہ ملوث ہے؟"

"ہم سب مل کر پالیسی بناتے ہیں اور اس پر عمل کرنا اگنس کی ذمے داری تھی۔ اسی کے پاس سارا ریکارڈ ہوتا تھا۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ تم نے میرے مؤکل کی توجہ اگنس کے لباس کی جانب دلائی تھی جو عام دنوں کی نسبت غیر معمولی اور مختلف تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ اس شام وہ کسی سے ملنے والی ہے؟"

"یقیناً ایسا ہی تھا۔"

"اور تم نے یہ بھی کہا تھا کہ حال ہی میں اس کا کسی کے ساتھ تعلق ناخوش گوار انداز میں ختم ہوا ہے؟"

"مجھے اس سوال پر اعتراض ہے۔" سرکاری وکیل نے کہا۔

جج نے اعتراض مسترد کر دیا تو گورڈن نے کہا۔ "شکریہ..... مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔"

اگلا گواہ چارلس ریڈن تھا۔ گورڈن نے اس سے بھی وہی سوال کیا۔ "کیا تمہیں چرچ کے فنڈ میں ہونے والی کسی خورد برد کا علم تھا؟"

"نہیں۔"

"جس شام مس اگنس کا قتل ہوا، تم اس وقت کیا کر رہے تھے؟"

"میں جھیل پر مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ وہاں میرا کیبن ہے۔"

"کیا تمہیں وہاں کسی نے دیکھا؟"

"ہاں، کئی لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ مثلاً سروس اسٹیشن پر کام کرنے والا عملہ، اس اسٹور کا مالک جہاں سے میں سامان خریدتا ہوں۔ دو قریبی پڑوسی جنہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔"

"کیا تمہاری بیوی بھی ساتھ گئی تھی؟"

"نہیں، وہ گھر پر رہی تھی۔"

"کیا اس نے کبھی تمہارے کام میں مدد کی؟"

"ہاں، کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔" چارلس نے اعتراف کیا۔

"کیا وہ اگنس کو جانتی ہے؟"

"یقیناً۔"

"وہ تمہارے ساتھ مچھلیاں پکڑنے کیوں نہیں گئی؟"

اس سوال پر ڈسٹرکٹ اٹارنی نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ "اگر میرے فاضل دوست سمجھتے ہیں کہ مسز ریڈن کا اس مقدمے سے کوئی تعلق ہے تو انہیں گواہوں کے کٹہرے میں بلایا جائے۔"

گورڈن نے اس سے اتفاق کیا۔ آدھ گھنٹے بعد مسز

رینڈن کمرائے عدالت میں موجود تھی اور اپنی طلبی پر خاصی برہم نظر آرہی تھی۔ گورڈن نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تمہاری مالیاتی کمپنی کے ریکارڈ تک رسائی تھی؟''

''میرا شوہر اس کمپنی کا رکن ہے میں نہیں۔ مجھے تمہارا تہمت آمیز لہجہ اچھا نہیں لگا۔''

''معافی چاہتا ہوں۔ میرا مقصد کسی پر الزام عائد کرنا نہیں۔ تم ایک معزز عورت ہو اور میری معلومات کے مطابق اینگلو امریکن فرینڈشپ لیگ کی مقامی شاخ کے لیے بھی خدمات انجام دے چکی ہو۔''

''یہ درست ہے۔''

''یہ بھی سچ ہے کہ تم تین مرتبہ مقامی شاخ کی صدر رہ چکی ہو؟''

''ہاں۔''

''اور یہ بھی سچ ہے کہ مقتولہ اگنس کرافٹ بھی اس تنظیم کی ممبر تھی اور وہ تمہارے ساتھ نائب صدر کے طور پر کام کر چکی تھی؟''

''ہاں۔''

''اس شام تم اپنے شوہر کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے کیوں نہیں گئیں؟''

''مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ تم باقاعدگی سے مچھلیاں پکڑتی ہو؟ میں نے تمہاری ایک تصویر دیکھی ہے جس میں تم ایک بڑی سی ٹراؤٹ مچھلی پکڑے ہوئے ہو۔ تم دو سال پہلے اینگلو امریکن فرینڈشپ لیگ کے زیرِ اہتمام ہونے والے مقابلے میں فاتح قرار پائی تھیں۔''

''میں اپنے شوہر کے ساتھ مچھلیاں پکڑنا پسند نہیں کرتی۔'' اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''تم یہی سننا چاہ رہے تھے؟''

سوالوں کا یہ سلسلہ مزید ایک گھنٹے جاری رہا لیکن کسی گواہ نے یہ اعتراف نہیں کیا کہ وہ ہنری آسٹن کی مالی بے قاعدگیوں کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ استغاثہ نے ہنری آسٹن کو مجرم ثابت کرنے کے لیے جو کہانی گھڑی تھی، گورڈن نے اس کے پرخچے اڑا دیے۔ استغاثہ جائے وقوعہ پر ہنری آسٹن کی موجودگی ثابت کرنے میں ناکام رہا اور نہ ہی آلۂ قتل برآمد ہوا۔ البتہ گورڈن نے اپنے دلائل اور گواہوں پر جرح کر کے جیوری کو قائل کر دیا کہ اگنس کا قتل ہنری آسٹن نے نہیں بلکہ کسی اور نے کیا ہے اور یہ پولیس کا کام ہے کہ وہ اس مشتبہ شخص کو تلاش کرے۔

تین دن بعد ڈپٹی اٹارنی ڈیوڈ نے اختتامی دلائل دیے۔ گورڈن نے اپنے اختتامی دلائل میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اگنس نے مرنے سے پہلے چھری پادری کی تصویر میں چہرے پر نہیں بلکہ اس کی ناک پر رکھی تھی اور تصویر میں جو ناک نظر آرہی ہے، وہ پادری کی اصلی ناک سے مختلف ہے جو کسی دوسرے شخص کی بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے مطالبہ کیا کہ استغاثہ پادری کے خلاف ثبوت و شواہد پیش کرنے میں ناکام رہا ہے اس لیے اس کے مؤکل کو باعزت طور پر بری کیا جائے۔ جیوری نے اس کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے پادری کے خلاف الزام واپس لے لیا۔

قتل کا یہ معما کبھی حل نہ ہو سکا۔ پولیس کے پاس ایسا کوئی سراغ نہیں تھا کہ وہ اصل قاتل تک پہنچ سکے۔ وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتی رہی اور کچھ عرصے بعد یہ کیس داخلِ دفتر ہو گیا لیکن اس کے نتیجے میں متعلقہ لوگوں کی شہرت بری طرح داغ دار ہوئی۔ اس کے باوجود ہنری آسٹن یا رینڈن نے شہر نہیں چھوڑا۔ ایسی صورت میں وہ مشتبہ قرار دیے جا سکتے تھے البتہ انہیں یقین تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ لوگ اس واقعے کو بھی بھول جائیں گے اور ان کی کھوئی ہوئی ساکھ بحال ہو جائے گی۔

فوٹوگرافر ہارٹن ڈولی اچانک ہی منظر سے غائب ہو گیا اور کسی نے اس کی غیر موجودگی پر توجہ دی، نہ ہی کسی کو یہ خیال آیا کہ اسے پادری کی تصویریں کھینچنے کا جو معاوضہ چرچ کی جانب سے دیا گیا تھا، اس کی منظوری کس نے دی تھی..... یا اگنس کے ساتھ اس کے تعلقات کی کیا نوعیت تھی تاہم اس پر کسی کا شک نہیں گیا..... لیکن گورڈن کی نظر میں وہ مشتبہ تھا۔ ایڈن روز کے کہنے کے مطابق اگنس نے اس روز لباس کے معاملے میں خصوصی اہتمام کیا تھا۔ کسی نے بھی اس پر غور نہیں کیا کہ اس سے ملنے کون آسکتا ہے۔ گورڈن کے پاس بھی ایسا کوئی سراغ نہیں تھا جس کے ذریعے اگنس کے ملاقاتی کی شناخت ہو سکے۔ اس لیے اس نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔ ویسے بھی ہنری آسٹن کے بری ہو جانے کے بعد اس کا کام ختم ہو چکا تھا اور کسی مشتبہ ملاقاتی کا سراغ لگانا اس کے دائرۂ اختیار میں نہیں تھا۔

●●●

انوکھا قتل

سمن با حلیم

ہر وہ چیز جو مضبوطی کے ساتھ بندھی ہو... اسے مختلف سمتوں سے اٹھنے والی آندھیاں بھی نہیں اکھاڑ سکتیں... جبکہ کمزور یا ناپختہ چیز اپنی جگہ سے اکھڑ جاتی ہے... اسی طرح واقعات... جذبات اور انسانی کردار کا بھی معاملہ ہے... وقت کا ہلکا سا جھونکا بھی انہیں اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے... ایک ایسے ہی کردار کی پُراسرار حرکات و سکنات...

ایک ایسے قتل کی سنگین روداد جس کی تیاری و عمل زیرِ نگرانی تھا

''میں آج اسے قتل کر دوں گا۔'' میں نے اس شخص کو یہ کہتے سنا۔ ''وہ تین دن سے بیسمنٹ میں بندھی پڑی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔''

مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی فون پر قتل کرنے کے بارے میں اس حد تک سرسری انداز میں بات کر سکتا ہے۔

''نہیں، ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا کہ کس طرح قتل کرنا ہے لیکن اب میں اس پر عمل کر کے رہوں گا۔''

جب وہ شخص بس سے نیچے اترا تو میں نے اس کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہو سکتا ہے کہ میں اسے اس کے ہولناک ارادے سے روکنے کا کوئی راستہ تلاش کر لوں۔ میں اس شخص کے حلیے کا بغور جائزہ لینے لگا تاکہ بعد میں پولیس کو اس کا درست اور صحیح صحیح حلیہ بیان کر سکوں۔

اس شخص کی عمر پچاس پچپن برس کے درمیان رہی ہو گی۔ اس کے بال گرے رنگ کے تھے۔ اس نے ایک عام سی جینز اور بلیو رنگ کی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کے حلیے میں کسی قسم کی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

وہ چلتا ہوا ایک دکان میں داخل ہو گیا اور میں باہر رک کر کھڑکی سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ کلرک نے ڈسپلے کیس میں سے ایک بڑا سا چاقو نکال کر اس شخص کو تھما دیا۔ وہ شخص اس چاقو کو ہوا میں لہرانے لگا تو مجھے بے ساختہ اس بےچاری عورت کا خیال آگیا جسے وہ اس کی گردن کاٹ کر قتل کرنے جا رہا تھا۔

بظاہر یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس بڑے چاقو سے مطمئن ہو کیونکہ اس نے وہ چاقو کلرک کو واپس تھما دیا تھا۔ پھر وہ دکان میں دیگر اشیا دیکھنے لگا۔ اس نے منظم طریقے سے بھانت بھانت کے اوزار دیکھے۔ پہلے ایک کلہاڑی، پھر ایک بھاری ہتھوڑا، پھر ایک بڑی سی آہنی سلاخ جو آتش دان کی راکھ کریدنے کے کام آتی ہے۔ وہ ان اوزاروں کو ہوا میں لہرا کر چیک کرتا جا رہا تھا جیسے ان کے وزن کا اندازہ لگا رہا ہو۔

پھر وہ ایک کیبنٹ کے سامنے جا کھڑا ہوا جس میں مختلف قسم کے خنجر سجے ہوئے تھے۔ کلرک نے اسے متعدد خنجر دکھائے۔ میں دہشت سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ ان خنجروں کو اپنے نادیدہ شکار پر وار کرنے کے انداز میں چیک کر رہا تھا۔

ان مناظر کو دیکھتے ہوئے میں اپنے اختیار کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ اس معاملے میں پولیس کی مدد حاصل کرنے کے لیے میرے پاس ٹھوس ثبوت موجود ہونا چاہیے لیکن پھر میں نے پولیس کو فون کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

''آپریٹر... پولیس کو کال ملاؤ۔'' میں نے پریشان لہجے میں کہا۔ ساتھ ہی اس شخص پر نگاہیں جمائے رہا جو اب بندوقیں دیکھ رہا تھا۔

''ٹوئنٹی تھرڈ پریسنٹ!'' ڈیسک سارجنٹ کی بوری آواز سنائی دی۔

''یس، میں ایک امکانی قتل کی رپورٹ درج کرانا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا پھر اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جانتے ہو... قتل ہونے والا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' سارجنٹ نے جواب دیا۔ اب وہ مستعد ہو گیا تھا کیونکہ اس کے لہجے میں بوریت کا عنصر شامل نہیں تھا۔ ''کیا تم کسی کو قتل کرنے کی پلاننگ کر رہے ہو؟''

''نہیں، مرتہن کی دکان میں ایک شخص موجود ہے جو ہتھیاروں کو چیک کر رہا ہے۔ میں نے اسے فون پر بات کرتے ہوئے سنا ہے۔ اس نے کسی عورت کو اپنے بیسمنٹ میں باندھ کر رکھا ہوا ہے اور وہ اسے قتل کرنے والا ہے۔''

''اوہ آئی سی۔ مستقبل کے اس قتل کی جائے واردات کا پتا کیا ہے؟'' ڈیسک سارجنٹ نے پوچھا۔ بظاہر وہ میری اس فون کال سے محظوظ ہو رہا تھا۔

''مجھے اس پتے کا ابھی علم نہیں ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن جو کام تم لوگوں کو کرنا چاہیے، وہ میں کروں گا اور اس شخص کا پیچھا جاری رکھوں گا۔''

''سر! میں آپ کو مشورہ نہیں دوں گا کہ آپ اس کا پیچھا...'' میں نے اتنا سنا ہی تھا کہ تیزی سے لائن کاٹ دی۔

وہ شخص اب مرتہن کی دکان سے باہر نکل رہا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس نے دکان سے کوئی شے بھی نہیں خریدی تھی۔ میں نے بظاہر اپنی توجہ ڈسپلے ونڈو تک مرکوز رکھی لیکن مجھے اس بارے میں فکرمند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ وہ شخص بظاہر اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا اور میرے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی۔

میں نے اس کا تعاقب جاری رکھا۔

مجھے اس کی یک طرفہ گفتگو کے کچھ کچھ جملے سنائی دے رہے تھے جو وہ خود کلامی میں بڑبڑا رہا تھا۔

''منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وجہ سے اس کی چیخیں گھٹ گئی تھیں... اس کی آنکھوں سے عیاں خوف ایک ہیجانی کیفیت طاری کر رہا تھا... وہ خون میں نہا جائے گی...''

یہ کس قسم کا عفریت ہے؟ میں نے اب مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اس بے چاری عورت کو جسے اس شخص نے اپنے بیسمنٹ میں باندھ رکھا ہے، قتل ہونے سے روکوں گا۔

کئی بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ شخص اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ جب وہ اپنے غیر معروف چھوٹے سے گھر میں داخل ہو گیا تو میں نے اس کا پتا نوٹ کرلیا اور ایک بار پھر پولیس کو فون کیا۔

''ٹوئنٹی تھرڈ پریسنٹ۔'' وہی مانوس آواز سنائی دی۔

''مجھے اب پتا معلوم ہو گیا ہے۔'' میں نے تیزی سے کہا۔ ''ڈبل ٹو ون زیرو، ایلم۔ کسی کو فوراً بھیجو۔''

''اوہ، تم وہی ہو نا سر! صرف فون پر گفتگو سننے کے بجائے ہمیں مزید ٹھوس ثبوت درکار ہے کہ کوئی جرم سرزد ہونے والا ہے۔ میں یہی تجویز کروں گا کہ تم اس شخص کا تعاقب چھوڑ دو اور سیدھا پولیس اسٹیشن آ کر رپورٹ درج کرادو۔'' ڈیسک سارجنٹ نے کہا۔

''رپورٹ درج کرادوں؟'' میں فون پر چیخ پڑا۔ ''تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو؟ وہ قتل کا ارتکاب کرنے ہی والا ہے۔''

''سر! فون بند مت کرنا...''

''لعنت ہو تم پر ....'' میں نے بڑبڑاتے ہوئے

فون بند کر دیا اور اس مکان کے عقبی حصے کی جانب چل دیا۔

میں نے کچن کی کھڑکی سے جھانکا تو مجھے قاتل کی ایک جھلک دکھائی دی جو بیسمنٹ کی سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہا تھا۔

اب مجھے تیزی سے کام لینا تھا۔ وہ یقیناً اس عورت کو قتل کرنے کے ارادے سے نیچے تہ خانے میں اتر رہا تھا۔ میں لپک کر مکان کے عقبی دروازے پر پہنچا۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ میں بلا ہچکچاہٹ قاتل کے گھر میں داخل ہو گیا۔

کچن کاؤنٹر پر ایک بڑا سا چاقو رکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ چاقو جھپٹ لیا اور بیسمنٹ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ میں ایک لمحے کے لیے سیڑھیوں کے اوپر رک گیا اور سننے کی کوشش کرنے لگا۔

مجھے کچھ سنائی نہیں دیا۔ میں آہستہ آہستہ قدموں سے کوئی آواز پیدا کیے بغیر بیسمنٹ کی لکڑی کی سیڑھیاں اترنے لگا۔

جب میں سب سے آخری زینے پر پہنچا تو چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ بیسمنٹ نہایت عمدہ قرینے سے آراستہ تھا۔

اچانک مجھے ایک شیطانی قہقہہ سنائی دیا۔ یہ آواز کمرے کے آخری گوشے میں ایک بند دروازے کے پیچھے سے ابھری تھی۔

میں اس دروازے کے قریب جا پہنچا۔

میں نے قاتل کو یہ کہتے سنا۔ ''اب وقت آ گیا ہے کہ تم جس سلوک کی مستحق ہو، وہ تمہارے ساتھ کرلیا جائے۔ تم بے وفا، بدکردار...''

اس ہاتھ پیر اور منہ بندھی عورت کا تصور کرتے ہوئے جو قتل ہونے جا رہی تھی، میں چاقو لہراتا اور چیختا ہوا دروازے کو دھکا دے کر اندر گھستا چلا گیا۔ ''نہیں، میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔'' یہ کہتے ہی میں دیوانہ وار اندر گھستا چلا گیا۔

میرے اس طرح اچانک در آنے پر وہ شخص حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے اپنی میز پر سے اٹھنے کی کوشش کی تو بدحواسی میں فرش پر گر پڑا۔ اور میں اسے اس حالت میں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

اس کی میز پر ایک ٹائپ رائٹر رکھا ہوا تھا جس پر وہ بلند آواز کے ساتھ اپنے پُراسرار ناول کا مسودہ ٹائپ کر رہا تھا۔

ویزا

''میں کل دس دن کے لیے چین جا رہا ہوں۔''

''کیا ویزا آسانی سے مل گیا؟''

''ویزا کی کیا ضرورت ہے؟''

''مجھے ڈر ہے کہ تم ویزا کے بغیر چین میں داخل نہیں ہو سکو گے۔''

''ارے نہیں بھائی... میں تین دفعہ چین جا چکا ہوں۔ وہاں کسی نے مجھ سے ویزا کارڈ طلب نہیں کیا... سب امریکن ایکسپریس کا کریڈٹ کارڈ خاموشی سے قبول کر لیتے ہیں۔''

تین انڈے

سوزی نے ایک مدت کے بعد گھر کی خوب صفائی کرنے کی ٹھان لی۔ شادی کے پچھلے بیس برسوں میں مسہری کے نیچے کاٹھ کباڑ کا ایک انبار جمع ہو گیا تھا۔ اس نے مسہری سرکا کر وہ سب نکالا تو اسے قدرے صاف ستھرا ایک چوبی ڈبا نظر آیا۔ سوزی کو حیرت ہوئی کہ اس پر گرد و غبار کی تہیں کیوں نہیں تھیں۔ ڈبا کھولا تو اس میں تین انڈے اور دس ہزار ڈالر موجود تھے۔

شام کو شوہر کی واپسی پر اس نے ڈبے کا ذکر کیا تو اس نے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ وہ جب بھی سوزی سے بے وفائی کا مرتکب ہوتا ہے تو ڈبے میں ایک انڈا ڈال دیتا ہے، سوزی نے دل میں سوچا کہ بیس برس میں شوہر کا صرف تین بار بھٹکنا قابلِ معافی ہے۔ اس نے اگلا سوال ڈالرز کے بارے میں کیا۔

''بکس چھوٹا ہے۔'' شوہر نے ایمان داری سے بتایا۔ ''انڈے زیادہ ہو جاتے ہیں تو میں انہیں بیچ کر رقم اسی ڈبے میں ڈال دیتا ہوں۔''

کوئٹہ سے حبیب اللہ جان کی دور اندیشی

آخری قسط

اسما قادری

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چال بازی یا مقدر کا کھیل..... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالاتر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کرکے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

یہ کیا ہو گیا تھا اور کیونکر ہو گیا تھا، کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ تا تھا۔ صدمہ بہت بڑا تھا اور ایسے وقت میں ان پر ٹوٹا تھا جبکہ وہ بیک وقت بہت سے محاذوں پر مشکل میں گھرے ہوئے تھے۔

''کرنل توحید شہید کر دیے گئے۔'' یہ خبر ایسی نہیں تھی کہ آسانی سے سن لی جاتی۔ سننے والوں کے حواس منجمد ہو گئے۔ اتنا گہرا صدمہ تھا کہ خواص و عوام سب نے اس کا اثر اپنے دلوں پر محسوس کیا تھا۔ سی ایف پی تو جیسے یتیم ہو گئی تھی۔ ''کرنل... کرنل توحید نہیں رہے۔'' اس بات کو سن کر قبول کرنا کوئی آسان تو نہیں تھا۔

''کیسے ہوا یہ سب کچھ؟'' شہریار نے سرخ آنکھوں سے ساکت بیٹھے ذیشان سے پوچھا۔

''جو فوٹیج ملی ہے، اس کے مطابق کرنل صاحب ایکسپو سینٹر سے کینٹ جانے کے لیے نکلے تھے کہ گلشن کالج کے قریب ان کی گاڑی کو روک لیا گیا۔ مجرموں نے ایک ریموٹ کنٹرولڈ اسپورٹس سائیکل پر پانچ چھ سالہ بچے کی ڈمی کو بٹھا کر عین کرنل کی گاڑی کے گزرنے کے وقت اسے سڑک پر دوڑا دیا۔ فطری طور پر ایک بچے کو گاڑی کی زد میں آنے سے بچانے کے لیے ڈرائیور نے بریک لگا دیے اور بس پھر وہ لوگ ٹوٹ پڑے۔ کرنل کے ڈرائیور اور گارڈ کے علاوہ بھی کئی بے گناہ راہ گیر زد میں آئے ہیں۔'' ذیشان نے سپاٹ لہجے میں اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔ وہ کرنل کی شہادت کی خبر ٹی وی پر سننے اور دیکھنے کے بعد ہی سی ایف پی کے ہیڈ کوارٹر دوڑا ہوا آیا تھا اور اب ذیشان سے حقائق جاننے کا خواہش مند تھا۔ ذیشان کی حالت اس سے بھی زیادہ ابتر تھی اور وہ دکھ کی اس انتہا پر پہنچا ہوا تھا جہاں آنسو بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔

''فوٹیج تم تک پہنچ گئی ہے؟'' شہریار نے اس سے پوچھا۔

''ہاں، تم بھی دیکھ لو۔'' ذیشان نے اپنا لیپ ٹاپ اس کی طرف کھسکایا۔ کسی اپنے کے مرنے کی خبر سننا ہی قیامت ہوا کرتا ہے، اس کے مرنے کا منظر دیکھنا تو پھر ستم در ستم تھا۔ لیکن وہ کیا کرتا؟ ان کا شعبہ ہی ایسا تھا کہ اسے خود پر جبر کر کے دیکھنا پڑا۔ ہونٹ بھینچے وہ فوٹیج دیکھتا رہا۔

''اس فوٹیج کو دیکھ کر تو ایسا لگتا ہے کہ حملہ آوروں کا مقصد کرنل کو ہلاک کرنا نہیں تھا، بس اتفاق سے یا بدحواسی میں انہوں نے کرنل کو نشانہ بنا دیا۔'' فوٹیج دیکھ کر اس نے تبصرہ کیا۔

اس کا یہ تجزیہ کئی اعتبار سے درست تھا۔ اگر ہلاک کرنا مقصد تھا تو اس کا سب سے آسان طریقہ تو یہی تھا کہ جس ریموٹ کنٹرولڈ سائیکل کے ذریعے کرنل کا راستہ روکا گیا، اس میں بارودی مواد نصب کر دیا جاتا اور ریموٹ کنٹرول

کے ذریعے ہی اسے اڑا دیا جاتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا تھا بلکہ مختلف سمتوں سے کرنل کو گھیرنے کی کوشش کی گئی تھی اور پہلے ان کے گارڈ اور ڈرائیور کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ کرنل والی سائڈ پر تو اس وقت کوئی براہ راست فائر بھی نہیں کیا گیا تھا جب تک کہ کرنل نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے خود فائرنگ شروع نہیں کی۔

فوٹیج میں دو افراد کرنل کی چلائی ہوئی گولیوں کی زد میں آکر گرتے ہوئے صاف دکھائی دے رہے تھے جبکہ ان پر گولیاں چلانے والے کا بھی سائڈ پوز نظر آرہا تھا۔ گولیاں کرنل کے سر اور گردن میں لگی تھیں اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے۔ ایک اور فوٹیج میں دو نقاب پوش نظر آرہے تھے وہ دونوں بھاگتے ہوئے کرنل کی گاڑی کی طرف آرہے تھے لیکن جب انہوں نے کرنل کو گولیاں کھا کر سیٹ پر گرتے دیکھا تو رک گئے۔ ایک نے ہاتھ کو اس انداز میں حرکت دی جیسے بُری طرح جھنجلایا ہو اور پھر وہ سب وہاں سے فرار ہونے لگے۔ سارا قصہ سیکنڈوں میں نمٹ گیا تھا لیکن یہاں تو قیامت آگئی تھی۔ شاید قیامت آتی بھی ایسے ہی ہے۔

"میرا بھی یہی اندازہ ہے۔" ذیشان نے سپاٹ لہجے میں اس کی تائید کی۔

"کرنل کے ہاتھوں ہلاک ہونے والوں کی شناخت ہوگئی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، وہ دونوں ایک کالعدم تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں اور تنظیم نے اس حملے کی ذمے داری قبول بھی کرلی ہے۔" ذیشان نے بتایا۔

"شٹ... یہاں یہی ہوتا ہے۔ ہمارے دشمن ہمیں ہمارے اپنوں کے ہاتھوں مروا دیتے ہیں اور نقصان ہر صورت ہمارا ہی ہوتا ہے۔ اب یہ دو جو کرنل کے ہاتھوں ہلاک ہوئے ہیں، ان کی موت کا بین بھی ہماری دھرتی کی مائیں ہی کریں گی۔" میز پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے اس نے لہورنگ لہجے میں کہا۔

"کیا کریں کہ ہماری غفلتوں نے ہمیں یہ فصل کاٹنے پر مجبور کردیا ہے۔ دشمن ہماری جڑوں میں گھس کر بیٹھ گیا ہے۔ وہ صرف ڈوریں ہلاتا ہے۔ کٹھ پتلیوں کی طرح اشاروں پر ناچنے والے وہ ہیں جن سے ہمارا کوئی نہ کوئی ناتا جڑا ہوا ہے۔ تم نے تو خود ایسے اداروں کو ڈس کور کیا ہے جہاں تعلیم کے نام پر ہمارے بچوں کے معصوم ذہنوں کو بھٹکایا جارہا ہے۔" ذیشان کے لہجے میں بھی دکھ بول رہا تھا۔

"ہاں اور میں جانتا ہوں کہ یہ زہر کتنی شدت سے پھیلایا جارہا ہے۔ میں تو آج تک ان نوجوانوں کو بھی نہیں بھولا ہوں جنہیں پانڈے اللہ آباد سے جاتے جاتے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ان نوجوانوں کے والدین کتنے دنوں تک میرے پاس آتے رہے تھے کہ اے سی صاحب! ہمارے بچوں کا کچھ معلوم کرو لیکن میں کچھ نہیں کرسکا۔ میں جانتا ہوں کہ ان نوجوانوں کو ایسے کسی تربیتی کیمپ لے جایا گیا ہوگا جہاں تعلیم کے نام پر ان کی نس نس میں زہر بھرنے کے بعد انہیں دہشت گردی کے طریقے سکھائے گئے ہوں گے اور پھر فیلڈ میں بھیج دیا گیا ہوگا۔ کیا معلوم کہ اب تک وہ کسی حملے، کسی کارروائی میں کام بھی آچکے ہوں لیکن ان کی مظلوم ماؤں کی آنکھیں تو ان کی راہ دیکھتی ہوں گی نا اور راہ دیکھنے والی وہ مائیں کون ہیں؟ ان کا شمار میرے اپنوں میں ہی تو ہوتا ہے۔" کرنل کی جدائی کے دکھ سے نڈھال جانے وہ کن کن دکھوں کو رو رہے تھے کہ یہ رونا تو نصیب میں لکھ دیا گیا تھا۔

☆☆☆

"کرنل مرگیا، یہ اچھا نہیں ہوا۔ تم اسے زندہ لے کر آتے تو وہ ہمارے بہت کام آتا۔ بہت کچھ جاننا تھا مجھے اس سے۔" ڈیوڈ نے دانت کچکچاتے ہوئے اپنے سامنے کھڑے آدمی سے کہا۔ وہ شخص اتنا شرمندہ تھا کہ اس کا سر اوپر نہ اٹھتا تھا اور آنکھیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ نظر اٹھا کر دیکھتا بھی تو اسے اپنے سامنے بیٹھے ڈیوڈ کی اصل شکل دیکھنے کو نہ ملتی۔ دنیا کی کئی زبانوں پر عبور رکھنے والا وہ عیار شخص حلیہ بدلنے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ اس وقت وہ ایک قبائلی سردار کے بہروپ میں بیٹھا اپنے غصے کا اظہار کررہا تھا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں جناب... بس میرے ایک آدمی کی غلطی نے سارا معاملہ بگاڑ دیا۔ کرنل کے گولیاں چلانے پر اس نے خود بھی گھبرا کر اس پر گولیاں چلادیں۔ اسے اس کی اس غلطی کی سزا دی جاچکی ہے۔" شرمسار کھڑے شخص نے صفائی پیش کی۔

"غلطی اس سے زیادہ تمہاری ہے۔ اتنی اہم مہم کے لیے تم نے آدمیوں کا انتخاب کرتے ہوئے ہوشیاری سے کام کیوں نہیں لیا اور ایک ایسے آدمی کو اپنے ساتھ کیسے شامل کرلیا جو ذرا سی فائرنگ سے گھبرا گیا؟" ڈیوڈ نے اس کی گوشمالی کی۔ اس بار وہ خاموش رہا اور کوئی صفائی پیش نہیں کی۔

"مداوا خان مداوا... تمہیں اپنی اس غلطی کا مداوا کرنا ہوگا۔" ڈیوڈ نے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے اسے گھورا۔

"میں تیار ہوں سردار۔" وہ جو بہت خونخوار تھا اور ایک سیکنڈ میں لوگوں کی زندگیوں کے فیصلے کرڈالتا تھا، ڈیوڈ کے سامنے بھیگی بلی بنا ہوا تھا کہ ہر ایک کے لیے کوئی نہ کوئی زبردست تو ہوتا ہی ہے۔

"معلوم کرو کہ کرنل کی لاش کب اس کے آبائی گاؤں بھیجی جارہی ہے اور کوئی ایسا چلتا پُرزہ رپورٹر ہائر کرو جو ہر ہر لمحے کی رپورٹ ہم تک پہنچاتا رہے۔ اس رپورٹر کی ذمے لگاؤ کہ وہ پوسٹ مارٹم سے لے کر تدفین تک آس پاس نظر

آنے والے لوگوں پر نظر رکھے۔ کرنل کے خاص آدمی اس موقع پر اس سے دور نہیں رہیں گے۔ تمہارے ہائر کیے ہوئے رپورٹر کو ان افراد کی فہرست فراہم کرنی ہے۔ فہرست سامنے آجائے تو باری باری ان افراد کو اٹھانا اور ان سے وہ جاننے کی کوشش کرنا جو ہم کرنل سے جاننا چاہتے تھے۔" ڈیوڈ نے حکم جاری کیا۔

"بےفکر رہیں سردار... سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہی ہوگا۔"

"مجھے کوئی فکر نہیں خان۔ فکر تم کرو اپنی۔ اس بار کوئی گڑبڑ ہوئی تو انجام تمہارا بُرا ہوگا۔" ڈیوڈ کی دھمکی پر اس کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ یہ سردار کبھی کبھی ہی اس سے ملاقات کرتا تھا۔ عام طور پر اس کے احکامات ہی ملتے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ دل کھول کر دولت لٹانے والا یہ سردار کتنا سفاک ہے۔ وہ خود کئی بار اس کے حکم پر کئی لوگوں کو ان کی کوتاہیوں کی سزا دے چکا تھا اور یہ سزائیں اتنی ہولناک ہوتی تھیں کہ سہنے والا تو سہنے والا، دیکھنے والا بھی لرز جاتا تھا۔

"اب میں دوبارہ تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔ میرا آدمی تم سے رابطہ کرے گا۔ اسے پابندی سے رپورٹ دیتے رہنا۔" اسے اچھی طرح خوف زدہ کردینے کے بعد ڈیوڈ وہاں سے روانگی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے علاقے میں دہشت کی علامت بن کر رہنے والا خان کسی وفادار کتے کی طرح اسے اس کی گاڑی تک رخصت کرنے گیا۔ جس کوٹھی میں ان کی ملاقات ہوئی تھی، وہ خان کی ہی ملکیت تھی لیکن ڈیوڈ نے اسے فون کرکے یوں وہاں بلوایا تھا جیسے وہ خود کوٹھی کا مالک رہا ہو۔ ایک طرح سے وہ تھا بھی کیونکہ اس کے ٹکڑوں پر پلنے والے خان جیسے کئی مہرے اس دولت سے ہی تو یہ جائدادیں بناتے تھے جو وہ انہیں ان کی خدمات کے عوض عطا کرتا تھا۔ وہ دنیا کی خطرناک ترین سیکرٹ سروس موساد کا نمائندہ تھا جو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے دونوں ہاتھوں سے دولت لٹانے کی طاقت رکھتی تھی اور جس کی پٹاری میں بےشمار عیاریوں بھرے حربے موجود تھے۔

وہاں سے روانہ ہونے کے بعد اس نے لنڈا سے رابطہ کیا۔

"کیا ہورہا ہے ڈارلنگ؟"

"چودھری کی میزبانی کا لطف اٹھا رہی ہوں۔" اس نے کھلکھلا کر بتایا۔

"کام وام بھی دیکھا یا اس بڈھے کے پہلو سے ہی لگی بیٹھی ہو؟" کرنل والی ناکامی کی وجہ سے اس کا موڈ قدرے خراب تھا، اس لیے لنڈا کی کھلکھلاہٹ پسند نہیں آئی۔

"کام ہمیشہ میری پہلی ترجیح رہی ہے اور تم جانتے ہو کہ بڈھے کے پہلو سے لگ کر بیٹھنا بھی میرے کام کا ہی حصہ ہے۔" اس نے ڈیوڈ کے الفاظ و انداز کا بُرا منایا۔

"سوری، میں ذرا ٹینشن میں تھا۔ یہاں میرے دوسرے مشن کو بھی مکمل کامیابی حاصل نہیں ہوسکی ہے۔ میرے ہائر کیے آدمی کرنل توحید کو صحیح وقت پر گھیرنے میں تو کامیاب ہو گئے تھے لیکن وہ اسے اغوا کرکے نہیں لاسکے اور کرنل اپنی... جی داری کی وجہ سے موقع پر ہی مارا گیا۔" گاڑی چلاتے ہوئے اس نے اطمینان سے لنڈا کو ساری بات بتائی۔

وہ اور لنڈا خصوصی موبائل سیٹس پر بات کررہے تھے اس لیے انہیں یہ ڈر نہیں تھا کہ ان کی یہ گفتگو کہیں سن لی جائے گی۔ خود کو عظیم اسرائیل کا خادم کہنے والے ان خطرناک ایجنٹوں کو اپنی چالاکیوں کے علاوہ اکثر اس لیے بھی برتری حاصل ہوتی تھی کہ وہ جدید سائنسی ایجادات سے لیس ہوتے تھے۔ وہ اس قوم کے افراد تھے جنہوں نے برسوں کی ذلت کے بعد زبردستی اسرائیل کو پایا تھا اور اب اتنے طاقتور ہوچکے تھے کہ اپنے گاڈ فادر امریکا تک کو نہ صرف آنکھیں دکھاتے تھے بلکہ ان کے خلاف سازشیں بھی کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے محسنوں کو بھی کبھی نہیں بخشا تھا۔ ان کے علم میں لائے بغیر ان کی جاسوسی بھی کرتے تھے اور بلیک میلنگ بھی۔ امریکا میں ہیروئن کا پھیلاؤ بھی ان کا ایک منصوبہ تھا جس کے لیے وہ پاکستان کی سرزمین اور افراد کو نہایت چالاکی سے استعمال کررہے تھے۔ امریکا ردِعمل میں کچھ کرتا تو پاکستان کے خلاف۔ ان کا بھلا کیا بگڑتا۔

"یہاں سب کچھ بالکل ٹھیک چل رہا ہے۔ مشینری فکس ہوگئی ہے، مال پہنچ چکا ہے اور کام کرنے والے بندے بھی موجود ہیں۔ نگرانی کا انتظام بھی اچھا ہے۔ بس چودھری تھوڑا سا ٹینس ہے کہ کہیں وہ پھنس نہ جائے تو اسے ریلیکس کرنے کے لیے ہی تو میں یہاں اس کے ساتھ آئی ہوں۔ تم بھی بےفکر رہو، اس طرف صورتِ حال مکمل طور پر ہمارے قابو میں ہے۔" لنڈا نے اسے بتایا۔

"خوشی کی بات ہے پھر بھی تم ہوشیار رہنا کیونکہ ابھی حال ہی میں جنگل میں خاصی گڑبڑ ہوئی ہے۔" ڈیوڈ اسے پیش آنے والے واقعے کی تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔

"اوہ... کچھ معلوم نہیں ہوا کہ وہ کون لوگ تھے؟" لنڈا سن کر تشویش میں مبتلا ہوئی۔

"نہیں، کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ تمہیں معلوم ہے کہ

یہاں ہمارے اپنے تربیت یافتہ افراد کی کمی ہے اس لیے مقامی افراد پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور یہ سارے مقامی بلڈی فول ہیں۔ کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرتے۔'' ڈیوڈ کو ایک بار پھر کرنل کے اغوا میں ناکامی یاد آ گئی تھی حالانکہ یادر کھنے کی بات تو یہ بھی تھی کہ را اور موساد کے تربیت یافتہ کمانڈوز بھی ایئربیس پر حملہ کر کے منہ کی کھا چکے تھے۔ بے شک ان کمانڈوز نے وہاں خاصی تباہی پھیلا دی تھی لیکن آخرکار خود بھی مارے گئے تھے بلکہ ایک تو زندہ وطن کے رکھوالوں کے ہاتھ لگ گیا تھا اور اس کی گرفتاری کی وجہ سے ڈیوڈ کو اپنے کئی اہم ٹھکانوں کی تبدیلی کا حکم دینا پڑا تھا۔

''ریلیکس رہو ڈارلنگ! میں ہوں نا یہاں۔ میں سب سنبھال لوں گی۔'' لنڈا نے ڈیوڈ کے موڈ کی خرابی دور کرنے کی کوشش کی۔ وہ صرف کام کے حوالے سے بہترین ساتھی نہیں تھے بلکہ ان کے درمیان تعلقِ خصوصی بھی تھا۔ لیکن ڈیوڈ کا شمار ان مردوں میں نہیں ہوتا تھا جو اپنی محبوبہ کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کے قائل ہوں اور اس کا کسی کے ساتھ نام تک لیے جانے پر تکلیف محسوس کرتے ہوں۔ وہ اپنے تئیں عظیم اسرائیل کے مفاد میں سب کچھ قربان کر رہا تھا اور مفادات کے حصول کے لیے لنڈا کے بے مثال حسن کو ریوڑیوں کی طرح بانٹنے پر قطعی معترض نہیں تھا۔ دوسری طرف لنڈا بھی خود کو کوئی آبرو باختہ عورت نہیں بلکہ اسرائیل کی عظیم مجاہدہ سمجھتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے اجداد نے اسرائیل کے قیام کے لیے وہ سب کچھ داؤ پر لگا یا تھا جو ان کے پاس تھا اور وہ بھی ان کے نقشِ قدم پہ چل رہی تھی۔ وہ اپنے حسن کی دولت کو ڈیوڈ سے پہلے اسرائیل کی ملکیت تصور کرتی تھی چنانچہ اسرائیلی مفادات کے لیے بے دریغ اس کا استعمال کرتی تھی۔ بھارت، پاکستان، امریکا اور افغانستان میں کتنے تھے جو اس کے حسن کے جال میں پھنس کر اس کی وہ خواہشات پوری کرتے تھے جن سے اسرائیل کا مفاد وابستہ تھا۔ سو ایک طرح سے وہ اپنے عمل کے لیے خود کو حق بجانب سمجھنے میں درست بھی تھی۔

''اچھا، یہ بتاؤ کہ تم کب تک پاکستان میں ہو؟'' لنڈا نے یک دم ہی گفتگو کا رخ بدلا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میرے یہاں آنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس فورس کا کھوج لگاؤں جو اب تک ہمیں کئی ضربات لگا چکی ہے لیکن ابھی تک اس مقصد میں کامیابی نہیں ملی ہے۔ یاریا اور سنتھیا کے ذریعے ہمیں کرنل توحید کا ایک کلیو ہاتھ آیا تھا لیکن ہم اس تک رسائی میں بھی ناکام رہے۔ اب میں ایک دوسرے ذریعے سے کوشش کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ اس طرح کامیابی مل جائے گی۔ یہ کامیابی مل جائے اور میں اس فورس کو منتشر کرنے کا کام انجام دے ڈالوں تو پھر پاکستان سے روانگی بھی ہو جائے گی۔'' ڈیوڈ نے اپنا پروگرام بتایا۔

''پھر تو تمہارا یہاں قیام کافی لمبا ہو سکتا ہے۔ میں تو بس زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کے لیے یہاں ہوں۔'' لنڈا نے تبصرہ کرتے ہوئے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔

''بہتر ہے کہ تم اور بھی پہلے یہاں سے نکل جاؤ۔ چودھری کی حویلی میں تمہاری موجودگی ان لوگوں کے کان کھڑے کر دے گی جو چودھری کو مشکوک سمجھ کر پہلے ہی اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔'' ڈیوڈ نے اسے مشورہ دیا۔ لنڈا کا دبئی سے پاکستان آنا اسے زیادہ پسند نہیں آیا تھا لیکن یہ الفا کی خواہش تھی اس لیے وہ منع بھی نہیں کر سکا تھا۔ الفا اور اس کے ساتھی مل کر وہ بین الاقوامی تنظیم چلا رہے تھے جو دنیا بھر میں ہیروئن اور دیگر نشہ آور اشیا کے پھیلاؤ کے لیے کام کر رہی تھی۔ اس تنظیم کی غیر اعلانیہ حکومتی سرپرستی کرنے والا اسرائیل اس سے دو بنیادی فوائد حاصل کر رہا تھا۔ اوّل اپنے حریفوں اور حلیفوں کے مستقبل کو نشے میں ڈبو کر تاریک کرنا، دوسرے بے تحاشا دولت کا حصول۔ موساد اس تنظیم سے تعاون کرنے کی پابند تھی کیونکہ اس کا صرف ایک ایجنڈا تھا... ''اسرائیل کا مفاد۔'' اب یہ مفاد دشمنوں کو کچل کر حاصل ہوتا یا دوستوں کی گردنوں پر پاؤں رکھ کر... انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔

''ڈونٹ وری ڈیوڈ! تم صرف اپنے کام پر توجہ رکھو اور میرے لیے بالکل بھی پریشان مت ہو۔ تم جانتے ہو کہ میں مشکل حالات سے نکلنے کا گُر جانتی ہوں۔ اگر یہاں کسی نے مجھے گھیرنے کی کوشش کی بھی تو چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر نکل جاؤں گی۔'' لنڈا نے تسلی دینے والے انداز میں کہا اور اپنی بات کے اختتام پر کھلکھلا کر ہنسی۔ ڈیوڈ نے بھی اس کی ہنسی کا ساتھ دیا لیکن اس کی آنکھوں میں تشویش کے سائے پوری طرح غائب نہیں ہوئے تھے۔ ٹریفک کے بہاؤ میں بہتے ہوئے وہ اپنے ذہن سے وہ سارے اندیشے جھٹکنے میں ناکام رہا تھا جو حالات کو دیکھتے ہوئے پیدا ہوئے تھے۔

☆☆☆

''ہماری خاطر تم نے خود کو بڑی مشکل میں پھنسا لیا ہے۔'' ماہ بانو نے نازک اندام جوڈی کی طرف دیکھتے ہوئے تفکر سے کہا۔

''کچھ نہیں ہوتا۔ ہم بچنے کی کوئی نہ کوئی راہ نکال لیں گے۔ تمہیں پناہ دینے کا فیصلہ جان کا تھا اور میں اس کے کسی فیصلے سے اختلاف نہیں کرتی ہوں۔'' جوڈی نے مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''جان خوش قسمت ہے کہ اسے تم جیسی فرماں بردار بیوی ملنے والی ہے۔'' ماہ بانو نے بھی مسکراتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''فرماں بردار بیوی۔'' جوڈی اس کے الفاظ دُہراتے ہوئے ہنسی پھر بولی۔ ''میں نے سنا ہے تمہارے ہاں بیویاں اپنے شوہروں کی بہت فرماں بردار ہوتی ہیں۔''

''حالات پر منحصر ہے۔ ہمارے ہاں بھی بعض عورتیں اپنے شوہروں کی بالکل نہیں سنتیں لیکن اکثریت ان کے فیصلوں کا احترام کرتی ہے۔ اصل میں ہمارے ہاں مرد کو خاندان کا سربراہ تسلیم کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ سربراہ کی فرماں برداری نہ کی جائے تو نظام بگڑ جاتا ہے۔''

''میں جان کی بات صرف اس لیے مانتی ہوں کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ وہ ہے بھی سمجھ دار آدمی، غیر اصولی فیصلے نہیں کرتا اس لیے مجھے بھی اس کی بات ماننے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا۔ اب تم اپنے ہی معاملے کو دیکھ لو۔ تمہارے ساتھ یہاں ظلم کیا گیا تھا اور انسانیت کے ناتے ہمارا فرض تھا کہ ہم اس ناانصافی کے خلاف تمہارا ساتھ دیں۔ تمہیں مظلوم جاننے کے باوجود اگر ہم تمہیں ان درندوں کے حوالے کر دیتے تو ساری زندگی خود کو کیا جواب دیتے اور آنے والے وقتوں میں اپنے بچوں کو انسانیت کا درس کیسے دیتے؟'' وہ اپنے عمل پر بالکل مطمئن تھی۔ ماہ بانو کو اس پر رشک محسوس ہوا۔ جو اخلاقی اقدار مسلمانوں میں پائی جانی چاہیے تھیں، وہ ان لوگوں میں موجود تھیں جن پر بے حیائی اور کفر کے فتوے دائر کرتے ہم ہر طرح کی بداعمالیوں میں مبتلا خود کو جنت کا وارث سمجھتے ہیں۔

''جان کا دوست کارلوس اثر رسوخ والا بندہ ہے۔ وہ ہمارے لیے بچاؤ کی کوئی نہ کوئی راہ نکال لے گا۔ تم اس کی طاقت کا اندازہ اس بات سے کر لو کہ ابھی تک کسی نے یہاں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کی ہے حالانکہ میرے گھر پر جان اور اس کے دوستوں کی موجودگی کے باعث وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس کا تعلق ہارلم سے ہے۔ ان کی انویسٹی گیشن نے یہ بھی واضح کر دیا ہوگا کہ ہم تمہیں اپنے ساتھ یہاں لے کر آئے ہیں لیکن وہ یہاں ایسے ہی منہ اٹھا کر چڑھائی نہیں کر سکتے۔ انہیں معلوم ہے کہ وہ یہاں آئے تو پورا ہارلم ان کے مقابل سینہ تان کر کھڑا ہوگا اور چاہے وہ انہیں کتنا ہی حقیر سمجھیں، بہرحال ان سے اس وقت جیسا سلوک نہیں کر سکتے

جب یہ لوگ گوروں کے غلام ہوتے تھے اور ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔ صدیوں کی جدوجہد کے بعد ان سیاہ فاموں نے اپنے حقوق تسلیم کروائے ہیں اور آج اتنے کمزور نہیں رہے ہیں کہ ان کے ساتھ من مانا سلوک کیا جا سکے۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ اجداد سے سیاہ فاموں کے لیے نفرت نئی نسل میں بھی منتقل ہوئی ہے لیکن اس کی شدت یا تناسب پہلے کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ جو نفرت رکھتے ہیں، وہ بھی سیاہ فاموں کی طاقت سے خائف رہتے ہیں۔'' جوڈی اسے حقائق سے آگاہ کر رہی تھی کہ جان کے ساتھ مشابرم خان وہاں آ گیا۔

''میری مصطفیٰ خان سے بات ہوئی ہے۔ اس نے تمہارے لیے ایک پیغام بھیجا ہے۔''

''کیسا پیغام؟'' وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تمہاری اور مجاہد کی ایک ویڈیو تیار کی جائے گی۔ اس ویڈیو میں تم اپنے اغوا سے لے کر جنگل میں قائم خفیہ لیبارٹری، پروفیسر ہنری اور اس کے ساتھی ڈاکٹروں کے تجربات سمیت وہ سب کچھ بتاؤ گی جو وہاں تمہارے ساتھ پیش آیا یا تم نے وہاں دیکھا۔ تم بتا سکتی ہو کہ اسلم نے خود اس لیبارٹری کو تباہ کیا تھا جہاں انسانوں پر غیر انسانی تجربات کیے جا رہے تھے۔ تم بتانا کہ کس طرح تم وہاں سے فرار ہوئیں اور اس کوشش میں تمہارے شوہر کی جان گئی۔ اس ویڈیو میں تم اپنی اور اپنے بچے کی جان کو لاحق خطرے کے بارے میں بھی بتاؤ گی۔'' مشابرم خان نے اسے مصطفیٰ کے پیغام کے بارے میں بتایا۔

''لیکن کیوں؟'' وہ حیران ہوئی۔

''ہم، اس ویڈیو کو سب سے پہلے پولیس اور ایف بی آئی تک پہنچائیں گے اس پیغام کے ساتھ کہ اگر ان لوگوں نے تمہارا پیچھا نہیں چھوڑا تو یہ ویڈیو انٹرنیٹ پر ڈال دی جائے گی اور دنیا بھر میں انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والی تنظیموں سے اپیل کی جائے گی کہ ایک بے سہارا لڑکی اور اس کے بچے کی جان بچانے کی کوشش کی جائے۔'' اس بار جان نے اس کو وضاحت دی۔

''شاید اس سے کوئی فرق نہ پڑے۔ تمہارے حکام کہہ دیں گے کہ یہ سب جھوٹ ہے اور آرلینڈو کے جنگلات میں آگ لگنے کے واقعے کو بنیاد بنا کر انہیں بدنام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔'' ماہ بانو نے اعتراض کیا۔

''ایسی صورت میں تمہارے پاس اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے ثبوت موجود ہیں۔'' مشابرم خان اطمینان

سے بولا۔

''کیسے ثبوت؟'' وہ حیران ہوئی۔

''اسلم اور پروفیسر ہنری کی لاشیں دریافت نہیں ہوسکی ہیں اور یہ صرف تم جانتی ہو کہ وہ لاشیں کہاں ہیں۔ اس کے علاوہ جس اسپتال میں مجاہد کی پیدائش ہوئی، وہاں تمہارے اور مجاہد کے خون کے نمونوں سے حاصل کردہ ایسی رپورٹس موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ دورانِ حمل تمہیں کچھ خاص قسم کی ادویات اور غذائیں استعمال کروائی جاتی رہی تھیں جس کی وجہ سے بچہ نارمل انسانوں سے قدرے مختلف ہے۔ ہمارے ایک ساتھی کے موبائل میں ایڈی کی وہ ویڈیو بھی محفوظ ہے جو اس نے اس وقت بنائی تھی جب ایڈی مجھے لیبارٹری اور تمہارے متعلق بتا رہا تھا۔ ہوسکتا ہے اس ویڈیو میں ایڈی کی آواز واضح نہ ہو لیکن اس کی تصویریں تو واضح ہیں نا... اگر امریکی حکام اس کی اصلیت قبول کرنے سے انکار بھی کریں تو انہیں یہ جواب دینا ہوگا کہ جنگل سے برآمد ہونے والی لاشوں کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا۔ مزید برآں ان کی پوسٹ مارٹم رپورٹ ثابت کردے گی کہ ہلاک ہونے والوں کی موت کا سبب آگ نہیں تھی بلکہ وہ مختلف حادثات کا شکار ہوئے۔ مصطفیٰ خان نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر بہت سی معلومات حاصل کرلی ہیں اور امریکی حکام اتنی آسانی سے اس سارے معاملے کو کور اپ نہیں کرسکیں گے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے پاس تمہارے خلاف کوئی فردِ جرم نہیں ہے۔ تم معمولی سے معمولی جرم میں بھی قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے کو مطلوب نہیں ہو تو پھر امریکی حکام یوں تمہارے پیچھے لگے رہنے کا کیا جواز پیش کرسکتے ہیں؟''

مشا یرم خان نے اسے جو تفصیلات سنائیں، ان سے واضح ہوگیا کہ اس کے یہاں موجود مددگار و ہمدرد ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے ہیں بلکہ اس کے یہاں سے نکلنے کے انتظامات کیے جارہے ہیں۔

''ٹھیک ہے۔ میں ویڈیو بنوانے کے لیے تیار ہوں۔ اگر اس طرح نجات کی کوئی راہ نکل آئی تو مجھے خوشی ہوگی ورنہ جتنے یہ لوگ چالاک ہیں، مجھے یقین ہے کہ اس کا بھی کوئی نہ کوئی توڑ تلاش کرہی لیں گے۔'' وہ بہت زیادہ پُرامید نہیں تھی۔ ناامیدی کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ کوئی یاسیت زدہ عورت تھی، بس حقیقت اتنی تھی کہ اسے دشمن کی طاقت کا اندازہ تھا کہ وہ کیسے اپنے مدمقابل کو مسل دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

''ہوسکتا ہے وہ کوئی توڑ تلاش کرلیں لیکن اس ڈر سے ہم کوشش تو ترک نہیں کرسکتے۔ تمہارے سامنے ہماری قوم کی مثال ہے۔ ہم ان کے ہاتھوں کتنی بُری طرح پسے ہوئے تھے لیکن صرف اور صرف کوشش سے ہی نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، سو تم بھی کوشش کرو۔ ویسے بھی تمہارے معاملے کا تعلق امریکا کے لاڈلے اسرائیل سے ہے۔ امریکی حکام نہیں چاہیں گے کہ ان کی اسرائیل کو دی گئی اس سہولت کا ذکر لوگوں کے سامنے آئے۔ جھٹلانے کو وہ جھٹلا دیں گے لیکن دنیا بھی جانتی ہے کہ جہاں آگ ہوتی ہے وہیں سے ہی دھواں اٹھتا ہے۔ باقی دنیا رہی ایک طرف، خود امریکا کے مہذب شہری اس امر پر احتجاج کریں گے کہ امریکی حکام نے غیر انسانی واخلاقی تجربات کے لیے ایک اسرائیلی سائنس داں کو اپنی سرزمین اور اس پر بسنے والے لوگ استعمال کرنے کی اجازت کیسے دی۔ بات نکلے گی تو پھر حالیہ برسوں میں غائب ہونے والی حاملہ خواتین کے غیر حل شدہ کیسز پر بھی بات ہوگی اور ان کے لواحقین کی طرف سے بھی احتجاج سامنے آئے گا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے حکام اتنا پریشر برداشت کرنے کے بجائے تم سے کوئی خاموش معاہدہ کرنا زیادہ پسند کریں گے۔'' جان نے دلائل کے ساتھ اس کی ہمت بندھائی تو اسے بھی منظر کچھ روشن نظر آنے لگا اور وہ اپنے بچے کو سینے سے لگائے ویڈیو ریکارڈ کروانے کے لیے تیار ہوگئی۔

☆☆☆

ذیشان نے اپنے موبائل پر موصول ہونے والی اطلاع سنی اور پھر کچھ سوچتے ہوئے شہریار کا نمبر ڈائل کیا۔

''ہاں ذیشان! کہو کیا بات ہے؟'' کرنل توحید کی شہادت کے بعد وہ سب بہت بکھرے ہوئے تھے اور ہر لمحہ یہ ڈر لگتا تھا کہ جانے اب کیا سننے کو مل جائے چنانچہ اس وقت بھی شہریار نے قدرے اضطراب کے عالم میں اس کی کال ریسیو کی تھی۔

''اسپتال میں اشیش کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔'' ذیشان نے اسے اطلاع دی۔ یہ اشیش وہی تھا جو پہلے پیر آباد کے مدرسے میں امام کا بہروپ بھر کر رہ رہا تھا، ساتھ ہی قوم لوط کا بھی پیروکار تھا۔ ماہ بانو کا اکلوتا اور معصوم بھائی اسی کی ہوس کا نشانہ بن کر اپنی جان سے گیا تھا لیکن اس موقع پر اشیش کا کردار بھی سامنے آگیا۔ وہ پیر آباد سے فرار ہوا اور ایک دوسرے گاؤں میں جاکر وہی سب کچھ کرنے لگا جو پیر آباد میں کرتا تھا۔ اب یہ اتفاق تھا کہ چودھری کے عتاب سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر بھٹکتے آفتاب اور کشور بھی اسی گاؤں میں رہائش پذیر ہوگئے۔ وہاں آفتاب نے اشیش کو دیکھ کر

شناخت کرلیا اور شہریار کو اطلاع دے دی۔ اشیش گرفتار کرلیا گیا لیکن بعد میں اسے کوما کی حالت میں اسپتال میں داخل کروانا پڑا۔ یہی وقت تھا جب شہریار افسر شاہی کے منصب کو ٹھکرا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سی ایف پی کو جوائن کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنی اصل شناخت کو بھی قربان کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا کہ را اور موساد کے ایجنٹس پہلے ہی اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے اور وہ سجاد رانا اور شینا کی اموات کے انتقام کے علاوہ جذبۂ حب الوطنی سے سرشار کچھ نہ کچھ کرنے کا خواہاں تھا۔ چنانچہ دشمنوں کو یہ تاثر دیا گیا کہ بم بلاسٹ میں شدید زخمی ہونے کے بعد وہ کوما میں چلا گیا ہے۔ ایک جیسا قد کاٹھ رکھنے کی وجہ سے اشیش کو ہی شہریار قرار دے دیا گیا اور دشمنوں کو خود ایسے ثبوت فراہم کیے گئے کہ وہ یقین کرنے پر مجبور ہوگئے کہ اسپتال میں بے بس ولاچار پڑا بندہ شہریار عادل ہی ہے۔ اشیش کے اس نیم مردہ وجود کے اخراجات وہ صرف اس لیے اٹھا رہے تھے کہ مستقبل میں شہریار کو اپنے بارے میں یہ فیصلہ کرنے میں آسانی رہے کہ آیا وہ ہمیشہ کے لیے عادل خان ہی بن کر رہنا چاہتا ہے یا اسے اپنی شہریار عادل والی حیثیت واپس چاہیے۔

اشیش کی موت نے فیصلے کی گھڑی اس کے سر پر لاکھڑی کی۔ اب اسے یہ مشکل فیصلہ کرنا تھا کہ وہ اپنے لیے کیا چاہتا ہے۔ اس فیصلے پر ہی اس کی آئندہ پوری زندگی کا انحصار تھا اور قسمت نے عجیب چال چلی تھی کہ فیصلے کا یہ مرحلہ اس وقت اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا جبکہ کرنل توحید کی شہادت سے ان میں سے ہر ایک اپنے دماغ کو ماؤف ہوتا محسوس کررہا تھا۔ کرنل ان لوگوں کے لیے کیا تھے، اسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل تھا لیکن فی الحال تو ان سب کو ایسا لگتا تھا کہ کسی لق ودق صحرا میں بالکل خالی ہاتھ کھڑے ہیں۔ نہ ان کو اس صحرا سے نکلنے کا راستہ معلوم ہے اور نہ ہی وہ وسائل پاس ہیں کہ جن کی موجودگی صحرا سے نکلنے کی کوشش کا آسرا بن سکے۔

''کرنل کو کب ان کے آبائی گاؤں روانہ کیا جارہا ہے؟'' بہت دیر بعد ذیشان کی دی اطلاع پر تبصرہ کرنے کے بجائے شہریار نے ایک بالکل مختلف سوال کیا۔ ذیشان کرنل کی شہادت کی اطلاع ملنے کے بعد فوری دستیاب فلائٹ سے کراچی چلا گیا تھا اور اس اسپتال میں موجود تھا جہاں کرنل کا پوسٹ مارٹم کیا جارہا تھا۔ اشیش کے مرنے کی اطلاع شہریار سے پہلے اس تک اس لیے پہنچی تھی کہ اسپتال انتظامیہ کو اس بارے میں سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اس مریض کے بارے میں کوئی بھی اطلاع اس کے اعزا سے پہلے انہیں دینے کے پابند ہوں گے۔ سی ایف پی کو کور دینے کے لیے بنائی گئی سیکیورٹی ایجنسی کا ایک گارڈ ہمہ وقت اسپتال میں ہی رہتا تھا اس لیے سب سے پہلے اطلاع ذیشان تک پہنچی تھی۔

''پوسٹ مارٹم ہوگیا ہے۔ جنازے کو خصوصی طیارے سے پہلے پنڈی بھجوایا جائے گا اور پھر وہاں سے ان کے آبائی گاؤں پہنچانے کا بندوبست ہوگا۔ میں اس خصوصی طیارے میں جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں جس میں کرنل کو پنڈی لے جایا جارہا ہے۔ وہاں سے پھر میں ان کے گاؤں جاؤں گا۔'' ذیشان نے اسے پروگرام سے آگاہ کیا۔ اس وقت وہ انسان سے زیادہ ایک روبوٹ کی طرح کام کررہا تھا۔ صدمے نے اسے اس حد تک متاثر کیا تھا کہ اسے لگتا تھا کہ اس کے سارے حواس مکمل طور پر اپنا کام انجام نہیں دے رہے ہیں۔ اس وقت وہ بس زیادہ سے زیادہ وقت کرنل کے قریب گزارنے کا خواہش مند تھا۔ وہ ایک بے روح جسم میں تبدیل ہوگئے تھے پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ اس وقت تک ان کے قریب رہے جب تک ان کا وجود زمین پر موجود ہے۔ قبر میں تو انسان کے اعمال کے سوا اس کے ساتھ کسی کو جانے کا اختیار نہیں ہوتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت وہ جذباتیت کا مظاہرہ کررہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کی یہاں موجودگی کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ سی ایف پی کا مقامی ہیڈ کوارٹر یہاں تھا پھر سب سے بڑھ کر فوج کے اپنے لوگ سارے معاملات کو دیکھنے کے لیے موجود تھے لیکن ذیشان پھر بھی خود کو نہیں روک سکا تھا۔ وہ کیسے خود کو روک سکتا تھا۔ کرنل توحید وہ انسان تھے جنہوں نے اس وقت اس کی اپنی نظروں میں کھوئی ہوئی عزت کو بحال کرنے میں مدد دی تھی جب وہ ایملی پارکر جیسی حسینہ کے جال میں پھنس کر اپنی ہی فورس سے غداری کا مرتکب ہوگیا تھا۔ یہ غداری شعوری نہیں تھی۔ ایملی نے اپنے حسن اور شراب کے نشے میں ڈبو کر اس سے چند قیمتی راز حاصل کرلیے تھے اور پھر اڑن چھو ہوگئی تھی۔ ذیشان کو ہوش آیا تو چڑیا کھیت چگ کر جاچکی تھی۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ اپنی کوتاہی کا اعتراف کرکے سزا پالے اور ہمیشہ کے احساسِ جرم سے نکل آئے۔ اس نے یہ اعتراف کرنل کے سامنے ہی کیا تھا لیکن کرنل نے اسے سزا نہیں دی اور انسانی جبلت کی کمزوری کو تسلیم کرتے ہوئے

اسے اپنی کوتاہی کے ازالے کا ایک بہترین موقع دیا۔ وہ سی ایف پی کے لاہور میں قائم کردہ ہیڈ کوارٹر میں لا بٹھایا گیا اور یہاں اس نے اتنی جی جان سے وطن کی خدمات سرانجام دیں کہ ماضی میں دامن پر لگا داغ مٹنے لگا۔ اس کی اپنی نظر میں اس کی کھوئی ہوئی عزت بحال ہونے لگی۔

کرنل کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے کبھی اسے اس کے ماضی کی وہ غلطی یاد نہ دلائی اور ہمیشہ کامیابیوں پر اس کا شانہ تھپکتے رہے۔ وہ نفیس اور محبِ وطن انسان آج شہادت کا درجہ حاصل کر کے اپنی ہمیشہ کی آرام گاہ جانے کا منتظر تھا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ذیشان کا کندھا اسے کندھا دینے والوں میں شامل نہ ہوتا۔ کرنل کے احسان کے بوجھ سے جھکے اس کے شانے شہید کے جنازے کو اٹھانے کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے بے چین تھے اور دل غم سے نڈھال ہوا جاتا تھا۔

''ٹھیک ہے تم پنڈی پہنچو، میں بھی پہنچ رہا ہوں۔ وہاں سے ساتھ ہی کرنل کے گاؤں چلیں گے۔'' شہریار نے اپنا فیصلہ سنایا اور ذرا سے توقف کے بعد بولا۔ ''میں ماموں جان سے بات کرلوں گا۔ اشیش کو اس دوران ہی بطور شہریار دفنا دیا جائے گا۔ میری خاطر میرے گھر والوں کو یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑے گا۔''

''تم اچھی طرح سوچ لو شہریار! اس کے بعد تمہارے پاس واپسی کا ہر راستہ بند ہو جائے گا اور تم ہمیشہ کے لیے عادل خان رہ جاؤ گے۔'' ذیشان نے اسے سمجھایا۔

''اس مسئلے پر میں پہلے ہی سوچ چکا ہوں۔ میری زندگی کا بنیادی مقصد ہے اپنے دین اور وطن کی حفاظت... اس کے لیے میرا نام شہریار ہو یا عادل خان، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں بے نام بھی مارا گیا تو مجھے قطعی دکھ نہیں ہوگا۔ بس گھر والوں کو کنوینس کرنے میں تھوڑی سی محنت کرنی پڑے گی۔'' اس نے حتمی لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا۔

''تم بھی کرنل کی طرح عظیم ہو شہریار... میں نے جتنا عرصہ ان کے ساتھ گزارا یہی دیکھا کہ انہوں نے وطن کو ہر شے پر فوقیت دی۔ وہ زندہ دل اور جی دار انسان تھے۔ انہوں نے موت کو بھی بہت بہادری سے سینے سے لگایا اور اب تم اتنی بڑی قربانی دینے چلے ہو۔ میں تمہاری عظمت کو سلام کرتا ہوں۔'' اس کا فیصلہ سن کر ذیشان نے جذباتی لہجے میں کہا۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں کرنل کے بعد وہ جس شخص سے بہتر متاثر ہوا تھا، وہ شہریار ہی تھا۔ وہ ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتا تھا اور ایک ایسے خاندان کا حصہ تھا جس کے بیشتر افراد بیوروکریٹس تھے۔ اس نے خود اپنی محنت اور ذہانت سے اسسٹنٹ کمشنر کا عہدہ حاصل کیا تھا۔ اس کے اکیڈمک ریکارڈ اور فیملی بیک گراؤنڈ کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کا مستقبل شاندار و تابناک ہوگا لیکن وہ سب سے مختلف نکلا۔ اس نے افسر شاہی بن کر راج کرنے کے بجائے قوم اور وطن کا خدمت گار بننا پسند کیا اور اس کرسی کی قربانی دے دی جس پر بیٹھ کر چاہتا تو حکومت بھی کرتا اور مال بھی بناتا۔

اپنی مختصر ملازمت کے دوران بھی اس نے ایسا بہت کچھ کیا جو اس کے پیش رو نہیں کر سکے تھے۔ اس نے اپنے علاقے کے سب سے طاقتور وڈیرے سے ٹکر لی۔ اس کے ظلم و ستم کے خلاف ایکشن لیا۔ اس کی مدد سے کی جانے والی بدعنوانیوں کی راہ روکی اور علاقے کے عوام کو وہ سہولتیں دینے کی کوشش کی جو ان کا بنیادی حق تھیں۔ بظاہر یہ سارے اندرونی مسائل تھے لیکن ان سے نمٹتے نمٹتے وہ ملک دشمنوں کی نظر میں آ گیا اور پھر اس نے فیصلہ کرلیا کہ ان دشمنوں کے خلاف سینہ تان کر کھڑا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے اس نے اپنی شناخت کی قربانی دی اور جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ کارزار میں کود پڑا۔ اس نے جس کام میں ہاتھ ڈالا، سرخ رو ہو کر نکلا۔ اس کے عزم اور ہمت کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا تھا کہ کامیابیوں کا یہ سلسلہ بہت دور تک جائے گا لیکن اس سب کے بدلے وہ شہریار عادل کو داؤ پر لگا گیا تھا اور اب اس کا وجود دنیا کی نظروں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹنے والا تھا۔

☆☆☆

''یہ کیا بکواس ہے؟ میں کم از کم اس ڈرامے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔'' آفرین رانا، لیاقت رانا اور مریم... خاندان کے یہ تین افراد تھے جو اس کے روبرو بیٹھے ہوئے تھے۔ اشیش کی موت اور اپنے ارادے کو ان کے سامنے بیان کرنے کے لیے اس نے انہیں ایک جگہ جمع کیا تھا اور بہت رسان سے ساری بات بتائی تھی۔ سب سے پہلا ردِعمل آفرین رانا کی طرف سے آیا اور انہوں نے رنج اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں اس کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

''پلیز ممانی جان...'' اس نے ملتجیانہ لہجے میں انہیں پکارا۔

''تم ایک ماں سے ایسا مطالبہ نہیں کر سکتے شیری! تم نہیں جانتے کہ اولاد کا غم کیا ہوتا ہے لیکن میں نے سہا ہے یہ غم۔ اس گھر سے میرے سامنے میرے جوان بیٹے اور نوعمر پوتی کے جنازے اٹھے ہیں۔ رو رو کر میری بینائی جانے لگی لیکن آنسو خشک نہیں ہوتے اور اب تم مجھ سے مطالبہ کر رہے ہو کہ میں اپنے گھر سے ایک اور ایسا جنازہ اٹھتے دیکھوں جس پر تمہارا نام ہو۔ نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ بے شک میں نے تمہیں اپنے بطن سے پیدا نہیں کیا لیکن ایک ماں کی طرح پالا تو ہے اور ایک ماں اپنے جوان بیٹے کی جھوٹی موت کو بھی قبول کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ میں اگر تمہارے اس مطالبے کو مان لوں گی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے شہریار کو سینے سے لگانے سے محروم ہو جاؤں گی۔ اب تک میں نے جو کچھ سہا، وہ اس امید پر کہ ایک دن تم لوٹ کر ہمارے پاس آؤ گے اور ہم پھر سے پہلے کی طرح ایک ساتھ مل کر رہنے لگیں گے۔ لیکن اب تم مجھے بتا رہے ہو کہ تم ہمیشہ کے لیے اپنی شناخت ختم کرنے جا رہے ہو اور اب اس دنیا میں ایسا کوئی فرد نہیں ہوگا جسے میں اپنا شیری کہہ کر پکار سکوں تو سن لو، مجھے یہ منظور نہیں ہے۔''

وہ سخت جذباتی ہو رہی تھیں، ان کے برابر میں بیٹھی مریم نے ان کے شانے پر ہاتھ پھیلا کر انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

''آنٹی ٹھیک کہہ رہی ہیں شہریار! تمہارا جذبہ... بے شک لائقِ ستائش ہے لیکن وطن کے علاوہ تم پر ان رشتوں کا بھی تو حق ہے جو تم سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ میں اپنی بات نہیں کرتی۔ میرے دونوں ہاتھ تو پہلے ہی خالی ہو چکے ہیں لیکن تمہیں انکل اور آنٹی کے جذبات کا احساس کرنا چاہیے۔ ان کے لیے یہ کتنا مشکل ہوگا کہ اس گھر سے تمہارے نام کا جنازہ اٹھتے ہوئے دیکھیں۔'' شوہر اور بیٹی کی موت کے بعد گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے والی مریم نے مختصر الفاظ میں آفرین رانا کی حمایت کی۔

''مجھے آپ سب کے جذبات کا احساس ہے بھابی اور میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس پر عمل کرنا آپ سب کے لیے تکلیف دہ ہوگا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میرا خاندان ایک محبِ وطن خاندان ہے۔ کم از کم ماموں جان اور ممانی جان کو میں نے ہمیشہ ایسا ہی پایا ہے اور یہ طے ہے کہ ایسے ہی لوگوں کے حصے میں زیادہ قربانیاں آتی ہیں۔ ایسے لوگ قدرت کی طرف سے عظیم قربانیوں کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں اور قابلِ فخر ہوتے ہیں۔ سچ بتایئے، کیا آپ لوگوں کو سجاد بھائی کی شہادت پر فخر محسوس نہیں ہوتا اور ان کی جدائی کے باوجود یہ احساس حوصلہ نہیں دیتا رہتا کہ وہ ایک ایمان دار و فرض شناس پولیس افسر تھے اور اپنے فرائض کو انجام دیتے ہوئے شہادت کی موت سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ آج کوئی بھی ان کا ذکر کرتا ہے تو عزت اور احترام کے ساتھ۔ اگر وہ اس سے متضاد شخصیت کے مالک ہوتے اور ان کا شمار کرپٹ اور بے ایمان افسران میں ہوتا تو کیا آپ لوگ ایسا فخر محسوس کر سکتے تھے؟ نہیں نا، تو بس جان لیجیے کہ اللہ کا ہم سب پر بڑا کرم ہے۔ اب رہی میری بات... تو کیا آپ لوگوں کے ذہنوں سے یہ بات نکل گئی ہے کہ بطور شہریار میری زندگی کو کتنے خطرات لاحق تھے۔ مجھ پر کتنے قاتلانہ حملے کیے گئے اور کس کس طرح ٹریپ کرنے کی کوشش کی گئی۔ میں نے اپنی شناخت بدلی تو ان ساری مصیبتوں سے نجات پائی۔ اب اگر فرض کریں کہ میں واپس شہریار کی حیثیت سے اس گھر میں آ جاتا ہوں تو کیا وہ سارا سلسلہ دوبارہ شروع نہیں ہو جائے گا... پھر آپ لوگ کیا کریں گے؟'' وہ جوابی دلائل دے کر ان لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''ہمارے لیے تو صورتِ حال اب بھی پہلے سے مختلف نہیں ہے بیٹا... پہلے تم پر قاتلانہ حملے ہوتے تھے اور اب تم خود لپک لپک کر موت کی طرف جاتے ہو۔ تم کہاں ہوتے ہو اور کیا کیا کرتے ہو، اس کا درست علم نہ ہونے کے باوجود میں جانتی ہوں کہ تم خطروں سے کھیلتے رہتے ہو اور ہر پل میرا دل اندیشوں سے لرزتا رہتا ہے۔'' آفرین رانا نے دکھی سے لہجے میں کہا۔ لیاقت رانا البتہ اب تک بالکل خاموشی سے بیٹھے ہوئے تھے اور انہوں نے گفتگو میں قطعی دخل نہیں دیا تھا۔

''مجھے آپ کے جذبات کا احساس ہے ممانی جان! لیکن سچ پوچھیں تو یہاں کون خطرے میں نہیں۔ ایک اکیلی آپ ہی نہیں ہیں جن کے دل میں اندیشے ہیں۔ ایک ریڑھی لگانے والے سے لے کر آفس میں وائٹ کالر جاب کرنے والے تک سب کی ماؤں کے دل اندیشوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ میرے وطن کی ہر ماں صبح جب اپنے بیٹے کو گھر سے رخصت کرتی ہے تو اس کے دل میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ جانے اس کا بیٹا زندہ سلامت گھر واپس آئے گا بھی یا نہیں کیونکہ ہر روز وہ خبروں میں کتنوں ہی گھروں کے چراغ بم بلاسٹ اور ٹارگٹ کلنگ میں بجھنے کے منظر دیکھتی ہے اور سینہ کوبی کرتی ماؤں، بہنوں کو دیکھ کر یہ سوچ کر لرزتی رہتی ہے کہ ملک بھر میں لگی یہ آگ جانے کب ہمارے دامن تک پہنچ جائے۔ ان ماؤں کے سکھ کے لیے، ان کے اندیشوں سے لرزتے دل کو سہارا دینے کے لیے مجھے اور میرے جیسے بہت سوں کو میدان میں اترنا ہی ہوگا۔ اگر ہم

میدان میں نہ اتریں گے تو دشمن کی راہ کون روکے گا۔ آپ ڈرتی ہیں کہ میں اپنی شناخت مٹا کر ان دشمنوں کے خلاف کھڑا ہوں گا تو مجھے کچھ ہو جائے گا۔ لیکن کیا آپ کو یہ یاد نہیں کہ ہماری شینا تو کسی سے نہیں لڑ رہی تھی۔ وہ تو بس پڑھنے کے لیے گھر سے نکلی تھی اور ان کا نشانہ بن گئی تھی جنہوں نے ہماری غفلت کی وجہ سے جانے کس کس روپ میں اس ملک میں اپنے پنجے گاڑ لیے ہیں۔ میرا ساتھ دیں ممانی جان اور مجھے اپنی سرزمین کو دشمن کے ناپاک قدموں سے پاک کرنے والوں میں شامل ہونے کی اجازت دیں ورنہ شاید ایک دن ایسا آئے کہ آپ پچھتاووں میں گھر جائیں اور آپ کو دکھ ہو کہ آپ اس وطن کی وہ ماں ہونے کا حق نہیں ادا کر سکیں جو اپنے جگر کے ٹکڑوں کو دھرتی پر نثار کرنے کا فریضہ دل و جان سے انجام دیتی ہے۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قدموں میں آبیٹھا تھا اور بہت جذباتی لہجے میں بول رہا تھا۔ آفرین رانا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ان آنسوؤں میں گزرے حادثوں کا دکھ بھی تھا اور آنے والے غموں کے اندیشے بھی۔

''آپ مجھے روکیں گی تو میں رک جاؤں گا۔ میں ایک نئی شناخت کے ساتھ وطن کی خدمت کے ارادے سے بھی باز آجاؤں گا لیکن میرے تحفظ کی کوئی ضمانت تو پھر بھی نہیں ہو گی... تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ مجھے وہ کرنے دیں جو میں کرنا چاہتا ہوں اور مجھے کرنا چاہیے۔'' اس بار وہ ذرا دھیمے لہجے میں بول رہا تھا۔ آفرین رانا کا ہاتھ اس کے سر پر آٹھہرا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! تم جو چاہے کرو۔ میں تمہیں تمہارے کسی ارادے سے نہیں روکتی لیکن اس مردود ملک دشمن کو اپنا شہریار قرار دے کر اس کے جنازے پر آنسو بہانا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ تم مجھ سے اتنا بڑا مطالبہ مت کرو۔'' انہوں نے اسے اجازت دینے کے ساتھ ہی اپنی مجبوری بھی بیان کی۔

''تو ٹھیک ہے۔ یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ اپنے کمرے تک محدود رہیے گا۔ لوگوں سے کہہ دیا جائے گا کہ آپ کو صدمے کی وجہ سے ٹرنکولائزر دے کر سلا دیا گیا ہے۔ بھابی اور ماموں جان باقی معاملات سنبھال لیں گے۔'' اس نے گویا چٹکی بجاتے مسئلہ حل کر دیا۔

''اپنے بوڑھے ماموں کو بہت حوصلہ مند سمجھ لیا ہے تم نے؟'' لیاقت رانا نے شکوہ کیا۔

''حوصلہ تو آپ کو دکھانا ہوگا ماموں جان کہ یہ آپ پر اس سرزمین کا قرض ہے۔ البتہ میں یہ انتظام کروا دوں گا کہ ان تکلیف دہ لمحات کا دورانیہ زیادہ نہ ہو۔ لاش کو تابوت میں بند بالکل تیار حالت میں لایا جائے گا اور ساتھ ہی ڈاکٹرز کی اس ہدایت کا بھی اعلان کر دیا جائے گا کہ لاش کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اسے زیادہ دیر رکھا جا سکے اس لیے فوری تدفین ضروری ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر آپ پروفیشنل لوگوں کی مدد سے فارغ ہو جائیں گے۔ باقی دیگر رسوم مرگ کے بارے میں تو ہمارے خاندان والے بھی واقف ہیں کہ میں قائل نہیں تھا اس لیے آپ آرام سے اس سارے سلسلے سے اپنی جان چھڑا سکتے ہیں۔'' وہ سب کچھ سوچ چکا تھا۔

''بھابی! آپ مختار انکل کو فون کر کے بلوا لیجیے گا۔ وہ یہاں کے معاملات سنبھالنے میں ماموں جان کی بہتر مدد کر سکتے ہیں۔'' اس بار وہ مریم سے مخاطب ہوا۔ مریم کے والد مختار مراد آئی جی کے عہدے پر فائز تھے اور ماضی میں شہریار ان سے بہت مدد لیتا رہا تھا۔ بعد میں اس کا سی ایف پی سے تعلق قائم ہوا تو ان کی مدد کی ضرورت ہی نہیں رہی اور وہ بالکل مختلف انداز سے اپنا مشن انجام دینے لگا۔

''ٹھیک ہے، میں انہیں فون کر دوں گی۔'' حسبِ عادت مریم نے مختصر جواب دیا۔

''میں پنڈی جا رہا ہوں ماموں جان۔ وہاں سے کرنل توحید کے جنازے میں شرکت کے لیے ان کے گاؤں جاؤں گا۔ پھر اس کے آگے کا پروگرام آپ کو فون پر بتا دوں گا۔ ہو سکتا ہے اب کافی دنوں تک میری آپ سے ملاقات نہ ہو سکے۔ موقع ملنے پر فون پر رابطہ کر لوں گا لیکن اب گفتگو میں بھی ہمیں احتیاط برتنی ہوگی اور آپ میں سے ہر شخص کو خیال رکھنا ہو گا کہ مجھے شیری کہہ کر نہ پکارے۔ شیری کا وجود آج کے بعد بالکل ختم ہو جائے گا۔'' اس نے لیاقت رانا کو اپنے اگلے پروگرام سے آگاہ کرتے ہوئے آئندہ کے لیے چند ہدایات بھی دیں۔ اب بھی وہ گھر میں اپنے لیے مخصوص کمرے کے بجائے گیسٹ روم میں ٹھہرا ہوا تھا اور ملازم اسے ایسا بے تکلف مہمان سمجھتے تھے جسے گھر کے اندر تک بھی رسائی حاصل تھی اور جو جب چاہے اہلِ خانہ سے گفتگو کر سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! تم جاؤ، ہم سب تمہارا پوری طرح ساتھ دیں گے۔'' لیاقت رانا نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ کچھ دیر بعد وہ اسے گھر سے رخصت ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے اور دل بیک وقت فخر اور دکھ کے احساسات سے دوچار تھا۔ انہیں اپنی تربیت پر ناز تھا جس نے اسے ایک سچا محبِ وطن پاکستانی بنا دیا تھا لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ ان کا شیری ہونے کے باوجود بھی اب پہلے کی طرح ان کا نہیں رہا تھا۔ اب وہ جب بھی یہاں آئے گا، مہمانوں ہی کی طرح آیا کرے گا لیکن وطن کی خاطر کچھ لوگوں کو تو قربانیاں دینی ہی تھیں تو پھر لیاقت رانا کا خاندان کیوں پیچھے رہتا...

☆☆☆

وہ جس وقت پنڈی میں ذیشان سے ملا نشریاتی ادارے اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل کی طویل عرصہ کوما میں رہنے کے بعد انتقال کی خبر نشر کر رہے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کرنل توحید جیسی اہم شخصیت کی شہادت کی خبر کے مقابلے میں یہ خبر بہت چھوٹی تھی اس لیے سرسری طور پر ہی نشر کی گئی۔ میڈیا کا سارا فوکس کرنل توحید کی شہادت پر تھا۔ سی سی ٹی وی فوٹیج کے ساتھ ساتھ مختلف چینلز سے مختلف تبصرے اور تجزیے بھی پیش کیے جا رہے تھے۔ ان کی میت کے آبائی گاؤں پہنچنے اور نمازِ جنازہ وغیرہ کی کوریج کے لیے بھی پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے بہت سے نمائندے موجود تھے۔ اس نے ذیشان کو اپنی آمد سے پہلے ہی باخبر کر دیا تھا اس لیے اس نے اسے لینے کے لیے گاڑی بھیج دی تھی۔ کرنل کے گاؤں تک کا سفر بھی انہیں اسی گاڑی میں کرنا تھا۔ وہ پہنچا تو گاؤں کی طرف جانے والا قافلہ روانگی کے لیے تیار تھا چنانچہ ذیشان اسے نیچے نہ اترنے کا اشارہ کر کے خود گاڑی کی طرف آگیا۔ ڈرائیور کو اس نے فارغ کر دیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اس طرح وہ اور شہریار زیادہ آزادی سے ایک دوسرے سے گفتگو کر سکتے تھے۔

''یہاں سے کرنل کے گاؤں تک کا سفر کتنی دیر کا ہے؟'' شہریار نے یونہی گفتگو کے آغاز کے لیے ایک سوال کیا۔

''تقریباً گھنٹا، سوا گھنٹا لگ جائے گا۔'' ذیشان نے بتایا۔

''یعنی تقریباً پانچ چھ گھنٹے کا پروسس ہے۔ ظاہر ہے ابھی میت کرنل کے گھر جائے گی۔ وہاں گھر والے کچھ دیر اسے روکیں گے، اس کے بعد نمازِ جنازہ اور تدفین کے مراحل سے نمٹ کر واپس آنے میں ہمیں اتنا وقت تو لگ ہی جائے گا۔'' اس کا جواب سن کر شہریار نے تبصرہ کیا۔

''ہوں۔'' ذیشان نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے بے دھیانی سے ہنکارا بھرا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی پہلے کے مقابلے میں مزید بڑھ گئی تھی۔

''کرنل کا مشن تھا، اپنی سرزمین کو ملک دشمن عناصر سے پاک رکھنا۔ ان کے چلے جانے کے بعد ہمیں اس مشن کو جاری رکھنا ہو گا اور یہ بات دھیان میں رکھنی ہو گی کہ ہمارے پاس محدود وقت ہے۔ زیادہ تاخیر سے بازی پلٹ

بھی سکتی ہے۔ کرنل کے جانے کا غم اپنی جگہ لیکن ہم اپنے فرائض سے کوتاہی نہیں کر سکتے۔ میں سی ایف پی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن تم عرصے سے اس کا حصہ ہو اس لیے تم واقف ہو گے کہ کرنل کی غیر موجودگی میں وہ کون سا فرد ہو گا جو سی ایف پی کے معاملات چلانے میں مدد دے گا۔ ہمیں اس شخص سے فوری رابطہ کرنا ہو گا اور اسے بتانا ہو گا کہ جنگل میں آپریشن کتنا ضروری ہے۔'' وہ اصل موضوع پر آگیا۔ کرنل کی شہادت نے اسے بھی دھچکا پہنچایا تھا لیکن وہ خود کو اس دھچکے سے سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب وہ سب سوچ رہا تھا جو اسے سوچنا چاہیے تھا۔

''کرنل نے ایسے کسی شخص سے مجھے متعارف نہیں کروایا تھا۔ میں صرف سی ایف پی کے ان ہی ارکان سے واقف ہوں جو میری طرح مختلف شہروں میں اپنے یونٹس سنبھال کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ البتہ ایک بار کرنل نے مجھ سے ذکر ضرور کیا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی بھی غیر معمولی واقعہ پیش آنے کی صورت میں کوئی ایسا بندہ خود ہم سے رابطہ کرے گا جو سی ایف پی کے معاملات میں ہماری راہنمائی کرے گا۔ لیکن ابھی تک ایسے کسی شخص نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا ہے۔'' ذیشان نے اسے بتایا تو وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ انہیں کچھ نہیں معلوم تھا کہ کرنل نے ایسے کسی فرد کو حالیہ سچویشن سے آگاہ کیا تھا یا نہیں۔ اگر وہ شخص ناواقف تھا تو اندیشہ تھا کہ وہ فوری رابطہ بھی نہیں کرے گا اور ایسی صورت میں وہ آپریشن نہیں کر سکتے تھے۔ وہ پہلے مختار مراد کی مدد سے جنگل میں آپریشن کروا چکا تھا۔ اس آپریشن میں پولیس فورس نے حصہ لیا تھا لیکن اب جس نوعیت کے آپریشن کی ضرورت تھی اس کے لیے پولیس موثر کردار ادا نہیں کر سکتی تھی۔ انہیں جن وسائل اور سہولیات کی ضرورت تھی، اس کے لیے فوج کا کوئی شعبہ ہی معاون ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ ان کے مقابل جدید ٹیکنالوجی سے لیس تھے اور اس کا توڑ کرنا آسان نہیں تھا۔

''یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔ زیادہ وقت گزرنے سے ہماری مشکلات میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم خود کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں؟'' اس نے ذیشان سے پوچھا۔

''یہ بہت رسکی ہو گا کیونکہ ہم سو فیصدی کسی کے بارے میں نہیں جانتے کہ وہ کیسا ہے اور اس کا سی ایف پی سے کوئی تعلق بنتا بھی ہے یا نہیں۔ فرض کرو، اندازے کی غلطی سے ہم کسی غیر متعلقہ شخص سے رابطہ کر بیٹھے تو کتنا بڑا بھونچال آجائے گا۔ سی ایف پی ایک خفیہ ادارہ ہے جسے خفیہ

رکھنے کی اس حد تک کوشش کی گئی ہے کہ ملک کی سیاسی قیادت کو بھی اس کے معاملے میں اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ ہماری ذرا سی جلد بازی اور بداحتیاطی اس ادارے کے استحکام کے لیے بھی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ ویسے بھی ہمیں فوج میں یہی سکھایا گیا ہے کہ آرڈر از آرڈر۔ کرنل نے کہا تھا کہ ان کے نہ ہونے کی صورت میں کوئی شخص خود رابطہ کرے گا تو میرے لیے ان کی یہ بات ایک آرڈر کی حیثیت رکھتی ہے اور میں ہر صورت میں اس بات کا پابند ہوں کہ کسی کے خود رابطہ کرنے کا انتظار کروں۔'' ذیشان نے بہت واضح الفاظ میں اسے اپنی پوزیشن سے آگاہ کیا تو وہ اس سے بحث نہیں کرسکا۔ اس کے اندیشے اپنی جگہ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ سی الیف پی کے وجود کو خطرے میں نہیں ڈالا جاسکتا تھا۔

پاکستان جیسے ملک میں سی الیف پی جیسے ادارے کا وجود کسی نعمت سے کم نہیں تھا اور نعمتوں کی قدر کرنی پڑتی ہے، انہیں بہت سنبھال کر رکھنا پڑتا ہے ورنہ یہ ہاتھ سے نکل جاتی ہیں اور ہمیشہ کا پچھتاوا انسان کا مقدر بن جاتا ہے۔ اسے بھی خود پر ضبط کرنا پڑا لیکن طبیعت مکدر سی ہوگئی کہ اتنا سب کچھ سامنے ہوتے ہوئے بھی وہ کچھ کرنے سے قاصر تھے۔ کرنل کے گاؤں تک کا باقی راستہ انہوں نے خاموش رہ کے گزارا۔ گاؤں کی حدود میں داخل ہوئے تو اسے خوش گوار سی حیرت ہوئی۔ راستہ صاف ستھرا اور پختہ تھا۔ کرنل کے گھر تک پہنچنے کے لیے گاڑیوں کو گاؤں کا چکر کاٹنا پڑا تھا اور اس دوران انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ پورا گاؤں بہت صاف ستھرا اور منظم طور پر آباد تھا۔ انہیں نہ تو کہیں گندگی کے ڈھیر نظر آئے، نہ راستے کی بے ہنگم رکاوٹوں سے واسطہ پڑا۔ مکانات اگرچہ چھوٹے بڑے اور کچے پکے ہر طرح کے تھے لیکن ایک خاص ترتیب سے بنے ہوئے تھے۔ کہیں کوئی بے ڈھنگا پن نظر نہیں آرہا تھا۔ گلیاں کشادہ تھیں۔ کرنل کا مکان خاصا بڑا اور پختہ تھا۔ گھر کے سامنے وسیع شامیانہ لگا ہوا تھا اور کثیر تعداد میں لوگ جمع تھے۔ لوگوں کی تعداد کو دیکھ کر لگتا تھا کہ گاؤں کا شاید ہی کوئی ایسا فرد ہو جو وہاں موجود نہ ہو۔ ہر آنکھ اشکبار تھی اور ہر چہرے پر غم کا تاثر تھا۔

کرنل کا تابوت اتارا گیا تو بے شمار کاندھے اسے سنبھالنے کے لیے لپکے۔ اتنی محبت اور چاہت کو دیکھ کر رشک آتا تھا۔ دنیا سے تو سب ہی کو جانا ہے کہ جو یہاں آیا ہے اس کی ایک دن واپسی بھی طے ہے لیکن ایسی دھج سے جانے والے خال خال ہی ہوتے ہیں۔ یہ شان، یہ عزت انہی کو حاصل ہوتی ہے جو اپنے دنیا میں آنے کا حق ادا کرکے یہاں سے جائیں ورنہ بعض تو ایسے بدنصیب ہوتے ہیں کہ لوگ ان کے جانے پر شکر کا کلمہ ادا کرتے ہیں۔

''بڈھا ہوگیا ہوں، پوتے پوتیاں جوان ہو کر آگئے ہیں۔ ماں باپ کی ہڈیاں کب کی قبر میں گل چکی ہیں لیکن یہ اپنا توحید گیا ہے تو لگتا ہے آج اسی ویلے میں یتیم ہوا ہوں۔ کیسا جی دار اور پیار کرنے والا تھا۔ میرے وڈے پتر کی عمر کا تھا۔ بڑی عزت کرتا تھا میری پر میرے جی میں اس کی ایسی عزت تھی جیسے وہ میرا بزرگ ہو۔ اتنا وڈا افسر تھا، چاہتا تو بیوی بچوں کے ساتھ شہر میں رہتا ہور مڑ کر بھی اس پنڈ کو نہ دیکھتا، پر نہ جی، وہ تو اپنی مٹی سے سچی محبت کرنے والا تھا۔ ادھر کم کم ہی آتا تھا، پر کبھی یہاں کے مالات (معاملات) سے غافل نہیں رہتا تھا۔ اس کی وجہ سے تو یہ پنڈ اتنا سنور گیا ہے۔ اس نے ادھر اسکول اور اسپتال بنوائے۔ پکی سڑک ڈلوائی۔ جب جب ادھر آتا تھا، پنڈ کے منڈوں کو جمع کرکے یہی سمجھاتا تھا کہ پڑھ لکھ کر اپنی زندگی بھی سنوارنی ہے، پنڈ کی حالت بھی اچھی کرنی ہے اور وطن کی خدمت بھی کرنی ہے۔ سب چھوٹے بڑے اس کے عاشق تھے ہور اس کے آنے کی راہ تکتے تھے۔ ابھی پچھلے برس تو اس نے ادھر کالج کی بنیاد رکھوائی تھی۔ اب اللہ جانے اس کے بعد یہ کالج مکمل بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ ہم تو لٹ گئے۔ ظالموں نے ہمارے سر سے ہمارا سائبان چھین لیا۔'' بوڑھا زار زار روتا تھا اور بولتا جاتا تھا۔

کئی چینلز کے رپورٹر اس کی یہ گفتگو ریکارڈ کررہے تھے۔ ذیشان اور شہریار نے بھی اس کی یہ ساری گفتگو سنی اور آنکھوں کو نم ہونے سے نہ روک سکے... کرنل کی زندگی کے اس پہلو سے وہ آج ہی آگاہ ہوئے تھے اور دل میں ان کی عزت میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ کیسی باکمال ہستی تھے وہ کہ ان کے جانے کے بعد ان سے وابستہ ہر شخص خود کو بے سہارا سمجھنے لگا تھا۔ وہ دونوں دریوں پر بچھائی گئی صاف ستھری چاندنیوں پر بیٹھ گئے۔ تابوت کو گھر کے اندر لے جایا گیا تھا تاکہ مستورات بھی جانے والے کا آخری دیدار کرلیں۔ اندر سے کبھی کبھی ذرا بلند آواز میں رونے کی آواز آتی تھی لیکن پھر لمحہ بھر میں ہی معدوم ہوجاتی تھی۔ شاید کوئی تھا جس کا ضبط جواب دے جاتا تھا لیکن پھر یہ احساس ہونے پر کہ بظاہر دنیا سے چلے جانے والا تو حیاتِ جاوداں پا گیا ہے، گریہ کے آگے بند باندھ دیتا تھا۔ وہ خود بھی ایسی ہی کیفیات سے گزر رہے تھے۔ مرد تھے، دھاڑیں مار کر رو تو نہیں سکتے تھے لیکن اندرونی حالت دگرگوں تھی۔ خاص طور پر ذیشان تو بالکل ہی

نڈھال ہورہا تھا۔ شہریار اسے حوصلہ دینے کے لیے کبھی کبھی اس کے شانے کو تھپتھپا کر خاموش تسلی دیتا تھا اور پھر خود بھی سر جھکا کر بیٹھ جاتا تھا۔ ایسے میں انہیں احساس ہی نہیں ہوا کہ کوئی بہت دیر سے انہیں غور سے دیکھ رہا ہے۔ جب وہ شخص ان کے قریب آکر بیٹھا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''آپ لوگوں کی شہید سے کیا رشتے داری تھی؟'' وہ ان کے قریب بیٹھا ان سے پوچھ رہا تھا۔

''وہ ہمارے عزیز تھے۔'' شہریار نے اسے گول مول سا جواب دیا۔ اس کی ٹی شرٹ پر موجود ایک ٹی وی چینل کا لوگو دیکھ کر وہ یہ تو سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی رپورٹر ہے لیکن بہر حال اس کا چہرہ اس کے لیے شناسا نہیں تھا۔

''اصل میں، میں شروع سے ہی اس واقعے کی کوریج کررہا ہوں۔ اسپتال میں بھی موجود تھا اور وہاں سے یہاں تک بھی مسلسل موجود رہا ہوں۔ اس دوران میں نے ان صاحب کو مستقل موجود پایا ہے اور ان کی حالت دیکھ کر مجھے یہی لگا کہ یہ کرنل صاحب کے کوئی قریبی عزیز ہیں اس لیے میں ان کے تاثرات جاننا چاہ رہا تھا۔'' اس نے ذیشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بہت سلیقے سے اپنا مدعا بیان کیا۔

''کرنل صاحب ان کے آفیسر ہوتے تھے اور اس حوالے سے یہ ان سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ کچھ ذاتی وجوہات کی بنا پر انہوں نے فوج سے استعفا دے دیا تھا لیکن کرنل صاحب سے عقیدت قائم رہی جب ہی ان کی شہادت کی خبر سن کر رہ نہ سکے اور آپ انہیں دیکھتے رہے۔'' شہریار نے اسے مختصر جواب دیا کیونکہ ذیشان کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ کسی قسم کے سوال جواب کے موڈ میں نہیں ہے۔

''حیرت ہے، اتنے سے تعلق کی بنیاد پر ذمے داران نے انہیں اس حد تک ساتھ ساتھ رہنے کی اجازت دے ڈالی ورنہ فوج والے تو ہم صحافیوں کو بھی بہت مشکل سے گھاس ڈالتے ہیں۔'' اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''آپ کو کس بات پر اعتراض ہے، انہیں گھاس ملنے پر یا خود کو نہ ملنے پر؟'' شہریار کو اس کا انداز اچھا نہیں لگا تو ذرا تیز لہجے میں بولا۔

''پلیز ناراض مت ہوں۔ میں نے تو اپنے صحافیانہ تجسس کی وجہ سے یونہی ایک بات پوچھ لی تھی۔'' وہ فوراً سنبھل گیا۔

''انسان کو اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران دوسروں کے جذبات اور احساسات کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ معاف کیجیے گا، اس وقت ہماری ذہنی حالت ایسی نہیں ہے کہ ہم میڈیا والوں کے الٹے سیدھے سوال و جواب کا سامنا کرسکیں۔'' شہریار نے اسے دھیمے لہجے میں ہی ٹھیک ٹھاک سناڈالیں تو وہ وہاں سے کھسک گیا۔

تھوڑی دیر بعد جنازہ اٹھنے کا اعلان کیا جانے لگا۔ وہاں موجود جمِ غفیر کے ساتھ انہوں نے بھی کرنل کا آخری دیدار کیا پھر سبز ہلالی پرچم میں لپٹے تابوت کو گھر کے قریب ہی واقع ایک میدان میں لے جاکر نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور اس کے بعد شہید کو فوجی اعزاز کے ساتھ اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا۔ تدفین کے بعد ان کا وہاں کوئی کام باقی نہیں رہا تھا، چنانچہ خالی پن کے احساس کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگئے۔ ابھی پنڈی کے قریب ہی پہنچے تھے کہ ذیشان کے موبائل پر میجر عمر فاروق کی کال آنے لگی۔ وہ خود چاہنے کے باوجود جنازے میں شرکت کے لیے نہیں آسکے تھے۔ کچھ پیشہ ورانہ مصروفیات نے ان کے قدموں میں زنجیر ڈال دی تھی۔

''تم دونوں وہاں سے اسلام آباد پہنچو۔ کرنل سبکتگین آج شام چھ بجے تم سے ملاقات کریں گے۔'' ادھر ادھر کی کوئی بات کرنے کے بجائے انہوں نے پیغام دیا اور بتانے لگے کہ اسلام آباد میں انہیں کہاں ٹھہرنا ہوگا۔ وہاں سے کرنل سبکتگین کا آدمی خود انہیں پک کرلیتا۔

''ٹھیک ہے سر۔'' ذیشان نے مؤدبانہ انداز میں انہیں جواب دیا تو سلسلہ منقطع ہوگیا۔

''لو بھئی، تمہاری فکر دور ہونے کا تو لگتا ہے انتظام ہونے جارہا ہے۔ کرنل سبکتگین نے فوری ملاقات کا پیغام بھیجا ہے۔ فی الحال ہم اسلام آباد جارہے ہیں۔ ملاقات کی جگہ کا وہاں پہنچ کر ہی علم ہوگا۔''

کال سے فارغ ہوکر اس نے شہریار کو خوش خبری سنائی۔ یہ خبر ایسی تھی کہ بے پناہ اداسی کا خول ترخ گیا اور وہ اپنے اندر ایک جوش اور سنسنی سی دوڑتی محسوس کرنے لگا۔ کرنل توحید کی شہادت کے بعد جس طرح ان پر سارے راستے بند ہوگئے تھے، کرنل سبکتگین کے پیغام نے ان کے کھلنے کی امید باندھ دی تھی۔ کرنل کے جانے کا غم اپنی جگہ لیکن جب تک دشمن سلامت تھے، وہ چین سے کیونکر بیٹھ سکتے تھے۔ انہیں عمل کے لیے راہ چاہیے تھی اور اچانک بند ہونے والی راہیں اب کھلنے کو ہی تھیں۔

☆☆☆

سلو اپنے والدین سے مل کر خوش ہوا تھا کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ لوگ کتنی آرام دہ زندگی گزار رہے ہیں۔ ساری

زندگی غربت و افلاس کی چکی میں پستے اس کے والدین کو تو شاید کبھی ایسا گھر دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوا تھا جہاں وہ مقیم تھے۔ زندگی کی تمام بنیادی سہولیات سے آراستہ اس گھر میں انہیں صرف زبان ہلانے پر سب کچھ مل جاتا تھا اور ان کے پاس بیٹھ کر کھانے، پینے اور ٹی وی دیکھنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ گیٹ پر مسلسل موجود رہنے والے چوکیدار کے علاوہ گھریلو کاموں کے لیے بھی ایک مستقل ملازم موجود تھا جو ہرفن مولا تھا اور کسی جن کی طرح احکامات کی تعمیل کرتا تھا۔ جس دن سلو والدین سے ملنے گیا، اس کی ماں نے خاص طور پر اس کے لیے مچھلی تیار کروائی۔ ملازم نے ایک دو مزید ڈشز کے ساتھ مچھلی تیار کر کے ڈائننگ ٹیبل پر رکھی تو اس کی خوشبو ہی بڑی اشتہا انگیز تھی۔ سلو نے کھائی تو بے اختیار تعریف کیے بنا نہیں رہ سکا۔

''سچی بات ہے بیٹا، اپن نے ساری عمر مچھی (مچھلی) پکڑی اور کھائی ہے لیکن جیسی مچھی یہ بندہ پکاتا ہے، وہ پہلے کبھی کھانے کو نہیں ملی۔'' سلو کے باپ نے بھی اس کی تائید کرتے ہوئے ملازم کی تعریف کی۔

اپنے قیام کے دوران سلو کو اندازہ ہو گیا کہ ملازم واقعی زبردست ہے اور یہ اس کے پکائے ہوئے کھانوں اور خدمت گزاری کا نتیجہ ہے کہ اس کے والدین کے مدقوق چہروں پر رونق نظر آنے لگی ہے لیکن وہ لوگ کچھ اداس بھی تھے۔

''اچھا کھانا پینا، عیش آرام سب ہے بیٹا پر آزادی ختم ہو گئی ہے۔ کہیں آ جا نہیں سکتے، کوئی بات کرنے والا نہیں ہے۔ اپنوں کو دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔ بس ہم بڈھا بڈھی بیٹھے ایک دوسرے کو ہی دیکھتے رہتے ہیں۔'' اس کی ماں نے اس سے شکوہ کیا۔

''اچھا ہے نا اماں، ویسے تو بابا سارا وقت سمندر میں رہتا تھا اور مشکل ہی سے گھر آتا تھا، اب تم یہاں بیٹھ کر آرام سے جی بھر کے اس سے باتیں کرو۔'' سلو نے ماں کے شکوے کو مذاق میں ٹال دیا لیکن وہ ان کے مسئلے کو سمجھ رہا تھا۔ ان کا حال بالکل ایسا تھا جیسے کھلے پانی کی مچھلیوں کو کسی خوب صورت ایکوریم میں بند کر دیا جائے۔ زندگی گزارنے کے سارے لوازمات مچھلی کو ایکوریم میں بھی ملتے ہیں لیکن آزاد پانی کی خوشی تو نہیں مل سکتی۔ بس ان دونوں کا بھی یہی حال تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ اپنے دوست احباب اور رشتے داروں سے بچھڑ گئے تھے اور انسان جیسا سماجی جانور بھلا تنہا رہ کر کب خوش رہ سکتا ہے۔ خود وہ جلد ہی بے عملی کی زندگی سے گھبرا گیا۔

ماں باپ کے ساتھ رہنا خوشی کی بات سہی لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ ان کے ساتھ رہنے کا عادی نہیں تھا۔ دن کا کچھ حصہ ان کے ساتھ گپ شپ لگاتا، اپنے معمول کی ورزشیں کرتا اور باقی وقت ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر گزارتا۔ جلد ہی اسے اکتاہٹ ہونے لگی۔ میدانِ عمل میں رہنے والے آدمی کے لیے اتنی کم مصروفیت کے ساتھ لگی بندھی زندگی گزارنا بہت مشکل تھا۔ اوپر سے اسے باہر نہ نکلنے کا مشورہ دیا گیا تھا کیونکہ بھارت میں اس کے منظر پر آ جانے کے بعد یہ بات طے شدہ تھی کہ پاکستان میں موجود را کے ایجنٹس کو اس کے بارے میں ہوشیار کر دیا گیا ہوگا اور ہر ایجنٹ کو اس کی تصاویر فراہم کر کے ہدایت کر دی گئی ہوگی کہ چلتے پھرتے اس شخص کو تلاش کرتے رہیں۔ سلو مل جاتا تو ان کی پہلی ترجیح یقیناً اسے ختم کرنا ہوتی کیونکہ یہ جان کر کہ ان کا تربیت یافتہ بندہ اب پاکستان کے مفادات کے لیے کام کر رہا ہے، بھارتیوں کے سینوں پر سانپ لوٹ رہے ہوں گے۔ وہ یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ جو شخص ان کے کام نہیں آسکا، وہ پاکستان کے کام آئے۔ سلو کے علم میں بھی یہ سارے حقائق تھے لیکن اس کی افتادِ طبع خطرے کو زنجیر بنا کر کہاں اسے نچلا بٹھا سکتی تھی اور کچھ نہیں سوجھی تو اپنی منگیتر سے ملاقات کے لیے کراچی جانے کی ٹھان لی اور منہ اندھیرے جبکہ سارے لوگ سو رہے تھے، حلیے میں معمولی سی تبدیلی کر کے ایک چھوٹے سفری بیگ کے ساتھ اس طرح گھر سے نکل کھڑا ہوا کہ گیٹ پر موجود چوکیدار کو بھی کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ میک اپ کا فن اسے آتا تھا لیکن سامان کی عدم دستیابی کی وجہ سے اپنے چہرے مہرے میں خاص تبدیلیاں نہیں کر سکا تھا اور کئی دنوں کی بڑھی شیو کو مشین سے خشخشی داڑھی میں تبدیل کرنے کے علاوہ آنکھوں پر زیرو نمبر کے گلاسز لگانے اور سر پر کیپ رکھنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ خیال تھا کہ باقی کی تبدیلیاں موقع ملنے پر کر لے گا۔ اتنی صبح تو بازار کا رخ کرنے پر بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ منہ اندھیرے تو سارے بازار ہی بند پڑے ہوتے ہیں۔

گھر سے نکل کر ٹیکسی حاصل کرنے کے لیے بھی اسے خاصی دور تک پیدل چلنا پڑا۔ ٹیکسی اسے ایک ایسے ہوٹل کے سامنے ملی جو سویرے سویرے اٹھ کر ڈیوٹی جانے والے چھڑے مردوں کی ناشتے کی ضرورت پوری کرنے کے لیے کھلا ہوا تھا۔ ہوٹل کچھ خاص صاف ستھرا نہیں تھا لیکن چائے اور پراٹھوں کی خوشبو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ سلو ہوٹل میں داخل ہوا تو وہاں اس کے علاوہ دو تین ہی گاہک اور موجود تھے۔

یقیناً یہ آغاز تھا۔ اس نے اپنے لیے انڈے پراٹھے کے ساتھ دودھ پتی کا آرڈر دیا اور ناشتے کے دوران یہ جاننے میں بھی کامیاب ہو گیا کہ ہوٹل کے باہر کھڑی خالی ٹیکسی کا مالک وہ پٹھان لڑکا ہے جو کونے والی میز پر بیٹھا بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ ملائی دار چائے میں پراٹھے کے نوالے ڈبو ڈبو کر کھانے میں مصروف ہے۔ سلو اور اس لڑکے نے لگ بھگ ایک ساتھ ناشتا ختم کیا اور جیسے ہی وہ لڑکا ناشتے کے بعد باہر نکلنے لگا، سلو بھی اس کے پیچھے لپکا۔

''اسٹیشن چلو گے خان؟'' اس نے لڑکے کو آواز دے کر پوچھا تو وہ رک گیا لیکن چہرے پر تذبذب تھا۔

''کیا ہوا خان؟ کس سوچ میں پڑ گئے؟'' سلو نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''کچھ نہیں سر! اصل میں، میں رات کی شفٹ میں ٹیکسی چلاتا ہوں اور ناشتا کرنے کے بعد گھر جا کر سو جاتا ہوں۔ اب آپ نے پکارا تو سمجھ میں نہیں آیا کہ انکار کروں یا اقرار۔'' اس نے بہت صاف لہجے میں بات کی ورنہ سلو کو تو اس سے گلابی اردو کی توقع تھی۔

''آج اپنی روٹین میں تھوڑی سی تبدیلی کر لو۔ مجھے اسٹیشن چھوڑنے کے بعد گھر جا کر سو جانا۔ میں تمہیں ڈبل کرایہ دوں گا۔'' سلو نے اسے پیشکش کی۔ اصل میں وہاں اس وقت وہی واحد ٹیکسی موجود تھی، دوسرے اسے وہ لڑکا بھی اچھا لگا تھا اس لیے ڈبل کرایہ دینا بھی گوارا تھا۔

''لگتا ہے آپ کو بہت ضروری اسٹیشن پہنچنا ہے۔ ٹھیک ہے میں لے چلتا ہوں۔'' لڑکا راضی ہو گیا اور باہر نکلنے کے بعد اپنی ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اسے بٹھایا۔ اگلے ہی لمحے اس کی ٹیکسی فراٹے بھر رہی تھی۔

''دیکھنا خان، کہیں نیند کے خمار میں ٹیکسی مت ٹھونک ڈالنا۔'' سلو نے اسے تنبیہ کی۔

''فکر نہیں کریں سر! میں لائسنس یافتہ ڈرائیور ہوں اور ساتھ ہی ذمے دار شہری بھی... اگر نیند سے اتنا ہی بے حال ہوتا تو کبھی آپ کو اسٹیشن تک چھوڑنے کے لیے راضی نہیں ہوتا۔'' اس نے اعتماد سے جواب دیا۔

''پڑھے لکھے لگتے ہو؟'' اس کی گفتگو کے انداز سے پہچان کر سلو نے تبصرہ کیا۔

''جی پڑھ رہا ہوں۔ ایم اے کا فائنل ہے اس کے بعد لاء کالج میں داخلہ لوں گا۔ سات سال سے یہاں ہوں۔ ٹیکسی چلا کر اپنے خرچے بھی پورے کرتا ہوں اور تھوڑا بہت گھر والوں کو بھی بھیجتا ہوں۔ پہلے کرائے کی ٹیکسی چلاتا تھا پھر پیسے جمع کر کے اپنی یہ سیکنڈ ہینڈ ٹیکسی خرید لی۔ اس کو خریدنے کے چکر میں پڑھائی میں تھوڑا گیپ بھی آ گیا ورنہ اب تک ایم اے کر چکا ہوتا۔'' اس نے اپنے بارے میں تفصیل سے آگاہ کیا۔

''ایم اے پرائیویٹ کر رہے ہو یا ریگولر؟'' سلو کو اس سے گفتگو میں لطف آنے لگا۔

''ایوننگ شفٹ میں ریگولر کر رہا ہوں جی۔ پرائیویٹ پڑھنے میں مزہ نہیں آتا۔ رات دس بجے تک کلاسز ہوتی ہیں، اس کے بعد ٹیکسی چلاتا ہوں۔ کبھی ڈیڑھ دو بجے تک اور کبھی پوری رات۔ جس روز پوری رات چلاؤں تو اس ہوٹل میں ناشتا کر کے گھر جا کر سو جاتا ہوں اور بارہ بجے کے بعد پھر نکل پڑتا ہوں۔ رات گھر پر گزارنے کی صورت میں بھی سوتا نہیں ہوں بلکہ فجر تک پڑھتا رہتا ہوں۔ سونے کی ٹائمنگ فجر کے بعد سے بارہ بجے تک کی ہی ہے۔'' اس نے اپنے معمولات سے آگاہ کیا۔ شاید نیند سے بچنے کے لیے اسے بھی گفتگو جاری رکھنا مناسب لگ رہا تھا۔

''گڈ! مجھے یقین ہے کہ ایک دن تم بڑے آدمی ضرور بنو گے۔'' سلو نے اسے سراہا۔ وہ سچ مچ اس لڑکے سے متاثر ہوا تھا۔ اس کی اپنی زندگی تو بالکل مختلف انداز میں گزری تھی اور کم عمری میں ہی وہ بڑے بڑے تجربات کا سامنا کر چکا تھا لیکن شہریار کے ساتھ اس نے اپنی زندگی کا جو عرصہ گزارا تھا، اس میں اس کے اندر بہت سی ایسی تبدیلیاں آئی تھیں جن کی بدولت وہ ایسے لوگوں کی قدر کرنے لگا تھا۔ پہلے اسے وطن اور حب الوطنی جیسی کسی شے سے کوئی واسطہ نہیں تھا لیکن اب اسے احساس ہونے لگا تھا کہ وطن کی کیا اہمیت ہوتی ہے اور وطن کے لیے اس ٹیکسی ڈرائیور جیسے جوان کتنے اہم ہوتے ہیں۔

''تمہارا نام کیا ہے یار؟'' اس نے قدرے بے تکلفی سے لڑکے سے دریافت کیا۔

''زمرد خان۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بتایا اور مزید بولا۔ ''یہ نام میری دادی نے رکھا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میری آنکھیں زمرد جیسی خوب صورت ہیں۔''

''وہ ٹھیک ہی کہتی تھیں۔'' سلو نے بیک ویو مرر میں نظر آتی اس کی آنکھوں کو دیکھ کر تائید کی۔ اسی وقت ٹیکسی اسٹیشن کی حدود میں داخل ہوئی اور زمرد خان نے اسے ایک مناسب جگہ تک لے جا کر روک دیا۔ سلو نے ہزار کا نوٹ نکال کر اسے تھمایا اور خود ٹیکسی سے اتر گیا۔

''میرے پاس کھلے پیسے نہیں ہیں سر! میں آپ کو بقایا

واپس نہیں کرسکوں گا۔ آپ مجھے چھوٹے نوٹوں میں ادائیگی کردیں۔" ہزار کا نوٹ دیکھ کر زمرد خان نے اس سے کہا اور خود بھی باہر آ گیا۔

"میرے پاس بھی چھٹا نہیں ہے یار... ایسا کرو تم یہ سارے پیسے رکھ لو۔" سلو نے سخاوت کا مظاہرہ کیا۔

"نہیں سر! یہ تو بہت زیادہ ہیں۔ جہاں سے میں نے آپ کو بٹھایا تھا، وہاں سے تو اسٹیشن تک کا ڈبل کرایہ بھی اس سے کم ہی بنتا ہے۔ ایسا کریں آپ یہیں ٹھہریں، میں کہیں سے کھلا کروا کر لاتا ہوں۔" سلو کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ ایک طرف دوڑ گیا۔ سلو کے نزدیک انتظار کرنا فضول تھا، اسے زمرد خان اچھا لگا تھا اور وہ اس سے پیسے واپس لینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا چنانچہ شانے جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

سب سے پہلے اس نے کراچی تک کا ٹکٹ خریدا پھر ایک اسٹال سے اخبار خرید کر بینچ پر جا بیٹھا۔ سگریٹ کا پیکٹ اس کی جیب میں موجود تھا۔ ایک سگریٹ سلگا کر اس کے کش لیتے ہوئے وہ یونہی سرخیوں پر نظر ڈالنے لگا۔ اس کی مطلوبہ گاڑی آنے میں ابھی خاصا وقت تھا اس لیے وہ اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔

"آپ یہاں بیٹھے ہیں سر! میں وہاں آپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔" ابھی اس نے دو چار خبریں ہی دیکھی تھیں کہ زمرد خان وہاں چلا آیا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی خفگی تھی۔

"تم نے خوامخواہ اتنی زحمت کی یار! میں نے تم سے کہا تو تھا کہ بقایا رکھ لو۔" سلو نے اس کی خفگی کا مسکرا کر جواب دیا۔

"نہیں سر! مجھے بخشش لینا اچھا نہیں لگتا۔ میں نے کبھی کسی پسنجر سے طے شدہ کرائے سے ایک روپیا بھی زیادہ نہیں لیا۔ اپنی محنت کی کمائی میں جو برکت رکھی ہے اللہ نے وہ کسی اور چیز میں نہیں ہوتی۔" اس نے بڑے ٹھوس لہجے میں جواب دیتے ہوئے بقایا سلو کی طرف بڑھایا تو اس بار سلو نے خاموشی سے روپے تھام لیے۔

زمرد خان کی شخصیت نے اسے متاثر کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر شہریار کی اس لڑکے سے ملاقات ہوتی تو وہ بہت خوش ہوتا کیونکہ اس طرح کے دیانت دار اور غیور لوگ تو اس کے نزدیک اس ملک کا سرمایہ تھے۔ اس کا دل چاہا کہ اس لڑکے سے شہریار کی ملاقات کروائے چنانچہ واپس جاتے ہوئے زمرد خان کو آواز دے کر واپس بلایا۔

"اپنا کوئی اتا پتا تو دیتے جاؤ یار۔" بینچ سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے وہ دوستانہ لہجے میں بولا تو زمرد کی آنکھوں میں حیرت چمکی اور یوں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے مخاطب کوئی اور ہو۔ اِدھر اُدھر دیکھنے میں یک دم ہی اس کی نظر ایک چادر پوش آدمی پر پڑی جو لمبی نال والا پسٹل تھامے ہوئے تھا اور اس کا نشانہ یقینی طور پر سلو تھا۔

"بچیے سر۔" وہ زور سے چلایا اور خود سے دو قدم کے فاصلے پر موجود سلو کو جھپٹ کر زور سے دھکا دیا۔ اس کے دھکا دینے سے سلو لڑکھڑایا اور اس کی طرف آتی گولی زمرد خان کے سر میں گھس گئی۔ وہ بے چارہ بنا کوئی آواز نکالے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس دوران میں سلو اس چادر پوش کو دیکھ چکا تھا جس نے سائیلنسر لگے پسٹل سے اس پر فائر کیا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سر میں گولی لگنے کے بعد زمرد خان ہر طرح کی مدد سے بے نیاز ہو چکا ہے چنانچہ منظر سے غائب ہونے کی کوشش میں بھاگتے ہوئے چادر پوش کی طرف لپکا۔ اسٹیشن پر اس وقت بہت زیادہ لوگ موجود نہیں تھے۔ فائر بھی سائیلنسر لگے پسٹل سے کیا گیا تھا اس لیے فوری طور پر کوئی متوجہ نہیں ہوا لیکن سلو اور چادر پوش کی بھاگ دوڑ نے بالآخر لوگوں کو چونکا دیا۔ کچھ لوگوں نے زمرد خان کی نیچے گری لاش بھی دیکھ لی۔ صبح کے باقی دن کی نسبت ذرا خاموش ماحول میں ہلچل سی مچ گئی۔ ادھر سلو سب باتوں سے بے نیاز چادر پوش کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

اس شخص کا لباس بے حد میلا اور پیوند زدہ تھا اور یوں لگتا تھا کہ وہ کوئی بھکاری ہو۔ بھاگتے ہوئے وہ دوسرے پلیٹ فارم تک پہنچا اور آڑ لے کر سلو کی طرف لگاتار دو فائر کیے لیکن اس بار سلو غافل نہیں تھا سو آسانی سے خود کو نشانہ بننے سے بچا لیا۔ ساتھ ہی اپنا چھوٹا سا پسٹل نکال کر خود بھی دو فائر کیے۔ چادر پوش چھپا ہوا تھا اس لیے اس کا نشانہ بننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا تاہم سلو اسے یہ باور کروانے میں کامیاب ہو گیا کہ اس کا مقابل بھی غیر مسلح نہیں ہے۔ اس کے پسٹل پر چونکہ سائیلنسر نہیں لگا تھا اس لیے فائر کی آواز دور تک گئی تھی اور ردِعمل میں لوگ چیخنے چلانے لگے تھے۔

چادر پوش اور سلو دونوں ہی فی الحال اس چیخ و پکار سے بے نیاز تھے اور انہیں اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔

سلو اس شخص کو ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ زندہ ہاتھ آ جاتا تو بہت سی معلومات حاصل ہو سکتی تھیں البتہ چادر پوش کا سب سے بڑا مقصد ہی شاید یہ تھا کہ کسی طرح اسے ہلاک کر دے۔ اس لیے اپنی پناہ گاہ سے نکل کر بھاگتے ہوئے بھی اس نے سلو کی طرف بلا دریغ دو مزید فائر کر ڈالے۔ اب وہ پلیٹ فارم نمبر تھری پر کھڑی ایک ریل گاڑی کی آڑ لے کر بھاگ رہا تھا۔

سلو مستقل اس کے پیچھے تھا۔ اب اسے اپنے پیچھے بھی بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یقینی طور پر اسٹیشن پر موجود پولیس اور سیکیورٹی اہلکار حرکت میں آ چکے تھے۔ اسے ان لوگوں کی پروا نہیں تھی، بس وہ کسی طرح خود پر گولی چلانے والے کو چھاپنا چاہتا تھا لیکن وہ بھی خاصا پھرتیلا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اس نے اچانک ہی پینترا بدلا اور پلٹ کر سلو پر فائر کرنے کے بعد خود تیزی سے ریل کے ایک ڈبے میں گھس گیا۔ سلو کے پاس اس کا پیچھا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چادر پوش کے کیے ہوئے فائروں کی تعداد اس کے ذہن میں تھی اس لیے اس کے اندازے کے مطابق وہ تمام گولیاں فائر کر چکا تھا اور اسے اپنے پسٹل کو دوبارہ لوڈ کرنے کے لیے تھوڑی سی مہلت درکار تھی۔ شاید اسی مہلت کو حاصل کرنے کے لیے وہ بوگی میں گھسا تھا۔ سلو نے بھی بھرپور پھرتی کا مظاہرہ کیا اور خود بھی اس بوگی میں گھس گیا۔ چادر پوش بیچ بیچ پسٹل کو لوڈ کر رہا تھا۔

"پسٹل پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو ورنہ اپنی جان سے جاؤ گے۔" بجائے ہاتھ پیر چلانے کے سلو نے سیدھے سیدھے اسے اپنے ہاتھ میں موجود پسٹل کی مدد سے دھمکایا، ردِعمل اس کی توقع کے بالکل برخلاف تھا۔ چادر پوش نے اس کے حکم کی تعمیل میں اپنا پسٹل نیچے پھینکنے کے بجائے پوری قوت سے اس کی طرف اچھال دیا۔ نشانہ شاید سلو کا چہرہ تھا لیکن بروقت جھکائی دینے سے وہ خود کو بچانے میں کامیاب ہو گیا لیکن اس دوران میں چادر پوش کو موقع مل چکا تھا کہ اس پر حملہ کر سکے۔ اس نے ایک وحشیانہ چیخ کے ساتھ سلو پر چھلانگ لگائی اور کچھ ایسے انداز میں اس سے ٹکرایا کہ اس کے ہاتھ میں موجود پسٹل چھوٹ کر بوگی کے کھلے دروازے سے باہر جا گرا۔ اسے پسٹل کی پروا نہیں تھی کیونکہ وہ اپنے مقابل پر اس کا براہِ راست استعمال کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ اس شخص کو زندہ گرفتار کرنے کا خواہش مند تھا جبکہ اس نے پہلے کے بعد دوسرا حملہ بھی اتنی وحشت سے کیا تھا کہ لگتا تھا اسے سلو کی جان کے سوا کچھ درکار نہیں ہے لیکن اب سلو ہوشیار ہو چکا تھا چنانچہ اس کے اس حملے کا بھرپور جواب دیا اور اس زور سے اس کے پہلو میں لات ماری کہ وہ عملاً اڑتا ہوا بوگی کی دیوار سے جا کر ٹکرایا۔ بوگی بالکل خالی تھی۔

ہاتھا پائی کے دوران اس شخص کی چادر اتر گئی تھی اور اندر سے ایک میلا کچیلا کھچڑی داڑھی والا مرد برآمد ہوا تھا۔ ظاہری حلیے کی خستگی کے باوجود سلو نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ مضبوط ہاتھ پاؤں کا آدمی ہے اور بھکاریوں جیسا یہ حلیہ اس کا بہروپ ہے۔

زوردار ضرب کھانے کے بعد بھی وہ مقابلے سے پیچھے نہیں ہٹا اور ایک بار پھر سلو پر حملہ آور ہوا جس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ لڑنے بھڑنے کے فن میں ماہر ہے۔ اس بار اس نے سلو کی ناک کو اپنے بھاری بھرکم سر سے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ سلو چہرے کا رخ پھیر کر ناک کو تو بچا گیا لیکن کان زد میں آ گیا۔ یہ بہت زوردار ضرب تھی۔ سلو کا دماغ ہل کر رہ گیا اور طیش میں آ کر اس نے اپنے مقابل کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اتنی زور سے نیچے پٹخا کہ وہ فوری طور پر اٹھ نہ سکا اور سلو اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اسی وقت کھلے دروازے سے پولیس والوں نے انٹری دی۔

"ہینڈز اپ... کسی نے حرکت کی تو اپنی جان سے جائے گا۔" اے ایس آئی کے عہدے کے ایک بندے نے اپنا ریوالور لہراتے ہوئے بھڑک ماری۔ اس کی بھڑک سے کم از کم سلو تو نہیں ڈر سکتا تھا البتہ اس کے خیال کے مطابق اب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی اس لیے اطمینان سے ہاتھ جھاڑتا ہوا اپنے مقابل کے سینے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ ایک بے گناہ کا قاتل ہے انسپکٹر صاحب! اسے گرفتار کر لیں۔" اس نے اے ایس آئی کو مخاطب کیا۔

"مینوں بچاؤ مائی باپ! ایہہ مینوں قتل کرنا چاہدا ہے۔ اس نے ہی اس ٹیکسی والے منڈے کو فیر (فائر) کر کے قتل کیا ہے۔" بھکاری نما شخص نے بھی بلند آواز میں دہائی دی۔

"اوئے کرم داد! دونوں کو ہتھکڑی لگا کر تھانے پہنچاؤ۔ وہیں ان سے دو دو ہاتھ ہوں گے۔" اے ایس آئی نے گرج کر اپنے ساتھ آنے والے سپاہیوں کو حکم دیا تو وہ فوراً حرکت میں آ گئے۔

"قاتل میں نہیں، یہ ہے۔" سلو نے خود کو ہتھکڑی لگائے جانے پر مزاحمت کی۔

"یہ فیصلہ تو تھانے چل کر ہم کریں گے بچو۔" اس کے احتجاج کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اسے ہتھکڑی لگا دی گئی۔

سلو کو غصہ تو بہت آیا لیکن پی گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس چکر میں پڑ کر وہ کراچی روانہ ہونے سے محروم ہو جائے گا لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ اسے اس معاملے سے نمٹنا ہی تھا۔ ایک موبائل میں بٹھا کر انہیں تھانے لے جایا گیا اور بغیر کسی بات چیت کے لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ پولیس والوں کے اس طرزِ عمل پر سلو تلملا کر رہ گیا۔

"یہ کون سا طریقہ ہے۔ تم لوگ ہر ایک کو ایک ہی

لاٹھی سے کیسے ہانک سکتے ہو۔ میں کوئی مجرم نہیں ہوں بلکہ ایک قاتل کی گرفتاری میں پولیس کی مدد کی ہے۔ اپنے صاحب سے کہو کہ میرا بیان ریکارڈ کرے اور مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے۔'' اس نے سپاہی کے سامنے احتجاج کیا۔

''ایس ایچ او صاحب ابھی ڈیوٹی پر نہیں آئے ہیں۔ وہ آئیں گے تو بیان ریکارڈ ہوگا۔'' سپاہی نے اسے جواب دیا اور مڑ کر جانے لگا۔

''وہ اے ایس آئی تو ہے نا... وہ کیوں بیان ریکارڈ نہیں کرتا؟'' سلو چلّایا۔

''وہ بھی فارغ نہیں ہیں۔ انہیں جائے وقوعہ کی رپورٹ تیار کرنی ہے، اس میں مصروف ہیں۔'' سپاہی نسبتاً شریف بندہ تھا جو اس کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا ورنہ تھانے کے اصولوں میں اتنی بھی شرافت موجود نہیں ہوتی۔

''تم لوگوں کو اپنے اس رویّے کا جواب دینا ہوگا۔ مجھے ایک فون کال کرنے دو پھر دیکھتا ہوں کہ کیسے تم مجھے یوں تھانے میں روک پاتے ہو۔'' طیش میں آکر وہ دھمکیوں پر اتر آیا جن کا سپاہی نے کوئی اثر نہیں لیا۔

یقینی طور پر وہ ان سب چیزوں کا عادی تھا چنانچہ گردن موڑ کر اطمینان سے آگے بڑھ گیا۔ سلو بھی تھک ہار کر لاک اپ کے فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ گرفتار ہونے والے بھکاری کو یہاں بند نہیں کیا گیا تھا۔ یہاں اس کے ساتھ دو دوسرے قیدی موجود تھے جو اردگرد سے بے نیاز سگریٹ ہونٹوں سے لگائے دھوئیں کے مرغولے بنانے میں مصروف تھے۔ لاک اپ کی محدود فضا میں پھیلی بو سے... بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ سگریٹ کے اندر چرس بھری ہوئی ہے۔ شکل وصورت اور حلیے سے بھی وہ عادی مجرم اور چھٹے ہوئے بدمعاش لگ رہے تھے۔

سلو کو ان سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ تو بے چینی سے یہاں سے نکالے جانے کا منتظر تھا۔ پولیس والوں نے اتنی ہوشیاری دکھائی تھی کہ ریلوے اسٹیشن پر ہی اس کا موبائل فون اپنے قبضے میں کرلیا تھا اور عملاً وہ ان کا محتاج ہوکر رہ گیا تھا۔ لاک اپ میں فارغ اور بیزار بیٹھے اسے رہ رہ کر زمرد خان بھی شدت سے یاد آرہا تھا۔ روزگار اور تعلیم کے لیے اپنے گاؤں سے یہاں آکر بسنے والے اس لڑکے کی آنکھوں میں کتنے خواب تھے لیکن ایک ظالم گولی نے خواب بننے والی ان آنکھوں کو ہی ہمیشہ کے لیے بند کردیا تھا۔ پیچھے پتا نہیں کون کون تھا جو اس کے خوابوں کو تعبیر ملنے کی دعا کرتا، اس کی واپسی کی راہیں دیکھتا تھا۔ خود وہ بھی تو اس باہمت لڑکے سے کتنا متاثر ہوا تھا اور اسے لگا تھا کہ یہ وہ شخص ہے جسے شہریار کے مطابق پاکستان کے سنہری مستقبل کی امید قرار دیا جاسکتا ہے لیکن کیا ہوا تھا۔ چند انچ کی ایک گولی نے اس بے چارے کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا تھا۔

اب اسے اپنا کراچی جانے کا فیصلہ بھی احمقانہ لگنے لگا تھا۔ اس کے اس عمل نے ایک بے قصور کی جان لے لی تھی۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ کراچی جا کر آخر کیا کرتا؟ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی منگنی کی کیا حیثیت تھی کہ وہ اپنی منگیتر سے ملنے کو بے چین ہو جاتا۔ باقی رشتے ناتے بھی اس کے نزدیک زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے کہ وہ برسوں اپنے سارے عزیزوں سے دور رہا تھا اور واپس آیا بھی تھا تو لوگوں کو اس زہر سے ہلاک کرنے جوراوالوں نے اس کی رگ رگ میں بھر دیا تھا۔

لاک اپ میں گزرتے وقت میں اپنا تجزیہ کرتے اسے اس بات کا بھی ادراک ہوگیا تھا کہ وہ کسی کی محبت یا کشش میں کراچی نہیں جارہا تھا بلکہ اپنی تھرلنگ طبیعت کی وجہ سے وہاں کا قصد کیا تھا۔ شاید اس کے اندر کہیں یہ خیال تھا کہ اس کی تاک میں رہنے والوں نے اس کی منگیتر کے گھر پر نظر رکھی ہوئی ہوگی کہ وہ وہاں آئے گا تو اسے دھر لیں گے اور وہ ان سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے اس جال میں پھنسنے جارہا تھا لیکن یہاں تو لاہور سے نکلنے کی بھی نوبت نہیں آسکی تھی اور حال یہ تھا کہ وہ خود ایک مجرم کی طرح لاک اپ میں بند تھا۔ اللہ اللہ کر کے کوئی ڈھائی تین گھنٹے بعد اسے ایس ایچ او کے تھانے پہنچ جانے اور شرفِ ملاقات بخشنے کی نوید سنائی گئی۔ ایک سپاہی کی نگرانی میں وہ ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچا تو اس نے بھکاری لگنے والے زمرد خان کے قاتل کو اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھا پایا لیکن خود اسے ایسی کوئی پیشکش نہیں کی گئی۔

''ہاں بھئی طرم خان، سنا ہے تُو بڑا بے چین تھا مجھ سے ملنے کے لیے؟'' ایس ایچ او کا لہجہ اسے مخاطب کرتے ہوئے خاصا تحقیر آمیز تھا۔ سلو کو خود پر خاصا جبر کرنا پڑا کہ وہ اس لہجے کے جواب میں بدتمیزی سے پیش نہ آئے۔

''جی ہاں، میں چاہتا تھا کہ آپ جلد از جلد میرا بیان ریکارڈ کر کے مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں تو میں اپنے کام دھندے نمٹاؤں۔'' اس نے خاصے تحمل سے جواب دیا۔

''کون سا کام دھندا... شاپنگ سینٹر میں بم دھماکے کرنے کا یا بے گناہ لوگوں پر گولیاں چلانے کا؟'' ایس ایچ

او کا لہجہ طنز اور تحقیر سے بھرا ہوا تھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' اس کی بات سن کر سلو کو جھٹکا لگا۔

''جو کہہ رہا ہوں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ کیا تم اس بات کو جھٹلا سکتے ہو کہ تم نے برسوں بھارت میں گزارے ہیں جہاں تمہیں راوالوں نے دہشت گردی کی تربیت دے کر پاکستان میں تباہی پھیلانے کے لیے یہاں بھجوایا تھا اور ایسے ہی کسی الزام میں تم جیل میں بند تھے جہاں ہونے والی ہنگامہ آرائی کے دوران تمہیں فرار کا موقع مل گیا۔'' ایس ایچ او اسے جو ہوش ربا داستان سنا رہا تھا، اس کی اسے قطعی امید نہیں تھی۔

بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر کچھ کہہ سکا تو بس اتنا کہ... ''آپ مجھے ایک فون کرنے کی اجازت دیں پھر آپ کو میرے متعلق اچھی طرح علم ہو جائے گا کہ میں کون ہوں اور میری کیا حیثیت ہے۔'' اس درخواست کے جواب میں ایس ایچ او نے ذرا نرمی کا مظاہرہ نہیں کیا اور کڑک کر بولا۔

''کچھ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب کچھ معلوم ہو چکا ہے تمہارے بارے میں۔''

''اور یقیناً یہ معلومات اس شخص نے فراہم کی ہوں گی۔ ایک آدمی کا قاتل ہونے کے باوجود آپ نے اسے اپنے سامنے اتنی عزت سے بٹھا رکھا ہے۔'' اس بار سلو کو بھی طیش آگیا۔

''یہ ہمارا اپنا آدمی ہے۔ اس کے ہاتھوں جو قتل ہوا، وہ محض اتفاق تھا۔ یہ تمہیں دیکھ کر گھبرا گیا تھا کیونکہ اسٹیشن پر تمہیں دیکھ کر اسے یہی خیال آیا تھا کہ تم دہشت گردی کی کوئی بڑی کارروائی کرنے جارہے ہو۔ تمہیں کسی خطرناک حرکت سے روکنے کے لیے اس نے گولی چلائی تھی جو اتفاق سے اس ٹیکسی ڈرائیور کو لگ گئی۔ ابھی تو ہمیں یہ بھی تحقیق کرنی ہے کہ وہ ٹیکسی ڈرائیور سچ مچ بے قصور تھا یا تمہارا کوئی ساتھی۔'' ایس ایچ او کے جواب نے اسے تلملا کر رکھ دیا۔

وہ سمجھ گیا کہ یہ ساری داستان اس بھکاری نے سنائی ہوگی جس کے بارے میں اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ را ہی کا ایجنٹ ہے لیکن حیرت انگیز طور پر ایس ایچ او اسے پولیس کا بندہ قرار دے رہا تھا۔

''اگر یہ آپ کا بندہ ہے تو پھر مجھے کہنے دیجیے کہ آپ بھی را کے ایجنٹ ہیں اور اپنے ایک ساتھی کو تحفظ فراہم کررہے ہیں۔'' تلملاہٹ میں وہ ایسی تلخ بات کہہ گیا جو معاملے کو سدھارنے کے بجائے مزید بگاڑ کا سبب بنی۔

''را کا ایجنٹ کون ہے، یہ اس وقت ثابت ہوگا جب ہم تمہیں ننگا کر کے چھت سے الٹا لٹکائیں گے۔'' ایس ایچ او نے غضب ناک لہجے میں اسے جواب دیا اور اسے لانے والے سپاہی کی طرف منہ کر کے دہاڑا۔

''لے جاؤ اسے اور اتنا مارو کہ یہ خود اپنا سارا اگلا پچھلا اگل دے۔'' حکم ملتے ہی سپاہی نے اسے گدی سے دبوچ لیا۔ سلو اتنا کمزور نہیں تھا کہ کسی عام سے سپاہی کے قابو میں آجاتا لیکن وہ ان لوگوں پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہتا تھا کہ ان کا شمار اس کے دشمنوں میں نہیں ہوتا تھا۔

ایس ایچ او کے مقابل بیٹھا بھکاری اس ساری گفتگو کے دوران بالکل خاموش بیٹھا رہا تھا جیسے اطمینان ہو کہ سلو کو پھنسانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ اس کے اس اطمینان پر سلو کو یک دم ہی طیش آیا اور نتائج کی پروا کیے بغیر اس نے بالکل اچانک اس شخص پر ہاتھ ڈال دیا۔ کرسی پر بیٹھے اس شخص کو اس نے اتنی سرعت سے گردن میں ہاتھ ڈال کر کھینچا کہ کسی کو کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہاں تک کہ اس کی گردن دبوچنے والا سپاہی بھی دیکھتا رہ گیا کہ آخر یہ بندہ کس طرح میری گرفت سے آزاد ہوا ہے۔ جب تک ایس ایچ او اپنا ریوالور سیدھا کرتا، سلو اس بھکاری کو اپنی گرفت میں لیے ایک دیوار سے پشت ٹکا چکا تھا۔ پیچھے دیوار اور آگے اس شخص کے ہونے کی وجہ سے وہ مکمل طور پر محفوظ ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھکڑیوں کے درمیان موجود زنجیر سے اس بری طرح اس شخص کی گردن کو گرفت میں لیا تھا کہ وہ اپنے بچاؤ کے لیے بھی ہاتھ پیر نہیں چلا پا رہا تھا۔

''ہلنے جلنے کی غلطی مت کرنا ورنہ اپنی جان سے جاؤ گے۔ لڑنا بھڑنا جانتے ہو اس لیے اس داؤ کو بھی اچھی طرح پہچانتے ہوگے۔ حرکت میں تمہاری اپنی جان جانے کا خطرہ ہے۔ سانس کی نالی کچل جائے گی۔'' اس نے نہایت سخت لہجے میں اس بھکاری سے کہا اور پھر ایس ایچ او کی طرف متوجہ ہوگیا جو اس دوران میں چیخ چیخ کر شاید پولیس اسٹیشن میں موجود تمام سپاہیوں کو اپنے کمرے میں جمع کر چکا تھا لیکن وہ سب بھی اپنے افسر کی طرح اس صورتِ حال پر سخت بے بس نظر آرہے تھے۔

''چھوڑ دو اسے ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔'' ایس ایچ او نے اسے گیدڑ بھبکی دی ورنہ گولی وہ کہاں مارتا۔ گولی چلاتا تو پہلے وہ شخص نشانہ بنتا جسے وہ اپنا بندہ قرار دے چکا تھا۔

''میرا آپ کو مشورہ ہے انسپکٹر صاحب کہ مزید غلطیاں مت کریں اور مجھے میرے بتائے ہوئے نمبر پر ایک کال ملا کر دے دیں۔ تھوڑی دیر میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو

جائے گا۔" صورتِ حال اپنے قابو میں ہونے کے باوجود اس نے ایس ایچ او سے تہذیب کے دائرے میں بات کی۔

"میں کیسے تمہاری بات کا اعتبار کروں؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم اپنے ساتھیوں سے رابطہ کر کے انہیں یہاں حملے کے لیے بلوا لو اور وہ تمہیں ہم سے چھڑوا کر لے جائیں۔" ایس ایچ او بے چارہ تذبذب میں تھا۔

"جانے سے تو آپ مجھے اب بھی نہیں روک سکتے لیکن آپ کے اطمینان کے لیے میں آپ کو یہ پیشکش کر سکتا ہوں کہ پہلے آپ اپنی مدد کے لیے فورس طلب کر کے تھانے کی حفاظت کا بندوبست کر لیں پھر میری بات کروا دیجیے گا۔" اس نے پیشکش کی جو شاید ایس ایچ او کے دل کو لگی۔ اس نے ایک نظر اس کی گرفت میں جکڑے بھکاری پر ڈالی اور پھر نمبر ملانے لگا۔ دھیمی آواز میں کچھ دیر کسی سے بات کرنے کے بعد وہ سلو کی طرف متوجہ ہوا۔

"اب تم وہ نمبر بتاؤ جس پر بات کرنا چاہتے ہو؟" سلو نے بلاجھجک روانی سے نمبر بتا دیا۔ اسے یہ نمبر ایک۔۔ کوڈ ورڈ کے ساتھ دیا گیا تھا کہ جب بھی ضرورت ہو رابطہ کر لے۔ نمبر اسے زبانی یاد تھا۔ اس کے کہنے پر انسپکٹر نے نمبر ملایا اور فون کا اسپیکر آن کر دیا کیونکہ سلو نے اسے اپنے قریب آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ دوسری طرف سے کال ریسیو کیے جانے پر سلو نے اپنا کوڈ ورڈ بتایا تو فوراً ہی اس کا رابطہ کسی ذمے دار سے کروا دیا گیا۔

"تم کہاں ہو؟ چوکیدار نے کال کی تھی کہ تم غائب ہو اور تمہارے والدین کو بھی تمہارے بارے میں کچھ علم نہیں؟"

دوسری طرف موجود شخص نے فوراً ہی اس سے سوال کیا۔ جواب میں سلو نے تفصیلات میں جانے کے بجائے مختصراً اپنی پولیس اسٹیشن میں موجودگی کا بتایا تو دوسری طرف سے یقین دلایا گیا کہ جلد ہی اس معاملے کو سنبھال لیا جائے گا۔ ایس ایچ او جاننا چاہتا تھا کہ دوسری طرف سے بات کرنے والا وہ بندہ کون ہے اور کس ادارے سے تعلق رکھتا ہے لیکن دوسری طرف سے فوراً ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

اس ساری گفتگو کے دوران سلو کے شکنجے میں پھنسا شخص بہت بے چین لگ رہا تھا لیکن بے بس تھا کہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ سلو نے اس کے نرخرے پر اس حد تک دباؤ ڈال رکھا تھا کہ وہ بات چیت بھی کرنے سے قاصر تھا اور بمشکل سانسوں کی آمدورفت جاری تھی۔ ایس ایچ او اس صورتِ حال پر خاصا پریشان لگ رہا تھا۔ عملے کے بیشتر افراد کو اس نے واپس کمرے سے باہر بھیج دیا تھا۔ مزید پانچ منٹ گزرے تو اسے اوپر سے کسی افسر کا فون آ گیا۔ فون آنے کے بعد اس کا انداز بالکل بدل گیا۔ اس نے سلو کو پیشکش کی کہ وہ اس کی ہتھکڑیاں کھلوا کر اس شخص کو ہتھکڑی لگا دیتا ہے لیکن احتیاط کے پیشِ نظر سلو نے اس کی پیشکش کو قبول نہیں کیا۔ مزید بیس منٹ اسی پوزیشن میں گزر گئے اور پھر پولیس اسٹیشن جوتوں کی کھٹاکٹ اور سیلیوٹ مارنے کی آوازوں سے بھر گیا۔ آنے والے صرف چار تھے جن میں سے ایک کے جسم پر پولیس کی اور دوسرے کے جسم پر آرمی کی یونیفارم تھی جبکہ باقی دو سادہ لباس میں تھے۔ پولیس والا ایس پی رینک کا جبکہ فوجی کیپٹن کے عہدے کا بندہ تھا۔ ایس ایچ او کی تو اپنے افسر کو دیکھ کر ہی حالت پتلی ہو گئی۔ باقی رہی سہی کسر آنے والوں کے اپنے شناختی کاغذات پیش کرنے سے پوری ہو گئی۔ فوری طور پر سلو کو ہتھکڑی سے آزاد کروا کر دوسرے بندے کو ہتھکڑیاں لگائی گئیں۔

ایس ایچ او بے چارہ اپنی نگرانی میں یہ سارے کام کرواتا اپنی صفائی بھی پیش کرتا رہا۔ اس کے مطابق ملزم گزشتہ پانچ سال سے پولیس کے مخبر کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ وہ ریلوے اسٹیشن پر بھیک مانگتا تھا اور کئی بار اس نے پولیس کو مفید معلومات فراہم کی تھیں اور مجرموں کو گرفتار کروایا تھا اس لیے پولیس والے اس پر اعتماد کرتے تھے اور اپنا بندہ قرار دیتے تھے۔ بلیک مارکیٹ سے پسٹل بھی اس نے پولیس کی مدد سے ہی خریدا تھا کہ کسی مشکل کے وقت کام آ سکے۔ اس کے سابقہ ریکارڈ کی وجہ سے ہی آج اس کے سلو کے بارے میں بیان کو بلاجھجک قبول کر لیا گیا تھا۔

"تم احمق ہو۔ تمہیں اس بات کا خیال نہیں آیا کہ اگر یہ عام سا بھکاری اور مخبر ہوتا تو کیسے جان سکتا تھا کہ یہ لڑکا را کا تربیت یافتہ ہے اور اسے را نے دہشت گردی کے لیے پاکستان بھیجا ہے۔" ایس پی نے ایس ایچ او کی بات سن کر اسے لتاڑا جس پر وہ صرف "سوری سر" ہی کہہ سکا۔

"باقی سب چھوڑیں ایس ایچ او صاحب، یہ بتائیں کہ اسے یہاں موبائل وغیرہ تو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی؟" سادہ پوشوں میں سے ایک نے پوچھا جس پر ایس ایچ او نے ایک سب انسپکٹر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ خود تو بہت تاخیر سے وہاں پہنچا تھا اور گرفتاری کرنے والا اے ایس آئی بھی تھوڑی دیر تھانے میں رکنے کے بعد وہاں سے نکل گیا تھا۔

"موبائل کا نہیں معلوم صاحب، اپنا بندہ ہونے کے خیال سے ہم نے اس کی تلاشی نہیں لی تھی اور بس روک لیا تھا

کہ کسی بھی وجہ سے سہی، تمہارے ہاتھوں بندہ تو مارا گیا ہے اس لیے ضمانت ہونے تک یہیں رہنا ہوگا۔" سب انسپکٹر نے جواب دیا جس پر ایک بار پھر ایس پی سے ایس ایچ او کو ڈانٹ پڑی اور پھر ملزم کی تلاشی لی گئی۔ اس کے چغے کی اندرونی جیب سے موبائل نکل آیا لیکن وہ کوئی میسج یا کال ریکارڈ حاصل نہیں کر سکے۔

ظاہر ہے کہ ایک تربیت یافتہ ایجنٹ اس قسم کا ریکارڈ سنبھال کر نہیں رکھ سکتا تھا۔ ریکارڈ کی انہیں فکر بھی نہیں تھی۔ وہ موبائل کمپنی سے بھی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ کیپٹن نے پولیس سے ملزم کو اپنی کسٹڈی میں لیا اور پھر ان سب کی وہاں سے روانگی عمل میں آئی۔ ایس پی اور کیپٹن اپنی اپنی الگ گاڑیوں میں آئے تھے جبکہ سادہ پوش جو سی ایف پی کے اہلکار تھے، الگ گاڑی میں آئے تھے۔ سلو اور گرفتار شدہ بندے کو اسی گاڑی میں بٹھایا گیا اور گاڑیاں اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئیں۔ سی ایف پی والی گاڑی آگے بڑھی تو اس کے پیچھے ہی پولیس اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر موجود ایک ایسی موٹر سائیکل حرکت میں آ گئی جس کے سوار کا چہرہ ہیلمٹ میں چھپا ہوا تھا۔

☆☆☆

"گڈ۔۔۔ ویری گڈ۔" ڈیوڈ تک اس کے مطلب کی خبر پہنچی تو وہ کھل اٹھا۔ اس کا میڈیا کے کسی بندے کے ذریعے اپنے مطلوبہ افراد کو ٹریس کرنے کا آئیڈیا کافی کامیاب رہا تھا۔ ان کے ہائر کردہ رپورٹر نے کرنل کے جنازے میں شرکت کرنے والے چند افراد کی نشاندہی کی تھی جو اس کے مطابق کسی خفیہ ادارے سے متعلق ہو سکتے تھے۔ رپورٹر ڈیوڈ کے نمک خوار خان کا خاص بندہ تھا جو بھاری معاوضے پر پہلے بھی اس کے لیے خدمات انجام دیتا رہا تھا چنانچہ اس بار بھی اس نے اپنے ایک ساتھی کی مدد سے کام کر دکھایا۔

رپورٹر کا وہ ساتھی ایک ٹیکنیشن تھا۔ رپورٹر اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر ان افراد کی فہرست تیار کرتا رہا جو اس کے مطابق کسی خفیہ ادارے سے متعلق ہو سکتے تھے اور ٹیکنیشن نے ان افراد کی گاڑیوں میں خفیہ ڈیوائس نصب کر دی۔ اس ڈیوائس کی مدد سے گاڑی میں ہونے والی گفتگو سنی جا سکتی تھی۔ رپورٹر اور ٹیکنیشن صاحب جس قسم کی حرکتیں کرتے تھے، انہیں انجام دینے کے لیے انہوں نے کئی چھوٹے موٹے ضروری "فن" بھی سیکھ رکھے تھے جن میں سے ایک فن بند تالوں کو صرف ایک تار کی مدد سے کھولنا بھی تھا۔ چینل کی وین میں بیٹھ کر تکنیکی مسائل سے نمٹنے کے بہانے چالاک ٹیکنیشن مستقل اس حصے میں موجود رہا جہاں جنازے کے شرکاء کی گاڑیاں پارک تھیں۔ اپنی وین سے نکل کر مطلوبہ گاڑی کا لاک کھولنے اور اس میں ڈیوائس نصب کرنے میں اسے چند منٹ ہی لگتے تھے۔ انہوں نے کل چار گاڑیوں میں ڈیوائس نصب کی تھیں جن میں سے ایک گاڑی ذیشان کی تھی۔ اتفاق سے دورانِ سفر ذیشان کے موبائل پر میجر عمر فاروق کی کال آ گئی اور یہ اہم اطلاع مخالفین تک پہنچ گئی کہ آج کرنل سبکتگین ان دو افراد سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ رپورٹر ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے اپنے نزدیک مشکوک تمام افراد سے پہلے ہی تھوڑی بہت بات چیت کر کے انہیں ٹٹول لیا تھا۔ ذیشان اور شہریار سے بھی اس کی گفتگو ہوئی تھی اور اس گفتگو سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق ذیشان فوج کا سابقہ ملازم تھا جو صرف کرنل سے اپنی جذباتی وابستگی کی وجہ سے اس کے جنازے میں شرکت کے لیے آیا تھا لیکن اسے کرنل سبکتگین کی طرف سے ملنے والے پیغام نے ثابت کر دیا تھا کہ معاملہ کچھ اور ہے چنانچہ اس نے خان تک رپورٹ پہنچا دی اور خان نے ڈیوڈ کے نمائندے تک۔ ڈیوڈ کو یہ خبر ملی تو وہ کھل اٹھا۔ اسے ایسے ہی کسی کلیو کی تو تلاش تھی۔

"کرنل سبکتگین سمیت ان دونوں بندوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے مجھے بتاؤ۔" اس نے اپنے ماتحت کو حکم دیا۔

"یہ کام میں پہلے ہی کر چکا ہوں سر۔ کرنل سبکتگین آن سروس افسر ہے جبکہ میجر ذیشان نے بالکل اچانک فوج سے استعفا دے کر ایک سیکیورٹی ایجنسی جوائن کر لی تھی۔ سی ایف پی نام کی یہ سیکیورٹی ایجنسی ملک کے تقریباً ہر بڑے شہر میں کام کر رہی ہے اور بھاری معاوضے پر اداروں اور افراد کو سیکیورٹی گارڈز فراہم کرتی ہے۔ کمپنی کا ریکارڈ بہت اچھا ہے اس لیے لوگ خوشی سے بھاری معاوضوں پر ان کے گارڈز ہائر کرتے ہیں۔ سی ایف پی کا ہیڈ کوارٹر لاہور میں ہے اور میجر ذیشان وہیں موجود ہوتا ہے۔ اس دوسرے بندے عادل خان کو بھی اس کے ساتھ کبھی کبھار دیکھا جاتا رہا ہے لیکن اس کے بارے میں کوئی حتمی معلومات حاصل نہیں ہو سکی ہیں۔ کچھ نہیں معلوم کہ اس کی رہائش گاہ کہاں ہے اور ذریعۂ معاش کیا ہے۔" ماتحت نے مستعدی سے رپورٹ پیش کی تو ڈیوڈ سوچ میں پڑ گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی اس کا چہرہ اندرونی خوشی سے تمتما اٹھا۔

"میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ سارا چکر کیا ہے۔ یقیناً سی ایف

پی نامی اس سیکیورٹی ایجنسی کی آڑ میں ہی وہ خفیہ ادارہ کام کررہا ہے جس نے اتنے عرصے سے ہمیں ناکوں چنے چبوا رکھے ہیں۔ ٹھیک ہے، اب میں ان سے نمٹ لوں گا۔'' اس کے شاطر دماغ نے فوراً ہی درست اندازے قائم کرلیے۔

''ذیشان اور عادل خان پر کڑی نظر رکھو۔ دیکھو کہ شام میں کرنل سبکتگین سے ملاقات کرکے وہ کہاں جاتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ ہوسکے تو ملاقات کی تفصیل بھی حاصل کرو۔ یہ بہت اہم کلیو ہمارے ہاتھ آیا ہے، اسے ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ اس کلیو کی مدد سے ہم بڑی کامیابیاں حاصل کرسکتے ہیں۔ اس رپورٹر کو اب درمیان سے ہٹادو اور اپنے تربیت یافتہ اور ہوشیار بندوں کو پیچھے لگاؤ۔ اب کسی غلطی کا چانس نہیں ہے۔'' حاصل شدہ معلومات سے نتائج اخذ کرنے کے بعد اس نے ایک ہی سانس میں احکامات جاری کیے۔

''یس سر۔'' ماتحت اسے یقین دہانی کرواکر تعمیل کے لیے روانہ ہوگیا جبکہ ڈیوڈ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ملنے والی کامیابیوں کی امید نے اس کے موڈ پر اچھا اثر ڈالا تھا۔

☆☆☆

''ایک موٹر سائیکل ہمارا پیچھا کررہی ہے۔'' انہیں تھانے سے نکل کر دس منٹ گزرے تھے کہ سلو نے کسی کو بطورِ خاص مخاطب کیے بغیر یہ اطلاع دی۔

''کون سی موٹر سائیکل؟'' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا سلمان چونکا۔ ان کے آگے پیچھے اچھا خاصا ٹریفک تھا اس لیے اسے اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ سلو نے کس موٹر سائیکل کی طرف اشارہ کیا ہے۔

''وہ ون ٹو فائیو جس کے سوار نے نیلا اپرچن رکھا ہے اور سر پر ہیلمٹ ہے۔ وہ پولیس اسٹیشن سے ہی ہمارے پیچھے لگا ہوا ہے۔'' سلو نے اپنے سابقہ اطمینان سے جواب دیا تو ان کے ساتھ ہی گاڑی میں سوار مخبر بھکاری کا چہرہ اتر گیا۔ گرفتاری کے باوجود اب تک اس لیے مطمئن تھا کہ اسے اپنے ساتھیوں کی اردگرد موجودگی کا یقین تھا لیکن سلو کی ہوشیاری نے اس کا یہ اطمینان بھی رخصت کردیا تھا۔

''کیا کرنا ہے؟'' سلمان نے ساتھ والی سیٹ پر موجود جاوید علی سے پوچھا جس کے زخم مکمل طور پر تو نہیں بھرے تھے لیکن بوریت سے گھبرا کر وہ آج یونہی دفتر چلا آیا تھا جہاں پہلے اسے سلو کے غیاب کی خبر ملی اور پھر یہ بھی پتا چل گیا کہ وہ ایک پولیس اسٹیشن میں موجود ہے۔ سلمان اس کی بازیابی کے لیے روانہ ہونے لگا تو وہ بھی اس کے ساتھ ہولیا اور اب اپنے زخموں کو بھول کر ایکسائٹڈ نظر آرہا تھا۔

''آنے دو اسے۔ ذرا مل کر اس کا شجرۂ نسب معلوم کرلیتے ہیں۔'' اس نے سلمان کو جواب دیا۔ اس جواب سے سلمان نے سمجھ لیا کہ وہ کیا ارادہ رکھتا ہے چنانچہ گاڑی پُرہجوم سڑکوں سے ہٹا کر ایسے راستوں کی طرف لے جانے لگا جہاں وہ اطمینان سے اپنی کارروائی کرسکیں۔ مستقل پیچھے آتے موٹر سائیکل سوار کی موجودگی نے تصدیق کردی کہ سلو کا اس کے بارے میں دعویٰ درست ہے، وہ واقعی ان کا تعاقب کررہا تھا۔ خاموشی سے اپنے ہتھیار نکال کر وہ اس سے نمٹنے کے لیے تیار ہوگئے۔

وہ تین تھے اور ایک اکیلے بندے کو قابو کرنے کے لیے انہیں زیادہ جدوجہد کی ضرورت نہیں تھی اس لیے خاصے ریلیکس بھی نظر آرہے تھے۔ سلمان نے گاڑی کو گھما پھرا کر ایک ایسے راستے پر ڈال دیا تھا جہاں سڑک کا حشر خراب تھا اور دونوں اطراف جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ سڑک کی حالت اور علاقے کی ویرانی کی وجہ سے لوگ عموماً اس طرف کا رخ نہیں کرتے تھے کیونکہ اکثر اوقات یہاں... راہ زنی کی وارداتیں بھی پیش آجاتی تھیں۔ ان کا پیچھا کرنے والا موٹر سائیکل سوار اس سڑک پر بھی ان کے پیچھے ہی تھا۔ سلمان نے سڑک کے تقریباً وسط میں پہنچ کر اچانک ہی اپنی گاڑی روک لی۔ گاڑی اس انداز میں روکی گئی تھی کہ سڑک پر سے گزرنے کا راستہ بالکل باقی نہیں رہا تھا۔ موٹر سائیکل سوار کو بھی رکنا پڑا۔

''کیا بات ہے... کیوں اس طرح راستہ روکا ہے؟'' بجائے خوف زدہ ہونے کے وہ پُراشتعال لہجے میں چلّا کر دریافت کرنے لگا۔

''پہلے تم بتاؤ کہ تم کس لیے ہمارا پیچھا کررہے ہو؟'' جاوید علی ہاتھ میں پسٹل لیے گاڑی سے نیچے اترا اور کڑے لہجے میں بازپرس کی۔ پسٹل دیکھنے کے باوجود موٹر سائیکل سوار کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہیلمٹ کی وجہ سے اس کے چہرے کے تاثرات تو نہیں دیکھے جاسکتے تھے لیکن باڈی لینگویج بتارہی تھی کہ وہ خوف زدہ قطعی نہیں ہے۔

''یہ تو تمہیں ابھی پتا چل جائے گا۔'' اس نے معنی خیزی سے جاوید علی کے سوال کا جواب دیا اور پھر زور سے چلّایا۔ ''اے ہلنا مت ورنہ گولی ماردوں گا۔'' اس کا مخاطب سلو تھا جو بالکل ہی اچانک گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل سوار کی للکار کا کوئی اثر نہیں لیا اور دائیں طرف کی جھاڑیوں میں چھلانگ لگادی۔ موٹر سائیکل سوار نے فوراً اس کی طرف ایک گولی داغی لیکن سلو بال بال

بچ گیا۔ دوسری گولی چلنے سے قبل وہ جھاڑیوں میں روپوش ہوچکا تھا۔ اس مختصر سے دورانیے میں وہاں مزید تبدیلیاں بھی آئی تھیں۔ عموماً ویران رہنے والی سڑک پر نہ جانے کیسے دونوں اطراف سے گاڑیاں نمودار ہوگئی تھیں۔ گولی کی آواز کے ساتھ ساتھ گاڑیوں کے بریکس چرچرائے اور کھٹا کھٹ دروازے کھولتے ہوئے ان میں سے کئی افراد برآمد ہوئے۔ ان افراد میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں جدید اور بھاری ہتھیار موجود تھے۔ سلمان اور جاوید علی کی سمجھ میں آگیا کہ موٹر سائیکل سوار کے اس قدر اطمینان کا کیا سبب تھا۔ ان کا تعاقب کرتے ہوئے یقیناً وہ اپنے ساتھیوں سے مسلسل رابطے میں تھا اور انہیں اپنی لوکیشن سے آگاہ کرتا رہا تھا۔ ان لوگوں نے اسے گھیرنے کا پروگرام بنا کر اس سڑک کا رخ کیا تو یقیناً وہ ان کا پروگرام سمجھ گیا اور الٹا انہیں ہی گھیرنے کی منصوبہ بندی کرلی۔

''اب تم لوگ اپنے ہتھیار پھینک کر شرافت سے ہاتھ اوپر اٹھالو ورنہ جان سے جاؤ گے۔'' موٹر سائیکل سوار نے انہیں حکم دیا جس پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ دونوں بہت بُری طرح پھنس چکے تھے۔

''تیسرا ادھر جھاڑیوں میں گھسا ہے۔ اسے تلاش کرو۔'' سلمان اور جاوید علی ناچار اس کے حکم پر عمل کرنے جارہے تھے کہ اس نے اپنے ساتھیوں کو دوسرا حکم دیا۔ اس کے حکم کی تعمیل کے لیے تین چار افراد جھاڑیوں کی طرف بڑھے۔ ابھی پہلے آدمی نے جھاڑیوں میں قدم رکھا تھا کہ گولی چلی اور موٹر سائیکل سوار جھٹکے سے نیچے گرا۔ گولی نے اس کی گردن پر عین ہیلمٹ کے نیچے چھید کیا تھا۔ اسے چیخنے تک کا موقع نہیں ملا، البتہ جاوید علی اور سلمان نے موقع کا خوب فائدہ اٹھایا اور فوراً ہی زمین پر گر کر گاڑی کے نیچے لڑھک گئے۔ دوطرف موجود دشمنوں کی موجودگی میں ان کے پاس یہی عارضی پناہ گاہ تھی جہاں وہ کچھ دیر خود کو گولیوں کی بوچھاڑ سے بچاسکتے تھے۔

موٹر سائیکل سوار کی ہلاکت کے بعد وہاں بے تحاشا فائرنگ شروع ہوگئی تھی۔ وہ لوگ اندھا دھند فائرنگ کررہے تھے اور باقاعدہ کسی سمت کا تعین نہیں کیا تھا۔ کچھ کے ہتھیاروں کا رخ ان کی گاڑی کی طرف تھا تو کچھ جھاڑیوں پر گولیاں برسا رہے تھے۔ جاوید علی نے بھی اپنے پسٹل سے چند فائر کیے لیکن ظاہر ہے یہ فائر بے اثر تھے۔ البتہ سلمان کو موقع مل گیا تھا کہ وہ گاڑی کی تہ میں موجود خفیہ خانہ کھول کر اس میں سے ہتھیار نکال سکے۔ ہتھیار نکالنے کے دوران وہ ہیڈکوارٹر رابطہ کرکے مختصراً صورتِ حال اور اپنی پوزیشن کے بارے میں بھی اطلاع دے چکا تھا۔ ہتھیار ہاتھ میں آئے تو دونوں نے ایک ایک جانب جواب دینے کا سلسلہ شروع کردیا۔ مخالفین کو اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ گاڑی کے نچلے حصے میں کوئی ایسا خفیہ خانہ موجود ہے جہاں ہتھیار چھپائے گئے ہیں اس لیے جب زوردار جواب ملا تو بوکھلا کر رہ گئے۔ ادھر سلو نے بھی ان کا ناطقہ بند کررکھا تھا۔ وہ بہت چالاکی سے اپنی جگہ بدل بدل کر فائر کررہا تھا لیکن اس کا ہر فائر اتنا سوچا سمجھا تھا کہ کوئی نہ کوئی اس کی زد میں ضرور آرہا تھا۔ دوسری طرف وہ خود ان لوگوں کے لیے چھلاوا بنا ہوا تھا جو کسی صورت ان کی زد میں نہیں آپارہا تھا۔

''پٹرول ٹینک میں سوراخ ہوگیا ہے۔'' گولیوں کی گونج میں جاوید علی نے وحشت زدہ لہجے میں ہڈیوں کا گودا جمادینے والا انکشاف کیا تو سلمان کو بھی زمین پر گرتا پٹرول دکھائی دے گیا۔

''ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' اس نے سرسراتی آواز میں کہا اور پھر دونوں نے ہی اپنے اعصاب کو قابو میں رکھتے ہوئے فوری طور پر لائحہ عمل بھی طے کرلیا۔ سڑک پر پیچھے کی جانب موجود افراد زیادہ مشکل میں تھے کیونکہ سلو کی گولیوں کا نشانہ زیادہ تر وہی لوگ بنے تھے اور ان کی نفری میں تین افراد کی کمی ہوگئی تھی۔ صرف دو موجود تھے جن میں سے ایک کی توجہ جھاڑیوں کی طرف تھی۔ جاوید علی اور سلمان نے خطرہ مول لیتے ہوئے اس طرف بے تحاشا فائرنگ شروع کردی اور موقع پاکر گاڑی کے نیچے سے نکل کر جھاڑیوں کی طرف چھلانگ لگائی۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ عین اسی وقت فضا میں پولیس کی گاڑی کا سائرن گونجنے لگا۔ حملہ آوروں کی توجہ بٹ گئی چنانچہ ان کی طرف کوئی فائر نہیں کیا گیا اور وہ بخیروخوبی جھاڑیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ جھاڑیوں میں گر کر ابھی وہ سنبھلے بھی نہیں تھے کہ فضا میں ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا گونجا۔ یہ ان کی گاڑی کا پٹرول ٹینک پھٹنے کی آواز تھی۔ وہ موت کے منہ سے بال بال بچ کر نکل آنے میں کامیاب ہوگئے تھے البتہ وہ بھکاری مخبر ضرور جان سے چلا گیا تھا جو گاڑی کی پچھلی نشست پر ہتھکڑی سے بندھا بے بس بیٹھا تھا۔ اس کی ہتھکڑی کو گاڑی کی چھت سے لگے ایک کلپ سے منسلک کردیا گیا تھا اس لیے وہ گاڑی سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔ اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے اسے نکالنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ شاید وہ ان کے لیے زیادہ اہم نہیں تھا۔

جھاڑیوں میں گر کر سنبھلتے ہی انہوں نے دوبارہ اپنے ہتھیاروں کا استعمال شروع کر دیا۔ سلو کے مقابلے میں انہوں نے بائیں طرف کی جھاڑیوں میں چھلانگ لگائی تھی اور ایک دوسرے سے مخالف سمت میں جھاڑیوں کے اندر ہی اندر حرکت کرتے ہوئے اس طرح آگے بڑھ رہے تھے کہ سڑک پر آگے پیچھے موجود دشمنوں کے نسبتاً نزدیک پہنچ جائیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ پولیس سائرن سن کر اب وہ لوگ فرار کی کوشش کریں گے اس لیے ان کی پہلی ترجیح ان کی گاڑیوں کو ناکارہ بنانا تھا۔ اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب رہے۔ فرار کی راہیں مسدود پا کر دشمن ایک بار پھر مقابلے پر ڈٹ گئے۔ فائرنگ کے اس شور میں پولیس والوں کی طرف سے کی جانے والی وہ اناؤنسمنٹ بھی سنائی دے رہی تھی جو وہ ہتھیار پھینکنے کے لیے کر رہے تھے۔ جب کسی پر اس اعلان کا اثر نہیں ہوا تو پولیس والے بھی میدان میں کود پڑے۔ ہر طرف سے گھر جانے والے دشمن کو آخرکار ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ہتھیار پھینک کر جب وہ سامنے آئے تو صرف دو بچے تھے۔ باقی یا تو شدید زخمی تھے یا ہلاک ہو چکے تھے۔ گرفتاری دینے والے دونوں افراد میں سے بھی ایک کے بازو سے خون بہہ رہا تھا جبکہ دوسرے کے چہرے پر خراشیں تھیں۔ شاید اس کا چہرہ سڑک سے رگڑ کھا گیا تھا۔ پولیس والے انہیں ہتھکڑیاں پہنانے لگے تو وہ تینوں بھی جھاڑیوں سے نکل کر باہر آ گئے۔ انہیں پولیس والوں کے ساتھ ساتھ سی ایف پی کے چند اہلکار بھی نظر آ رہے تھے۔ انہی اہلکاروں میں سے ایک نے بتایا۔

''پولیس اور ہم ساتھ ساتھ ہی یہاں پہنچے تھے۔ انسپکٹر نے ہم سے تعاون کیا اور ہم نے مل کر کارروائی کی۔''

''ٹھیک ہے۔ ان دونوں بندوں کو ہم ساتھ لے جائیں گے۔ لاشیں اور شدید زخمی پولیس اپنے ساتھ لے جا سکتی ہے لیکن میڈیا کے لیے پولیس کا بیان یہ ہونا چاہیے کہ یہ لوگ ڈاکو تھے جنہیں ڈکیتی کی واردات کرتے دیکھ کر پولیس نے للکارا اور جواب میں ڈاکوؤں کی طرف سے فائرنگ پر خود بھی اسلحے کے استعمال پر مجبور ہو گئی۔'' اس موقع پر سلمان نے آگے بڑھ کر معاملات نمٹانے شروع کر دیے۔ گرفتاری دینے والے دونوں افراد کے علاوہ وہ باقی زخمیوں کی حالت کا جائزہ لے چکا تھا۔ طبی امداد مل جانے پر بھی ان کی جان بچنا مشکل تھی۔ اگر کوئی قسمت سے بچ بھی جاتا تو بہرحال اسے عرصہ دراز تک بستر پر رہنا پڑتا چنانچہ فوری طور پر کام آنے والے بندوں کے علاوہ انہوں نے سب کو نظرانداز کر دیا تھا۔ بعد میں بچنے والے سے آرام سے نمٹا جا سکتا تھا۔

''او کے سر! میں سمجھ گیا... آپ کو کوئی شکایت نہیں ہو گی۔'' پولیس پارٹی کے انچارج نے اسے جواب دیا تو وہ لوگ قیدیوں سمیت اس گاڑی میں سوار ہونے لگے جو سی ایف پی والے اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کی اپنی گاڑی تو تباہ ہو چکی تھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ آنے والے ہائی روف میں آئے تھے اس لیے کار کے مقابلے میں زیادہ لوگ سما گئے تھے۔ قیدیوں کو انہوں نے پولیس کی لگائی ہوئی ہتھکڑیوں کے علاوہ سر پر اور چہرے پر سیاہ غلاف منڈھ کر بالکل بے بس کر دیا تھا۔ تیزی سے ہیڈ کوارٹر پہنچنے کے بعد انہوں نے قیدیوں سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس چکر میں کسی نے سلو سے بھی باز پرس نہیں کی کہ وہ بغیر اطلاع کے کیوں غائب ہو گیا تھا۔ ویسے بھی یہ اس کی پھرتی کا نتیجہ تھا کہ وہ گھیر لیے جانے کے باوجود مکمل بے بس ہونے سے بچ گئے تھے اور اب دو اہم قیدیوں کے ساتھ اپنے ہیڈ کوارٹر میں موجود تھے۔

جاوید علی نے بغیر وقت ضائع کیے پہلے ہی مرحلے پر جارح انداز میں تفتیش کا سلسلہ شروع کیا۔ ابتدا میں دونوں نے بہادری دکھانے کی کوشش کی لیکن جب جاوید علی نے نمک میں ڈوبی ایک پتلی راڈ سے بازو پر گولی کھانے والے کے زخم کو کریدنا شروع کیا تو اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے بتا دیا کہ وہ سب را کے فائٹنگ ونگ سے تعلق رکھتے ہیں اور انہیں مقامی انچارج پانڈے کی طرف سے ہدایات موصول ہوتی ہیں۔ تھوڑی سی مزید کوشش کے بعد اس نے پانڈے کا پتا بھی اگل دیا۔ فوراً ہی ایک ٹیم تشکیل دے کر جاوید علی اور سلمان ریڈ کے لیے تیار ہو گئے۔ سلو کی خواہش پر اسے بھی ساتھ لے لیا گیا۔ پانڈے جس کوٹھی میں مقیم تھا، وہ شہر کے پوش علاقے میں تھی۔ سی ایف پی کے اہلکاروں نے کوٹھی کو گھیر لیا اور ڈائریکٹ ایکشن شروع کر دیا۔ مقامی تھانے کو پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا تھا کہ یہاں ایک خفیہ محکمہ کارروائی کرنے جا رہا ہے اس لیے پولیس مداخلت نہ کرے۔

کوٹھی میں نگرانی کرنے والے کیمرے نصب تھے۔ کتے اور مسلح گارڈز بھی موجود تھے لیکن ان کی تعداد اتنی نہیں تھی کہ وہ سی ایف پی کے زوردار حملے کے سامنے ٹھہر سکیں۔ سی ایف پی کے اہلکار جارحانہ کارروائی کرتے ہوئے کوٹھی کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔ پانڈے کو انہوں نے ایک کمرے میں صوفے کے نیچے چھپا پایا۔ دو اہلکاروں نے گھسیٹ کر اسے باہر نکالا تو اس کی صورت سے ظاہر تھا کہ

اس کی حالت پتلی ہے۔ ایک اہلکار نے اس کی گدی پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے اسے کمرے سے باہر کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی لیکن حیرت انگیز طور پر پانڈے نے مزاحمت کی اور خود کو باہر دھکیلنے والے کو پلٹ کر بہت زور سے دھکا دیتے ہوئے اسی صوفے کی طرف چھلانگ لگائی جہاں سے اسے نکالا گیا تھا۔ اہلکار نے اضطراری طور پر گولی چلا دی۔ گولی پانڈے کے کولہے میں لگی اور وہ ایک دل دوز چیخ مارتا ہوا صوفے کے قریب ہی گر گیا۔ اگلا لمحہ مزید حیرت انگیز تھا۔ اس نے بے پناہ تکلیف میں ہونے کے باوجود صوفے کے نیچے ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا۔ یقیناً یہ اس کا اپنا ریوالور تھا جو اس نے وہاں چھپا دیا تھا اور سی ایف پی والے اس کی طرف دھیان نہیں دے سکے تھے۔

''ریوالور پھینک دو ورنہ گولی مار دوں گا۔'' اسے مسلح دیکھ کر سی ایف پی کا ایک اہلکار للکارا۔ پانڈے کا چہرہ کولہے پر لگنے والی گولی کی تکلیف کی وجہ سے مسخ ہو رہا تھا، اس کے باوجود اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں مزید بھیانک لگنے لگا۔

''میں کہتا ہوں ریوالور پھینک دو۔'' سی ایف پی اہلکار نے پھر تنبیہ کی لیکن پانڈے پر اثر نہیں ہوا اور بولا۔ ''تمہاری تحویل میں جا کر تشدد سہنے سے بہتر ہے کہ میں جان دے دوں۔'' کہنے کے ساتھ ہی اس نے کسی کے کچھ سمجھنے سے قبل ریوالور اپنی کنپٹی سے لگا کر فائر کر دیا۔ فوراً ہی اس کا جسم ایک جھٹکا کھا کر ساکت ہو گیا۔ ساکت تو دوسرے لوگ بھی رہ گئے تھے۔ پانڈے کی اس حرکت نے ان کی فتح کو ناکامی میں بدل دیا تھا۔ دوسری سمتوں میں مصروف سلمان، جاوید علی اور سلو جب فارغ ہو کر اس طرف پہنچے تو پانڈے کی لاش دیکھ کر قدرے مایوس سے ہو گئے۔

''سالا بہت چالاک نکلا۔ اپنے لیے آسان موت کو چن لیا۔'' سلو نے بے ساختہ ہی تبصرہ کیا۔

''زندہ ہاتھ آ جاتا تو بہت کام آتا۔ ہم اس سے ان کے یہاں پھیلے نیٹ ورک کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے تھے۔'' جاوید علی نے کفِ افسوس سے ہاتھ مسلے۔ سی ایف پی کے جن دو اہلکاروں کی موجودگی میں یہ واقعہ ہوا تھا، وہ ایک طرف قدرے شرمسار کھڑے تھے۔

''چھوڑو مٹی پاؤ۔ زمین ایک خبیث کے بوجھ سے آزاد تو ہوئی۔ باقیوں کو بھی ہم ان شاء اللہ وقت آنے پر فنا کر دیں گے۔'' لائٹ سے انداز میں کہتے ہوئے سلمان نے ماحول پر چھایا بوجھل پن دور کرنے کی کوشش کی اور کافی کامیاب بھی رہا۔ سب لوگ پانڈے کے زندہ ہاتھ نہ آنے کی افسردگی سے نکل کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ پانڈے زندہ ہاتھ نہیں آیا تھا لیکن اس کے اس اہم ٹھکانے سے بہت سی ایسی خفیہ دستاویز ہاتھ آنے کی امید تھی جن سے را کا کچھا چٹھا کھل سکتا تھا۔

☆☆☆

ہوٹل میں کچھ دیر آرام کرنے اور فریش ہونے کے بعد وہ ٹھیک چھ بجے آرمی کے ایک سیف ہاؤس میں کرنل سبکتگین سے ملاقات کر رہے تھے۔ انہیں آرمی ہی کی ایک بغیر نشان والی گاڑی میں یہاں لایا گیا تھا جبکہ ان کے زیرِ استعمال گاڑی ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی ہوئی تھی۔

''آپ لوگوں سے ملاقات کی خواہش تو تھی لیکن یہ امید نہیں تھی کہ ملاقات ایسے حالات میں ہو گی۔ کرنل توحید جیسی محبِ وطن شخصیت کی شہادت ہمارے ملک کا بہت بڑا نقصان ہے۔'' ان دونوں سے مصافحہ کرتے ہوئے کرنل سبکتگین اپنی گمبھیر آواز میں بولے تو ان کے دلوں کی افسردگی بھی مزید بڑھ گئی۔

''درست فرمایا آپ نے۔ کرنل کی شہادت واقعی ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ ان جیسے سچے، کھرے، بہادر اور جذبۂ حب الوطنی سے لبریز انسان سے محرومی پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔'' شہریار نے کرنل سبکتگین کی تائید کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ذیشان تو کرنل توحید کے معاملے میں اتنا جذباتی تھا کہ اس موضوع پر بات کرنے سے بھی گریز کر رہا تھا۔

''میرے بہادر جوانو! ہم نے اور تم نے مل کر جو ذمے داریاں اپنے شانوں پر لے رکھی ہیں، ان کی ادائیگی میں سب سے پہلے موت کا خطرہ ہی سامنے آتا ہے لیکن ہم ان خوش قسمتوں میں سے ہیں کہ جن کی موت اصل میں حیاتِ جاوید ہوتی ہے۔ شہادت کا درجہ پانا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی، ہر سپاہی اس کی آرزو کرتا ہے۔ اللہ نے کرنل صاحب کی اس آرزو کو پورا کیا۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ان کے کام کو جاری رکھیں۔ آپ لوگوں کا اب تک انہی سے واسطہ پڑا ہے اس لیے آپ ان سے آگے کچھ نہیں جانتے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سی ایف پی کے پیچھے بھی پوری ایک چین کام کر رہی ہے۔ کرنل کے بعد ان کے کام کو جاری رکھنے کے لیے میں ہوں اور میرے بعد کوئی اور جیسے کرنل کے نہ ہونے پر میں نے ازخود آپ سے رابطہ کر لیا ہے، اسی طرح میں نہ رہا تو میرے بعد کوئی اور ہو گا جو سی ایف پی کو

چلاتا رہے گا۔

"یہ پاکستان کی سالمیت کے لیے بہت خلوص سے قائم کردہ ادارہ ہے جو انشاء اللہ ہر صورت میں اپنا کام کرتا رہے گا۔ ہاں، یہ ہوسکتا ہے کہ نام اور چہرے بدلتے رہیں لیکن اتنا طے ہے کہ کام اور مقصد کبھی تبدیل نہیں ہوگا اور مقصد ایک ہی ہے... تن من دھن سے اس وطن کی بقا اور سلامتی کا فرض انجام دینا۔" بولتے بولتے کرنل سبکتگین ذرا سے جذباتی ہوگئے لیکن پھر فوراً ہی خود کو سنبھال کر نارمل لہجے میں بولے۔

"میرے علم میں ہے کہ پیر آباد سے متصل جنگل میں کس قسم کے لوگوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور پیر آباد کا چودھری کیسے ان لوگوں کا آلۂ کار بنا ہوا ہے۔ ہم آپ لوگوں کے ایکشن لینے کے لیے ایک بھرپور آپریشن کی تیاریاں شروع کر چکے تھے اور اپنے وسائل و قوت کو یکجا کر رہے تھے۔ کرنل صاحب حیات ہوتے تو خود آپ سے یہ پلان ڈسکس کرتے لیکن اب ان کے بعد میں آپ کی مدد کروں گا۔ اس سلسلے میں جو کچھ آپ کے ذہن میں ہے وہ مجھ سے ڈسکس کر سکتے ہیں۔" ابتدائی تمہید کے بعد اب وہ مطلب کی بات پر آچکے تھے۔ ذیشان اور شہریار بھی فوری طور پر مستعد ہوگئے۔

"ہمیں دو گروہوں میں تقسیم ہو کر بیک وقت چودھری کی حویلی اور جنگل دونوں جگہوں پر آپریشن کرنا ہوگا کیونکہ اطلاعات کے مطابق آج کل حویلی میں چودھری کے ساتھ کچھ اہم غیر ملکی بھی موجود ہیں اور وہاں کچھ مشکوک سرگرمیاں انجام دی جا رہی ہیں۔ ہم مختلف اوقات میں آپریشن کر کے کسی ایک جگہ کے لوگوں کو سنبھلنے یا فرار ہونے کا موقع نہیں دے سکتے البتہ میرا اندازہ ہے کہ ہمیں جنگل میں زیادہ وسائل کے ساتھ اور جدید ٹیکنالوجی سے لیس ہو کر کارروائی کرنی پڑے گی۔" اب گفتگو کا بیڑا ذیشان نے اٹھایا اور کرنل کے سامنے حالات کو واضح کرنے لگا۔ اس میٹنگ میں انہوں نے بہت باریکی سے ہر شے کا جائزہ لیا۔ شہریار چونکہ کچھ عرصہ بطور اے سی اس علاقے میں کام کر چکا تھا، اس لیے اس کے پاس مقامی حالات کے بارے میں بہتر معلومات تھیں۔ اس نے کرنل سبکتگین کے کئی اہم سوالوں کے جواب دیے۔ ان کے درمیان تقریباً ڈھائی تین گھنٹوں تک میٹنگ جاری رہی اور میٹنگ کے اختتام پر کرنل نے انہیں یقین دہانی کروائی کہ وہ آج رات ہی باقی ذمے داران کے ساتھ ڈسکس کر کے پلان کو فائنل کر دیں گے اور کل تک انشاء اللہ وہ اس لائق ہوں گے کہ کارروائی کر سکیں۔

کرنل توحید کی شہادت پر افسردگی میں ڈوب جانے والے ذیشان اور شہریار جب ان سے الوداعی مصافحہ کر رہے تھے تو ان کے دل جوش اور جذبے سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ میٹنگ روم سے باہر نکلے تو انہیں ویٹنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ وہ چونکہ اپنی گاڑی میں یہاں نہیں آئے تھے، اس لیے خیال تھا کہ گاڑی کے انتظار میں یہاں بٹھایا گیا ہے لیکن تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد انہیں دوبارہ کرنل کے سامنے حاضر ہونے کا حکم دیا گیا تو وہ چونک گئے۔ اس بار وہ میٹنگ روم سے ہٹ کر کسی دوسرے کمرے میں لے جائے گئے تھے۔ وہاں کا منظر دیکھ کر وہ چونک گئے۔ وہاں کرسیوں پر دو افراد کلپس کی مدد سے بندھے ہوئے تھے اور ان کے حلیے سے ظاہر تھا کہ ان پر تشدد کیا گیا ہے۔ دونوں میں سے ایک تو ان کے لیے اجنبی تھا لیکن ایک کو وہ شناخت کر سکتے تھے۔ یہ وہی رپورٹر تھا جو کرنل کے جنازے کے وقت بھی انہیں ملا تھا۔

"میرے پاس تم لوگوں کے لیے کچھ اہم اطلاعات تھیں اس لیے تمہیں روک لیا گیا۔" کرنل نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر رپورٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "اس شخص کو تو شاید تم لوگ پہچانتے ہوگے؟"

"یس سر! یہ ہمیں کرنل توحید کے جنازے پر ملا تھا۔ ایک چینل کا نمائندہ ہے۔" جواب شہریار نے دیا۔

"یہ اور بھی کچھ ہے اور اسی تعارف کے لیے میں نے تم لوگوں کو بلوایا ہے۔" کرنل نے جواب دیا اور بتانے لگے۔

"جب ہوٹل سے تم لوگوں کو یہاں لایا جا رہا تھا تو ایک گاڑی نے تعاقب کی کوشش کی۔ تعاقب کرنے والے اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کہ جس گاڑی میں تم لوگوں کو لایا جا رہا ہے، اس کے علاوہ بھی ایک گاڑی پیچھے موجود ہے۔ اس گاڑی میں سوار جوانوں نے تعاقب کرنے والوں کو گھیر لیا۔ مقابلے میں ایک شخص مارا گیا جبکہ دوسرے کو گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار شخص سے پوچھ گچھ کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس رپورٹر کی مدد سے تمہاری گاڑی کو بگڈ کیا گیا تھا۔ ہمارے جوانوں نے اسے بھی اس کے گھر سے اٹھا لیا۔ اب آگے یہ دونوں بتائیں گے کہ انہیں کس نے ہائر کیا تھا۔" کرنل نے انہیں مختصراً حالات سے آگاہ کیا تو وہ شرمندہ سے ہوگئے۔ دشمن ان کی راہ پر لگ چکا تھا اور انہیں علم ہی نہیں ہوسکا تھا۔ اگر کرنل کے جوان چوکنا نہ ہوتے تو دشمن یہاں تک رسائی حاصل کر چکے ہوتے۔

"شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ جب تم لوگوں کو ٹریس کیا گیا، تم بہت بڑے جذباتی بحران سے گزر رہے تھے... لیکن یاد رکھو کہ ہم جس فیلڈ میں ہیں، وہ ہر طرح کے حالات میں اپنے حواس قائم رکھنے کی متقاضی ہوتی ہے ورنہ بعض اوقات ناقابلِ تلافی نقصانات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بہرحال جو ہوا سو ہوا، آگے تم لوگ ہوشیار رہو۔ اس معاملے کو میں خود نمٹا لوں گا۔ تم اپنا فوکس اس آپریشن پر رکھو جو کل پیر آباد میں کرنا ہے۔ اس آپریشن میں آرمی کے جوان سی ایف پی کے شانہ بشانہ کام کریں گے۔ اپنی ٹیم کا انتخاب البتہ تم لوگ خود کرو گے۔" کرنل نے ان کی کیفیت بھانپ لی اور انہیں اپنے ساتھ لے کر اس کمرے سے باہر نکل آئے اور یہ سب کہا۔

"وی آر ویری سوری سر! آئندہ انشاء اللہ ایسی کوتاہی ہرگز نہیں ہوگی۔" پہلے ذیشان نے اپنی زبان کھولی۔

"میں نے کہا نا جانے دو۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب تم لوگوں کو احتیاط کرنی ہوگی۔ یہاں سے واپس ہوٹل کے بجائے تمہیں ایک محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دیا جائے گا۔ وہاں سے تم اپنے ماتحتوں سے رابطہ کرو اور انہیں تیار رکھو۔ میری طرف سے گرین سگنل ملنے پر تم لوگوں کو ایکشن کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ از اٹ کلیئر؟" نرم لہجے میں بولتے بولتے آخر میں انہوں نے فوجیوں کے سے مخصوص سخت لہجے میں پوچھا۔

"یس سر۔" دونوں نے بیک وقت جواب دیا۔ ان کا لہجہ پُرجوش تھا اور اس میں یہ عزم پوشیدہ تھا کہ دشمن سے ٹکرا کر اسے پاش پاش کر دینا ہے۔

☆☆☆

تیز رفتار جیپ راستوں کو روندتی ہوئی تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر لمبے قد اور گوری رنگت والا ایک ایسا شخص بیٹھا ہوا تھا جس کی داڑھی اور سر کے بال سنہری تھے اور آنکھوں کی رنگت پر نیلاہٹ غالب تھی۔ اس نے نسواری رنگ کی گھیردار شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور سر پر مخصوص وضع کی کنٹھی پگڑی تھی۔ اس کے ڈرائیونگ کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس پر کسی جگہ پہنچنے کی عجلت سوار ہے لیکن عجلت کے باوجود وہ بہت مہارت سے ڈرائیو کر رہا تھا اور کہیں بھی جیپ نے غیر ضروری جھٹکے یا اچھل کود نہیں دکھائی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بالکل سپاٹ تھے۔ اس کے اندر کی پریشانی یا کھاڑ پچھاڑ کا ذرا سا بھی عکس اس کے چہرے پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ پورے ارتکاز کے ساتھ جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔

طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے آہستہ آہستہ جیپ کی رفتار کم کرنا شروع کر دی اور اگلا موڑ مڑتے ہی ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں سڑک کے کنارے قطار سے کئی چھوٹے چھوٹے ہوٹل بنے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی جیپ سب سے پہلے پڑنے والے چھوٹے سے ہوٹل کے سامنے روک لی۔ ہوٹل کی تعمیر میں اینٹوں کا استعمال صرف چار دیواری تک ہی محدود تھا، باقی زیادہ تر لکڑی کا کام تھا۔ چھت بھی پھوس ہی کی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ یہاں چند ایسے چھوٹے چھوٹے کمرے موجود ہیں جہاں مسافر چند گھنٹوں کے لیے قیام کر سکتے ہیں۔

جیپ سے اتر کر وہ سیدھا استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔ اس کاؤنٹر پر تقریباً اسی کی سی وضع قطع کا سا ایک ادھیڑ عمر آدمی بہت ٹھسے سے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس ہوٹل کا مالک تھا۔

"مجھے دو گھنٹے کے لیے ایک کمرا چاہیے۔" مالک سے مصافحہ کرنے کے بعد اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔

"مل جائے گا لیکن کرایہ ایڈوانس دینا ہوگا۔ کھانے اور پینے کا بھی انتظام ہے۔" مالک نے اسے جو جواب دیا، اس میں لفظ "پینے" پر خاصا زور تھا۔ یہ ہوٹل جس راستے پر موجود تھا اس سے شریف لوگوں کے علاوہ جرائم پیشہ افراد کا کثرت سے گزر ہوتا تھا اس لیے بظاہر خستہ حال نظر آنے والے ہوٹلوں میں دیسی سے لے کر ولایتی تک ہر طرح کے پینے پلانے کا سامان مل جاتا تھا۔ شرط صرف اتنی تھی کہ گاہک نقد ادائیگی کر سکتا ہو۔

"کھانا ایک گھنٹے بعد میرے کمرے میں ہی پہنچا دینا۔ کھانے کے بعد میں صرف چائے پینا پسند کروں گا۔ اور ہاں، باہر میری جیپ کھڑی ہے۔ اس کے لیے تیل پانی کا بھی بندوبست کرنا ہے۔" مسافر نے اپنے مطالبات کے ساتھ کئی بڑی مالیت کے نوٹ کاؤنٹر پر رکھ دیے۔

"سب ہو جائے گا، فکر مت کرو۔ کوئی اور خدمت ہو تو بتاؤ؟" نوٹ دیکھ کر ہوٹل مالک کی آنکھوں میں چمک آگئی اور جھپٹ کر سارے نوٹ سمیٹتے ہوئے اس نے پہلے سے زیادہ خوش اخلاقی سے کہا۔

"فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ مجھے میرا کمرا دکھا دو۔" مسافر نے سپاٹ لہجے میں فرمائش کی تو ہوٹل کا مالک کسی نشاط خان کو آواز دینے لگا۔ فوراً ہی گاہکوں کی میزوں پر کھانے پینے کا سامان پہنچاتا ایک نوعمر لڑکا دوڑتا ہوا کاؤنٹر کے پاس چلا آیا۔

"صاحب کو کمرے میں لے جاؤ۔" مالک نے حکم دیا تو نشاط خان مستعد ہوگیا لیکن اسے صرف راہنمائی کا فریضہ

انجام دینا پڑا۔ اپنا چھوٹا سا سفری بیگ مسافر نے اپنے شانے پر ہی لٹکا رکھا تھا۔ کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے ہال میں کرسیوں پر بیٹھے کھاتے پیتے لوگوں پر بظاہر ایک سرسری سی نظر ڈالی لیکن اس ایک نظر نے ہی وہاں موجود جملہ افراد کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ سب بھی تقریباً اسی جیسے حلیے والے لوگ تھے اور ان میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

''ادھر غسل خانہ اور بیت الخلا دونوں موجود ہیں۔ اگر آپ کا نہانے کا ارادہ ہو تو مجھے بتادو، میں بندوبست کردوں گا۔'' اسے کمرے تک پہنچا کر نشاط خان نے برآمدے کے آخری سرے پر نظر آنے والے دو دروازوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پیشکش کی۔

''نہیں، میں صرف منہ ہاتھ دھونا پسند کروں گا۔ تم جاؤ۔ مجھے تمہاری کسی خدمت کی ضرورت ہوئی تو بلا لوں گا۔'' اس نے لڑکے کو چلتا کیا اور کچھ سوچ کر کمرے میں داخل ہونے کے بجائے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہ کئی گھنٹوں سے سفر میں تھا اور اب اسے باتھ روم جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ باتھ روم جاتے ہوئے بھی اس نے اپنا سفری بیگ اپنے ساتھ ہی رکھنا پسند کیا تھا۔

جب وہ فریش ہو کے اپنے کمرے میں پہنچا تو خود کو پہلے کی نسبت کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ کمرے میں بان کی چارپائی پر ایک میلا سا بستر بچھا ہوا تھا۔ وہ بلا تکلف اس بستر پر بیٹھ گیا اور اپنا موبائل نکال کر کوئی نمبر ملانے لگا۔ پہلی گھنٹی پر ہی اس کی کال ریسیو کرلی گئی۔

''کہاں ہو صاب... ہم یہاں آپ کا انتظار کرتا ہے؟'' دوسری طرف سے کال ریسیو کرنے والے نے اس سے دریافت کیا۔

''راستے میں ہوں۔ جیپ کا انجن ٹھنڈا کرنے کے لیے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔ چھ سات گھنٹے تک تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔'' اس نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا لیکن انداز سے اتنا ضرور واضح تھا کہ وہ مخاطب کے لیے باس کی حیثیت رکھتا ہے۔

''ادھر میں نے سارے انتظامات کر دیے ہیں۔ یہاں پہنچ کر آپ جب چاہو گے، آپ کو سرحد پار بھجوا دیا جائے گا۔'' اسے پُرجوش انداز میں اطلاع فراہم کی گئی۔

''گڈ! تم نے ثابت کردیا ہے کہ تم اپنے باپ کی جگہ لینے کے مکمل اہل ہو۔'' اس نے دوسری طرف موجود شخص کو سراہا پھر فوراً ہی رابطہ منقطع کردیا۔ اب وہ ایک اور نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

''ہیلو۔'' دوسری طرف سے ایک نحیف سی نسوانی آواز سنائی دی۔

''کہاں ہو تم؟ میں نے پہلے بھی تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن تم نے کال ریسیو نہیں کی۔'' اس نے قدرے غرانے والے انداز میں دریافت کیا۔ اب وہ پشتو کے بجائے عبرانی زبان کا استعمال کر رہا تھا۔

''میں اسپتال میں تھی۔ میری طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ مجھے فوڈ پوائزن ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسٹمک واش کیا ہے۔ کئی گھنٹے تقریباً نیم بے ہوشی کی حالت میں رہی ہوں اور اب بھی اتنی کمزوری ہے کہ بستر سے اٹھنا ممکن نہیں۔'' اس کی طرف سے عبرانی کا استعمال ہونے پر دوسری طرف سے بھی عبرانی میں ہی ساری تفصیل بتائی گئی لیکن بولنے والی کے لہجے میں واضح نقاہت کا اظہار ہو رہا تھا۔

''اوہ شٹ! یہ بیمار ہونے کا کون سا موقع تھا؟'' وہ بُری طرح جھنجلایا۔

''کوئی مسئلہ ہے ڈیوڈ... تم مجھے پریشان لگ رہے ہو؟'' اس سے تشویش سے استفسار کیا گیا۔

''حالات بہت خراب ہیں لنڈا! تمہیں فوری طور پر وہاں سے نکلنا ہوگا۔ میرے کچھ آدمی پکڑے گئے ہیں اور یقیناً ان سے بہت کچھ اگلوایا جا چکا ہے۔ آرمی اور خفیہ ایجنسی والے جگہ جگہ ریڈ کرتے پھر رہے ہیں۔ ہر طرف بھونچال آیا ہوا ہے۔ جو مقامی سردار یہاں ہمارے لیے کام کرتا تھا، وہ بھی مارا گیا ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے بروقت نکلنے کا موقع مل گیا اور اب میں سردار کے بیٹے کے ذریعے سرحد پار نکلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ان حالات میں ہمارا منظر سے غائب ہو جانا ہی سب سے بہتر ہے۔ پاکستان میں موجود را کا انچارج پانڈے بھی مارا جا چکا ہے اس لیے فی الحال ہم یہاں بالکل بے یار و مددگار ہیں۔'' ڈیوڈ نے جلدی جلدی اسے حالات سے آگاہ کیا۔

''اوہ نو... یہ تو بہت بُرا ہوا۔ اس طرح تو ہمارا جنگل والا پروجیکٹ بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔'' اس کی زبانی ساری تفصیل سن کر لنڈا نے پریشانی کا اظہار کیا۔

''میرے خیال میں وہ پروجیکٹ محفوظ ہے کیونکہ گرفتار ہونے والوں میں سے کسی کو بھی اس کے بارے میں علم نہیں تھا۔ ہاں چودھری کی طرف سے ضرور خطرہ ہے۔ اگر اس پر ہاتھ ڈالا گیا تو وہ سچ اگل دے گا اس لیے میرا تمہیں مشورہ ہے کہ وہاں سے نکلنے سے پہلے چودھری اور اس کے

ایسے بندوں کا کام تمام کر کے نکلو جنہیں اس بارے میں علم ہے۔ کام کرنے والے بعد میں ہمیں اور مل جائیں گے لیکن پروجیکٹ تباہ نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ لنڈا کو ہدایات دینے لگا۔

''اوکے، میں کچھ کرتی ہوں۔'' لنڈا نے پریشانی سے جواب دیا۔

''میں تمہاری کامیابی کی دعا کروں گا۔'' ڈیوڈ نے اس جملے سے اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔ اسے اندازہ تھا کہ لنڈا بڑی مشکل میں پھنس گئی ہے۔ اگر اسے خود عجلت میں فرار نہ ہونا پڑتا تو وہ اسے ساتھ لے کر ہی نکلتا یا کم از کم ایسا انتظام کر دیتا کہ اس تک بروقت اطلاع پہنچ جائے لیکن وہ ایسا کچھ نہیں کر سکا تھا۔ لنڈا اسے بے حد قربت کے باوجود اس نے مصیبت کے وقت سب سے پہلے اپنی جان بچانا ضروری سمجھا تھا کیونکہ اس کے خیال میں ان کے پیشے میں جذباتیت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ بدقسمتی یہ رہی تھی کہ لنڈا عین وقت پر شدید بیمار پڑ گئی تھی۔ اس بیماری کی وجہ سے اسے نہ تو وہ بروقت ہوشیار کر سکا تھا اور نہ ہی یقین سے یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ اس حالت میں حالات سے پوری طرح نمٹ سکتی ہے۔

بہت منجھی ہوئی ایجنٹ ہونے کے باوجود بہرحال وہ انسان تھی اور بشری کمزوریوں سے زیر ہو سکتی تھی۔ حالات اور اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کو ترازو میں تولتا وہ کامیابی اور ناکامی کے امکانات کو ففٹی ففٹی پرسنٹ ہی دیکھ رہا تھا۔

کال منقطع ہونے کے بعد بھی وہ کچھ دیر یونہی بستر پر گم صم سا بیٹھا رہا پھر دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکایا۔ بے ساختہ ہی اس کی نظر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف اٹھی۔ ایک گھنٹا گزر چکا تھا اور یقیناً اس کے لیے کھانا آگیا تھا۔

''اندر آجاؤ۔ دروازہ کھلا ہے۔'' اس نے بھاری گونج دار آواز میں کہا تو نشاط خان کھانے کی ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرا اتنا مختصر تھا کہ اس میں چارپائی اور ایک چھوٹی سی میز کے علاوہ کوئی فرنیچر موجود نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ایک کرسی تک بھی رکھنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔ نشاط خان نے کھانے کی ٹرے میز پر رکھی اور میز کو کھسکا کر چارپائی کے مقابل لے آیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ کمرے سے باہر نہیں گیا اور کچھ متذبذب سا ڈیوڈ کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاندیدہ ڈیوڈ نے اس کے انداز کو تاڑ لیا اور آہستہ سے بولا۔ ''کیا بات ہے لڑکے... کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

''جی ہاں، میرے خیال میں میرے پاس آپ کے لیے بہت اہم اطلاع ہے لیکن وہ میں مناسب معاوضے پر ہی آپ کو دوں گا۔'' عیاری کی چمک آنکھوں میں لیے بولنے والے نشاط خان کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ ڈیوڈ اس کی بات پر چونک گیا۔ لڑکا نوعمر ضرور تھا لیکن اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ معاشی جدوجہد کے ماہ و سال نے اسے اپنی عمر سے زیادہ تجربہ اور ہوشیاری عطا کردی ہے۔

''تم اطلاع دو۔ انعام تمہاری توقع سے بڑھ کر ہوگا۔'' اس نے بھی نشاط خان کی طرح ہی سرگوشیانہ انداز اختیار کیا کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ ان کی گفتگو کسی کے سن لینے کا امکان ہے۔

''خفیہ ایجنسی کا ایک بندہ آپ کی ٹوہ میں ہے۔ میں اسے اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ اس نے مالک سے خاص طور پر آپ کے برابر والا کمرا اپنے لیے بک کروایا ہے اور جتنی دیر سے آپ اس کمرے میں ہیں، وہ بھی اندر سے دروازہ بند کر کے برابر والے کمرے میں موجود ہے۔ ایک بار میں نے بہانے سے اس کے کمرے میں جانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے دروازہ نہیں کھولا اور ڈانٹ کر بھگا دیا۔'' جوں جوں نشاط خان بتا رہا تھا، ڈیوڈ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑتی جا رہی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ ماحول سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہونے کے باوجود کسی خفیہ ایجنسی کا بندہ اس کے پیچھے لگ سکتا ہے۔ البتہ وہ نشاط کی اطلاع کو غلط قرار نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ان علاقوں میں خفیہ ایجنسیوں کے اہلکار اپنے مطلب کے شکار کی بُو سونگھتے پھرتے ہیں۔

''یہ لو... لیکن خیال رکھنا کہ اب تمہاری زبان بالکل بند رہنی چاہیے ورنہ تم اپنی جان بھی گنوا سکتے ہو۔'' اس نے چند بڑے نوٹ نکال کر نشاط خان کو تھمائے اور سرگوشی ہی میں پھنکارا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا صاب! نشاط خان زبان کا پکا ہے۔'' لڑکے نے جلدی جلدی نوٹ اپنی شلوار کے نیفے میں ٹھونسے اور کمرے سے باہر جانے لگا لیکن ڈیوڈ نے اسے اشارے سے روک لیا پھر قدرے بلند آواز میں ایسی گفتگو کرنے لگا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خشک میوہ جات کا بیوپاری ہے اور اس علاقے سے میوہ لے کر پنجاب کے مختلف شہروں میں سپلائی کرتا ہے۔ نشاط خان بھی اس کے ساتھ ہوشیاری سے سوال جواب کرتا رہا۔ واقعی وہ بڑا چلتا پرزہ لڑکا تھا۔ اس موضوع پر اس نے ایسی گفتگو کی کہ ڈیوڈ

بھی اش اش کر اٹھا۔ آخرکار اس نے دو چار مزید باتیں کر کے اسے اپنے کمرے سے رخصت کر دیا۔

اس کے جانے کے بعد اس نے اپنا کھانا ختم کیا۔ ساتھ ساتھ وہ حالات کا جائزہ بھی لیتا رہا تھا۔ وہ جس کمرے میں موجود تھا، دراصل وہ لکڑی کا ایک کیبن تھا اور یہ بات یقینی تھی کہ ساتھ والے کمرے یا کیبن میں سے اگر کوئی لکڑی کی درمیانی دیوار سے کان لگا کر سن گن لینے کی کوشش کرتا تو اس کمرے میں ہونے والی گفتگو سن سکتا تھا۔ اگرچہ اس نے یہاں بیٹھ کر جو دو فون کیے تھے، ان کے دوران اس کی آواز بہت دھیمی تھی لیکن کوئی ہوشیار شخص بہرحال اتنا تو اندازہ کر سکتا تھا کہ ایک کال کے دوران اس نے مقامی کے بجائے عبرانی کا استعمال کیا ہے اور یہی چیز اسے مشکوک کرنے کے لیے کافی تھی۔ اپنے کیریئر کے دوران وہ متعدد بار ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوا تھا اس لیے زیادہ گھبرایا نہیں اور صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے اپنا لائحہ عمل طے کرنے لگا۔

اسلحے کے سلسلے میں اسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ قمیص کے نیچے کمر پر بندھی بیلٹ سے اس کا چھوٹا چپٹا سا خطرناک پسٹل لٹکا ہوا تھا۔ اس پسٹل کی ساخت ایسی تھی کہ لباس کے نیچے اس کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ یوں بھی جتنا ڈھیلا ڈھالا لباس اس نے پہن رکھا تھا، وہ بہت کچھ پوشیدہ رکھ سکتا تھا۔ اس پسٹل کے علاوہ اس کی جیپ میں بھی ایک خطرناک گن موجود تھی جبکہ پنڈلی کے ساتھ ایک بہت تیز دھار خنجر بندھا ہوا تھا۔ اسے خود پر اعتماد تھا کہ وہ چار چھ افراد سے اکیلا ہی بخوبی نمٹ سکتا ہے چنانچہ جب اپنے کمرے سے باہر نکلا تو چہرہ حسبِ معمول پُرسکون تھا۔ ہال سے گزر کر بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے اس کی عقابی نگاہوں نے بھانپ لیا کہ اسے دیکھتے ہی کونے کی میز پر بیٹھا ہوا ایک آدمی متوجہ ہوا ہے۔ اس آدمی کو نظرانداز کرتے ہوئے وہ سیدھا آگے بڑھتا گیا۔ اس کی جیپ کے قریب نشاط خان کھڑا اسے کپڑے سے صاف کر رہا تھا۔

''گاڑی کو ایک دم اے ون کر دیا ہے صاب۔ تیل پانی سب برابر ہے۔'' ڈیوڈ کو دیکھ کر اس نے چہکتے ہوئے اطلاع دی۔

''شاباش! یہ لو تمہارا انعام۔'' ڈیوڈ نے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا نوٹ تھمایا اور جیپ کے پچھلے حصے میں نظر ڈالی۔ اس کی فرمائش کے مطابق پٹرول سے بھرے دو کین وہاں موجود تھے۔ آگے اسے جن راستوں پر سفر کرنا تھا، وہاں پٹرول کا حصول ناممکن تو نہیں لیکن ذرا مشکل ہو جاتا تھا۔ ویسے بھی اب وہ بغیر رکے مسلسل سفر کرنا چاہتا تھا۔ یہاں رکنے سے اسے اور اس کی جیپ کو مناسب وقفہ مل گیا تھا اور وہ یہاں سے آگے آسانی سے سفر جاری رکھ سکتا تھا۔ جیپ میں بیٹھ کر روانہ ہوتے ہوئے اس نے دیکھ لیا تھا کہ ہوٹل کے ہال میں اسے دیکھ کر چونکنے والا آدمی ایک دوسرے آدمی کے ساتھ باہر نکلا ہے۔ وہ دونوں بھی ایک جیپ میں سوار ہو گئے۔ یعنی وہ اس کا تعاقب کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان کے اس ارادے پر زیرِلب مسکراتے ہوئے وہ اطمینان سے اپنی جیپ کو دوڑاتا چلا گیا۔ رفتار حسبِ سابق تیز ہی تھی۔

تیز رفتاری سے جیپ کو دوڑاتے ہوئے وہ سڑک کے ایسے حصے تک پہنچ گیا جہاں سے سڑک مڑ رہی تھی۔ سڑک کے اطراف میں پہاڑ تھے چنانچہ موڑ مڑتے ہی وہ تعاقب میں آنے والوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہاں سے جیپ آگے بڑھانے کے بجائے اس نے سڑک کے کنارے روک دی اور سیٹ کے نیچے سے گن نکال کر نیچے اتر آیا۔ اب وہ جیپ کی آڑ میں چھپا اپنا تعاقب کرنے والوں کا انتظار کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ کے انتظار کے بعد پیچھے آنے والی جیپ موڑ سے نمودار ہوئی۔ وہ بالکل تیار تھا۔ اس نے فوراً ہی برسٹ مارا۔ فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور... ٹائر پھٹنے کی آواز سے گونج اٹھی۔ جیپ کا ڈرائیور بے قابو ہوتی جیپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی اثنا میں ڈیوڈ نے دوسرا برسٹ مارا۔ اس بار گولیاں ونڈ اسکرین کو چور چور کرتی ہوئی ڈرائیور کی کھوپڑی میں گھس گئیں لیکن جان جانے سے قبل وہ بریک پر پاؤں رکھ چکا تھا اس لیے جیپ کسی حادثے سے محفوظ رہی۔ ڈرائیور کے برابر میں بیٹھا ہوا اس کا ساتھی جو عین وقت پر سر جھکا لینے کی وجہ سے فائرنگ سے محفوظ رہا تھا، چھلانگ لگا کر نیچے اترا اور اپنی جیپ کی آڑ لیتے ہوئے ڈیوڈ کی طرف جوابی فائرنگ کی۔ ڈیوڈ پہلے ہی آڑ میں تھا اس لیے اس فائرنگ سے مکمل محفوظ رہا۔ ایک آدھ منٹ تک وہ دونوں ایک دوسرے پر لاحاصل فائرنگ کرتے رہے لیکن پھر ڈیوڈ نے مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے فیصلہ کن حملے کی ٹھانی اور اپنے شولڈر بیگ میں ہاتھ ڈال کر ایک دستی بم برآمد کیا۔ دانتوں کی مدد سے بم کی پن کھینچ کر اس نے اسے جیپ کی طرف اچھال دیا۔ فضا کان پھاڑ دینے والے دھماکے سے لرز اٹھی۔ دھماکا اتنا زوردار تھا کہ ڈیوڈ کی اپنی جیپ بھی ہل کر رہ گئی اور خود اس نے زمین کی لرزش کو اپنے بدن پر محسوس کیا لیکن یہ سب غیر متوقع نہیں تھا چنانچہ اس کے اطمینان میں کوئی

فرق نہیں آیا اور وہ اپنے دشمنوں کے نیست و نابود ہونے کی خوشی دل میں لیے دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔

حسبِ سابق جیپ کو برق رفتاری سے آگے کی طرف دوڑاتے ہوئے اس نے پلٹ کر پیچھے دھواں دھواں ہوتے منظر کو دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی اور سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹوں کو سکیڑتا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ کوئی اتنا معمولی آدمی نہیں تھا کہ اسے یوں آسانی سے قابو کر لیا جاتا۔ وہ تو چکنی مچھلی کی طرح پاکستانیوں کے ہاتھ سے پھسل کر واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچنے والا تھا۔

☆☆☆

ڈیوڈ کی فون کال لنڈا کے لیے بے حد پریشان کن ثابت ہوئی تھی۔ ڈیوڈ کے فرار نے ظاہر کر دیا تھا کہ حالات بہت زیادہ خراب ہو چکے ہیں چنانچہ اس کا مزید یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ سخت بیمار ہو کر بستر پر پڑی ہوئی تھی اور اس کے ایک ہاتھ میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ اس کے حسین چہرے پر نقاہت کے آثار بہت واضح تھے۔ فوڈ پوائزن کی یہ مصیبت اس لسّی کے سبب اس پر نازل ہوئی تھی جو اس نے بڑے شوق سے پی تھی۔ اب یہ معلوم نہیں تھا کہ لسّی کی تیاری میں کوئی گڑبڑ ہوئی تھی یا اس کے معدے نے عادی نہ ہونے کے سبب احتجاج کیا تھا۔ وجہ جو بھی رہی ہو، وہ مشکل میں پھنس گئی تھی۔ البتہ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ مرکزِ صحت میں فرائض انجام دینے والے ڈاکٹر داور ایک لائق ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے اپنی مہارت سے اس کی جان بچالی تھی ورنہ ممکن تھا کہ شہر تک علاج کے لیے پہنچتے پہنچتے وہ اپنی جان سے ہی چلی جاتی۔ ڈاکٹر داور نے نہ صرف مرکز پر اس کا اچھی طرح ٹریٹمنٹ کیا تھا بلکہ حویلی بھی اس کے ساتھ ہی آئے تھے۔ کوئی عام مریض ہوتا تو شاید وہ اپنے کمپاؤنڈر کو بھیج دیتے لیکن لنڈا چودھری کی مہمان تھی اور وہ بھی اتنی خاص کہ اس کی خاطر چودھری خود پورا وقت مرکز کے ویٹنگ روم میں بیٹھا رہا تھا۔ اس کے کارندوں نے وہاں موجود دوسرے مریضوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر چلتا کر دیا تھا۔ ڈاکٹر داور نے ان کے اس عمل پر ناگواری محسوس کی تھی لیکن وہ چودھری یا اس کے کارندوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے یہاں سے اپنا بوریا بستر گول نہیں کر سکتے تھے۔

وہ ان چند گنے چنے لوگوں میں سے تھے جو ڈگری کو کمائی کے بجائے حقیقتاً عوام کی خدمت کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ یہاں سے چلے گئے تو اس گاؤں کے لوگ طویل عرصے کے لیے کسی ڈاکٹر سے محروم ہو جائیں گے اس لیے ضبط کر گئے اور لنڈا کو بہترین طبی امداد دینے کے ساتھ چودھری کے حکم پر اس کے ساتھ حویلی تک جانا بھی قبول کر لیا۔ یہاں انہوں نے لنڈا کو ڈرپ لگائی اور مریضہ کی بابت چند ضروری ہدایات دے کر واپسی کی اجازت چاہی۔ چودھری انہیں یہ اجازت دینے کو تیار نہیں تھا اور چاہتا تھا کہ وہ لنڈا کے بستر کے ساتھ کرسی ڈال کر اس کے جسم میں داخل ہوتے گلوکوز کے ایک ایک قطرے کا معائنہ کرتے رہیں لیکن خود لنڈا نے ان کی یہ مشکل آسان کر دی اور انہیں چودھری سے اجازت دلوا دی کہ وہ دو گھنٹے کے لیے اپنے ہیلتھ سینٹر جا کر مریضوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں واپس یہیں آنا تھا۔ لنڈا نے انہیں یہ اجازت غریب دیہاتیوں کی ہمدردی میں نہیں دلائی تھی۔ وہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے لیے اپنے دل میں خاصے سفاکانہ جذبات رکھتی تھی لیکن اگر ڈاکٹر مستقل اس کے سرہانے بیٹھا رہتا تو اس کی پرائیویسی متاثر ہوتی۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد اس نے اپنا حویلی میں ہی رہ جانے والا شولڈر بیگ طلب کیا۔ اس بیگ میں اس کا خصوصی موبائل فون موجود تھا۔ فون نکال کر اسے چیک کر ہی رہی تھی کہ ڈیوڈ کی کال آ گئی۔ ڈیوڈ نے اسے جو کچھ بتایا، وہ سخت پریشان کن تھا لیکن بہرحال اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا...۔ فی الحال مسئلہ یہ تھا کہ اسے اتنی شدید نقاہت ہو گئی تھی کہ فوری طور پر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی سکت نہیں تھی۔ ڈیوڈ نے اسے چودھری اور اس کے خاص کارندوں کو ٹھکانے لگانے کی ذمے داری بھی سونپی تھی اور ظاہر ہے یہ اتنا آسان کام نہیں تھا۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ وہ پھرتی سے حرکت کرنے سے قاصر تھی۔ چاروناچار وہ جسم کو توانائی فراہم کرنے والی ڈرپ ختم ہونے کا انتظار کرنے پر مجبور ہو گئی۔

''چودھری صاحب کو بلاؤ۔'' اس نے اپنی دیکھ بھال کے لیے مسلسل کمرے میں موجود نوکرانی کو حکم دیا تو وہ فوراً باہر نکل گئی۔ چند منٹ کے اندر چودھری اس کے کمرے میں موجود تھا البتہ نوکرانی کو اس نے باہر ہی روک دیا تھا۔

''کیا بات ہے ڈارلنگ! طبیعت ٹھیک تو ہے نا؟ میں بس نیچے تہ خانے تک چکر لگانے گیا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو معلوم کر لوں۔'' وہ بہت لگاوٹ سے بولتا ہوا لنڈا کی پائنتی بیٹھ گیا۔

''میں بہت کمزوری محسوس کر رہی ہوں چودھری صاحب! آپ ڈاکٹر داور سے کہیں کہ اس ڈرپ میں طاقت کا

کوئی انجکشن شامل کردیں۔" اس نے اپنی خواہش بیان کی۔

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔ میں تو چاہتا تھا کہ وہ مستقل یہیں رہے لیکن تم نے ہی اسے واپس بھجوا دیا۔" چودھری نے بولتے ہوئے جیب سے اپنا موبائل نکالا۔

"مجھے اس کے سارا وقت اپنے سر پر سوار رہنے سے الجھن ہو رہی تھی اس لیے میں نے اسے چلتا کر دیا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے پاس ایمرجنسی میں کوئی بھی ایسی کال آسکتی ہے جو میں ڈاکٹر کے سامنے ریسیو کر کے اسے شک کا موقع نہیں دے سکتی۔ آپ کے جاہل ملازمین کے مقابلے میں ایک پڑھے لکھے ڈاکٹر کو بے وقوف بنانا ذرا مشکل بات ہے۔" لنڈا نے ذرا ناک چڑھا کر اس کی بات کا جواب دیا۔ کوئی اور ہوتا تو اس کا لہجہ چودھری کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا لیکن لنڈا کا تو ہر اندازِ حسن کی ایک ادا تھی جس پر ناراض ہونے کے بجائے وہ ریشہ خطمی ہو جاتا تھا۔ اب بھی اس نے لنڈا کو جاں نثار نظروں سے دیکھتے ہوئے ڈاکٹر کا نمبر ملایا اور اسے فوراً حویلی پہنچنے کا حکم دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

"ڈاکٹر آرہا ہے۔ اگر تم اس ڈاکٹر کے علاج سے مطمئن نہیں ہو تو میں شہر سے کوئی دوسرا قابل ڈاکٹر بھی بلوا سکتا ہوں۔" لنڈا کو میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے اسے پیشکش کی۔

"نہیں، یہ ڈاکٹر ٹھیک ہے۔ میری جو حالت ہوگئی ہے، اس کو کوئی بھی ڈاکٹر جادو کے زور پر اچانک تو ٹھیک نہیں کر سکتا۔" لنڈا نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"سوری بے بی! مجھے افسوس ہے کہ تم میری حویلی میں آکر اس طرح بیمار ہوگئیں۔ میں نے تمہارے لیے لسی بنانے والی ملازمہ کو قید میں ڈلوا دیا ہے۔ تم صحت یاب ہو جاؤ، میں تمہاری نظروں کے سامنے اس نمک حرام کی کھال ادھیڑوں گا۔" چودھری نے اپنے عزم کا اظہار کیا۔

لنڈا کو اس وقت ملازمہ کو سزا دلوانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا ذہن تو مسلسل ڈیوڈ کی باتوں میں الجھا ہوا تھا اور وہ اپنی حکمتِ عملی طے کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس سارے کھیل میں وقت کی بہت اہمیت ہے لیکن اپنی ناتوانی کے سبب فوری طور پر کچھ کرنے سے قاصر تھی۔ ڈاکٹر داور نے دوبارہ حویلی آکر اس کی خواہش کے مطابق ڈرپ میں طاقت کی دوا انجیکٹ کر دی تو اسے ذرا اطمینان ہوا کیونکہ گھنٹا بھر بعد ہی اس نے اپنی جسمانی حالت میں کافی بہتری محسوس کی تھی۔ اس دوران چودھری وہاں سے جا چکا تھا۔ عرصے بعد یہاں آنے کی وجہ سے اسے ڈھیروں معاملات نمٹانے پڑ رہے تھے اس لیے خواہش کے باوجود مستقل لنڈا کے پاس نہیں بیٹھ پا رہا تھا۔

"چودھری صاحب کہاں ہیں؟ مجھے ان کے بارے میں معلوم کر کے بتاؤ۔" ڈرپ ختم ہوگئی تو اس نے خدمت کے لیے موجود ملازمہ کو حکم دیا۔ ملازمہ حکم کی تعمیل میں فوراً کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی لنڈا نے کھینچ کر اپنے ہاتھ سے کینولا نکالا اور ٹیپ بینڈیج لگا دی تاکہ خون نہ بہے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ بستر سے کھڑی ہوئی۔ کھڑے ہونے پر اسے بہت زور کا چکر آیا لیکن چند لمحوں میں ہی اس نے خود کو سنبھال لیا اور اس الماری کی طرف بڑھی جس میں اس کی ضرورت کا سامان رکھا تھا۔ کپڑے وغیرہ وہیں چھوڑ کر اس نے بس چند اہم چیزیں اپنے شولڈر بیگ میں ڈالیں اور الماری دوبارہ بند کر دی۔ اسی اثنا میں ملازمہ واپس آگئی۔

"سرکار منشی جی کے ساتھ بیٹھے کھاتے دیکھ رہے ہیں۔ پٹواری بھی آیا بیٹھا ہے پر اگر آپ کو کوئی ضروری گل کرنی ہے تو بتاؤ، میں مردانے میں آپ کا پیغام بھجوا دوں گی۔" اس نے لنڈا کو چودھری کی مصروفیت سے آگاہ کرتے ہوئے پیشکش کی۔

"نہیں، انہیں پریشان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بس مجھے کچن تک لے چلو۔ میں اپنی پسند کے مطابق پرہیزی کھانا تیار کروانا چاہتی ہوں۔" اس نے اپنے سوچے ہوئے منصوبے کے مطابق فرمائش کی۔

"آپ کو باورچی خانے میں جانے کی کیا لوڑ ہے بی بی! مینو دسو۔۔۔ میں آپ کی پسند کا پرہیزی کھانا تیار کروا دوں گی۔" ملازمہ نے اپنے فرض کو نبھاتے ہوئے مؤدبانہ عرض کیا۔

"نہیں، میں اپنی نگرانی میں اپنی پسند کا کھانا بنوانا چاہتی ہوں۔" اس نے سختی سے جواب دیا تو ملازمہ۔۔۔ بے چاری مجبور ہوگئی۔ لنڈا کو کچن تک پہنچا دیا گیا۔ کچن کی نگراں اسے وہاں پاکر بدحواس ہوگئی اور اس کی خواہش کا علم ہونے پر کمرے میں آرام کرنے کا مشورہ دیا لیکن اس کے اصرار کے آگے مجبور ہونے پر اس کے لیے کچن میں ہی ایک آرام دہ۔۔۔ کرسی رکھوا دی۔

"یہ بھیڑ بھاڑ ہٹواؤ یہاں سے۔ میں اتنے سارے لوگوں کو اپنے آس پاس برداشت نہیں کر سکتی۔" اس نے باورچن کی مددگار عورتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم

دیا تو فوراً ہی ان عورتوں کو وہاں سے نکال دیا گیا۔

"حکم بی بی۔" جب نگراں عورت اکیلی رہ گئی تو اس نے ہاتھ باندھ کر اس سے پوچھا۔ لنڈا نے اسے ایک ایسی ڈش تیار کرنے کا حکم دیا جس کے بارے میں اسے سو فیصد یقین تھا کہ وہ عورت تیار کرنا تو دور کی بات، اس کے نام سے بھی واقف نہیں ہوگی۔ ہوا بھی یہی۔ ڈش کا نام سن کر عورت آنکھیں پٹپٹانے لگی پھر بولی۔

"ماف (معاف) کرنا بی بی، مجھے اس ڈش کا کوئی پتا نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے، آج مجھ سے سیکھ لینا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ آج کیا پک رہا ہے؟" وہ ہوشیاری سے اپنے مطلب کی بات کی طرف آگئی۔

"مٹر آلو کی سبزی ہے۔ بکرے کا شوربا ہے۔ بھنا ہوا مرغ بھی ہے لیکن سب سے خاص چودھری صاحب کی پسند کے بڑے کے پائے تیار ہو رہے ہیں۔ میں نے صبح فجر سے ہی چڑھا دیے تھے، بس اب تیار ہونے کو ہی ہیں۔" ملازمہ نے اسے اطلاع دیتے ہوئے ایک بڑے سے پتیلے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ ساری تو بہت ہیوی ڈشز ہیں۔ میں تو اس میں سے کچھ نہیں کھا سکتی۔ تم ایسا کرو جا کر کاغذ قلم لے آؤ۔ میں تمہیں کچھ چیزوں کے نام لکھوا دیتی ہوں۔ وہ بازار سے منگوا لو تو پھر میری پسند کا کھانا بنا دینا۔"

"ٹھیک ہے بی بی! میں ابھی آئی۔" ملازمہ مستعدی کا مظاہرہ کرتی ہوئی کچن سے باہر نکل گئی۔ لنڈا کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ اس نے اپنے بیگ میں سے ایک چھوٹی سی بوتل نکالی اور اس میں موجود محلول کو تیزی سے پائے والے پتیلے میں انڈیل دیا۔ وہ پتیلے پر ڈھکن واپس رکھ رہی تھی کہ ملازمہ واپس آگئی۔

"بہت زبردست خوشبو ہے۔ میری طبیعت خراب نہ ہوتی تو میں ضرور اسے چکھتی۔" کسی بھی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر اس نے اطمینان سے کہا اور کرسی پر واپس آبیٹھی۔ ملازمہ نے خاموشی سے اسے نوٹ پیڈ اور قلم تھما دیا۔ لنڈا نے اس پر دو چار چیزوں کے نام لکھے۔ یہ بھی پکانے میں استعمال ہونے والی ایسی اشیا تھیں جن کا پیر آباد میں ملنے کا امکان نہیں تھا۔ ان اشیا کے نام لکھ کر اس نے نوٹ پیڈ قلم سمیت دوبارہ ملازمہ کو تھما دیا اور بولی۔

"میرے خیال میں یہ سامان آنے میں تو خاصا وقت لگ جائے گا۔ تم ایسا کرو، اس ٹائم مجھے مرغی کا سوپ تیار کر کے دے دو۔۔۔ ڈش میں بعد میں تیار کروا لوں گی۔"

"ٹھیک ہے بی بی! جیسا آپ کا حکم۔" ملازمہ نے اسی طرح مؤدبانہ جواب دیا تو لنڈا اٹھ کر کچن سے باہر آگئی۔ اب پھر وہ اسی کمرے میں تھی جو اس کے زیرِ استعمال تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ وہ اپنا آدھا کام کر چکی ہے۔ پائے کے سالن میں اس نے جو سریع الاثر زہر ملایا تھا، اس کو کھانے کے بعد چودھری اور اس کے خاص مصاحب کے بچنے کا امکان ہی نہیں تھا۔ وہ اتنی سنگ القلب عورت تھی کہ اسے اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ یہ سالن وہ لوگ بھی کھا سکتے ہیں جو اس کا ٹارگٹ نہیں ہیں۔ اپنی قوم کے مزاج کے مطابق اسے صرف اپنا ہدف حاصل کرنے سے غرض تھی۔ ساتھ میں کتنے ہی لوگ زد میں آجاتے، اس سے اسے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔ کرنے کو وہ اسلحے کا استعمال بھی کر سکتی تھی لیکن اس نے اپنے لیے آسان راستہ چن لیا تھا۔ چن چن کر لوگوں کو نشانہ بنانے کے لیے زیادہ وقت، توانائی اور ہوشیاری کی ضرورت تھی اور یہ خطرہ بھی تھا کہ کہیں وہ خود زد میں نہ آجائے لیکن اب سارا کام نہایت صفائی سے ہو گیا تھا۔ اب اسے کھانے کے وقت سے پہلے پہلے خود یہاں سے نکلنا تھا اور لیبارٹری میں کام کرنے والے خاص آدمیوں کو بھی فوری طور پر نکل جانے کا پیغام بھیجنا تھا۔ وہ لوگ اس سے زیادہ آسانی سے نکل سکتے تھے کیونکہ وہ اس کے علاوہ کسی اور کو جواب دہ نہیں تھے اور مکمل طور پر خود مختار تھے۔ اپنا خاص موبائل فون نکال کر اس نے لیبارٹری انچارج کا نمبر ڈائل کیا۔

"شمعون! تم اپنے خاص آدمیوں کے ساتھ فوری طور پر یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ میری طرف سے کوئی دوسرا حکم ملنے تک تم سب کو انڈر گراؤنڈ رہنا ہوگا۔" اس نے اپنے ساتھی کو حکم دیا جو ظاہر ہے اجنبی زبان میں ہونے کی وجہ سے کمرے میں موجود ملازمہ نہیں سمجھ سکتی تھی۔

"ٹھیک ہے میڈم۔۔۔ ہم ابھی نکل جاتے ہیں۔" شمعون نے اسے حسبِ منشا جواب دیا۔ ان کے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ ایسے کسی موقع پر سوال جواب میں وقت ضائع کرنے کے بجائے حکم کی فوری تعمیل پر زور دیا جاتا تھا۔ اس طرف سے بھی مطمئن ہو جانے کے بعد اب اسے اپنے نکلنے کا بندوبست کرنا تھا۔ اس نے ملازمہ کو چودھری کو بلانے کا حکم دیا۔ ملازمہ نے باہر نکلنے کے لیے کمرے کا دروازہ کھولا تو سامنے ہی چودھری کھڑا تھا۔

"ارے چودھری صاحب! میں آپ کو ہی یاد کر رہی

تھی۔" لنڈا نے لہک کر اس سے کہا۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" چودھری نے سنجیدہ چہرے کے ساتھ سوال کیا۔ اس کے انداز نے لنڈا کو چونکایا۔ تاہم اس نے اس کا اظہار نہیں کیا اور نقاہت زدہ آواز میں بولی۔

"طبیعت کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتی اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ شہر جا کر کسی بڑے اسپتال میں چیک اپ کروا لیتی ہوں۔ آپ میرے لیے گاڑی کا بندوبست کر دیں۔" اس نے اپنے منصوبے کے مطابق فرمائش کی۔

"ٹھیک ہے، گاڑی تیار ہو جائے گی بلکہ ایسا ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

"ارے نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی آپ کا یہاں رہ کر یہاں کے معاملات کو سنبھالنا ضروری ہے۔" جواب دیتے ہوئے اس نے چودھری کے چہرے کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی۔ اس کے اندازے کے مطابق چودھری کچھ چھپا رہا تھا۔

"کیا بات ہے چودھری صاحب! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟" اس نے چودھری کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔

"ہاں، بات ہی پریشانی کی ہے۔" خلافِ توقع چودھری نے فوراً قبول کر لیا۔

"مجھے بتائیں کیا مسئلہ ہے؟ شاید میں کوئی حل پیش کر سکوں۔" اس نے بڑی لگاوٹ سے کہا تو چودھری نے اس پر ایک گہری نظر ڈالی اور بلند آواز میں اپنے ایک ملازم کو پکارا۔ فوراً ہی ملازم ہاتھ میں ایک بڑی سی ٹرے اٹھائے نمودار ہوا اور چودھری کے اشارے پر ٹرے لنڈا کے سامنے رکھ دی۔ ٹرے میں ایک مردہ بلی کا جسم موجود تھا جسے دیکھ کر لنڈا کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

"یہ... یہ کیا ہے؟" اس نے قدرے گھبراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"اس بلی کو پائے کا وہ شوربا پلایا گیا تھا جو ملازمہ میرے لیے تیار کر رہی تھی۔ شوربا پیتے ہی یہ لمحوں میں تڑپ کر مر گئی۔ یعنی اگر میں وہ سالن کھاتا تو میرا انجام بھی اس بلی جیسا ہوتا۔"

"یہ تو آپ کے کسی دشمن کی سازش لگتی ہے۔ آپ فوراً پولیس کو بلوائیں۔ وہی لوگ ملازمین سے تفتیش کر کے اصل حقیقت معلوم کریں گے۔" یہ مشورہ دیتے ہوئے اس نے غیر محسوس طور پر اپنا شولڈر بیگ کھول کر اس میں سے پسٹل نکالنے کی کوشش کی لیکن آناً فاناً وہاں بہت سے مسلح افراد دندناتے ہوئے گھس آئے اور اسے اپنے نشانے پر رکھ لیا۔

"یہ... یہ سب کیا ہے چودھری صاحب؟" لنڈا بوکھلا گئی۔

"اس سوال کا جواب تو تمہیں دینا ہوگا ڈارلنگ! بتاؤ کہ تم نے مجھے ہلاک کرنے کی سازش کیوں کی؟" اس پر ہر لحظہ فدا رہنے والا چودھری غراتے ہوئے دریافت کرنے لگا۔

"آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" اس نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

"کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ باورچی خانے کی نگراں نے خود تمہیں سالن میں کچھ ملاتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کی اطلاع پر ہی میرے آدمیوں نے باقی کارروائی کی۔" چودھری نے ٹرے میں پڑی بلی کی لاش کی طرف اشارہ کیا اور مزید بولا۔ "ثبوت کے طور پر میرے آدمی تمہارے بیگ سے زہر کی بوتل بھی دریافت کر سکتے ہیں۔"

اشارہ ہونے کی دیر تھی، لنڈا سے اس کا بیگ چھین کر بستر پر الٹ دیا گیا۔ فوراً ہی شیشے کی وہ چھوٹی سی بوتل سامنے آ گئی جس کی تہ میں اب بھی تھوڑا سا محلول موجود تھا۔

"اب کیا کہتی ہو؟" چودھری نے اس سے دریافت کیا۔

"میں اب بھی یہی کہوں گی کہ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ اپنا لہجہ سنبھالے رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی ورنہ یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ وہ اتنی بُری طرح پھنس گئی تھی۔ اس وقت نہ تو اس کے پاس کوئی ہتھیار تھا اور نہ ہی جسم میں توانائی کہ اپنے دفاع میں کچھ کر پاتی۔

"ٹھیک ہے، ابھی تو میں ذرا مصروف ہوں۔ تم اس کمرے میں رہو، بعد میں آرام سے میری غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرنا۔" مزاج کے مطابق فوری اشتعال کا مظاہرہ کرنے کے بجائے چودھری نے سرد لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے کارندوں نے فوراً ہی لنڈا کو جکڑ لیا اور اس کے چیخنے چلّانے کی پروا کیے بغیر ہاتھ پیر باندھ کر بستر پر ڈال دیا۔ یہ بڑا عبرت ناک منظر تھا۔ حویلی کی معزز ترین مہمان اب ایک معتوب قیدی کی حیثیت سے بے دست و پا پڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

سی ایف پی اور آرمی کے جوان اپنے مشترکہ مشن کی انجام دہی کے لیے پوری قوت اور منصوبہ بندی کے ساتھ حرکت میں آ گئے تھے۔ کارروائی کرنے والے گروہوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک گروپ کو جنگل میں کارروائی کرنی تھی جبکہ دوسرے کو چودھری کی حویلی پر۔ ذیشان کو اس کے چند جوانوں کے ساتھ جنگل کی طرف

جانے والے گروپ میں شامل کیا گیا تھا۔ ان لوگوں کے پاس فضائی اور زمینی دونوں طرح کی کارروائی کے لیے مکمل انتظامات تھے جبکہ چودھری کی حویلی کے لیے محض زمینی کارروائی کو کافی سمجھا گیا تھا۔ شہریار حویلی کو گھیرنے والی پارٹی میں شامل تھا۔ حویلی کے گرد گھیراؤ کرتے ہوئے انہوں نے اس بات کا بطورِ خاص خیال رکھا تھا کہ چودھری کا آبائی قبرستان اور پیر صاحب کا مزار بھی ان کی نظروں میں رہے۔ گاؤں دیہاتوں کے عمومی ماحول کے مطابق وہاں جلد ہی رات نے اپنے پنجے پھیلا دیے تھے اور دن بھر کی مشقت سے تھکے ہارے مکین اپنے گھروں میں گہری نیند سوئے ہوئے تھے کہ یک دم ہی گونجنے والے دھماکوں اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے انہیں ہڑبڑا کر اٹھ جانے پر مجبور کر دیا۔

کارروائی کا آغاز جنگل سے کیا گیا تھا۔ حویلی کو گھیرنے والی فورس کو اس کے بعد حرکت میں آنا تھا۔ جنگل کی طرف سے آوازیں آنا شروع ہوئیں تو حویلی کو گھیرنے والی فورس اور پیر آباد کے سوئے ہوئے مکینوں کے جسموں نے ایک ساتھ حرکت کی۔ بستر پر سے ہڑبڑا کر اٹھنے والے خوف زدہ تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ کسی سرحدی گاؤں میں تو رہتے نہیں تھے کہ دشمن ملک کے حملے کا امکان ہو لیکن آوازوں سے یہی ظاہر تھا کہ کوئی بہت بڑا حملہ ہوا ہے۔ وہ گھبرا کر اپنے گھروں سے نکلنے ہی لگے تھے کہ مسجد سے اعلان کیا جانے لگا اور پیر آباد کے باسیوں کو تاکید کی گئی کہ وہ اپنے گھروں تک محدود رہیں۔ اعلان کرنے والے نے یہ بھی بتا دیا کہ کچھ خطرناک مجرموں کی سرکوبی کے لیے پاکستان آرمی ان کے علاقے میں کارروائی کر رہی ہے اور پیر آباد کے باسیوں سے انہیں صرف اتنا تعاون درکار ہے کہ وہ گھروں سے باہر نکلنے کی غلطی نہ کریں۔

غریب و بے بس باسیوں نے اس حکم کی تعمیل کی اور اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہولتے دلوں اور جاگ جانے والے بچوں کو سنبھالتے رہے۔ ادھر حویلی کی حفاظت پر مامور محافظوں کو جونہی اپنے گھیرے جانے کا احساس ہوا، انہوں نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ باہر موجود افراد کو ان پر جوابی فائر کرنے میں کیا عار تھا۔ وہ تو اتنا فاصلہ طے کر کے آئے ہی اس لیے تھے کہ ان سے دو دو ہاتھ کر سکیں۔ دونوں طرف سے گولیوں کی برسات شروع ہوئی تو یہ حال ہو گیا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ شہریار اس دستے کے ساتھ شامل تھا جس نے قبرستان کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ عمومی حالات میں قبرستان میں مسلح محافظوں کی موجودگی کی کوئی تُک نہیں بنتی تھی لیکن انہیں زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور اس شک کی تصدیق ہو گئی کہ پچھلے دنوں قبرستان کی مرمت اور توسیع کے بہانے یقیناً کچھ اور ہوتا رہا ہے جب ہی تو مسلح محافظ تعینات ہیں۔

قبرستان میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ حویلی کے اندر کی بھی ساری روشنیاں بجھا دی گئی تھیں اس لیے ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دینے والا اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا تھا لیکن آنکھوں پر نائٹ ویژن گاگلز لگائے قبروں کی آڑ لے کر آگے بڑھتے ہوئے شہریار کو زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں تھا۔ وہ اپنی پوزیشن بدل بدل کر مختلف قبروں کی اوٹ سے بہت سوچ سمجھ کر فائر کر رہا تھا۔ چودھری کے اس خاندانی قبرستان میں کوئی قبر معمولی نہیں تھی۔ طبعی موت مرنے والوں سے لے کر دشمن اور گھریلو سازشوں کا شکار ہونے والوں تک ہر ایک کی قبر بڑی شان و شوکت سے بنائی گئی تھی۔ کسی قبر پر گنبد بنا تھا تو کسی کو مرنے کے بعد سنگِ مرمر کی چھتری تلے سایہ فراہم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مختلف نوع کی یہ تعمیرات ان کے لیے بہترین آڑ ثابت ہو رہی تھیں۔ شہریار بھی اس وقت ایک گنبد کے پیچھے چھپا بیٹھا تھا۔ قبرستان خاصا وسیع تھا اور ہر قبر کے اوپر موجود تعمیر کی وجہ سے ہر قبر نے ہی خاصی جگہ گھیر رکھی تھی۔ شہریار اپنی جگہ بیٹھا اس بات کا جائزہ لے رہا تھا کہ قبرستان سے حویلی تک جانے کا راستہ کس طرف ہو سکتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ یہاں ایسا خفیہ راستہ ضرور موجود ہوگا لیکن فی الحال وہ کوئی حتمی رائے قائم کرنے میں ناکام تھا۔

چنگاریوں کی طرح اِدھر اُدھر اڑتی گولیوں کے شور میں زیادہ سوچنے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے اپنی پناہ گاہ سے نکل کر مزید آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور ابھی آڑ سے نکل ہی رہا تھا کہ ایک سایہ احاطے کے ساتھ لگے درختوں میں سے ایک درخت کی آڑ سے نکل کر دوسرے کی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیص کی وجہ سے وہ بہ آسانی تمیز کر سکتا تھا کہ یہ اس کے ساتھیوں میں سے نہیں ہے۔ اس نے اس سائے کی طرف فائر کرنے کے لیے گن سیدھی کی لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔ اس دوران میں وہ شخص دوسرے درخت کے موٹے تنے کے پیچھے چھپ چکا تھا۔ شہریار نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کیا اور رینگتا ہوا اس درخت کی جانب بڑھنے لگا۔ ہر طرف برستی گولیوں میں یہ ایک خطرناک فیصلہ تھا۔ کوئی بھی اندھی گولی اسے نشانہ بنا

سکتی تھی لیکن وہ ایسے اندیشوں سے ڈرنے والا تھا ہی کہاں۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر پھرنے والے سر پھرے اندیشے پالا بھی نہیں کرتے۔

اس کے رینگ کر آگے کھسکنے سے جسم تلے آنے والے سوکھے پتے چرمرا رہے تھے لیکن اسے یقین تھا کہ پتوں کے چرمرانے کی آواز اس ہنگامے میں کسی اور کو سنائی نہیں دے سکتی۔ گولیوں کے شور کے علاوہ رات کی تاریکی نے بھی اسے پناہ فراہم کر رکھی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ درخت کے پیچھے چھپا شخص سمت بدل بدل کر فائر کر رہا تھا۔ ظاہر ہے اس کے سامنے کوئی ٹارگٹ تو تھا نہیں اس لیے وہ انکل سے ہی اپنے مخالفین کو نشانہ بنانے یا وہاں سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

شہریار کی اپنے نزدیک موجودگی کا اسے اسی وقت احساس ہوا جب وہ اس کے بالکل سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے تڑپ کر پیچھے مڑنے کی کوشش کی لیکن اس کی کوشش ناکام رہی اور شہریار نے اسے چھاپ لیا۔ شہریار کا زوردار دھکا لگنے سے اس کی رائفل دور جا گری۔ وہ بے طرح ہاتھ پیر چلاتے ہوئے خود کو شہریار کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کرتا رہا۔ یک دم ہی شہریار نے اس کے نرخرے پر ہاتھ ڈال دیا۔ دباؤ بڑھنے سے اس کا دم گھٹنے لگا تو ہاتھ پیروں کی مزاحمت بھی ہلکی پڑ گئی اور گلے سے خرخراہٹ کی آوازیں نکلنے لگیں۔

''اب کوئی حرکت کی تو اپنی جان سے جاؤ گے۔'' شہریار نے پھنکارتے ہوئے اسے دھمکی دی۔ اب وہ اس شخص کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا۔ اس کی دھمکی سن کر آدمی نے اپنی مزاحمت بالکل ہی ترک کر دی۔

''اندر جانے کا راستہ بتاؤ۔'' اسے اپنی دھمکی کے زیر اثر آتے دیکھ کر شہریار نے مطالبہ کیا، جواب میں اس نے دائیں بائیں سر پٹخ کر انکار کیا۔ اس کا انکار شہریار کے جسم میں آگ بھر گیا۔ دایاں ہاتھ تو اس کے نرخرے پر جما ہوا تھا۔ بائیں سے اس نے پے در پے کئی مکے اس آدمی کے جبڑے پر جڑ دیے۔ مکوں کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ اس کے کئی دانت ہلنے کے علاوہ جڑ سے بھی اکھڑ گئے اور منہ سے خون بہنے لگا۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو موت سے بدتر صورتِ حال سے دوچار ہو گے۔'' شہریار نے اس کے دانت توڑنے پر ہی بس نہیں کیا اور غراتے ہوئے اس کے بائیں ہاتھ کے پنجے کو اپنے ہاتھ کی گرفت میں لے لیا۔ انگلیاں، انگلیوں میں پیوست ہوئیں اور پھر لحہ بھر کی ہی بات تھی کہ اس شخص کی انگلیوں کے جوڑ چٹختے چلے گئے۔ اس نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا۔ اگر اس کا نرخرہ شہریار کی گرفت میں نہیں ہوتا تو یقیناً اس کے حلق سے بہت بلند چیخیں برآمد ہوتیں لیکن اس وقت تو وہ اندر ہی کہیں گھٹ کر رہ گئیں۔

''بتاؤ ورنہ میں تمہارے جسم کا ہر جوڑ الگ کر دوں گا۔'' شہریار نے ایک بار پھر وحشت بھری غراہٹ کے ساتھ اسے حکم دیا۔ اس وقت کہیں سے بھی وہ پڑھا لکھا اور نرم خو آدمی نہیں تھا جو دوسروں کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے مقابل ایک ایسا شخص ہے جو ظالم کا ساتھ دے رہا ہے۔ چودھری جیسے غدارِ وطن اور اس کے ساتھیوں کے لیے اس کے پاس کسی قسم کی کوئی رعایت موجود نہیں تھی۔ وہ ان غداروں سے نمٹ کر جلد از جلد اپنی ماہ بانو تک پہنچنے کے لیے بے چین تھا۔ اس کے سینے میں اس تصور سے آگ بھڑک اٹھتی تھی کہ ''وہ'' جس کے لیے اس نے ہمیشہ نرم سائے کی خواہش کی تھی، دیارِ غیر میں تپتی دھوپ میں جھلس رہی تھی۔ وہ اسے اپنی بانہوں کی پناہ میں لینے کے لیے بے قرار تھا لیکن وطن کے ان دشمنوں سے نمٹے بغیر کیسے اپنی ذات کا اطمینان حاصل کرنے چلا جاتا۔

''بولو، ورنہ بہت پچھتاؤ گے۔'' اس نے اپنے گھٹنوں سے اس کے سینے پر دباؤ ڈالا۔ اس کا گھٹتا ہوا دم یقیناً مزید گھٹنے لگا ہو گا جب ہی وہ بے چینی سے ہاتھ پیر پٹخنے لگا۔ شہریار کو اس کی حالت کا احساس ہوا تو اس کے نرخرے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ کم کیا اور ایک بار پھر اپنا مطالبہ دہرایا۔ اس بار اسے مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور اس کے شکنجے میں جکڑے آدمی نے ایک بہت بڑے گنبد کی طرف اشارہ کیا۔ شہریار اس کے اشارے کا مطلب سمجھ گیا۔ یقیناً اس گنبد سے کوئی خفیہ راستہ اندر کی طرف جاتا تھا۔ اس نے اپنے نیچے دبے شخص کی کنپٹی پر ایک زوردار گھونسا مار کر اسے بے سدھ کیا اور اپنے پاس موجود آپریٹس پر اپنے ساتھیوں سے رابطہ کر کے بتانے لگا کہ خفیہ راستے کی موجودگی کا کہاں امکان ہے۔

''آپ کا اندازہ ٹھیک لگتا ہے کیونکہ سب سے زیادہ افراد کا زور اسی گنبد کے اردگرد ہے۔'' دوسری طرف سے اسے بتایا گیا اور پھر وہ اپنی نئی حکمتِ عملی طے کرنے لگے۔ اس بار انہوں نے پوری شدت سے گنبد تک پہنچنے کے لیے زور لگا دیا۔ چودھری کے کارندے کتنے ہی بہادر سہی، ایک منظم فورس سے مقابلے کی تو بہرحال اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ تھوڑی سی کوشش سے وہ گنبد تک پہنچنے میں

کامیاب ہو گئے اور ایک جوان نے اپنی ذہانت سے یہ عقدہ بھی حل کر لیا کہ یہ پورا کا پورا گنبد دائیں جانب کھسک سکتا ہے۔ قبرستان کے محافظوں کو زیر کر لینے کے بعد انہوں نے اپنے پاس موجود طاقتور ٹارچیں روشن کر لی تھیں البتہ ان کے ساتھی پوری طرح چوکس تھے کہ اگر کہیں سے کوئی کارروائی ہوتی ہے تو اس کا فوری جواب دے سکیں۔ حویلی کی طرف سے بھی اب انہیں بس اکا دکا ہی فائر سنائی دے رہے تھے۔ وہاں سے اطلاع مل گئی تھی کہ آرمی اور سی ایف پی کے جوان مین گیٹ کو دستی بم سے اڑانے کے بعد اندر داخل ہو چکے ہیں اور انہوں نے صورتِ حال کو قابو کر لیا ہے لیکن حویلی میں انہیں خواتین اور بچوں کے علاوہ صرف ملازمین ہی ملے تھے، چودھری غائب تھا۔ وہ کسی خفیہ تہ خانے کی موجودگی کے امکان کو سامنے رکھتے ہوئے اسے تلاش کر رہے تھے۔

دونوں گروپس آپس میں رابطہ رکھتے ہوئے اپنی اپنی کارروائی کرتے رہے۔ شہریار والے گروپ نے گنبد کو کھسکایا تو انہیں نیچے جانے کا راستہ نظر آ گیا۔ وہ کافی کشادہ سیڑھیاں تھیں جو نیچے کی طرف جا رہی تھیں۔ سیڑھیوں پر انہیں کوئی نظر نہیں آیا۔ شہریار نے دو نوجوانوں کے ساتھ ان سیڑھیوں سے نیچے اترنے کا فیصلہ کیا۔ سب سے آگے وہ خود ہی تھا۔ سیڑھیوں پر ان کا کسی سے سامنا نہیں ہوا۔ سیڑھیوں سے آگے ایک کشادہ سرنگ نما راستہ آگے جا رہا تھا جس کی سمت سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ راستہ حویلی کے کسی تہ خانے کی طرف جا رہا ہے۔ انہوں نے یہ راستہ بھی بخیریت طے کر لیا۔ اوپر موجود ان کے ساتھی بھی لحہ بہ لحہ رپورٹ لیتے ان کے پیچھے ہی تھے۔

سرنگ کے اختتام پر لکڑی کا ایک مضبوط مگر عام سا دروازہ تھا۔ شہریار نے دروازے کو دھکیل کر دیکھا تو وہ اندر سے بند تھا اور صاف پتا چل رہا تھا کہ آٹومیٹک لاک کے بجائے کنڈی لگا کر بند کیا گیا ہے۔ سرنگ میں موجود ہونے کی وجہ سے وہ اس دروازے کو دستی بم وغیرہ پھینک کر توڑنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ نتیجے میں سرنگ بیٹھ جاتی تو وہ سب کے سب زندہ دفن ہو جاتے۔ اب ان کے پاس یہی حربہ رہ گیا تھا کہ دروازے کو توڑنے کے لیے روایتی طریقہ استعمال کریں۔ شہریار اور ایک نوجوان نے مل کر اس پر عمل کرنا شروع کر دیا اور پوری قوت سے دروازے کو اپنے شانوں سے ضربیں لگانے لگے۔ دروازہ چونکہ بہت مضبوط تھا اس لیے پہلی دو تین ضربوں میں کچھ نہیں ہوا لیکن آخرکار اس کی چولیں ہلنے لگیں۔ اس موقع پر انہیں پیچھے ہٹا کر دو تازہ دم جوانوں نے ذمے داری سنبھال لی۔ ان جوانوں کی تیسری ضرب پر دروازہ اپنے قبضے سے اکھڑ کر دوسری طرف جا گرا لیکن ساتھ ہی فوراً ہی گولیوں کی بوچھاڑ بھی آئی۔ دروازہ توڑنے والے دونوں جوان بالکل سامنے ہونے کی وجہ سے ان گولیوں کی زد میں آ گئے اور نیچے گر کر تڑپنے لگے۔ ردِعمل میں ان کی طرف سے بھی فائرنگ کی گئی لیکن اندر موجود لوگ ان کے مقابلے میں زیادہ محفوظ پوزیشن میں تھے۔ سرنگ میں موجود جوانوں نے نیچے لیٹ کر اور سرنگ کی دیواروں سے چمٹ کر خود کو کسی قدر محفوظ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ بلٹ پروف جیکٹس بھی پہنے ہوئے تھے لیکن بازو اور ٹانگیں تو گولیوں کا نشانہ بن سکتی تھیں اور بن رہی تھیں۔ شہریار ٹوٹے ہوئے دروازے سے بہت قریب دیوار کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر اس نے اپنی پشت پر بندھے بیگ سے دھوئیں کے دو بم نکالے اور اندر کی طرف اچھال دیے۔ فوراً ہی اندر باہر دھواں پھیلنے لگا اور بصارتوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔

شہریار سانپ کی سی تیزی سے اندر کی طرف رینگ گیا۔ اسی وقت اطلاع ملی کہ حویلی کے اندر موجود فورس نے بھی حویلی سے تہ خانے میں کھلنے والا راستہ دریافت کر لیا ہے اور اب وہ لوگ بھی نیچے اتر رہے ہیں۔ تہ خانے میں موجود افراد کو بھی یقینی طور پر یہ خبر مل گئی اور وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئے۔ حقیقتاً اندر موجود افراد میں سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جن کا لڑنے بھڑنے سے براہِ راست تعلق نہیں تھا چنانچہ دوطرفہ حملے سے وہ شپٹا کر رہ گئے۔ آدھے گھنٹے کے اندر صورتِ حال مکمل قابو میں کر لی گئی۔ زخمیوں کو ابتدائی طبی امداد دے کر اسپتال کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ زخمی ہونے والوں میں چودھری افتخار عالم شاہ بھی موجود تھا۔ اس کے نچلے دھڑ میں کئی گولیاں لگی تھیں اور اسپتال جاتے ہوئے وہ بالکل بے سدھ تھا۔ زخمیوں کو ترجیحی بنیاد پر اسپتال منتقل کروانے کے ساتھ ساتھ لاشوں اور صحیح حالت میں گرفتار ہونے والوں کا بھی انتظام کیا جانے لگا۔ شہریار اور اس کے ساتھ آرمی کے چند افسران تہ خانے میں قائم کردہ ہیروئن سازی کی لیبارٹری کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

چودھری کی حویلی میں اس لیبارٹری کے قیام کا سبب یہ تھا کہ کوئی شک میں مبتلا نہیں ہو گا کہ یہاں ایسی کوئی سرگرمی ہو رہی ہے۔ کچھ چودھری کے اثر رسوخ کی وجہ سے بھی یہ سمجھا جاتا تھا کہ قانون نافذ کرنے والا کوئی ادارہ اس

طرف کا رخ نہیں کرے گا... لیکن جب کارروائی ہوئی تو ساری غلط فہمیاں دور، اندازے دھرے کے دھرے رہ گئے اور یہ ثابت کر دیا گیا کہ پاکستان میں صرف وہی لوگ نہیں بستے ہیں جو ہر دم اسے لوٹنے کھسوٹنے میں لگے رہتے ہیں بلکہ یہاں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو دفاعِ وطن کے لیے سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔

نیچے کے معاملات نمٹانے کے سلسلے میں چند ضروری ہدایات دینے کے بعد شہریار اور فوج کا ایک افسر اوپر حویلی میں پہنچ گئے۔ یہاں مرد و خواتین ملازمین کو الگ الگ کمروں میں بند کر دینے کے علاوہ چودھری کے اہلِ خانہ کو بھی الگ کمرے میں رکھا گیا تھا۔ ان افراد میں چھوٹی چودھرائن، چودھری کا ذہنی معذور بیٹا بہزاد شاہ، اس کی منکوحہ فریدہ اور فریدہ کا بچہ شامل تھے۔ شہریار نے فریدہ کو شناخت کر لیا۔ وہ اسے پہلے نور پور میں اس کے بھائی چودھری بختیار کے گھر میں بھی دیکھ چکا تھا۔ تب وہ بڑی الھڑ، شوخ اور بے پروا سی لڑکی ہوتی تھی لیکن عشق میں کھائے دھوکے نے اسے اپنے بھائی کے گھر کی ٹھنڈی چھاؤں سے پیر آباد کی اس بڑی سی حویلی کے جہنم میں لا پھینکا تھا اور وہ اتنی سی عمر میں دنیا کے بڑے بڑے بھیانک تجربوں سے گزر چکی تھی۔ یہ فریدہ ہی تھی جس نے حویلی کے بہت سے پہروں کے باوجود ان کے لیے مخبری کا فریضہ انجام دیا تھا۔ اس کے دل میں چودھری کے لیے جو بے تحاشا نفرت تھی، اس کے بعد اسے ایسا ہی کچھ کرنا چاہیے تھا۔ ہر طرف کا جائزہ لیتا شہریار پل بھر کے لیے اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"بہت بہت شکریہ۔" اس نے بہت آہستہ آواز میں فریدہ سے کہا تو جواب میں اس کا چہرہ تمتما اٹھا اور پلکیں لرزنے لگیں۔ وہ شہریار کو پہچان نہیں سکتی تھی لیکن یہ بات خوب اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا شکریہ کس خدمت کے عوض ادا کیا جا رہا ہے۔

"چودھری بہت شدید زخمی ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا کیا انجام ہو۔" اس کی دی اطلاع نے فریدہ کے عرصے سے جلتے دل پر پانی کے چھینٹے ڈالے۔ اپنی ہر سانس کے ساتھ اس نے جس شخص سے نفرت کی تھی اور ہر طرح کا خطرہ مول لے کر مخبری کا کام انجام دیا تھا، اس کے بارے میں یہ اطلاع سن کر سکون محسوس کرنا فطری سی بات تھی۔

"اللہ نے چاہا تو وہ بدترین انجام سے ہی دوچار ہو گا۔" یہ جملہ ادا کرتے ہوئے فریدہ کی آنکھوں اور لہجے میں شعلے لپک رہے تھے۔ شہریار خاموشی سے اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔ چودھری نے ساری زندگی اپنے لیے یہ نفرت ہی تو کمائی تھی۔ ایک اکیلی فریدہ پر کیا موقوف، اس کے مکر کا سلسلہ تو نہ جانے کہاں تک چلا گیا تھا۔ حویلی کے ہی ایک کمرے میں اس کی لنڈا سے بھی ملاقات ہوئی۔ ہوش ربا حسن کی مالک وہ عورت ان کے جوانوں کو بندھی ہوئی حالت میں ہی ملی تھی۔

اس نے اپنے طور پر کوشش کی کہ خود کو مظلوم ثابت کرتے ہوئے انہیں یہ باور کروا سکے کہ وہ ایک عام سی عورت ہے جسے چودھری نے اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے قید میں ڈال رکھا ہے لیکن ظاہر ہے وہ لوگ ایسی کسی کہانی سے متاثر نہیں ہو سکتے تھے۔ شہریار نے اسے بطورِ خاص سی ایف پی کے ایک خفیہ ٹھکانے پر منتقل کروایا۔

حویلی کے معاملات سے نمٹتے نمٹتے انہیں صبح ہو گئی۔ صبح سے پہلے ہی انہیں جنگل کی طرف جانے والوں کی طرف سے بھی کامیابی کی خبر مل چکی تھی۔ جنگل میں کارروائی کرنے والی فورس کا ایک حصہ وہیں رک کر معاملات نمٹاتا رہا۔ دوسرا فوری طور پر واپسی کے لیے روانہ ہو گیا جبکہ تیسرا حصہ حویلی میں اپنے ساتھیوں سے آملا۔ حویلی پہنچنے والوں میں ذیشان بھی شامل تھا۔ ان سب کے چہروں سے تھکن کا اظہار ہوتا تھا لیکن اس تھکن پر کامیابی کی خوشی حاوی ہو گئی تھی۔

"مائی گاڈ... وہ لوگ تو بہت منظم طریقے سے وہاں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ اگر ہمارے پاس عمیر اور جگنو کی فراہم کردہ رپورٹ نہیں ہوتی اور ہم اتنی تیاری سے نہیں آئے ہوتے تو یہ لوگ کبھی ہمارے قابو میں نہیں آ سکتے تھے۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ ہم نے فضا سے بھی ان تک رسائی کا انتظام رکھا ورنہ زمین پر تو انہوں نے ایسا جال بچھا رکھا تھا کہ کوئی ان کی حدود میں داخل ہی نہیں ہو سکے۔ جب ان پر فضائی حملہ ہوا تو بوکھلا کر خود ہی اپنے حصار سے باہر نکلے لیکن بھاگ کر کہاں جاتے۔ ہمارے جوان اطراف میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ جنہوں نے زندہ گرفتاری نہیں دی، انہیں جان سے جانا پڑا۔ بہرحال یہ سب کچھ بہت خوف ناک تھا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ دشمن ایسی جگہ پر بھی اپنے پنجے گاڑ سکتا ہے۔ اب تک تو ہماری قبائلی علاقوں کے بارے میں ہی یہ معلومات تھیں کہ وہاں دھڑلے سے افیون کاشت کی جاتی ہے اور ہیروئن سازی کی فیکٹریاں لگی ہوئی ہیں اور وہ لوگ اس حد تک خود مختار ہیں کہ قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے کی وہاں تک رسائی ممکن نہیں۔ لیکن یہاں، اس جگہ انہوں نے اپنا کارخانہ کھول لیا ہو گا، اس بات کی تو امید ہی

نہیں تھی۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آتا کہ اس جگہ بھی پوست کی کاشت کی جا سکتی ہے لیکن اپنے دشمن کی سائنس و ٹیکنالوجی میں مہارت کو نظر میں رکھوں تو یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔" اسے یہ ساری باتیں بتاتا ذیشان عجیب سی کیفیات کا شکار تھا۔

"ان لوگوں کے پاس اتنا جدید اسلحہ تھا کہ انہوں نے زمین سے ہمارے ایک ہیلی کاپٹر کو تقریباً ہٹ کر لیا تھا۔ پائلٹ ہوشیار نہ ہوتا تو ہیلی کاپٹر سمیت خود بھی جان سے جاتا۔ وہاں کا منظر دیکھ کر بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم بارڈر پر دشمن ملک کی فورس سے مقابلہ کر رہے ہوں۔"

ذیشان وقفے وقفے سے ہیجان زدہ لہجے میں اسے وہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کرتا تھا۔ یہ ساری خبریں سن کر شہریار کا دل کسی قمقمے کی طرح جل بجھ رہا تھا۔ یہاں ملنے والی کامیابیوں کا سوچتا تھا تو دل میں ہر طرف روشنی سی محسوس ہوتی تھی لیکن پھر اگلے لمحے ہی دیارِ غیر میں ماہ بانو کے پھنسے ہونے کے خیال سے تاریکی میں ڈوب جاتا۔ اندر باہر کی مختلف کیفیات اور حالات سے نمٹتے آخر کار اسے پیر آباد سے نکلنے کا موقع مل ہی گیا۔ حویلی اب بھی فورسز کے جوانوں کے قدموں سے گونج رہی تھی۔ سی ایف پی کے بھی چند جوان وہیں رکے ہوئے تھے لیکن شہریار، ذیشان سمیت روانہ ہو گیا۔ وہ دونوں ہی بہت زیادہ تھکے ہوئے تھے لیکن لاہور پہنچ کر انہوں نے سب سے پہلے لنڈا سے ملاقات کرنا ضروری سمجھا۔ چودھری کی حویلی میں ٹھہری اس غیر ملکی مہمان عورت سے انہیں بہت سے انکشافات کی امید تھی لیکن جب وہ دونوں لنڈا کے سامنے پہنچے تو خود ذیشان ہکا بکا رہ گیا۔

"ایملی پارکر۔" لنڈا کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں سے سرگوشی برآمد ہوئی۔

"تم اسے جانتے ہو؟" شہریار حیران ہوا۔

"یہ وہی تو ہے جس نے مجھ سے فوج کی وردی پہننے کا حق چھین لیا تھا۔" ذیشان کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ شہریار فوراً ہی سمجھ گیا کہ وہ کس کا ذکر کر رہا ہے۔ ذیشان اور اس کی دوستی اتنی گہری تھی کہ ذیشان نے اپنی زندگی میں کھائے جانے والے اس سب سے بڑے دھوکے سے بھی آگاہ کر دیا تھا... جو اسے آرمی سے نکال کر سی ایف پی میں لے آیا تھا اور یہ بھی کرنل توحید کی مہربانی تھی کہ انہوں نے اس کے اندر کے محبِ وطن سپاہی کو پہچان کر ہمیشہ کے لیے معتوب قرار دینے کے بجائے ایک بار پھر اٹھنے اور سنبھلنے کا موقع دیا تھا اور ذیشان نے ثابت کر دکھایا تھا کہ وہ اسی سلوک کا حق دار تھا۔ لیکن بہرحال ایملی پارکر نام کی پھانس اس کے سینے میں ہی اٹکی ہوئی تھی اور اس پھانس کو نکالنے کا اس سے بہترین موقع کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

"کانگریچولیشن۔" کرنل سبکتگین نے اپنے سامنے بیٹھے شہریار اور ذیشان کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا لیکن وہ دونوں ہی مسکرا نہ سکے۔ اس وقت پورے ملک میں تہلکہ سا مچا ہوا تھا۔ جنگل اور چودھری کی حویلی میں رات کے اندھیرے میں بیک وقت کی جانے والی وہ کارروائیاں ایسی تو نہ تھیں کہ میڈیا کی نظروں سے پوشیدہ رہتیں۔ بہت کچھ ظاہر نہ کرنے کے باوجود میڈیا نے بہت کچھ جان لیا تھا اور ملک بھر کے لوگ انگشت بدنداں یہ انکشافات سن رہے تھے کہ پیر آباد کا بااثر و با حیثیت چودھری جو اپنے علاقے میں ایک روحانی پیشوا کی سی بھی حیثیت رکھتا تھا، ایسی غیر ملکی تنظیموں کے لیے کام کر رہا تھا جو وطنِ عزیز میں ہیروئن اور اسلحے کی لعنت پھیلانے میں پیش پیش تھیں۔ چودھری کی حویلی کے تہ خانے میں قائم کردہ ہیروئن سازی کی لیبارٹری سے لے کر جنگل میں پوست کی کاشت تک بہت کچھ منظرِ عام پر آیا تھا۔

فوج کی اتنی بڑی کامیابی پر ایک طرف اسے سراہا جا رہا تھا تو دوسری طرف یہ تنقید بھی کی جا رہی تھی کہ اتنے بہت سے خفیہ اداروں کی موجودگی میں اس قسم کی صورتِ حال پیش ہی کیونکر آئی۔ لوگوں کی طرف سے چودھری افتخار عالم شاہ اور دیگر گرفتار شدگان کے لیے پھانسی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا لیکن چودھری تو ابھی ہنوز آئی سی یو میں تھا اور ڈاکٹرز اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں دے رہے تھے۔ البتہ یہ طے تھا کہ وہ زندہ بچ بھی گیا تو ہمیشہ کی معذوری اس کا نصیب بن جائے گی۔ فوج کے ترجمان نے میڈیا کو اس سلسلے میں بریفنگ دیتے ہوئے محض اتنا ہی کہا تھا کہ اس سب کے پیچھے ان کی دشمن طاقتیں موجود ہیں۔ واضح طور پر کسی ملک یا ادارے کا نام نہیں لیا گیا تھا۔ لنڈا اور حویلی کے تہ خانے سے گرفتار ہونے والے ہیروئن سازی کے ماہر کی گرفتاری کو بھی صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا۔ انہوں نے لنڈا اور چودھری کے خصوصی موبائل فون بھی حاصل کر لیے تھے۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا جسے کامیابی قرار دیا جا سکتا تھا لیکن اس وقت کرنل سبکتگین کے سامنے بیٹھے شہریار اور ذیشان کے چہروں پر کامیابی کی خوشی کے بجائے تناؤ نظر آ رہا تھا۔

"میں تم لوگوں کے جذبات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن ملکی معاملات میں جذبات کو پیچھے رکھ کر بھی بہت سے

سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔'' انہیں خاموش دیکھ کر آخرکار کرنل سبکتگین نے خود ہی وہ موضوع چھیڑ دیا جس نے انہیں تناؤ کا شکار کر رکھا تھا۔

''ہماری امریکی ذمے داران سے بات ہوئی ہے۔ ظاہر ہے وہ بھی اس بات پر سخت برافروختہ ہیں کہ موساد نے ان کی تمام تر مہربانیوں کے باوجود امریکا کے خلاف ایسی سازش تیار کی کہ پاکستان میں ہیروئن تیار کر کے اسے امریکا میں پھیلانے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ اسرائیل امریکا کا وہ چہیتا اور لاڈلا ملک ہے جس کی وہ ہر خطا معاف کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ ہماری طرف سے دی ہوئی رپورٹوں پر انہوں نے صرف اتنا کہا ہے کہ وہ اپنے طور پر خود موساد سے نمٹ لیں گے لیکن انہیں ہم سے لنڈا درکار ہے۔ ظاہر ہے ان کا یہ مطالبہ اسرائیل کی فرمائش پر ہی ہے لیکن ہم انہیں انکار کرنے سے پہلے اس لیے سوچنے پر مجبور ہیں کہ انہوں نے لنڈا کے بدلے اس لڑکی ماہ بانو کی صحیح سلامت واپسی کی ضمانت دی ہے جسے واپس لانے کے لیے تم لوگ خود بھی بے چین ہو۔ امریکی سفیر نے صاف کہہ دیا ہے کہ آرلینڈو کے جنگلات میں خفیہ تجربہ گاہ سے متعلق انکشافات پر مبنی ماہ بانو کی ویڈیو ان کے لیے خاص اہمیت نہیں رکھتی اور وہ بہ آسانی اسے ایک اسکینڈل قرار دے سکتے ہیں اس لیے اگر ہم اس لڑکی کو واپس چاہتے ہیں تو ہمیں لنڈا کو انہیں واپس کرنا ہوگا۔ اب تم بتاؤ کہ ہمارے پاس اس سودے کے سوا کیا باقی رہ گیا ہے؟ ہاں، یہ ضرور ہوسکتا ہے کہ ہم ساتھ ہی اپنے لیے کچھ مراعات کا مطالبہ کر کے موقع سے فائدہ اٹھالیں۔'' کرنل سبکتگین نے ان پر ایک بار پھر صورتِ حال واضح کی۔

''لیکن یہ سودا کسی طور پر بھی مناسب نہیں ہے۔ لنڈا اور ماہ بانو میں بہت فرق ہے۔ ماہ بانو زمانے کی ستائی ہوئی ایک بے قصور، بے گناہ اور ستم رسیدہ لڑکی ہے جبکہ لنڈا ایک ایسی عورت ہے جس کی وجہ سے سیکڑوں نہیں، ہزاروں زندگیاں تباہ ہوئی ہوں گی۔ وہ ہماری قومی مجرم ہے جو منشیات اور ہتھیاروں کے پھیلاؤ سے لے کر اہم قومی رازوں کو چرانے تک ہر طرح کے سنگین جرائم میں ملوث پائی گئی ہے۔ ہم اسے اتنی آسانی سے کس طرح نکلنے دے سکتے ہیں؟'' شہریار نے اعتراض کیا۔

''تم جو کچھ کہہ رہے ہو، مجھے اس کی سچائی سے انکار نہیں ہے لیکن سچائی کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ تم نے مجھے لنڈا کے جو جرائم گنوائے ہیں، وہی سارے جرائم وہاں ماہ بانو کے سر پر بھی تھوپے جاسکتے ہیں۔ ثبوت اور شواہد تیار کرلینا ان لوگوں کے لیے بالکل معمولی بات ہوگی۔ وہ اگر رعایت سے کام لے رہے ہیں تو ہمیں اس کا فائدہ اٹھالینا چاہیے ورنہ تم ان کا مزاج بھی جانتے ہو۔ طاقت کے نشے میں بدمست ہاتھی کو پروا نہیں ہوسکتی کہ اس کے قدموں تلے کون کون سے انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں۔ ہم کس حد تک آزاد اور خودمختار ریاست ہیں، یہ حقیقت بھی ہم پر اچھی طرح روشن ہے اس لیے بہتر ہے کہ جھکنا ہے تو کم از کم اپنی شرائط پر تو جھکیں ورنہ آگے وہ صورتِ حال کو ایسا کردیں گے کہ ہمارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔'' کرنل سبکتگین نے دھیمی آواز میں وہ حقائق گوش گزار کیے جو شرمناک اور تلخ تھے لیکن انہیں مانے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔

اس بار شہریار اور ذیشان میں سے کوئی بھی اعتراض نہیں کرسکا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ صرف ماہ بانو کا معاملہ نہیں تھا، مراد شاہ اور مصطفیٰ خان کے مستقبل کا بھی سوال تھا۔ ماہ بانو والے معاملے نے ان دونوں کو بھی مشکوک افراد کی فہرست میں شامل کر دیا تھا اور یہی موقع تھا کہ ان کی بھی وہاں سے بحفاظت واپسی کا سامان کرلیا جائے ورنہ آگے چل کر مشکلات میں مزید اضافہ ہوجاتا۔ ان کے درمیان اس حوالے سے کچھ دیر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔

''عادل خان کا تو امریکا کے لیے ویزا لگ ہی چکا ہے اس لیے یہ پہلے وہاں کے لیے روانہ ہوجائے گا۔ لنڈا کو ہم اس کے بعد روانہ کریں گے اور اس کے ساتھ بھی ہمارا ایک ساتھی خفیہ طور پر سفر کرے گا۔'' کرنل سبکتگین آگے کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔

''لنڈا کے ساتھ میں چلا جاؤں گا۔'' ذیشان نے فوراً خواہش ظاہر کی۔

''نہیں، تمہارا جانا مناسب نہیں ہوگا۔ لنڈا تمہیں پہچانتی ہے اور حلیے کی تبدیلی تمہیں ویسے ہی مشکوک بنادے گی اس لیے بہتر ہے کہ تم اپنے لوگوں میں سے کسی قابلِ اعتماد شخص کا انتخاب کرلو۔'' کرنل نے اس کی خواہش کو رد کرتے ہوئے تجویز پیش کی تو ذیشان دل مسوس کر رہ گیا لیکن مزید اصرار کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ کرنل نے انکار کی واضح دلیل پیش کی تھی۔

''میرے خیال میں اس کام کے لیے جاوید علی موزوں رہے گا۔ وہ بہت ذہین اور اسمارٹ لڑکا ہے۔''

شہریار نے مشورہ دیا جس کی ذیشان نے بھی تائید کی اور پھر اس حوالے سے ان کے درمیان مزید مشورے بھی

ہوتے رہے۔ آج کل ان کا کام ہی یہ تھا۔ وہ گھنٹوں کے حساب سے مشورے، تفتیش اور بھاگ دوڑ میں وقت گزار رہے تھے اور بہت کم وقت کے لیے آرام کر پاتے تھے۔ میڈیا کو سنبھالنا، عوام کے سوالوں کا جواب دینا، گرفتار شدگان سے تفتیش، بے گناہوں کی چھانٹی، اسپتالوں میں موجود اپنے ساتھیوں اور مجرموں کی خبر گیری، حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں مارے جانے والے چھاپے اور نہ جانے کون کون سے کام تھے جو انہیں ان دنوں کرنے پڑ رہے تھے۔ بستر پر آرام کے لیے کمر ٹکاتے بھی تھے تو ذہن کئی مسئلوں میں الجھا رہتا تھا۔

''تم لوگ اس کام کو نمٹا لو تو ہمیں سی ایف پی کے مستقبل کے لیے بھی کچھ فیصلے کرنے ہوں گے۔ ہم نے سیکیورٹی ایجنسی کی آڑ میں بہت عرصے تک اس ادارے کو کامیابی سے چھپائے رکھا لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ ہمارا یہ سیٹ اپ دشمنوں کی نظر میں آچکا ہوگا۔ خصوصاً ڈیوڈ نامی جس بندے کے فرار کی خبر ملی ہے، وہ بہت اہم ہے۔ ڈیوڈ بہت منجھا ہوا ایجنٹ ہے جس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہونے کے باوجود کبھی کوئی اس کے سائے تک بھی نہیں پہنچ سکا۔ کہتے ہیں بے شمار زبانوں کے ماہر اس شخص کے سیکڑوں روپ ہیں۔ وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدل کر خود کو اس ماحول سے ہم آہنگ کرلیتا ہے جہاں موجود ہو۔ اپنی انہی خصوصیات کی وجہ سے وہ یہاں سے بھی نہایت صفائی سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا اور ہمیں اپنے دو قیمتی آدمی گنوانے پڑے۔ مجھے یقین ہے کہ ناکامی کے باوجود ڈیوڈ یہاں سے بالکل خالی ہاتھ نہیں گیا ہوگا۔ کرنل توحید کے جنازے سے تمہارا اور ذیشان کا پیچھا ہونے کا مطلب ہے کہ انہوں نے سی ایف پی کی حقیقت بھی کھوج لی ہوگی۔ اس لیے اب ہمیں اس ادارے کے لیے کوئی نیا کور تلاش کرنا پڑے گا۔'' کرنل سبکتگین نے ایک اور مسئلہ سامنے رکھا۔

''ٹھیک ہے سر... ہمیں تو کام ہی کرنا ہے۔ کسی بھی صورت میں کریں، کیا فرق پڑتا ہے۔'' ذیشان نے شانے اچکائے۔

''تم یہاں رہ کر اس سلسلے میں میرے ساتھ کام کرو گے۔ عادل خان اور جاوید علی اس دوران میں وہاں کے معاملات نمٹاتے رہیں گے۔'' کرنل نے شاید اس پروگرام کا ذکر اس وقت بطورِ خاص ذیشان کی دل جوئی کے لیے چھیڑا تھا کہ کہیں وہ خود کو امریکا نہ بھیجے جانے پر دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کرے۔

''میں ہر وقت، ہر طرح کی خدمت کے لیے حاضر ہوں سر۔'' ذیشان نے خوش دلی سے جواب دے کر واضح کر دیا کہ وہ ان کے ہر حکم پر راضی ہے کہ سپاہی کا تو کام ہی حکم بجالانا ہے۔

☆☆☆

ائرپورٹ سے نکل کر ٹیکسی میں سوار ہوٹل کی طرف جاتے شہریار کے چہرے پر بظاہر شوق اور تجسس کے کچھ نہیں تھا اور اپنے حلیے سے وہ ایک ایسا کھلنڈرا نوجوان دکھائی دیتا تھا جو پہلی بار امریکا آنے پر بے حد مسرور ہو۔ اس نے نیلے رنگ کی جوئی شرٹ جینز کے ساتھ پہن رکھی تھی، اس پر واضح طور پر آئی لو نیویارک کے الفاظ چھپے ہوئے تھے اور اس کا ماڈرن سا ہیئر اسٹائل بھی یہی ظاہر کر رہا تھا کہ وہ ان ایشیائی جوانوں میں سے ایک ہے جن کے خوابوں کی سرزمین اکثر امریکا ہوا کرتی ہے۔ وہ ہونٹوں کو سیٹی بجانے کے انداز میں سکیڑے ایک شوخ سی دھن گنگنا رہا تھا اور بے حد شوق سے اردگرد کے مناظر دیکھ رہا تھا۔

ائرپورٹ سے ہوٹل تک کا راستہ اس نے اسی انداز سے طے کیا لیکن یہ تو وہی جانتا تھا کہ اس کے دل کے اندر کیا ہے۔ وہ دیو کی قید سے اپنی شہزادی کو لے جانے آیا تھا اور ظاہر ہے یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔

ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر جونہی اس نے دروازہ بند کیا، اس کے چہرے پر چڑھا شوخی کا نقاب بھی اتر گیا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے پاس موجود خصوصی موبائل فون نکالا جو کبھی چودھری کی ملکیت ہوا کرتا تھا۔ ایسا ہی ایک سیٹ انہیں لنڈا کے پاس سے بھی ملا تھا اور اسے وہ جاوید علی کے لیے چھوڑ آیا تھا۔ موبائل پر اس نے مصطفیٰ خان کے اس نمبر پر رابطہ کیا جو اس نے حال ہی میں کسی ذریعے سے حاصل کیا تھا اور ریکارڈ میں اس کے نام پر رجسٹرڈ نہیں تھا۔

''میں پہنچ گیا ہوں۔'' بغیر کسی حوالے کے اس نے مصطفیٰ خان کو اطلاع دی۔

''یہاں فی الحال سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ جس پارٹی سے سودا ہوا ہے اس کی طرف سے دھوکے..... کا بھی ڈر نہیں لیکن تھرڈ پارٹی ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ کرے گی۔ ہمیں اس کی طرف سے ہوشیار رہنا ہوگا۔ میں اور میرے ساتھی تم سے ہر طرح کا تعاون کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔'' مصطفیٰ خان نے بھی اسی کے سے انداز میں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''تھرڈ پارٹی کو دیکھنے کے لیے ہی میں یہاں آیا

ہوں۔باقی لوگوں کے بارے میں بتاؤ۔"

"لارڈ صاحب کے بیٹے اور بیٹی کی فیملی آج واپس روانہ ہورہی ہے۔کسی نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے۔ امید ہے کہ آگے بھی کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔" وہ کشور اور مراد شاہ کی بات کررہا تھا۔حویلی پر ہونے والے ریڈ اور چودھری کے شدید زخمی ہونے کی خبر سن کر ان دونوں بہن بھائی نے پاکستان واپس لوٹ جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

"اچھی بات ہے۔تم اپنے لوگوں کو ریڈی رکھو۔ اصل کہانی تو کل کی ہے۔کل کوئی نہ کوئی تماشا ضرور ہوگا۔" ان الفاظ کو ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں پھنکار سی تھی اور صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اب وہ کسی کو بخشنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہے۔اسے اس بات کی بھی قطعی پروا نہیں تھی کہ وہ امریکی سرزمین پر ہے اور امریکا اس طاقت کا نام ہے جو بیٹھے بیٹھے اس کے ملک جیسے ممالک پر اپنا حکم چلاتا ہے۔اس وقت اس کے سینے میں جو آگ دہک رہی تھی، وہ صرف اتنا دکھا سکتی تھی کہ اگر وہ اپنی ماہ بانو کو یہاں سے صحیح سلامت نہ لے جاسکا تو پھر یہاں بھی بہت سی تباہی پھیلے گی اور دنیا کے ٹھیکے دار جان لیں گے کہ جب کسی دل جلے عاشق کو چھیڑا جائے تو اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

☆☆☆

اسپتال کے بستر پر پڑا وہ وجود دیکھنے والوں کے لیے نشانِ عبرت تھا۔وہ شخص جو کبھی خود کو مطلق العنان حاکم بنا لوگوں کی زندگی اور موت کے فیصلے کیا کرتا تھا، آج اس لائق بھی نہیں تھا کہ اپنے ہاتھوں کو جنبش دے کر اپنے جسم پر بیٹھنے والی مکھی کو اڑا سکے۔اس صاحبِ اختیار و اقتدار کا آج اپنے جسم پر سے ہی اختیار ختم ہوگیا تھا اور وہ اپنے منہ سے بہنے والی رال کو بھی بہنے سے روکنے کا مختار نہیں رہا تھا۔پورے جسم میں صرف اس کی آنکھیں تھیں جو حرکت کرسکتی تھیں اور یہ آنکھیں اسے ان چہروں کو دکھا رہی تھیں جو کسی نہ کسی طور اس کے ظلم و جبر کا نشانہ بنے تھے۔

سب سے آگے اس کا پیارا اور لاڈلا بیٹا مراد شاہ کھڑا تھا۔اس بیٹے کو اس نے دنیا کی ہر آسائش دی تھی لیکن وہ باپ نہیں دے سکا تھا جس کے کردار و اخلاق پر وہ فخر کرسکے۔چنانچہ اس نے خود ساختہ جلاوطنی اختیار کر کے خود کو اس دولت و جاگیر سے دور کرلیا تھا جس کی بنیادوں میں مظلوموں کا خون، آہیں اور سسکیاں دبی ہوئی تھیں۔

مراد شاہ کے پیچھے اس کی وہ بیٹی موجود تھی جسے اس نے حویلی کی روایات کے خلاف کچھ سہولتیں دی تھیں اور ان سہولتوں نے اسے حرفِ آشنا بنا دیا تھا۔یہ مہربانی صرف اس لیے تھی کہ وہ فطری زندگی گزارنے کا حق تلف کرنے پر احتجاج نہ کرے اور باپ کے احسانوں تلے دبی رہے لیکن کشور ان بہلاووں سے نہ بہل سکی اور اس نے اپنے لیے آفتاب کا انتخاب کر کے حویلی کی اونچی اونچی دیواروں سے فرار حاصل کرلیا تھا۔اس جرأت و گستاخی کی سزا دینے کے لیے آج بے بس پڑے وجود نے کتنا اودھم مچایا تھا اگر کشور کی قسمت ہر بار ساتھ نہ دیتی تو وہ آفتاب اور اپنی بیٹی سمیت کب کی اس دنیا سے جاچکی ہوتی۔لیکن وہ کیسے چلی جاتی، اسے تو اپنے باپ کو آئینہ دکھانے کے لیے آج اس کے روبرو کھڑا ہونا تھا۔اس باپ کے روبرو جو کبھی اس سے اتنی شدید نفرت کرتا تھا کہ اس کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتا تھا اور آج ایسا بے بس تھا کہ اس سے منہ بھی نہیں موڑ سکتا تھا۔زبان سے نفرت کا ایک لفظ بھی ادا نہیں کرسکتا تھا بلکہ اس حیرانی کا بھی اظہار نہیں کرسکتا تھا جو کشور کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اسے ہورہی تھی۔اتنے لوگوں میں وہ واحد تھی جو اپنے ظالم باپ کے اس انجام پر دکھی تھی اور ہولے ہولے اس کے لیے سسک رہی تھی۔ہوسکتا ہے اس کی بڑی دونوں بیٹیوں تاجور اور صنوبر کو بھی اس کے لیے صدمہ ہو لیکن وہ اس سے ملنے اسپتال نہیں آئی تھیں۔انہیں اپنے سسرال کی طرف سے ایک بدنام شخص سے ملاقات کرنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔کشور کے ساتھ ہی اس کی ماں، چھوٹی چودھرائن ناہید کھڑی تھی۔وہ ان عورتوں میں سے ایک تھی جسے چودھری کی منکوحہ ہونے کا اعزاز حاصل رہا تھا اور وہ پہلے سے ہی بٹے ہوئے شخص کو اپنے حقوق، بازاری عورتوں پر لٹاتا دیکھ کر بھی خاموش رہ کر اس مال و دولت سے بہلنے پر مجبور تھی جو چودھری کی بیوی ہونے کی وجہ سے اس کے تصرف میں تھا۔

وڈی چودھرائن کو تو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے ٹھکانے لگایا تھا اور چھوٹی چودھرائن نے اس پر یہ احسان کیا تھا کہ بے بس و مجبور پڑے چودھری کے اس فعل کو اس کی اولاد پر ظاہر کر کے اس کے لیے نفرت کے مزید در نہیں کھولے تھے۔

چھوٹی چودھرائن کے پیچھے بہزاد شاہ اور فریدہ موجود تھے۔ذہنی معذور بہزاد شاہ جو اس سے اس بات کا بھی حساب نہیں لے سکتا تھا کہ اپنی منکوحہ بنا کر حویلی میں لائی جانے والی لڑکی پر نیت خراب کرنے کے جرم میں اس کا گریبان پکڑ سکتا لیکن جو وہ نہیں کرسکتا تھا وہ فریدہ کی نفرت

بھری نگاہیں کررہی تھیں۔وہ جب بھی اس کی طرف دیکھتی تھی، اپنی نظروں کی دھار سے اس کے دل کو کاٹ کر رکھ دیتی تھی۔پلکوں کی جنبش سے کوڑے لگاتی تھی اور چہرے کی سرخی کو مرچوں کی طرح اس کے زخم زخم وجود پر چھڑک دیتی تھی۔وہ اس لڑکی کو اس کے بھائی کو نیچا دکھانے کے لیے اپنی حویلی میں لایا تھا اور آج اسی کی وجہ سے اس کی حویلی کی بنیادیں ہل کر رہ گئی تھیں۔فریدہ نے اسے جتا دیا تھا کہ چیونٹی بھی حقیر اور بے وقعت نہیں ہوتی۔موقع ملنے پر وہ ہاتھی کی سونڈ میں گھس کر اسے بھی بے بس کرسکتی ہے اور پچھاڑ سکتی ہے، سو اس نے یہ سب کچھ کر دکھایا تھا۔

"میری ڈاکٹرز سے بات ہوئی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ لگنے والی گولیوں نے ان کے نروس کو اتنی بری طرح تباہ کردیا ہے کہ اب یہ ساری زندگی بستر سے نہیں اٹھ سکتے۔ ڈاکٹرز کے مطابق ریڑھ کی ہڈی میں گولیاں لگنے کے باوجود ان کا بچ جانا ایک معجزہ ہی ہے لیکن یہ زندگی محتاجی کی زندگی ہوگی اور مشکل ہی ہے کہ یہ کبھی اپنی زبان کو بھی حرکت دے سکیں۔" مراد شاہ دھیمی آواز میں ان سب کو بتا رہا تھا۔سننے والے جانتے تھے کہ چودھری کی زندگی کا بچ جانا معجزہ نہیں بلکہ وہ سزا ہے جو قدرت کی طرف سے اس کے لیے متعین کی گئی ہے۔ملک، قوم اور انسانیت کے اس دشمن کو قانون سزا بھی دیتا تو کیا دیتا۔زیادہ سے زیادہ سزائے موت کا ہی انتخاب ہوسکتا تھا نا، لیکن موت و زیست کے درمیان بستر پر پڑے رہنے کی یہ سزا سب سے کڑی تھی۔حکمرانی کرنے والا اپنی مرضی سے حرکت کرنے تک سے محروم ہوگیا تھا۔وہ بھوک، پیاس، درد، خوشی سب محسوس کرنے کے باوجود ان کے اظہار کی صلاحیت سے محروم ہوگیا تھا۔یہ سزا دنیا کی ہر سزا سے کڑی تھی۔اس سزا کو کاٹتے ہوئے وہ اچھی طرح جان لیتا کہ اسلحہ کتنی تباہ کن شے ہے اور منشیات کی لعنت سے گھن لگ جانے والے جسموں کے ساتھ زندگی گزارنا کیسا دشوار ہوتا ہے۔زندگی بچا کر زندگی کے مزے چھین لینے والے نے اسے پورا موقع دیا تھا کہ وہ اپنے پرائے ان سارے چہروں کو ایک ایک کر کے یاد کرے جو اس کے ظلم و ستم کا شکار ہوئے تھے۔اس نے حکمرانی کے مزے بہت لوٹے تھے، اب اسے یہ جاننا تھا کہ بے بسی کا عذاب کیسا ہوتا ہے اور اپنی ہی ہر سانس کیسے بوجھ بن جاتی ہے۔

زبان کی ذرا سی جنبش سے زندگی چھین لینے والا آج اتنا بے بس ہوگیا تھا کہ خود اپنے آپ کو زندگی کے عذاب سے نہیں نکال سکتا تھا۔اس کے پاس اللہ سے موت کی دعا مانگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔لیکن ساتھ ہی یہ بھی یقین موجود تھا کہ اس جیسے گناہ گاروں کی دعائیں اتنی آسانی سے قبول نہیں ہوتیں۔اذیت اور بے بسی کے احساس نے آخرکار اسے اپنی آنکھیں بند کرلینے پر مجبور کردیا۔آخر کوئی رحم، غصے اور نفرت سے بھری اپنوں کی نگاہوں کو کب تک سہہ سکتا ہے۔وہ بھی نہیں سہہ سکا تھا۔

"شاید انہیں نیند آرہی ہے۔آیئے ہم سب باہر چلتے ہیں۔" مراد شاہ نے سب سے کہا تو ایک ایک کر کے سب کمرے سے باہر نکل گئے۔

"میری ذمے داران سے بات ہوگئی ہے۔حویلی ہمارے حوالے کردی جائے گی اور ان ملازمین کو بھی رہا کر دیا جائے گا جو کسی جرم میں ملوث نہیں ہیں۔آپ لوگ چاہیں تو ابھی حویلی کے لیے روانہ ہوسکتے ہیں۔باہر گاڑی اور ڈرائیور موجود ہیں۔" وزیٹنگ روم میں پہنچ کر مراد شاہ نے ان سب سے کہا۔وہ خود بہت تھکا ہوا اور دکھی نظر آرہا تھا۔ لمبے سفر کے بعد اسپتال آنے تک بھی اسے مسلسل مصروف رہنا پڑا تھا۔یہ تو ذیشان کی مہربانی تھی کہ اس نے بہت سے معاملات خود ہی نمٹا دیے تھے اور صرف فون پر ہی سارے مسئلے حل ہوگئے تھے۔

مراد شاہ، چھوٹی چودھرائن، بہزاد شاہ اور فریدہ کو اس

سرکاری کام

میں کارپوریشن کے دونوں محنتی ملازموں کو دیر سے دیکھ رہا تھا۔ایک کدال سے فٹ پاتھ پر گہرے گڑھے کھودنے کے ساتھ مٹی نکال کر ڈھیر کررہا تھا، دوسرا اس کے پیچھے وہی مٹی ان گڑھوں میں بھرتا آرہا تھا۔

کڑی دھوپ میں دونوں پسینے میں نہائے ہوئے تھے۔میرے لیے وہ ایک معما تھا۔میں نے قریب جا کر پوچھا۔"تم دونوں بہت محنت کررہے ہو لیکن اس کا مقصد کیا ہے...گڑھا کھودتے ہو اور بھر دیتے ہو؟"

ایک نے اپنی پیشانی سے پسینا صاف کرتے ہوئے بتایا۔"یہاں تین آدمیوں کی ڈیوٹی ہے...آج ہم دونوں کے بیچ والا بیمار ہوگیا ہے۔"

"وہ یہاں کیا کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔"

"پودے لگانے...گڑھا کھودو، پودا لگاؤ اور مٹی بھر دو۔وہ بیمار ہے مگر ہم اپنا پورا کام کررہے ہیں۔"

کوٹ ادو سے جمال مصطفی کی برجستگی

ادارے سے لیتا ہوا اسپتال پہنچا تھا جہاں انہیں حویلی سیل کرنے کے بعد رکھا گیا تھا۔ آفتاب کو اپنے کچھ ضروری کام نمٹانے تھے اس لیے وہ ائرپورٹ پر ہی ان سے جدا ہو گیا تھا۔ اس نے کشور سے کہا تھا کہ وہ کچھ تاخیر سے اسپتال پہنچ جائے گا۔

"آپ باقی لوگوں کو لے کر چلے جائیں۔ میں آفتاب کا انتظار کروں گی۔" بچی کو گود میں اٹھائے کشور ایک صوفے پر ٹک گئی۔

"میں بھی ابھی نہیں جاؤں گا۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ ہمارے علاقے کے اے سی عمیر آفندی بھی اسی اسپتال میں داخل ہیں۔ میں ان کی مزاج پرسی کے لیے یہاں رکوں گا۔" مراد شاہ نے اسے جواب دیا اور پھر باقی لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ان افراد میں اس کی بیوی، بیٹی، سوتیلی ماں، بھائی بہزاد، فریدہ اور اس کا بیٹا شامل تھے۔ پتھرائی نظروں سے ایک ایک کا چہرہ دیکھتے اس کی نظریں فریدہ کے چہرے پر رک گئیں۔ یہ لڑکی بھی تو اس کے باپ کے ظلم کا نشان بن کر ان کے خاندان میں موجود تھی۔ خشک ہوتے گلے کو تر کر کے وہ فریدہ سے مخاطب ہونے کی جرأت کر سکا۔

"اگر آپ چاہیں تو اپنے لیے کوئی مناسب فیصلہ کر سکتی ہیں۔ اباجی کی ناانصافی نے آپ کو ایک ذہنی معذور شخص سے باندھ دیا تھا لیکن اب میں آپ کی زندگی کے سارے اختیارات آپ کے ہاتھ میں دینا چاہتا ہوں۔" فریدہ سے کب حویلی کے کسی مرد نے اتنی عزت سے بات کی تھی، اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور گلا رندھ گیا۔ وہ بڑی مشکل سے کچھ کہنے کے قابل ہو سکی۔

"آپ کا شکریہ بھائی صاحب کہ آپ نے میرا اتنا خیال کیا لیکن میں حویلی چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتی۔ میرے پاس اپنی زندگی کے لیے کوئی خواب اور خواہش نہیں ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ میرا بیٹا اپنے خاندان میں ہی پرورش پائے۔ میں نے یہ فیصلہ اس لیے بھی کیا ہے کہ میری معلومات کے مطابق اب اس خاندان کی سربراہی جس شخص کو ملنے والی ہے، وہ ایک ہمدرد، تعلیم یافتہ اور منصف مزاج شخص ہے۔" فریدہ جوں جوں بولتی گئی، اس کی رندھی ہوئی آواز صاف ہوتی چلی گئی۔

"میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کی ان توقعات پر پورا اتر سکوں۔" مراد شاہ نے اسے جواب دیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

"بہت بہت شکریہ۔" کشور نے فریدہ کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے نم آنکھوں کے ساتھ کہا تو فریدہ بس سر ہلا کر رہ گئی۔

وہ جانتی تھی کہ حویلی کے مکینوں میں سے واحد کشور ہی ہے جو اپنے باپ کے گھناؤنے کردار سے واقف ہے اور اس وقت اس نے اس کا شکریہ اس لیے ادا کیا ہے کہ وہ اس کے باپ کے گھناؤنے چہرے کو کسی کے سامنے نہیں لائی ہے۔ لیکن سچ یہ تھا کہ فریدہ ایسا کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے لیے بھلائی اسی میں تھی کہ وہ بہزاد شاہ کی منکوحہ کی حیثیت سے حویلی میں اپنی زندگی کے باقی کے دن عزت سے گزار دے۔ بعض سچ ایسے ہوتے ہیں جنہیں سامنے لانے پر رسوائی اور بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا اور وہ جانتی تھی کہ سچائی سامنے آنے کی صورت میں سب سے زیادہ نقصان اس معصوم وجود کا ہوگا جو خود کو دنیا میں لائے جانے کے گناہ میں ذرا بھی شریک نہیں تھا۔ اس کے لیے یہی سب سے بہتر تھا کہ وہ بہزاد شاہ کا بیٹا کہلاتا رہے۔

شکستہ ٹوٹے پھوٹے، بکھرے ہوئے افراد پر مشتمل اس خاندان کے افراد جب حویلی واپس لوٹنے کے لیے اسپتال سے روانہ ہو رہے تھے تو مراد شاہ، عمیر آفندی کے کمرے میں بیٹھا اس کی مزاج پرسی کر رہا تھا کیونکہ عمیر آفندی ہی وہ شخص تھا جس کے ساتھ مل کر اس کو مستقبل کے پیر آباد کی منصوبہ بندی کرنی تھی۔ اس پیر آباد کی جو چودھری افتخار عالم شاہ کے دور کے اندھیروں سے نجات پا کر ایک روشن مثال کے طور پر پاکستان کے لیے باعثِ فخر ثابت ہوتا۔

☆☆☆

فل آستینوں والے لانگ اسکرٹ میں ملبوس نصف چہرے کو اسکارف میں چھپائے سامنے کھڑی عورت، لنڈا ہو گی، اس بات کا ڈیوڈ بھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ لنڈا کے سوا کون ہو سکتی تھی کہ اس کے آدمی لنڈا کو لینے ہی تو ائرپورٹ گئے تھے۔ وہ کسی اور کو تو ہرگز بھی اپنے ساتھ نہیں لا سکتے تھے لیکن یہ حسن کا پیکر اتنا چھپ چھپا کر کیوں اس تک آیا تھا؟ یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ وہ تو ہمیشہ وہ پہنا کرتی تھی کہ جس کو پہن کر بھی نہ پہننے کا احساس ہو اور ہر طرف سے اس کا شباب چھلک چھلک پڑے۔

"لنڈا! یہ تم ہو؟" وہ بے یقینی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں، یہ میں ہی ہوں لیکن نہیں... یہ میں کہاں ہوں؟" لنڈا نے دیوانگی سے اپنا اسکارف نوچ کر دور پھینکا اور ڈیوڈ یہ دیکھ کر لرز گیا کہ حسن کے اس ماہِ تمام کو گہن لگ چکا ہے۔

"وہ میرے لیے بہت ظالم ثابت ہوئے کیونکہ ان کے مطابق میں انسانیت کی دشمن تھی۔ مجھ سے سچ اگلوانے کے لیے انہوں نے میرے پیروں، بازوؤں اور چہرے کو تیزاب کا اسپرے کر کے جھلسا ڈالا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مجھ سے کوئی انسانی سلوک نہیں کر سکتے کیونکہ میں، میرا وجود انسانیت کے نام پر ایک بدنما دھبا ہے۔"

وہ ڈیوڈ کے سینے سے لگی اسے ہذیانی لہجے میں بتاتی رہی۔ ڈیوڈ جو خود بڑی مشکلوں سے بچ بچا کر واپس نیویارک پہنچا تھا، اسے اس حال میں دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ یہ وہ لنڈا نہیں تھی جس پر وہ مرتا تھا اور جو اس کے ایک اشارے پر بڑے بڑے سورماؤں کو اپنے حسن کے ہتھیار سے شکار کر کے اس کے قدموں میں لا ڈالتی تھی۔ وہ ذہین تھی لیکن یہ ذہانت حسن کے ملاپ سے ہی اپنا کام دکھاتی تھی۔ حسن کھو دینے کے بعد تو وہ دس فیصد بھی ان کے کام کی نہیں رہی تھی اور اتنا بڑا نقصان وہ چپ چپاتے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بے جان ہاتھوں سے روتی ہوئی لنڈا کی پشت تھپکی اور قہرناک لہجے میں بولا۔

"تم فکر مت کرو لنڈا! تمہارے ساتھ کیے گئے اس سلوک کا پورا بدلہ لیا جائے گا۔ یہاں سے وہ لڑکی صحیح سلامت نہیں جا سکے گی جس کے بدلے میں تمہاری رہائی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ میں پہلے بھی اس کی اس طرح واپسی کا قائل نہیں تھا لیکن امریکیوں نے فرمائش کر کے مجبور کر دیا تھا۔ اب یہ فرمائش پوری کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ دشمنوں کو اپنے کیے کی سزا بھگتنی ہوگی۔" وہ جو کچھ لنڈا کی تسلی کے لیے کہہ رہا تھا، وہ پہلے ہی سے اس کے دل میں تھا۔

اس کی انا پہلے ہی اسے اس بات کی اجازت نہیں دے رہی تھی کہ ماہ بانو یہاں سے بہ حفاظت نکل جائے لیکن اپنے اور امریکی حکمرانوں کے درمیان طے پائے گئے معاملات کی وجہ سے وہ ذرا ہاتھ پیر بچا کر اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے جاسوس اب بھی ہارلم کے علاقے کے اردگرد منڈلا رہے تھے جن کے ذریعے اسے ماہ بانو کی نقل و حرکت کی اطلاع فوری طور پر مل جاتی۔ لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ اگلے بھی اس کی قوم کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہیں اور انہوں نے ان کے داؤ ان پر ہی الٹ دینے کا پورا بندوبست کر رکھا ہے۔ سی ایف بی کے انویسٹی گیشن سیل میں تشدد سہہ کر لمبا عرصہ خاموشی میں گزارنے والی لنڈا کو خبر ہی نہیں تھی کہ اس کی پنڈلی میں ایک ایسی چپ نصب کر دی گئی ہے جو اس کی لوکیشن اس کے ساتھ ہی آنے والے جاوید علی کو اچھی طرح بتا رہی ہے۔ چپ نصب کرنے کے لیے لگایا جانے والا کٹ دوسرے زخموں میں مل کر چھپ گیا تھا اس لیے ایک منجھی ہوئی ایجنٹ ہونے کے باوجود وہ کچھ نہیں جان سکی تھی۔ اس بار بازی دوسری طرف موجود لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو سانپ کے بل سے نکلنے سے قبل ہی اس کا سر کچل دینے کا تہیہ کیے بیٹھے تھے۔

☆☆☆

شہریار کا چہرہ پتھرایا ہوا تھا اور وہ تولتی ہوئی نظروں سے ان چار افراد کو دیکھ رہا تھا جنہیں مصطفیٰ خان نے اس کی معاونت کے لیے بھیجا تھا۔ مصطفیٰ خان کو احتیاط کے تقاضے نبھانے کے لیے اس مشن سے دور رکھا گیا تھا لیکن اس کے مطابق اس نے اس کی معاونت کے لیے بہت منتخب افراد کو بھیجا ہے اور شہریار کو لگتا تھا کہ اس کا یہ دعویٰ درست ہی ہوگا کیونکہ اس کے سامنے کھڑے افراد میں سے کسی نے بھی اس کی نظروں سے گھبرا کر اپنی نگاہیں یا بدن چرانے کی کوشش نہیں کی تھی اور ویسے ہی اعتماد سے کھڑے رہے تھے۔

"ہاں جاوید! کیا خبر ہے؟" اپنے ہم رکابوں کی طرف سے اطمینان ہو جانے پر اس نے جاوید علی سے رابطہ کیا۔ وہ لنڈا کے ساتھ اسی فلائٹ میں نیویارک آیا تھا جس سے وہ آئی تھی اور اس کے جسم میں پیوست چپ کے ننھے سے ریسیور کی مدد سے مسلسل اس کے تعاقب میں رہا تھا۔ اس ننھی سی جدید سائنسی ایجاد کے استعمال سے یہ فائدہ ہوا تھا کہ لنڈا کو ائرپورٹ سے ریسیو کرنے آنے والوں کے لیے ایسے کسی شخص کو کھوجنا ممکن نہیں رہا تھا جو لنڈا کے تعاقب میں ہو کیونکہ جاوید علی کو اس کو بالکل نظروں میں رکھ کر تعاقب کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ وہ دور دور رہ کر بھی اس کے نقشِ قدم پر چلتا رہا تھا اور اس اپارٹمنٹ بلڈنگ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا جہاں وہ اور ڈیوڈ رہتے تھے۔ وہ شہریار کو اس بارے میں اطلاع دے کر خود مسلسل بلڈنگ کی نگرانی کرتا رہا تھا۔ اس نگرانی کے نتیجے میں وہ ڈیوڈ کو بھی دیکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ڈیوڈ اس کے سامنے ہی لنڈا کو اسپتال پہنچا کر خود واپس اپارٹمنٹ آ گیا تھا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ شدید اضطراب کا شکار ہے۔ اس کے جسمانی تناؤ اور لنڈا کے ساتھ محسوس ہوتی واضح وابستگی و قربت نے ہی جاوید علی کو یہ باور کروایا تھا کہ یہ شخص ڈیوڈ ہے کیونکہ بیزار چہرے رکھنے والے اس شخص کے متعلق صرف ایک بات یقینی تھی کہ وہ لنڈا سے محبت کرتا ہے اور لازم تھا کہ لنڈا الوٹ کر اسی کے پاس جائے گی۔

بلڈنگ کے اردگرد منڈلاتے اس نے ڈیوڈ کے اپارٹمنٹ تک رسائی کی ایک دلچسپ ترکیب بھی ڈھونڈ نکالی تھی۔ بلڈنگ کے نوٹس بورڈ پر ایک ایسا نوٹس لگا تھا جس میں اپارٹمنٹ نمبر کے ساتھ یہ تفصیل درج تھی کہ کس اپارٹمنٹ میں کس قسم کے مضر جانور یا حشرات الارض دیکھے گئے ہیں یا ان کی موجودگی کا شک ہے۔ یہ نوٹس یقینی طور پر بلڈنگ کے مکینوں کی طرف سے انتظامیہ کے لیے لگایا گیا تھا لیکن ان کا کام آسان کر گیا۔ شہریار نے اس کی حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں دی جانے والی تجویز کو پسند کیا تھا اور اب اس تجویز پر عمل کرنے کے لیے ہی وہ اپنی ٹیم کے ساتھ وہاں جانے والا تھا۔

"وہ ابھی تک اپنے اپارٹمنٹ میں ہی موجود ہے۔ جو لوگ لنڈا کو ائرپورٹ سے لائے تھے، ان میں سے صرف ایک ہے جس کو میں نے واپس جاتے ہوئے نہیں دیکھا اور یقینی طور پر وہ اس کے ساتھ اندر ہی ہے۔ ان دو کے علاوہ اگر کوئی تیسرا شخص پہلے سے اندر موجود ہو تو میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔" جاوید علی نے مستعدی سے اپنی رپورٹ پیش کی۔

"ٹھیک ہے۔ ہم پندرہ منٹ میں وہاں پہنچ رہے ہیں۔" شہریار نے اس سے کہا اور سلسلہ منقطع کر کے اپنے ساتھ موجود افراد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ان چاروں نے اس سمیت ایک ایسی کمپنی کے یونیفارم پہن رکھے تھے جو فیومیگیشن کا کام کرتی تھی۔ یونیفارم، شناختی بیج اور کمپنی کے مونوگرام والی گاڑی کا مختصر مدت میں بندوبست مصطفیٰ خان کی یہاں بہترین کارکردگی کا ثبوت تھا۔

"تم میں سے دو افراد میرے ساتھ رہیں گے جبکہ دو نیچے والے فلور کے فلیٹ میں معمول کے انداز میں اپنا کام کریں گے۔ یاد رکھنا کہ نیچے فلور پر موجود لوگ صرف بیک اپ کے لیے ہوں گے جو ہماری کال کے بغیر قطعی مداخلت نہیں کریں گے۔ از اٹ کلیئر؟" انہیں سمجھاتے ہوئے آخر میں اس نے کسی آرمی آفیسر کے سے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

"یس سر۔" ان چاروں نے مستعدی سے بیک وقت جواب دیا۔ اس کے بعد وہ فوراً وہاں سے روانہ ہو گئے۔ مونوگرام والی گاڑی، یونیفارم اور بیجز کی موجودگی کی وجہ سے انہیں بلڈنگ میں داخل ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہاں تک کہ ان کے ایشیائی نظر آتے چہرے بھی کسی قسم کے شک کا باعث نہیں بنے کہ نیویارک میں اس قسم کے نچلے درجے کی ملازمتوں پر عموماً ایشیائی ممالک سے آئے ہوئے لوگ ہی فائز ہوتے ہیں۔ فیومیگیشن کے سامان کی آڑ میں ان کے لیے ہتھیار چھپا کر لے جانا بھی آسان ہو گیا تھا۔ یوں بھی انہوں نے خطرناک ہتھیاروں کے بجائے کچھ ایسی چیزوں کا انتخاب کیا تھا جو بظاہر ہتھیار محسوس ہی نہیں ہوتی تھیں۔ خواتین کا اپنے دفاع کے لیے استعمال کیا جانے والا کرنٹ لگانے والا آلہ، بے ہوش کرنے والی گیس سے بھرا اسپرے، چھوٹی سی ڈرل مشین اور اسی طرح کی چند دوسری معمولی سی اشیا کس کی نظر میں آ سکتی تھیں۔ وہ تو آرام سے فیومیگیشن کے سامان کے ساتھ رل مل گئی تھیں۔ باہر نگرانی کرتے جاوید علی کو کسی بھی طرح کا اشارہ کیے بغیر وہ بلڈنگ کے اندر گھستے چلے گئے۔

لفٹ میں داخل ہونے سے قبل البتہ شہریار کچھ دیر نوٹس بورڈ کے سامنے اس انداز میں کھڑا رہا جیسے وہاں لگے نوٹس کی تفصیلات اپنی جیبی نوٹ بک میں درج کر رہا ہو لیکن حقیقتاً اس نے نوٹس میں ڈیوڈ کے فلیٹ نمبر کا نہایت چابک دستی سے اضافہ کر دیا تھا۔ یہ بس صرف ایک احتیاط تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ کسی قسم کی تصدیق کی نوبت بھی ضرور ہی آتی۔ حسب پروگرام اس کے ساتھ آئے آدمیوں میں سے دو ڈیوڈ کے اپارٹمنٹ سے ایک فلور نیچے والے اپارٹمنٹ میں رک گئے اور خود وہ دو آدمیوں کے ساتھ اوپر چڑھ گیا۔ ڈیوڈ کے اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجاتے ہوئے اس کا دل اس کی کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا لیکن ظاہری طور پر اس نے خود کو بالکل پُرسکون رکھا تھا۔

"کون ہے؟" گھنٹی کے جواب میں دروازہ کھولے بغیر اندر سے دریافت کیا گیا۔

"فیومیگیشن ٹیم سر! آپ کے اپارٹمنٹ کے کچن میں ایک کاکروچ کی موجودگی کی اطلاع دی گئی ہے۔" شہریار نے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ اپارٹمنٹ کے دروازے پر اس انداز سے کھڑا ہو کہ ڈور آئی سے دیکھنے والے کو اس کا یونیفارم واضح طور پر دکھائی دے۔

"ہم نے ایسی کوئی کمپلین نہیں کی۔ تم یقیناً غلط جگہ آ گئے ہو۔" اندر سے سخت لہجے میں جواب دیا گیا۔

"ہم نوٹس بورڈ سے ایڈریس نوٹ کر کے یہاں آئے ہیں سر! اگر آپ اس وقت ہماری خدمات نہیں چاہتے تو پلیز اس پیپر پر دستخط کر کے دے دیں تاکہ ہم دفتر واپس جا کر رپورٹ کر سکیں۔" اندر موجود لوگ اس کے لیے سخت قابلِ نفرت تھے لیکن اس نے اپنے لہجے میں اس نفرت کی جھلک نہیں آنے دی اور ایک معمولی ملازم ہی کی طرح

مہذب انداز میں بات کرتا رہا۔

’’اوکے۔‘‘ اندر موجود شخص نے گویا ہتھیار ڈال دیے اور دستخط کرنے کے لیے دروازہ کھولا۔ شہریار نے ایک ہی نظر میں اس کے حلیے سے پہچان لیا کہ وہ ڈیوڈ نہیں ہے کیونکہ ڈیوڈ کا کوئی اور حلیہ اسے بتایا گیا تھا۔ اس آدمی کے لیے اپنی تمام تر احتیاط پسندی کے باوجود یہ امر یقیناً باعثِ حیرانی ہی رہا ہوگا کہ دستخط کے لیے نوٹ پیڈ اور قلم آگے بڑھاتے شخص نے یک دم ہی اس کے منہ پر ایک زوردار گھونسا دے مارا تھا لیکن اس نے اس حیرانی اور گھونسے دونوں سے خود کو تیزی سے سنبھال لیا مگر یہ مستعدی کسی کام نہیں آئی کیونکہ شہریار کے تقریباً ساتھ ساتھ کھڑے شخص نے بہت تیزی سے کرنٹ لگانے والے آلے کا استعمال کیا تھا۔ کرنٹ اتنا زوردار تھا کہ وہ شخص بُری طرح تڑپا اور پھر نیچے گر کر فوراً ہی بے حس و حرکت ہوگیا۔

’’کیا ہوا اسمتھ؟‘‘ گرنے کی آواز یقیناً اندر گئی تھی اس لیے کسی نے بلند آواز میں پوچھا۔ اسمتھ جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا لیکن وہ تینوں دندناتے ہوئے اندر گھس گئے۔ سب سے آگے شہریار تھا۔ اگر اس نے خود کو بروقت دائیں جانب اچھال نہ دیا ہوتا تو یقیناً اس بے آواز گولی کا نشانہ بن جاتا جو اندر سے اس پر چلائی گئی تھی۔ اس کے پیچھے آنے والے دونوں افراد البتہ اتنی مستعدی کا ثبوت نہیں دے سکے اور گولی نے عین شہریار کے پیچھے موجود شخص کے شانے کو نشانہ بنا لیا۔ اس شخص نے ہلکی سی کراہ کے ساتھ اپنے مجروح بازو کو تھام لیا لیکن اس کے ساتھی نے اس کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے پھرتی سے فلیٹ کے دروازے کو بند کرنے کو ترجیح دی۔ اس دوران میں کرنٹ کھا کر بے بس ہونے والے کے جسم میں حرکت پیدا ہوچکی تھی اس لیے اسے فوری طور پر اس کی طرف توجہ دینی پڑی۔ اس ساری کارروائی سے پہلے شہریار اس طرف دوڑ پڑا تھا جہاں سے ان پر گولی چلائی گئی تھی۔ گولی چلانے والے کی اس نے صرف ایک جھلک دیکھی تھی اور پر یقین تھا کہ وہ ڈیوڈ ہی ہے۔ وہ اندرونی کمرے میں تھا اور گولی چلانے کے بعد شاید کمرے کا دروازہ بند کرلینا چاہتا تھا لیکن شہریار نے دو قدم دوڑ کر ہی ایک لمبی چھلانگ لگائی اور اس کے دونوں پیر اس قوت سے بند ہوتے دروازے پر پڑے کہ دروازہ پورا کا پورا کھل گیا اور خود شہریار اڑتا ہوا کمرے کے وسط میں جا کر گرا۔ گرتے ہی وہ اسپرنگ کی طرح اچھلا اور یوں ایک بار پھر گولی کا نشانہ بننے سے بچ گیا۔ ڈیوڈ نے جھنجلا کر تیسری گولی چلانے کے لیے اپنے پسٹل کا رخ بدلا لیکن عین اسی لمحے شہریار نے اپنی جیب سے ایک گول سی چیز نکال کر اس کی طرف اچھال دی۔ وہ گول شے بہت سے کاغذ لپیٹ کر بنائی گئی ایک گیند کے سوا کچھ نہیں تھی لیکن ظاہر ہے ڈیوڈ کو اس پر کسی خطرناک شے کا ہی گمان ہوا ہوگا، سو اس نے خود کو بچانے کے لیے تیزی سے اپنی پوزیشن تبدیل کی۔ حرکت کرنے کی وجہ سے اس کا نشانہ خود بخود بہک گیا۔

شہریار نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور قریب پڑی ایک تپائی کو اس کی طرف اچھال دیا۔ تپائی کی ضرب لگنے سے ڈیوڈ کے ہاتھ سے پسٹل نکل گیا۔ شہریار نے فوراً ہی اس کی طرف چھلانگ لگائی لیکن ڈیوڈ کسی چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر دوسری طرف نکل گیا اور وہیں سے لات چلا کر شہریار کے چہرے کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ شہریار نے اپنا سر جھکا کر پہلو بدلا پھر بھی اس کا بازو زد میں آگیا۔ بازو پر لگنے والی ہتھوڑے جیسی ضرب نے اسے بتایا کہ اگر یہی ضرب منہ پر لگ جاتی تو اس کے جبڑے سمیت کئی دانت ٹوٹ جاتے۔ کچھ دیر تک وہ دونوں یونہی پینترے بدل بدل کر ایک دوسرے پر وار کرتے رہے لیکن باہر موجود شہریار کے ساتھیوں کی مداخلت سے جلد ہی یہ معاملہ نمٹ گیا۔ ڈیوڈ کے ساتھی کے مکمل طور پر ایکٹیو ہونے سے پہلے ہی انہوں نے اسے باندھ کر ڈال دیا تھا اور اب ڈیوڈ بھی اس کرنٹ لگانے والے آلے کی زد میں آگیا تھا جس نے اس کے ساتھی کو نشانہ بنایا تھا۔ شہریار نے اس مداخلت پر کوئی تعرض نہیں کیا کیونکہ یہاں وہ خود کو ڈیوڈ کے مقابلے میں بہادر ثابت کرنے نہیں بلکہ اس سے نمٹنے آیا تھا۔ ڈیوڈ کو بھی اس کے ساتھی ہی کی طرح باندھ دیا گیا۔

’’تم جا کر باقی اپارٹمنٹس کا کام نمٹاؤ۔ میں ان سے نمٹتا ہوں۔‘‘ شہریار نے اپنے اس ساتھی کو حکم دیا جو بالکل ٹھیک تھا۔ یہ احتیاط صرف اس لیے تھی کہ کہیں فیومیگیشن ٹیم کے کسی ایک اپارٹمنٹ تک محدود رہنے پر کوئی مشکوک نہ ہو جائے۔ زخمی کو البتہ وہاں روکے رکھنا ہی مناسب تھا۔ وہ خاصا جی دار آدمی تھا۔ زخم پر آستین کے اوپر سے ہی پیپر ٹیپ لپیٹ کر خون روکنے کا کچھ نہ کچھ بندوبست کرلیا تھا اور ایک بار پھر پورے حوصلے سے کھڑا ہوگیا تھا۔

’’کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟‘‘ ڈیوڈ جو نہی کرنٹ کے اثر سے نکلا، بندھا ہوا ہونے کے باوجود خوف ناک لہجے میں پوچھنے لگا۔

’’تعارف کی رسم نبھانے کا وقت نہیں ہے ہمارے

پاس۔ مجھے جلد از جلد تم سے اپنے کچھ سوالوں کے جواب چاہئیں۔ تاخیر اور پس و پیش کا نتیجہ خود تمہارے لیے بہت بھیانک ہوگا۔‘‘ اس کے سوال کو خاطر میں لائے بغیر شہریار نے اسے دھمکی دی تو اس نے جواباً یوں سر جھٹکا جیسے مکھی اڑا رہا ہو۔ وہ موساد کا ٹاپ ایجنٹ تھا اور یقینی طور پر اتنی آسانی سے کسی کی دھمکیوں میں نہیں آسکتا تھا۔ اس نے خود کو اس حیرت سے بھی سنبھال لیا تھا جو اسے ان کے یوں اپارٹمنٹ میں گھس آنے سے ہوئی تھی۔ اپنے طور پر وہ یہاں ایک عام شہری کی حیثیت سے رہتا تھا اس لیے غیر معمولی حفاظتی انتظامات بھی نہیں کر رکھے تھے۔ ایسے انتظامات خود اپنی جگہ لوگوں کو چونکانے کا باعث ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی تھا کہ اس اپارٹمنٹ کو وہ صرف ذاتی رہائش گاہ کے طور پر ہی استعمال کرتا تھا۔ اس جگہ کا علم بھی بس اس کے دو چار خاص ماتحتوں ہی کو تھا۔ پھر نہ جانے یہ کون تھے جو اس طرح یہاں گھس آئے تھے۔

’’ماہ بانو کو یہاں سے جانے سے روکنے کی خاطر تم نے کیا پلاننگ کی ہے؟‘‘ اس کی بے نیازی اور بے پروائی کو خاطر میں لائے بغیر شہریار نے اس سے پوچھا۔

’’اوہ... تو تم اس لڑکی کے چکر میں یہاں آئے ہو؟‘‘ ڈیوڈ نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

’’مجھے اپنے سوال کے جواب کے سوا کچھ نہیں سننا ہے۔‘‘ شہریار نے غرا کر اسے تنبیہ کی۔

’’تو سن لو کہ وہ لڑکی اور اس کا بچہ کسی طور زندہ یہاں سے واپس نہیں جاسکتے۔‘‘ ڈیوڈ نے چڑانے والے لہجے میں اسے جواب دیا۔

’’کیا ہوسکتا ہے اور کیا نہیں، یہ تو تم ابھی تھوڑی دیر میں ہی جان لوگے۔‘‘ شہریار نے اس سے کہا اور نیچے پڑی کاغذ کی موٹی سی بال اٹھا کر پہلے اسے ڈیوڈ کے منہ میں ٹھونسا اور پھر اوپر سے پیپر ٹیپ لگا دیا۔ ردِعمل میں ڈیوڈ کی آنکھوں سے حیرت چھلکی۔ وہ اس سے کچھ جاننا چاہتا تھا اور اس کے منہ پر ٹیپ لگا کر آواز کے اخراج کا راستہ ہی بند کر دیا تھا لیکن اس حیرت سے اسے بس چند سیکنڈ کے لیے ہی دوچار ہونا پڑا۔ شہریار نے اپنے سامان میں سے چھوٹی سی دستی ڈرل مشین نکالی اور اس کا بٹن آن کر کے اسے ڈیوڈ کی ناک پر بائیں جانب اس طرح رکھ دیا کہ ڈرل مشین بائیں سے دائیں نتھنے کو چھیدتی چلی گئی۔ ناک میں بننے والے ان بڑے بڑے سوراخوں سے خون نکل کر تیزی سے بہنے لگا اور ڈیوڈ کا جسم بھی اکڑ گیا تاہم اس نے ایسا کوئی اشارہ نہ کیا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ کچھ بتانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

شہریار نے بھی اپنا سوال نہیں دہرایا اور ناک کے بعد باری باری دونوں کانوں کی لو چھید ڈالی۔ اس کے بعد دونوں رخساروں کی باری آئی۔ ڈیوڈ کا جسم تکلیف سے جھٹکے کھانے لگا لیکن اس نے سپر نہیں ڈالی۔ فرش پر بندھا پڑا اس کا ساتھی پھیلی ہوئی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اگر اس کے منہ کو بھی ٹیپ لگا کر بند نہ کیا گیا ہوتا تو اس وقت یقیناً وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہا ہوتا۔

’’میں تمہارے جسم کو کسی چھتے کی طرح چھید ڈالوں گا لیکن یقین جانو کہ میرے سوال کا جواب دیے بغیر تمہیں موت بھی نہیں آئے گی۔‘‘ اب وہ ڈیوڈ کی ٹھوڑی اور گردن کے ملاپ کی جگہ پر کھال کو چٹکی سے کھینچ کر ڈرل مشین سے وہاں مشقِ ستم ڈھا رہا تھا۔ اس کے انداز میں مکمل سفاکی تھی کیونکہ سامنے ایک ایسا شخص تھا جس نے اس کے وطن میں وہ تربیتی کیمپ قائم کیے تھے جہاں معصوم نوجوانوں کی برین واشنگ کر کے انہیں اس حد پر لے جایا جاتا تھا کہ وہ خود اپنے جسم سے بم باندھ کر خود کو اور دوسرے کئی بے گناہوں کو چیتھڑوں کی طرح اڑا دیتے تھے۔ آج اگر وہ اس شخص کے جسم کا ایک ایک ریشہ بھی الگ کر دیتا تو ان بے شمار جانوں کا ازالہ نہ ہو پاتا جو اس شخص کی وجہ سے گئی تھیں۔

’’سر... سر... میرے خیال میں آپ اسے چھوڑ کر اس شخص پر ٹرائی کریں۔‘‘ زخموں کی تاب نہ لا کر ڈیوڈ... بے ہوش ہوگیا تو اس کے ساتھی نے اسے جھنجوڑتے ہوئے اس کی توجہ دوسرے شخص کی طرف مبذول کرائی۔ ڈیوڈ کے حال پر وہ جتنا خوف زدہ نظر آرہا تھا، اس سے ظاہر تھا کہ وہ نسبتاً آسان ہدف ثابت ہوگا۔ یہ اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ ڈرل مشین کے کیے ایک ہی چھید نے اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے جو تفصیلات بتائیں، اس کے مطابق وہ خود بھی ڈیوڈ کی اصل حیثیت سے واقف نہیں تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ ڈیوڈ سی آئی اے کا ایجنٹ ہے جو امریکی مفادات کے لیے کام کرتا ہے۔ اس نے ہارلم سے ائرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے اس مقام کی نشاندہی کر دی جہاں ماہ بانو کو نشانہ بنانے کی کوشش کی جاتی۔ اسے جو سمجھایا گیا تھا، اس کے مطابق امریکا پاکستان سے ہامی بھر لینے کے باوجود خود ماہ بانو کو پاکستان واپس نہیں بھیجنا چاہتا تھا اس لیے یہ منصوبہ تشکیل دیا گیا تھا۔ پہلے مقام پر ناکامی کی صورت میں انہوں نے ایک سیکنڈ پلان بھی بنا رکھا تھا۔

شہریار ہونٹ بھینچے سب سنتا رہا۔ ڈیوڈ بھی اس دوران

خودبخود ہوش میں آگیا اور اپنی جگہ بندھے بندھے بُری طرح مچلتا رہا تھا کہ کسی طرح اپنے ساتھی کی زبان روک لے لیکن وہ شخص اس سے نظر چرا گیا۔ وہ امریکی تھا اور دھوکے میں موساد کے مفادات کے لیے کام کرتا رہا تھا۔ یقیناً وہ یہ بھی سمجھتا ہوگا کہ جب ایک ایجنٹ اس طرح کے حالات میں کسی مخالف کی گرفت میں آتا ہے تو یقینی موت سے دوچار ہوتا ہے۔ اس نے اس وقت اپنی اس یقینی موت کو اذیت ناک موت میں تبدیل ہونے سے بچایا تھا۔ اس کی اس سمجھداری کے بدلے میں شہریار نے بچ اسے آسان موت عنایت کی اور ڈیوڈ کے پسٹل سے ایک گولی اس کے بھیجے میں اس طرح اتاری کہ وہ بغیر آواز نکالے بالکل خاموشی سے ختم ہوگیا۔ اب پسٹل کا رخ ڈیوڈ کی طرف تھا۔

"تجھ جیسے مکروہ شخص کو گولی کی آسان موت دینے کو دل تو نہیں چاہتا لیکن افسوس کہ میرے پاس وقت زیادہ نہیں ہے اور میں تجھ جیسے موذی کو زندہ چھوڑنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔" اس نے لگاتار دو گولیاں اس کی دونوں آنکھوں میں دے ماریں۔ ڈرل مشین والی کارروائی نے پہلے ہی اس کا چہرہ بھیانک کر دیا تھا، آنکھوں کی جگہ دو خون اگلتے گڑھے بنے تو خوفناکی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ گولیاں آنکھوں سے داخل ہونے کے بعد اس کا کاسۂ سر توڑتی ہوئی باہر نکلی تھیں اس لیے اس کے زندہ بچ جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے پسٹل کو اس کی لاش کے قریب پھینک کر باہر نکلتے شہریار کو کم از کم اتنا اطمینان ضرور ہوگیا تھا کہ ڈیوڈ کی لاش کو دیکھنے والے عبرت حاصل کریں گے کیونکہ اس کی لاش واقعی نشانِ عبرت بن گئی تھی اور قاتلوں تک رسائی اتنی آسان نہیں تھی کیونکہ وہ پورے انتظام سے آئے تھے۔ ان کے ہاتھ دستانوں میں چھپے تھے اور چہروں پر میک اپ کی تہیں تھیں۔ وہ اس بلڈنگ سے نکلنے کے بعد اپنے وجود پر موجود ایک ایک شے کو تلف کر دیتے اور اطمینان سے اس فلائٹ سے روانہ ہو جاتے جس میں پہلے ہی ان کے لیے سیٹیں بک تھیں۔ بعد میں کسی طور پاکستان کی طرف اشارہ کیا بھی جاتا تو وہاں کون تھا جو ان تک رسائی دیتا۔ وہ ان چند محبِ وطن لوگوں کی پناہ میں پہنچ جاتے جو پاکستان کی سالمیت کے لیے ان کی اور ان جیسوں کی بقا کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ویسے بھی امریکا سے جس طور ان کے معاملات طے پائے تھے، اس سے یہ واضح تھا کہ اپنے بہت ہی لاڈلے اسرائیل کی سازشوں اور بدمعاشیوں سے صرفِ نظر کرنے کی پالیسی کے باوجود وہ کچھ نہ کچھ تو پاکستان کا بھی خیال کرے گا ہی کہ ابھی اسے خطے میں پاکستان کی ضرورت بہرحال تھی۔

☆☆☆

"السلام علیکم۔" جہاز اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا کہ ماہ بانو نے کسی کو اپنے برابر میں بیٹھتے محسوس کیا لیکن متوجہ نہیں ہوئی کہ یہی خیال گزرا تھا کہ واش روم کے لیے جانے والا مشابرم خان واپس لوٹ آیا ہے۔ لیکن مخصوص لب و لہجہ میں کیے گئے سلام نے اسے چونکا دیا اور وہ ایک جھٹکے سے سلام کرنے والے کی طرف مڑی۔ مڑتے ہی اسے مایوسی کا سامنا ہوا۔ لب و لہجہ بے شک وہی تھا جو اس کے دل پر نقش تھا لیکن سامنے موجود صورت اجنبی تھی۔

"کیا آپ کے ہاں سلام کا جواب دینے کا رواج نہیں ہے؟" اس کی حیرت کو دیکھ کر اجنبی نے دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا لیکن اس وقت لب و لہجہ بالکل مختلف تھا۔ ماہ بانو الجھن میں پڑ گئی اور اسے لگا کہ پہلے اس نے جو سنا، وہ یقیناً اس کا واہمہ تھا۔ بھلا وہ آواز اسے دوبارہ کیسے سنائی دے سکتی تھی کہ اپنے دل کی تمام تر بے یقینی کے باوجود وہ اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتی تھی کہ شہریار عادل اب اس دنیا کے ہنگاموں میں شامل نہیں رہا ہے۔

"مجھے عادل خان کہتے ہیں۔ پاکستانی ہوں اور اس حوالے سے آپ سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور بنتا ہے۔" اس کی خاموشی کی پروا کیے بغیر وہ اپنی ہی رو میں بولتا جا رہا تھا۔

"معاف کیجیے گا، میں اجنبیوں سے اس طرح بے تکلف ہونا پسند نہیں کرتی۔" آخر ماہ بانو کو اسے ٹوکنا پڑا۔

"اجنبی کون؟ میں نے آپ سے اپنا تعارف کروا دیا۔ آپ بھی اپنا تعارف کروا دیں تو ساری اجنبیت ختم ہو جائے گی۔" اسے ماہ بانو کو چھیڑنے میں مزہ آ رہا تھا۔

"شاید آپ میری بات سمجھ نہیں رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میرے بھائی واپس آجائیں، بہتر ہوگا کہ آپ یہاں سے اٹھ کر اپنی سیٹ پر واپس چلے جائیں۔" اس بار اس نے پہلے کی نسبت ذرا زیادہ سخت لہجے میں جواب دیا۔

"اف، یہ ہماری پاکستانی خواتین۔ کہیں بھی ہوں، بھائیوں کی تڑی دینا نہیں بھولتیں۔ ٹھیک ہے خاتون، میں واپس چلا جاتا ہوں۔ مجھے تو بس آپ کی یہ چادر کھینچ لائی تھی۔ بہت خوب صورت ہے... آپ نے کہاں سے خریدی تھی؟" اس نے ماہ بانو کے جسم پر موجود نیلے پھولوں والی کالی چادر کی طرف اشارہ کیا تو ماہ بانو کھو سی گئی۔ یہ چادر تو شہریار نے بشام ہوٹل میں اسے خرید کر دی تھی اور جب سے اب تک کسی نہ کسی طرح وہ اس کے پاس محفوظ ہی تھی۔

اب بھی مصطفیٰ خان نے اپنے گھر میں موجود اس کی ضرورت کا سامان ہارلم بھجوایا تھا تو اس میں سے یہ چادر نکل آئی تھی اور اس نے بے ساختہ ہی واپسی کا سفر کرتے ہوئے اس چادر کو اپنے گرد لپیٹ لیا تھا اور اب یہ اجنبی جس کے پاس سے بڑی شناسا سی خوشبو آ رہی تھی، اس سے اس چادر کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

"یہ میں نے خریدی نہیں تھی بلکہ ایک بہت ہی عزیز ہستی نے مجھے تحفتاً عنایت کی تھی۔" وہ جو ابھی بہت سختی سے بات کر رہی تھی، چادر کے پھولوں پر نرمی سے ہاتھ پھیرتی بڑے دل گداز لہجے میں بتانے لگی۔ دیکھنے والی نظریں صاف محسوس کر سکتی تھیں کہ اس نے پھولوں کو اتنی ہی نرمی سے چھوا تھا جتنی نرمی سے وہ اپنی گود میں موجود پھول سے بچے کو تھامے ہوئے تھی۔

"جو آپ کو عزیز ہے اس کے خوش قسمت ہونے میں یقیناً کوئی کلام نہیں ہے۔" وہ آہستہ سے بول کر اس کے برابر سے اٹھ گیا۔ کھوئی کھوئی سی ماہ بانو چونکی تو مشابرم خان واپس آکر سیٹ سنبھال رہا تھا۔

"کیا کہہ رہا تھا یہ شخص؟" اس نے ماہ بانو سے پوچھا۔

"کچھ نہیں، بس مجاہد کو پیار کر رہا تھا۔" نہ جانے کیوں وہ مشابرم خان سے سچائی چھپا گئی۔ اس پردہ پوشی کے پیچھے وہ شناسا سا احساس ہی تھا جو اسے کسی کی یاد دلاتا تھا۔ اس کی زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ وہ شہریار عادل کی مدد کے بغیر مشکل سے نکل آئی تھی۔ اسے ائرپورٹ تک پہنچانے کی ذمے داری سنبھالنے والے جان اور کارلوس نے اچانک ہی پروگرام میں تبدیلی کر دی تھی۔ اسے اور مشابرم خان کو طے شدہ وقت سے بہت پہلے ائرپورٹ کے لیے روانہ کر دیا گیا تھا اور حیرت انگیز طور پر انہوں نے یہ راستہ پہلے بس اور پھر ٹیکسی میں طے کیا تھا۔ اگر اس عرصے میں کوئی حفاظت کے لیے ان کے آس پاس رہا تھا تو انہیں خبر نہیں ہو سکی تھی۔ لیکن بورڈنگ کارڈ لینے کے بعد اندر لاؤنج میں بیٹھ کر خبریں دیکھتے ہوئے پروگرام کی تبدیلی کی وجہ ضرور معلوم ہو گئی تھی۔ جس گاڑی میں انہیں ائرپورٹ جانا تھا، اس گاڑی پر راستے میں حملہ ہوا تھا۔ خبروں میں تو ظاہر ہے اس حوالے سے کوئی تفصیل نہیں تھی لیکن اس نے اور مشابرم خان نے کارلوس کی گاڑی کے علاوہ گاڑی کے اردگرد نظر آتے اس کے ساتھیوں کو شناخت کر لیا تھا اور اس کے بعد جہاز میں سوار ہونے تک بھی وہ دہلتے ہی رہے تھے کہ جانے کب ایک اور قاتلانہ حملہ کر دیا جاتا ہے... لیکن خیر گزری اور ایسا کچھ نہیں ہوا۔ کئی گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد آہستہ آہستہ دل سے اندیشے بھی مٹنے لگے لیکن پھر جانے کیوں یہ عادل خان موقع دیکھ کر اس سے بات کرنے چلا آیا۔ وہ جو پُرسکون ہو چلی تھی، اس کے اپنے پاس آکر جانے کے بعد ایک پل بھی چین سے نہ بیٹھ سکی۔ کچھ تھا جو دل کو کھینچتا تھا۔ کوئی ایسا احساس جو روح میں چٹکیاں لیتا تھا اور جسم و جاں کو ہلا ہلا دیتا تھا... اور وہ جس نے اس کے اندر یہ تلاطم پیدا کیا تھا، خود اپنی سیٹ پر آنکھیں موندے سکون سے سو رہا تھا۔ باقی راستہ خود سے لڑتے جھگڑتے، اندر ہی اندر سسکتے بلکتے کیسے طے ہوا، یہ وہ خود ہی جانتی تھی۔ مشابرم خان بے چارہ تو بس بار بار پوچھ کر ہی رہ گیا کہ اسے کیا ہوا ہے اور وہ کچھ بولتی کیوں نہیں ہے؟ وہ بھلا اسے کیا جواب دیتی کہ آج عرصے بعد اسے کسی کے لہجے پر شہریار کے لہجے کا گمان ہوا ہے اور کسی کی خوشبو میں شہریار کی مہک محسوس ہوئی ہے۔ ایسی پاگل پن کی بات کسی سے کہنا تو دور، وہ خود سے بھی چھپانا چاہتی تھی لیکن اس کوشش میں ناکام ہو کر نڈھال ہوئی جا رہی تھی۔ بے حد طویل تھکا دینے والا سفر تمام ہوا تو وہ جہاز میں سوار ہر شخص کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ تھکی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کا انگ انگ درد سے بھر گیا تھا۔

مشابرم خان کے پیچھے چلتی وہ نہ جانے کیسے خود کو گھسیٹتی رہی اور امیگریشن کی کارروائی سے نمٹ کر باہر نکلی۔ مشابرم خان اسے ایک گاڑی میں بٹھا کر خود نہ جانے کہاں چلا گیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کو نہ پہچانتی تو بہت گھبراتی۔ اسلم سے اپنے نکاح والے روز اس نے اس شخص کو دیکھا تھا۔ اسے اس شخص کا نام یاد نہیں آ رہا تھا لیکن بہرحال اتنا ضرور یاد تھا کہ اس شخص سے شہریار نے اپنے دوست کی حیثیت سے تعارف کروایا تھا۔ اس کے گاڑی میں بیٹھنے پر اس شخص نے اس سے سلام دعا کی اور خیر خیریت پوچھ کر چپ ہو گیا۔ ماہ بانو بھی زیادہ کچھ کہے بغیر ننھے مجاہد کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ذہنی و قلبی کیفیت ہی کچھ ایسی ہو رہی تھی کہ کسی سے زیادہ بولنے کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ اسی بے توجہی کے عالم میں کوئی دوسری طرف کا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھا اور فوراً ہی گاڑی حرکت میں آ گئی۔ اس نے اپنے برابر میں بیٹھنے والے شخص کو دیکھا تو کانپ اٹھی۔ یہ تو وہی عادل خان تھا جو اسے جہاز میں بھی ملا تھا۔

"کیسی ہو ماہ؟ کیا مجھے پہچانا نہیں؟" اس کی طرف دیکھ کر وہ مسکراتا ہوا بولا تو اسے غش آ گیا۔ شک و شبے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی۔ عادل خان، اصل میں شہریار

عادل تھا۔ وہ پورے اطمینان سے بے ہوش ہو گئی کہ سنبھالنے والا پاس ہی موجود تھا۔

☆☆☆

”مجاہد بہت ذہین بچہ ہے میڈم! یہ فوراً ہر بات سمجھ لیتا ہے۔ یہاں ہمارے پاس اس جیسے جتنے بھی بچے ہیں، ان میں مجاہد سب سے زیادہ ذہین ہے۔“ وہ نم ہوتی آنکھوں سے مجاہد کی ٹیچر کی باتیں سن رہی تھی اور اس کی نظریں مسلسل ڈھائی سالہ مجاہد پر ٹکی ہوئی تھیں جو بڑے انہماک سے اپنے سامنے رکھے رنگ برنگے بلاکس سے کچھ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ کام نہیں کرتا تھا اس لیے اس کے لیے یہ کام قدرے دشوار تھا لیکن پھر بھی وہ اچھی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک حوصلہ مند بچہ تھا جس کا دماغ بھی عام بچوں سے کچھ پیچھے تھا لیکن ورثے میں ملی حوصلہ مندی اسے بھی کسی کام سے پیچھے نہیں ہٹنے دیتی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ دنیا میں آنے سے بھی پہلے ماں کی کوکھ سے یہ سبق سیکھتا چلا آ رہا تھا۔

اس کی حوصلہ مند ماں نے اپنے اس بچے کی معذوری کو اپنی جان کا روگ نہیں بنایا تھا بلکہ اپنے بہت ہی چاہنے والے شوہر سے فرمائش کر کے اسپیشل بچوں کے لیے جدید خطوط پر کام کرنے والے اس اسکول کی بنیاد رکھ کر مجاہد جیسے بہت سے بچوں کے لیے آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ ان دونوں میاں بیوی کی روحوں کے تال میل آپس میں اتنے ملتے تھے کہ ایک کے لیے دوسرے کی بات حکم کا درجہ اختیار کر لیتی تھی۔ لیکن یہ حکم ایسا ہوتا تھا جس کی تعمیل بوجھ محسوس ہونے کے بجائے روح کو سرشاری عطا کر دیتی تھیں۔ انہوں نے بڑی لمبی ہجر کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک دوسرے کو پایا تھا سو ایک دوسرے کے قدردان بھی اسی حساب سے تھے۔

ایک دوجے کی سنگت میں رہ کر وہ بنا کہے بھی ایک دوسرے کی خوشی کا سامان کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ ایک کی خواہش دوسرے کی خوشی ہوتی تھی۔ شہریار نے صرف اسے ہی نہیں، اس کے بچے کو بھی پوری طرح اپنایا تھا بلکہ کبھی کبھی تو اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ شہریار اس سے بھی بڑھ کر مجاہد کو چاہتا ہے۔ شہریار کا ہاتھ تھام کر وہ اسلم کی روح سے کبھی شرمندہ نہیں ہوئی تھی بلکہ اسے یقین تھا کہ اسلم بھی اسے شہریار کے ساتھ دیکھ کر اوپر کہیں خوش ہوتا ہوگا کہ وہ ایک ایسی خوش قسمت عورت تھی جس کے دونوں چاہنے والوں نے اسے پانے سے زیادہ اس کی خوشی کو مقدم جانا تھا۔ اسلم نے اسے خوش رکھنے کی پوری کوشش کی تھی اور شہریار کے ساتھ وہ خوش تھی کہ پہلی محبت کو پالینا شاید دنیا کا سب سے خوش گوار تجربہ ہوتا ہے۔ شہریار نے اس کو اتنے مان کے ساتھ اپنایا تھا کہ اپنی ذات کا ہر راز اس کے ساتھ شیئر کر ڈالا تھا۔ (ملکی سالمیت کے رازوں کی بات البتہ مختلف تھی)۔

”واہ جناب! کیا عیش ہیں۔ محترمہ یہاں بیٹے کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہیں اور اس آفت کی پرکالہ کو میرے ذمے لگا دیا ہے۔ مجال ہے جو یہ شہزادی ایک منٹ کے لیے بھی ٹک کر بیٹھی ہو۔“ وہ ابھی وہاں سے پلٹنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ شہریار سوا سالہ عائشہ کو گود میں اٹھائے وہاں چلا آیا اور اس سے شکایت کی۔

”میں کیا کر سکتی ہوں۔ آپ کی بیٹی آپ پر ہی گئی ہے۔ آپ بھی تو مشکل ہی سے کہیں ٹک کر بیٹھتے ہیں۔“ عائشہ کو شہریار کی گود سے لیتے ہوئے اس نے شوخ لہجے میں جواب دیا تو شہریار بس مسکرا کر رہ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ماہ بانو نے اسے کس حوالے سے چھیڑا ہے۔

ماہ بانو سے شادی کے بعد اس نے اپنی زندگی کا بہت اچھا سیٹ اپ بنا لیا تھا۔ وہ لاہور جیسے بڑے شہر کو چھوڑ کر ایک چھوٹے شہر میں منتقل ہو گیا تھا اور یہاں اپنے ذاتی وسائل سے اسکول اور چھوٹے سے جدید اسپتال کے قیام کے علاوہ بھی زندگی کی دیگر سہولیات فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس نے اپنے لیے یہاں ایک جنت بسالی تھی لیکن اس جنت میں بھی وہ ٹک کر نہیں بیٹھتا تھا۔ سی ایف پی سے اس کی وابستگی اتنی گہری تھی کہ جب بھی اس طرف سے پکارا جاتا، وہ فوراً لبیک کہتا ہوا دوڑ پڑتا۔ ماہ بانو نے اسے کبھی بھی جانے سے نہیں روکا تھا کہ جانتی تھی کہ وہ رک گیا تو محض بے روح جسم بن کر رہ جائے گا۔ مذاق میں کچھ کہہ دینا الگ بات لیکن وہ کبھی شہریار کو اس کے مقصدِ حیات سے دور کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

”ماموں جان اور ممانی جان آ رہے ہیں۔“ وہ اس کے ساتھ چلتی باہر کی طرف بڑھی تو اس نے بتایا۔

”کب تک پہنچیں گے؟“ اس نے خوش دلی سے پوچھا۔ خود اس کے سارے رشتے تو تقریباً ختم ہو گئے تھے۔ جو بچے تھے انہیں بھی اس نے شہریار کی پرائیویسی کے خیال سے اپنے قریب لانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ البتہ اتنا اطمینان ضرور کر لیا تھا کہ پیرآباد کا موجودہ حاکم مراد شاہ ان کی خبر گیری کرتا رہتا ہے۔ اب وہ شہریار کے خاندان کو ہی اپنا سب کچھ تصور کرتی تھی۔

”دوپہر کے کھانے تک پہنچ جائیں گے۔“ شہریار کے مزے سے دیے گئے جواب پر اس کی چیخ نکل گئی۔

”کیا... دوپہر کے کھانے پر اور آپ مجھے اب پونے ایک بجے اطلاع دے رہے ہیں... گھر سے کال نہیں کر سکتے تھے کیا؟“ خفگی کا اظہار کرتی وہ شہریار کو ہمیشہ سے زیادہ پیاری لگی۔

”کیوں خود کو ہلکان کرتی ہو یار! میں نے سارے انتظامات کروا دیے ہیں۔ بھلا میں اپنی اتنی پیاری بیوی کو اس کے سسرالیوں کے سامنے شرمندہ کروا سکتا ہوں کیا؟“ اس کے شانے پر اپنا ہاتھ پھیلاتے شہریار نے اسے خود سے قریب کیا۔

”شرمندگی کی بات نہیں۔ مجھے وہ لوگ آپ کے حوالے سے عزیز ہیں اس لیے مجھے خود ان کی خدمت کر کے خوشی ہوتی ہے۔“ اس نے نہایت سچائی سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

”میں جانتا ہوں اس لیے میں نے بہت سارے دنوں کے لیے انہیں یہاں بلوا لیا ہے۔ تم دل بھر کر ان کی خدمتیں کرنا۔“ بے پرواہ انداز میں کہہ کر وہ گاڑی اَن لاک کرنے لگا۔ پھر پہلے دروازہ کھول کر اسے بٹھایا، اس کے بعد خود گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔

”شہریار!“ اس کے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے قبل ماہ بانو نے اپنا نازک سا ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ پر رکھا۔

”ہوں۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

”آپ کہیں جا رہے ہیں نا؟“ بہت دھیمے سے بولتی وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ اس کی شریر بیٹی اس کے گلے پر لگے رنگ برنگے موتی نوچ نوچ کر پھینک رہی ہے۔

”تمہیں معلوم تو ہے یار پھر کیوں پوچھتی ہو؟“ اس نے گویا ماہ بانو سے نظریں چرائیں۔

”ادھر میری طرف دیکھیں۔“ اس نے شہریار کی ٹھوڑی کے نیچے اپنا ہاتھ رکھ کر اپنی طرف رخ کیا۔ اس نے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ گندمی رنگت پر گھور سیاہ آنکھیں کسی کو بھی ڈبو دینے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ وہ بھی ڈولنے لگا۔

”اس بار شاید مجھے کچھ زیادہ دن لگ جائیں۔ ماموں جان کو کاروباری معاملات دیکھنے کے لیے واپس لاہور جانا پڑے گا البتہ ممانی جان اور سلو مستقل یہیں رہیں گے۔ تم گھبرانا مت۔“ وہ اسے تسلیاں دینے لگا۔

”میں بالکل نہیں گھبراؤں گی۔ آپ بھی فکرمند مت ہوں۔ میں آپ کے واپس آنے تک یہاں سب سنبھال لوں گی۔“ آنسوؤں کو پیچھے دھکیلتی وہ اس کا حوصلہ بڑھاتی رہی اور جب مزید ضبط کا یارا نہ رہا تو اس کے سینے میں منہ چھپا لیا۔ یہ سینہ اس کی پناہ گاہ تھا اور اس سینے میں دھڑکتا دل اس کے نام کی مالا جپتا تھا لیکن کسی بھی انسان کا بس کسی ایک فرد سے ہی تو رشتہ نہیں ہوتا۔ اسے اور بھی بہت سے رشتے نبھانے ہوتے ہیں۔ شہریار کو بھی بار بار اپنی مٹی سے رشتہ نبھانے کے لیے اسے چھوڑ کر جانا پڑتا تھا کہ وہ جو جنگ لڑ رہا تھا، اس کا شاید کوئی انجام نہیں تھا۔ ڈیوڈ، پانڈے، ورما، گپتا اور ان جیسے لوگوں کو ختم کر دینے کے باوجود مزید کئی تھے جو ہر روز سر اٹھاتے رہتے تھے۔ لنڈا عرف ایملی پارکر کو تو وہ خود نیویارک میں زندہ چھوڑ کر آیا تھا۔ اب تک ہیروئن کے تاجروں الفا اور اس کے ساتھیوں سے بھی ٹاکرا نہ ہو سکا تھا۔ اتنے بہت سے دشمنوں کے ہوتے بھلا وہ کیسے ہتھیار ہاتھ سے رکھ سکتا تھا۔ ہاں زندگی نے بس اتنی مہربانی کر دی تھی کہ جب وہ تپتی دھوپ میں اپنا وجود جھلسا کر واپس لوٹتا تھا تو محبت کے شجر سایہ دار میں بیٹھنے کا موقع مل جاتا تھا۔

”آپ بے فکری سے اپنے مشن پر جائیں۔ میں یہاں آپ کی کامیابی کے لیے خوب دعا کروں گی۔“ وہ اپنے سینے میں چھپا ہونے کی وجہ سے اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن آنسوؤں کی اس نمی کو محسوس کر سکتا تھا جو اس کے گریبان کو بھگو رہی تھی۔ بے ساختہ ہی اس نے پوری قوت سے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا اور اس کے ماتھے اور بالوں پر بوسوں کی بوچھاڑ کرنے لگا۔ بے تاب دلوں کی یہ شدت اوپر والا بھی جانتا تھا، سو وہ کبھی انہیں دائمی جدائی کا عذاب دینے والا نہیں تھا۔ ہاں، اتنا ضرور تھا کہ ان کا شمار ان منتخب لوگوں میں ہوتا تھا جنہیں بطورِ خاص آزمائشوں کے لیے چنا جاتا ہے کیونکہ کم کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی ذات سے بڑھ کر ملک و قوم اور انسانیت کے لیے سوچتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی زندگی کی کہانی ”اور پھر وہ ہمیشہ سکھ سے خوشی سے ایک ساتھ رہنے لگے“ کے روایتی جملے پر ختم نہیں ہوتی۔ ایسی کہانیاں دکھ سکھ کی آمیزش کے ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ ماہ بانو اور شہریار عادل کی کہانی کو بھی ایسے ہی چلتے رہنا تھا۔

... گرداب سے ساحل اور ساحل سے گرداب تک کا سفر طے کرتے ہوئے لیکن اہم بات یہ تھی کہ انہیں یہ سفر طے کرنے کی ہمت و جرأت عنایت کی گئی تھی اور یہی عنایت ہی تو سب سے بڑی نعمت ہے۔

برگلر

سلیم انور

تحقیقات کرنے کے لیے ٹریننگ جیسے لوازمات ہی کافی نہیں ہوتے ... بعض اوقات زندگی کے تجربات وہ کچھ سکھادیتے ہیں ... جو بڑے بڑے ادارے دورانِ تدریس نہین سکھا سکتے ... ایک سادہ اور گھریلو زندگی بسر کرنے والی عورت کا دلچسپ کارنامہ۔

چوروں کی شناختی پریڈ کا مشکل معاملہ' نکتہ رس انجام کی دلچسپ کہانی

''کیا تم سیریس ہو؟'' کیرولین نے پوچھا۔ ''کوئی میرے گھر میں گھس آیا تھا؟''

شیرف لوسی نے سڑک پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے غور سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنی ماں کو اس قدر حیرت زدہ اس سے پہلے صرف اس وقت دیکھا تھا جب اس نے تعلیمی میدان میں اے گریڈ حاصل کیا تھا۔ ''تمہاری پڑوسن لیزلی نے اسے ڈرا کر بھگا دیا۔'' لوسی نے بتایا۔

پھر وہ اپنی ماں کو تیزی سے تفصیل بتانے لگی۔ ڈپٹی ایڈمیلون کے مطابق لیزلی نے کیرولین کے گھر کی کھڑکیوں میں سے ایک کھڑکی کے پیچھے کسی سائے کو حرکت کرتے دیکھا۔ پھر اس نے فون کے ساتھ اپنے آنجہانی شوہر کا اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور بھی اٹھا لیا۔ لیکن اتفاق سے ریوالور سے اس کے کچن کے فرش پر فائر ہوگیا۔ پھر لیزلی نے سفید ٹی شرٹ اور ہاتھوں میں دستانے پہنے ہوئے کسی شخص کی ایک جھلک سی دیکھی جو کیرولین کے داخلی دروازے سے تیزی سے نکل کر بھاگ گیا۔

لیزلی کا فون ملتے ہی پولیس ڈسپیچ نے لیزلی کی فون کال متعلقہ علاقے میں ریلے کردی۔ ڈپٹی ایڈمیلون اس وقت اسی علاقے میں موجود تھا۔ ایڈمیلون نے تیزی سے علاقے میں گشت شروع کیا اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے تین مشتبہ نوجوانوں کو حراست میں لینے کے بعد شیرف لوسی کو ریڈیو پر پیغام دیا اور مشتبہ نوجوانوں کو لے کر کیرولین کے گھر روانہ ہوگیا تاکہ لیزلی سے اس نوجوان کی شناخت کرا سکے جو کیرولین کے گھر میں گھسا تھا۔

ایڈمیلون کو ان نوجوانوں میں سے کسی کے پاس سے بھی نہ تو دستانے اور نہ ہی چوری کی کوئی شے ملی تھی۔ اس دوران میں لوسی نے اپنے کزن ملڈرڈ کی ناولٹی شاپ سے اپنی ماں کیرولین کو ساتھ لے لیا جہاں وہ ہر سنیچر کو اس کی مدد کے لیے جاتی تھی۔ دکان شہر کے وسطی کاروباری علاقے میں واقع تھی۔

جب شیرف لوسی اپنی ماں کے ہمراہ ٹریفک کی روانی میں اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی تو ڈپٹی ایڈمیلون نے ایک بار پھر ریڈیو پر اس سے رابطہ کیا اور اسے یہ بُری خبر سنائی کہ لیزلی یقینی طور پر کسی بھی نوجوان کو شناخت نہیں کر سکی ہے۔ وہ اس حد تک گھبرائی ہوئی ہے کہ اسے اس ریوالور کو بھی شناخت کرنے میں دشواری پیش آرہی ہے جس سے اس نے اتفاقی طور پر فائر کیا تھا اور گولی نے اس کے کچن کے فرش میں ایک سوراخ کردیا تھا۔

جب کیرولین اور لوسی وہاں پہنچے تو لیزلی اور ڈپٹی ایڈمیلون تینوں مشتبہ نوجوانوں کے ساتھ کیرولین کے گھر کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ ان پانچوں میں سے کوئی بھی خوش دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''تم نے اس چور کے ہاتھوں میں کس قسم کے دستانے دیکھے تھے؟'' کیرولین نے لیزلی سے پوچھا۔ لوسی ٹہلتے ہوئے بات کرنے کے لیے ایڈمیلون کے پاس چلی گئی۔

''باریک ربر ٹائپ کے۔ جیسے امریکن ٹی وی میڈیکل سیریز کے ڈرامے میں ہوتے ہیں۔''

کیرولین نے تیوریاں چڑھا لیں۔ ''تم نے یہ تو دیکھ لیا کہ اس نے ہلکے دستانے پہنے ہوئے ہیں لیکن اس کا چہرہ نہیں دیکھ پائیں؟''

''سوری۔'' لیزلی نے برا مناتے ہوئے کہا۔ ''اگلی مرتبہ میں اس سے انتظار کرنے کو کہوں گی تاکہ میں لپک کر اپنی دوربین لے آؤں۔''

لوسی نے اپنی ماں کو پاس آنے کا اشارہ کیا اور پھر وہ دونوں مکان کے اندر چلی گئیں۔ داخلی دروازے کی جالی کو کسی اوزار سے چیرنے کے بعد تالا زبردستی توڑا گیا تھا اور سامنے کے دونوں کمرے تلپٹ پڑے تھے۔ کیرولین کی میز سے سونے کا ایک بریسلیٹ غائب تھا۔

''تمہیں یہ لڑکے کہاں سے ملے تھے؟'' کیرولین نے ڈپٹی ایڈمیلون سے پوچھا۔ وہ سب کے سب اب باہر دھوپ میں آگئے تھے اور لوسی نے لیزلی کا ریوالور لینے کے بعد اسے اپنے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔

''ایک چوتھائی میل کے اندر اندر تین مختلف مقامات سے۔'' ایڈمیلون نے بتایا۔ ''سرخ بالوں والا نوجوان مس بیلی کی سدا بہار جھاڑی میں گھٹنوں کے بل جھکا کچھ تلاش کر رہا تھا۔ ایشیائی نوجوان ٹھیکرز کے تالاب میں کوئی شے اچھال رہا تھا اور سنہری کریو کٹ بالوں والا نوجوان سڑک کے درمیان دوڑ رہا تھا لیکن مخالف سمت میں۔''

لوسی نے ان تینوں نوجوانوں کی طرف غور سے دیکھا۔ سرخ بالوں والا ان تینوں میں سب سے کم عمر تھا۔ غالباً جونیئر ہائی اسکول میں ہوگا۔ باقی دونوں کی عمریں سترہ برس سے اوپر رہی ہوں گی۔ وہ تینوں کے تینوں یا تو خوف زدہ یا پریشان یا پھر خوف زدہ اور پریشان لگ رہے تھے۔

''کوئی اور بات؟'' لوسی نے پوچھا۔

''ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں تھا۔'' ایڈمیلون نے بتایا۔ ''میرے خیال میں کم از کم یہ اس بارے میں سچ بول رہے ہیں۔ اور یہ سب یہ کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے کبھی تمہاری ماں کے گھر میں قدم نہیں رکھا۔''

''ہوں۔ اوکے، انہیں پولیس اسٹیشن لے چلو ایڈ۔ ہم اس معاملے کو وہاں حل کرلیں گے۔''

''یہ تم کس طرح کرنا چاہتی ہو؟'' کیرولین نے اپنی شیرف بیٹی سے پوچھا۔

''میں ان سے سوالات کروں گی اور کس طرح۔ چند فون کروں گی اور ان کی کہانیوں کو چیک کروں گی۔''

''اس کے باوجود بھی تم یقین سے نہیں کہہ سکوگی کہ ان

میں سے کس نے یہ حرکت کی ہے۔ اگر یہ سب بے گناہ اور معصوم ہوئے تو اصل چور اب بھی آزاد پھر رہا ہوگا۔ ہم اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔'' کیرولین نے کہا۔

''تمہارے پاس کوئی بہتر آئیڈیا ہے؟''

''یقیناً ہے۔ پہلے مجھے ان سے سوالات کرنے دو۔ گھر کے اندر لے جاکر۔''

''کیا؟'' شیرف لوسی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، ماں...''

''یہ میرا استحقاق ہے۔ یہاں میں شکار ہوئی ہوں۔''

''لیکن یہ جائے واردات ہے۔''

''یہ میرا گھر بھی ہے اور اگر تم یاد کرو تو یہیں پر پلی بڑھی ہو۔ مجھے چند لمحے اپنے ڈپٹی کے ساتھ اور پھر پانچ منٹ ان لڑکوں کے ساتھ بات کرنے کی مہلت دو، میرے چھوٹے کمرے میں۔''

''لیکن ہم نے انگلیوں کے نشانات حاصل کرنے کے لیے ابھی پوڈر نہیں چھڑکا اور نہ ہی...''

''لیزلی کا کہنا ہے کہ وہ جو کوئی بھی تھا، اس نے دستانے پہنے ہوئے تھے، لوسی۔ تمہیں انگلیوں کے کوئی نشانات نہیں ملیں گے۔ میرا خیال ہے کہ میں اس معاملے کی تہ تک پہنچ سکتی ہوں۔'' کیرولین نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

لوسی نے ایک گہرا سانس لیا اور ڈپٹی کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بے چارگی سے شانے اچکا کر رہ گیا۔

بالآخر کیرولین اور ایڈ میلون ایک ساتھ گھر میں داخل ہوگئے اور پھر کئی منٹ بعد شیرف لوسی بھی بڑبڑاتے ہوئے ان کے پیچھے اندر چلی گئی۔ تینوں مشتبہ نوجوان بھی اس کے ہمراہ تھے۔ وہ بے ترتیب لیونگ روم سے گزرتے ہوئے اس چھوٹے اندرونی کمرے میں چلے گئے جہاں چیزیں تتر بتر دکھائی دے رہی تھیں۔ اسی اثنا میں ڈپٹی ایڈ میلون ان کے اندر آتے ہی قریب سے گزرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اندر چھوٹے کمرے میں کیرولین اپنی شاہ بلوط کی لکڑی کی میز کے پیچھے اس طرح بیٹھی ہوئی تھی جیسے کوئی جج عدالت میں براجمان ہوتا ہے۔ لوسی ایک دیوار کے پاس ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے اپنے انگوٹھے اپنی گن کے بیلٹ میں اٹکا دیے تھے۔

کیرولین اپنی کرسی پر سے اٹھی اور ان مشتبہ نوجوانوں کے مقابل جا کھڑی ہوئی۔ میز اور اس کی درازوں میں رکھی ہوئی اشیا میز پر بے ترتیب پھیلی ہوئی تھیں۔ یقیناً چور نے اس کمرے کی بھی بھرپور انداز میں تلاشی لی تھی۔

تینوں نوجوان کے نرم تلے کے جوتوں میں پیر خوف و دہشت سے کپکپا رہے تھے۔

کیرولین سرخ بالوں والے نوجوان سے مخاطب ہوئی۔ ''تم جھاڑیوں میں کیوں چھپ رہے تھے، ینگ مین؟''

اس سوال پر نوجوان کا چہرہ اس کے بالوں کی رنگت کی طرح سرخ ہوگیا۔ ''میں چھپ نہیں رہا تھا۔ میں اپنی گھڑی تلاش کر رہا تھا جو گزشتہ روز مجھ سے کھوگئی تھی۔''

''حیت بیلی کی کیاریوں میں؟''

وہ نوجوان قدرے ہچکچایا پھر بولا۔ ''کچھ لڑکوں نے وہ گھڑی مجھ سے لے لی تھی اور پھر ان جھاڑیوں میں پھینک دی تھی۔''

''کیا واقعی ایسا ہوا تھا؟'' کیرولین نے کہا۔ پھر ایشیائی نوجوان کی جانب گھوم گئی۔ ''اور تم کیا کہتے ہو؟ تم تالاب میں کوئی چیز پھینک رہے تھے؟''

''وہ پتھر تھے۔'' ایشیائی نوجوان نے بمشکل تمام تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''وہ چیز تو نہیں تھی جو تم نے چوری کی تھی؟ یا دستانے جن سے وزن باندھا گیا ہوتا کہ وہ ڈوب سکیں؟ یا وہ چاقو جس کی مدد سے تم نے اندر داخل ہونے کے لیے دروازے کی جالی کاٹی ہو؟''

''وہ صرف پتھر تھے۔ میں انہیں پانی کی سطح پر اچھلتے ہوئے لڑھکا رہا تھا۔'' ایشیائی نوجوان نے کہا۔

ابھی کیرولین اس کے جواب پر غور کر رہی تھی کہ ڈپٹی ایڈ میلون کمرے کے واحد دروازے سے اندر داخل ہوا۔ وہ سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

کیرولین حیرت سے پلکیں جھپکانے لگی۔ پھر اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور وہ پیر پٹختے ہوئے اپنی بیٹی کے قریب سے گزرتے ہوئے ایڈ میلون کے پاس پہنچی اور اس کی انگلیوں میں دبی ہوئی سگریٹ چھین کر اسے بجھانے کے لیے کوڑے کی بالٹی میں جھک گئی۔ ''میرے گھر میں تمباکونوشی کی اجازت نہیں ہے، میلون۔'' یہ کہہ کر وہ لوسی کی جانب گھوم گئی۔ ''بہتر ہوگا کہ جب تک میں فارغ نہ ہو جاؤں تم دونوں لیونگ روم میں انتظار کرو۔''

لوسی دیوار سے ہٹ گئی اور بولی۔ ''دیکھو ماں...''

''مجھ پر اعتماد کرو، او کے؟ میلون تم جاتے ہوئے اس دروازے کو لاک کر دینا۔''

لوسی نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر اپنا ارادہ بدل دیا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

ایڈ میلون بھی اس کے پیچھے چل پڑا اور باہر نکلتے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

کیرولین ایک بار پھر بیٹھ گئی اور ان تینوں نوجوانوں کو دیکھنے لگی جو اب پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔

پھر وہ سنہری بالوں والے نوجوان سے مخاطب ہوئی۔ ''تم کیا کہتے ہو؟''

''میں؟''

''تم کس چیز سے بھاگ رہے تھے؟''

''میں تو بس جاگنگ کر رہا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''فٹ بال کی ٹریننگ کی خاطر۔''

''یہ سال کے اوائل میں ٹریننگ کے لحاظ سے کچھ جلدی نہیں...'' کیرولین نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور تیوریاں چڑھا کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ ''تم لوگوں کو کچھ بو سی آرہی ہے؟''

اور پھر وہ اپنے پیروں پر اچھل کھڑی ہوئی۔ اس کی میز کے برابر میں رکھی ہوئی ردی کی ٹوکری سے دھواں نکلنا شروع ہوگیا تھا۔ وہ تینوں نوجوان منہ اور آنکھیں پھاڑے سکتے کی سی کیفیت میں کھڑے ہوئے تھے۔

کیرولین نے ایک بڑے سے کاغذی لفافے کی مدد سے ردی کی ٹوکری پر ضربیں لگانا شروع کیں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ دھواں کمرے میں بھرنا شروع ہوگیا۔

اور کمرے کے واحد دروازے میں لاک لگا ہوا تھا۔

سرخ بالوں والے نوجوان نے کراہنا شروع کر دیا۔ ایشیائی نوجوان کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ کیرولین بڑھتے ہوئے دھوئیں سے بدستور نبرد آزما تھی جو اب ایک بادل کی سی شکل اختیار کر گیا تھا۔

اچانک سفید فوم کے ایک بڑے جھاگ نے ردی کی ٹوکری کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سنہری بالوں والا نوجوان جو خوف زدہ تھا، اس نے کیرولین کی میز کی دراز میں سے آگ بجھانے والا آلہ نکال کر استعمال میں لانا شروع کر دیا۔

عین اسی لمحے دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور شیرف لوسی اور اس کا ڈپٹی دوڑتے ہوئے کمرے میں آگئے۔ ''ماں، کیا ہوا؟''

''اب سب کچھ ٹھیک ہے، لوسی۔''

شیرف لوسی کا چہرہ پھیکا پڑا ہوا تھا۔ وہ تینوں نوجوانوں کو اپنے ہمراہ کمرے سے باہر لے گئی۔ اس نے ڈپٹی ایڈ میلون کو ان تینوں نوجوانوں کی نگرانی پر چھوڑا اور چھوٹے کمرے میں پلٹ آئی جہاں اس کی ماں کیرولین

ہوشیار وکیل

سالِ نو کی چھٹیوں میں ڈاکٹر، وکیل، دس سال کا لڑکا اور پادری تفریح کے لیے دوسرے شہر چھوٹے سے طیارے میں جا رہے تھے کہ اچانک جہاز کے انجن میں خرابی شروع ہوگئی اور انجن بند ہوگیا جس پر پائلٹ نے کہا کہ اس نے اپنے طور پر پوری کوشش کرلی انجن اسٹارٹ کرنے کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا اور اب جہاز زمین کی طرف جا رہا ہے۔ چند منٹوں میں یہ تباہ ہو جائے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ سب پیراشوٹ لگا کر فوری طور پر کود جائیں لیکن جہاز میں صرف چار پیراشوٹ ہیں اور ایک میں لے کر کود رہا ہوں۔ آپ چار میں سے فیصلہ کر لیں کہ کون اپنی جان کی قربانی دے کر باقی کو بچا سکے۔ یہ کہہ کر پائلٹ جہاز سے کود گیا۔

سب سے پہلے ڈاکٹر نے پیراشوٹ اٹھایا اور باندھ کر کہا کہ وہ ڈاکٹر ہے اور لوگوں کی زندگی کو بچاتا ہے اس لیے اس کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر نے جہاز سے چھلانگ لگا دی۔ اس کے بعد وکیل نے کہا میں وکیل ہوں اور میرا پیشہ سب پیشوں سے بہتر ہے اور وکیل ہونے کے ناتے میرا زندہ رہنا ضروری ہے۔ یہ کہہ کر وکیل نے پیراشوٹ اٹھایا اور باندھ کر جہاز سے کود گیا۔

تیسرا شخص پادری تھا۔ اس نے دس سالہ بچے کو دیکھا اور کہا۔ ''میرے بچے میں نے اپنی زندگی کے کافی سال گزار لیے ہیں اس لیے تم آخری پیراشوٹ پہن کر جہاز سے کود جاؤ۔ جس پر بچے نے پیراشوٹ پادری کو دیتے ہوئے کہا۔ ''فادر! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ ابھی جو تیز طرار آدمی کودا ہے وہ میرے اسکول کا بیگ لگا کر کودا ہے، اس لیے ہم دونوں کے لیے دو پیراشوٹ موجود ہے جان بچانے کے لیے۔''

کوئٹہ سے حسن سردار کا تعاون

کھانسنے کے ساتھ ہوا کے لیے پنکھا جھل رہی تھی۔

لوسی خاموشی کے ساتھ دیر تک اپنی ماں کو دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''تم جانتی ہو کہ ایڈ میلون سگریٹ نہیں پیتا۔ ہے نا؟''

''ہاں۔''

''اس نے بتایا کہ تم نے اس سے سگریٹ پینے کو کہا تھا۔''

''ہاں میں نے کہا تھا۔'' کیرولین نے جواب دیا۔

''میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ لیزلی سے ایک سگریٹ ادھار لے آئے۔''

''اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ اندر آ کر مخل ہو جائے؟''

''ہاں۔''

''تا کہ تم ہمیں کمرے سے باہر جانے کا کہہ سکو؟''

''اور تا کہ میں میلون کی سگریٹ حاصل کر سکوں۔''

''اور یقیناً تم یہ بھی جانتی تھیں کہ اس کمرے کے دروازے کا تالا نہیں لگتا۔'' لوسی نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔''

لوسی نے ایک گہرا سانس لیا اور بولی۔ ''میں یہ تمام سوالات کسی مذاق میں نہیں پوچھ رہی ہوں، ماں۔ کیا تم مجھے یہ بتانا مناسب سمجھتی ہو کہ یہ سب کیا تھا؟''

''تم ایک پولیس افسر ہو۔ اس بارے میں خود غور کرو۔'' کیرولین نے سلگتی ہوئی ردی کی ٹوکری کو اپنے جوتے کی نوک سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہیں اس میں سے کاغذ جلنے کی بو آ رہی ہے؟''

لوسی نے ایک لمحے کے لیے بو پر غور کیا۔ پھر بولی۔ ''نہیں، اس میں سے تو آگ کی بو قطعی محسوس نہیں ہو رہی ہے۔''

''وہ اس لیے کہ یہ آگ تھی ہی نہیں۔'' کیرولین نے جھاگ سے بھری ٹوکری کے اندر ایک چھوٹی گہرے رنگ کی ٹیوب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ دو ڈالر قیمت کا وہ بے ضرر دھویں کا بم تھا جو آج میں نے تمہارے کزن ٹومی کے لیے ملڈریڈ کی پارٹی شاپ سے خریدا تھا۔ وہ ان دھویں کے بموں کو فوجی انداز کی جنگ لڑنے کی نقل میں استعمال کرتا ہے۔ میں نے ایڈ میلون کی سگریٹ سے اس بم کے فیوز کو سلگا دیا تھا۔''

''دھویں کا بم؟'' لوسی نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اوکے میں ہار مانتی ہوں۔ یہاں آپ درحقیقت کیا ثابت کرنا چاہ رہی تھیں؟''

کیرولین ٹہلتے ہوئے اپنی میز کے پاس گئی اور اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنی بیٹی سے بولی۔ ''چور کی شناخت!''

''کیا؟''

''ہاں اب مجھے پتا چل گیا ہے کہ آج میرے گھر میں کون چور تھا جو تالا توڑ کر اندر گھسا تھا؟''

''کون؟''

''سنہری بالوں والا نوجوان۔''

''وہی جو کچھ دیر قبل آگ بجھا رہا تھا؟'' لوسی نے آنکھیں میچتے ہوئے کہا۔ ''تم یہ کس طرح کہہ سکتی ہو؟''

''اس لیے کہ وہ کوئی سپر ہیرو نہیں ہے۔''

''کیا؟''

''بعض اوقات سپر ہیروز کے پاس ایکس ریز کی سی بصارت ہوتی ہے۔ میں شرطیہ کہتی ہوں کہ اس نوجوان کے پاس یہ بصارت نہیں ہے۔''

''ماں! یہ تم آخر کیا باتیں کر رہی ہو؟'' لوسی نے زچ ہو کر کہا۔

کیرولین مسکرانے لگی۔ ''آگ بجھانے والا آلہ میری میز کی دراز میں رکھا ہوا تھا، لوسی۔ وہاں اس کی موجودگی کا اسے کیسے پتا چلا؟ ہاں ایک ہی صورت ہو سکتی تھی کہ وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ دراز میں آگ بجھانے والا آلہ موجود ہے۔''

شیرف لوسی ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئی پھر بولی۔ ''اچھا! تو تم نے اس کے لیے ایک جال بچھایا تھا؟''

''بچے بعض اوقات گھُنّے ضرور ہوتے ہیں لیکن احمق نہیں ہوتے۔'' کیرولین نے کہا۔

لوسی نے بالآخر دھیرے دھیرے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ میں اسے پولیس اسٹیشن لے جاؤں گی۔ ڈپٹی ایڈ میلون کو واپس اس جگہ بھیجوں گی جہاں سے وہ نوجوان پکڑا گیا تھا۔ اگر یہاں اور اس مقام کے درمیان کسی جگہ سے دستانے اور بریسلیٹ مل گئے تو میرے لیے اس کے خلاف یہی ثبوت کافی ہو گا۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے کی جانب بڑھی پھر پلٹ گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات اب نرم پڑ چکے تھے۔ ''گڈ ورک، ماں۔''

''گڈ لک، بیٹی!'' کیرولین نے ہاتھ لہرا دیا۔

شیرف لوسی نے باہر نکل کر ڈپٹی ایڈ میلون کو ثبوت تلاش کرنے کے لیے چند ہدایات دیں اور باقی دونوں نوجوانوں کو رہا کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے سنہری بالوں والے نوجوان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ پھر اسے ساتھ لے کر اپنی پولیس کار میں پولیس اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گئی۔

ویسے تو یہ کہانی بہت پرانی ہے۔

اس کہانی کا عنوان تھا۔ ''میر کلو کی گواہی۔''

پس منظر کچھ یوں ہے کہ میر کلو نام کے ایک شخص بازار میں کھڑے تھے۔ ادھر عدالت میں کسی گواہ کی پیشی ہونی تھی لیکن وہ گواہ غائب ہو چکا تھا۔

سب لوگ بوکھلائے ہوئے کسی گواہ کی تلاش میں گھوم رہے تھے کہ میر کلو پر نظر پڑی۔ وہ انہیں پیسوں کا لالچ دے کر کٹہرے میں لے آئے۔

گواہی

منظر امام

کچھ حقائق اس قدر تلخ ہوتے ہیں کہ ان سے نظریں ملانا ممکن نہیں ہوتا... مگر اس سے صرفِ نظر بھی نہیں کیا جا سکتا... ہمارے معاشرے کی ایک ایسی ہی تصویر... جس کے رنگ پھیکے پڑ چکے ہیں... ہم اور ہم جیسے حساس لوگوں کے لیے سب سے بڑی قیامت یہ کہ ہوس پرور لئیم سیاست نے اپنے شیطانی جذبات کی آسودگی کی خاطر انفس و آفاق کی اس وحدت کو ایک دوسرے سے نفرت کرنے والی کثرت میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے...

دانائی کی باتیں کرنے والے ایک سادہ لوح شخص کی پُراثر داستان

اب میر کلو کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ کس کے خلاف یا کس کے حق میں گواہی دینی ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی لچھے دار باتوں سے عدالت کو الجھائے رکھا اور وقت ختم ہو گیا۔

اس دور کی پرانی کہانی آپ کو سناتے ہیں لیکن ذرا مختلف انداز سے یعنی آج کے دور کے حساب سے۔

جج نے چشمے کے عقب سے کٹہرے میں کھڑے ہوئے شخص کی طرف دیکھا اور پہلا سوال کیا۔ ''مذہب کیا ہے تمہارا؟''

''ارے جناب! ہم جیسوں کا کیا مذہب۔ ہم تو مذہب کے نام پر دھبا ہیں۔'' میر کلو نے جواب دیا (یہ ہم نے فرض کر لیا ہے کہ آج کے گواہ کا نام بھی میر کلو ہی ہے)

''پھر بھی کوئی مذہب تو ہوگا؟''

''جمعے کو نماز کے لیے چلا جاتا ہوں۔ ہر اتوار کو چرچ میں جھانک آتا ہوں اور ہولی دیوالی کے موقع پر مندروں میں چلا جاتا ہوں۔''

بے چارہ جج پہلو بدل کر رہ گیا۔ ''اور نام کیا ہے تمہارا؟'' اس نے پوچھا۔

''رام شریف ڈیوڈ۔'' میر کلو نے جواب دیا۔

''کیا مذاق ہے۔ صحیح نام بتاؤ؟'' جج غصے سے بھڑک اٹھا۔ ''شناختی کارڈ پر کیا نام ہے؟''

''شناختی کارڈ پر تو میر کلو ہے جناب۔ لیکن اصل میں وہی نام ہے جو میں نے آپ کو بتایا ہے۔''

''آخر کیسے، یہ تینوں نام کیسے ہو گئے؟''

''جناب عالی! میں باپ کی طرف سے شریف ہوں یعنی مسلمان۔ ماں کی طرف سے ڈیوڈ ہوں۔ یعنی عیسائی اور دادی کی طرف سے رام یعنی ہندو۔''

''کیا تمہاری دادی ہندو تھیں؟''

''جی جناب عالی! اب یہ مت کہیے گا کہ ان کا شناختی کارڈ بھی دکھاؤ۔ کیونکہ اس زمانے میں زندگی بہت آسان تھی اور جس زمانے میں زندگی آسان ہونے لگے تو سمجھ جائیں کہ وہاں شناختی کارڈ کا دستور نہیں ہوا کرتا۔''

''کیا تم مقتول کو جانتے تھے؟''

''جاننا کیا ہے صاحب! ہم دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ وہ میرے بغیر رہ نہیں سکتا تھا اور میں اس کے بغیر۔ ایک دوسرے کو جب تک دیکھ نہیں لیتے تھے ہمیں چین نہیں آتا تھا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ مقتول تو یورپ میں رہتا تھا۔''

''یہی تو کمال ہے جناب عالی کہ وہ رہتا تو یورپ میں تھا لیکن اس کا تصور ہر وقت میرے ساتھ رہتا تھا۔'' میر کلو نے جواب دیا۔ ''مجھے تو ایسا لگتا جیسے وہ ہر وقت میرے ساتھ ہی ہو۔ میں ہوٹل میں بھی چائے کی دو پیالیاں منگواتا تھا۔ ایک اپنے لیے اور ایک اس کے لیے۔''

''وہاٹ نان سنس۔ جب وہ ہوتا ہی نہیں تھا تو پھر تم چائے کیوں منگواتے تھے؟''

''میں اپنے سامنے والی خالی کرسی کے سامنے رکھ دیتا تھا اور اس سے کہتا لو یار چائے پی لو۔ بعد میں وہ چائے میں خود پی لیتا تھا۔''

''تمہارے خیال میں مقتول کی عمر کیا ہوگی؟''

''عمر کا کیا پوچھتے ہیں جناب عالی۔ مقتول بہت ہی عمر چور قسم کا بندہ تھا۔ بیس سے چالیس سال کے درمیان نظر آتا تھا۔ کبھی دیکھو تو تازہ شگفتہ سا بیس سال کا نوجوان چلا آرہا ہے اور کبھی دیکھو تو چالیس سال کا پریشان حال شخص گردن جھکائے بیٹھا ہے۔''

''اس کا نام تو معلوم ہوگا تمہیں؟''

''اب میں کتنے نام بتاؤں۔ نام بدلنے کا شوق تھا مقتول کو۔ جس نجومی نے نام بدلنے کا مشورہ دیا۔ جھٹ سے نام بدل ڈالا۔ ایک بار نام بدلنے کے شوق میں اپنا نام مدھو بالا تک رکھ لیا تھا۔ اب یہ نہیں معلوم کہ قتل ہوتے وقت اس کا کیا نام چل رہا تھا۔ ویسے میں یہ عرض کر دوں جناب والا کہ قبر میں فرشتوں تک کو الجھن ہو رہی ہوگی کہ کس نام کے بندے سے حساب کتاب کیا جائے۔''

''کیا تمہارے علم میں ہے کہ مقتول نے بینک سے بھاری قرضے لے رکھے تھے؟'' جج نے پوچھا۔

''جی ہاں جناب عالی۔ یہ مجھے نہیں معلوم ہوگا تو کس کو ہوگا۔ مقتول نے اس مشن میں کمال حاصل کر رکھا تھا۔ ان کا فلسفہ تھا کہ بینک سے کبھی دس بیس پچاس ہزار قرض مت لو۔ کیونکہ وہ جان کا عذاب ہے۔ اس کی قسطیں بھی دینی پڑتی ہیں۔ ہمیشہ چالیس پچاس کروڑ کی بات کرو۔ چالیس پچاس کروڑ کھا جانے والوں کو بینک والے کچھ نہیں کہتے بلکہ الٹا اس کی عزت کرتے ہیں۔ اس کے آگے پیچھے گھومتے ہیں۔''

''مقتول نے ستر کروڑ لے رکھے تھے۔'' جج نے میر کلو کو بتایا۔

''کچھ بھی نہیں ہے جناب عالی! اس جیسے شخص کے لیے ستر کروڑ کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ مقتول کا نیب میں کیس چل

رہا تھا؟''

''جی ہاں جناب عالی! وہ اسی بات پر بہت خوش بھی تھے۔''

''خوش تھے، وہ کیوں؟''

''وہ کہتے تھے کہ اب اس کا کیس نیب میں چلا گیا ہے۔ اب اس کا کچھ نہیں ہوگا۔''

''کیا تمہیں علم ہے کہ مقتول کو کس طرح قتل کیا گیا ہے؟'' جج نے پوچھا۔

''مقتول بہت ہی ڈھیٹ قسم کے آدمی تھے جناب۔'' میر کلو نے کہا۔ ''وہ آسانی سے مرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان پر ہر قسم کے طریقے آزمائے گئے ہوں گے۔''

''ہر قسم کے طریقوں کی تشریح کرو۔''

''میرا خیال ہے کہ پہلے ان کو پانی میں ڈبویا گیا ہوگا۔ جب کچھ نہیں ہوا ہوگا تو پھر آگ میں پھینک دیا ہوگا اور جب وہاں سے بھی بچ نکلے ہوں گے تو کوئی خودکش ان سے جا کر لپٹ گیا ہوگا اور مقتول سیدھے جنت میں چلے گئے ہوں گے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ مقتول مذہبی آدمی تھے؟''

''مذہبی ہوں یا نہ ہوں۔ جنت سے ضرور دلچسپی تھی۔ اور خاص طور پر حوروں سے... کبھی کبھی تو وہ ان لوگوں کو اپنی طرف سے چائے بھی پلا دیتے تھے جن کی تقریروں میں حوروں کا ذکر ہوتا تھا۔''

''تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ مقتول کنجوس آدمی تھے؟''

''نہیں جناب عالی! ان کے مزاج میں یہی تو خوبی تھی۔ بلا کے کنجوس، بلا کے سخی۔ اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کنجوس زیادہ ہیں یا سخی زیادہ ہیں۔''

''کیا تمہارے علم میں ہے کہ وہ الیکشن میں کھڑے ہونے کی تیاری کر رہے تھے؟''

''جی ہاں جناب عالی! ویسے بھی میں نے انہیں کبھی بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ کھڑے ہی رہتے تھے۔ ایک بار اتنی دیر تک کھڑے رہے کہ دونوں پیروں میں ورم آ گیا تھا۔ یہ سمجھ لیں کہ ان کے پاؤں بھاری ہو گئے تھے۔''

پیر کلو کی اس بات پر کمرائے عدالت میں بیٹھے ہوئے لوگ مسکرا دیے۔

''وہ الیکشن میں کیوں کھڑا... ہونا چاہتے تھے؟''

''اس بارے میں بھی ان کا ایک الگ فلسفہ تھا جناب عالی۔'' میر کلو نے کہا۔

''وہ فلسفہ کیا تھا؟''

''وہ یہ تھا جناب عالی کہ اگر ملک میں ترقی دیکھنی ہے تو صرف سیاست داں پروڈیوس کرو۔ اس ملک کو سائنس داں، انجینئر، ڈاکٹرز، دانشور، ماہر اقتصادیات وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف سیاست دانوں کی ضرورت ہے۔ اس لیے ہر گلی کوچے میں آپ کو سیاست داں بنتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔''

''اپنی بات کی وضاحت کرو؟''

''بہت بہتر جناب عالی! آپ نائی کی دکان پر بال بنوانے چلے جائیں تو وہ یو این او والوں کو مشورہ دے رہا ہوگا کہ فن لینڈ کی خارجہ پالیسی کیا ہونی چاہیے۔ وہ آپ کے بالوں پر کم اور فن لینڈ کی صورتِ حال پر زیادہ توجہ دے گا۔ آپ آلو خریدنے چلے جائیں تو سبزی والا یہ بتا رہا ہوگا کہ اگر امریکا برازیل کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے تو برازیل کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ آپ گھوم پھر کر خود دیکھ لیں جناب۔ آپ کو ہر دکان، ہر موڑ، ہر ہوٹل میں صرف سیاست ہی سیاست سنائی دے گی۔''

میر کلو کی اس بات پر تالیاں بج اٹھیں۔

خود معزز جج کو بھی ان کی باتوں میں مزہ آنے لگا۔

''اگر تمہارا یہی خیال ہے تو پھر تعلیمی اداروں سے بھی طلبا تنظیمیں ختم کر دینی چاہئیں۔''

''نہیں جناب عالی! ان کو اور فروغ دینا چاہیے۔ ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔''

''وہ کیوں؟''

آپ نے تو سنا ہوگا جناب عالی کہ آج کا بچہ کل کا باپ ہوتا ہے۔ اگر یہ بچے آج آپس میں گولیاں نہیں چلائیں گے۔ لاٹھی ڈنڈوں کا استعمال نہیں کریں گے۔ ایک دوسرے کو... فعال نہیں بنائیں گے تو آگے جا کر ان سے کیا امید رکھی جائے۔''

''میر کلو تم بہت سخت باتیں کر رہے ہو۔''

''یہ تلخ سچائی ہے جناب عالی اور میں ابھی اپنی قوم کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ یہ قوم بہت ترقی کرے گی۔''

''وہ کس طرح؟''

''جب کسی مارکیٹ کی طرف جاتا ہوں اور میں یہ دیکھتا ہوں کہ کسی باپ نے بچے کی ضد پر مجبور ہو کر اسے کھلونا بندوقیں دلوا دی ہیں تو میرا دل خوش ہو جاتا ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''پریکٹس جناب عالی! بچہ ابھی سے پریکٹس میں رہے

گا تب ہی تو آگے جا کر موبائل چھینے گا۔ ڈاکے ڈالے گا اگر آپ نے اسے کھلونے کے طور پر ٹرک یا ہوائی جہاز یا رنگین تصویری کہانیوں کی کتابیں دلوادیں پھر تو وہ ناکارہ نکلے گا۔"

ایک بار پھر تالیاں بجنے لگیں۔

"مسٹر! تم نے یہ باتیں کہاں سے سیکھیں؟"

"وقت جناب عالی، جو سب سے بڑا استاد ہوتا ہے۔ جس نے مجھے دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان دیے ہیں۔"

"چلو اب پھر اصل معاملے کی طرف آتے ہیں۔ یہ بتاؤ مقتول گورے تھے یا کالے؟"

"جناب عالی! ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اپنا اصل روپ کبھی کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔" میر کلو نے کہا۔ "صرف وہی نہیں جناب عالی! یہ سیاسی جلسوں میں خوب صورت باتیں کرنے والے کیا اپنے اصل روپ اور رنگت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ نہیں جناب عالی! ان کی اصل رنگت تو کچھ اور ہوتی ہے۔"

"مقتول کے بارے میں بتاؤ۔"

"وہی عرض کررہا ہوں جناب! مقتول کے پاس دونوں کلر تھے۔ وہ جب سائے میں آتے تو گورے دکھائی دیتے اور جب دھوپ میں چلے جاتے تو کالے ہوجاتے۔ دھوپ چھاؤں والا کیس تھا ان کے پاس۔ اسی لیے آج تک مجھے بھی پتا نہیں چل سکا کہ وہ گورے ہیں یا کالے۔"

جج پھر پہلو بدل کر رہ گیا۔ یہ گواہ تو کسی طور قابو میں ہی نہیں آرہا تھا۔

"چلو، کم از کم اتنا تو بتادو کہ وہ لمبے تھے یا چھوٹے قد کے؟"

"اس میں بھی انہوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی تھی جناب۔" میر کلو نے کہا۔ "وہ جب انکساری سے خود کو سمیٹ کر چلتے تو چھوٹے قد کے دکھائی دیتے اور جہاں غرور کے ساتھ سینہ تان کر نکلے، لمبے قد کے ہوگئے۔"

"دلچسپ۔ یہ بتاؤ کہ مقتول انکساری کس وقت دکھاتے تھے؟"

"جب انہیں اس بات کا اندازہ ہوتا کہ لوگ ان کو عقیدت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں یا اپنے سے اونچے درجے کے کسی شخص کے پاس چلے گئے ہیں۔ مقتول فوراً انکساری اختیار کرلیتے تھے۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں جناب عالی! کسی مجلس میں اگر کوئی بڑا صنعت کار یا سیاست داں وغیرہ بیٹھا ہو اور کوئی ملنے کے لیے آئے تو کتنا جھک کر ملتا ہے۔ جیسے اس سے زیادہ حلیم کوئی نہیں ہوگا اور جیسے ہی وہ شخص اس محفل سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھتا ہے اس کی گردن میں سریا لگ جاتا ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا۔ مقتول کا بھی یہی حال تھا۔"

"مقتول کردار کے کیسے تھے؟" جج نے پوچھا۔

"یہ بھی ایک الجھا ہوا معاملہ ہے جناب عالی! مقتول کردار کو وقت کا زیاں سمجھتے تھے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ کیریکٹر وہی بہتر ہوتا ہے۔ جس کی چار لوگ تعریف کریں۔ اسی لیے مقتول کا کیریکٹر لوگوں کے سامنے بہت اچھا ہوتا ہے لیکن تنہائی ملتے ہی وہ اپنی اصلیت پر آجاتے تھے۔ اسی لیے میں ان کے کیریکٹر کے بارے میں کوئی بات حتمی نہیں کہہ سکتا۔"

"میں نے تو سنا ہے کہ مقتول لوگوں میں بہت بدنام تھے اور تم کہہ رہے ہو کہ سب کے سامنے وہ اچھے بنے رہتے تھے؟"

"یہ بھی ان کا کمالِ فن تھا جناب عالی۔ وہ جب یہ دیکھتے کہ لوگ ان سے بہت زیادہ عقیدت رکھنے لگے ہیں تو فوراً ہی درویشوں کی طرح اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرنے لگتے اور تنہائی میں جا کر خوب توبہ تلا کرتے۔ یعنی یہ سمجھ لیں کہ کبھی ان کا کردار لوگوں کے سامنے خراب اور تنہائی میں بہت اچھا ہوجاتا اور کبھی اس کے بالکل برعکس ہوتا۔ اسی لیے مجھ جیسا آدمی بھی آج تک نہیں سمجھ پایا کہ ان کا کیریکٹر کیسا تھا؟"

"مقتول نے کتنی شادی کی تھیں؟"

"صحیح تعداد تو خود مقتول کو بھی نہیں معلوم ہوگی۔"

"کیا مطلب، تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ مقتول نے بہت سی شادیاں کی تھیں؟"

"جناب والا مقتول تو شادیوں کو کسی خاطر ہی میں نہیں لاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ شادیاں کرلینا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اصل مسئلہ ہے۔ شادیاں نہ کرنا اسی لیے یہ بھی کنفرم نہیں ہے کہ انہوں نے کتنی شادیاں کی ہوں گی۔"

"لوگوں کا تو یہ کہنا ہے کہ مقتول نے ایک شادی بھی نہیں کی تھی۔"

"یہ بھی درست ہے جناب والا۔"

"کیا مطلب؟ اب یہ کیسے درست ہوسکتا ہے؟"

"یہ اس طرح درست ہے جناب عالی کہ جب وہ کسی کو پتا چلنے دیں تب تو کوئی بات کنفرم ہوسکتی ہے۔ وہ تو اس بات کے قائل ہی نہیں تھے کہ کسی کو اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بتائیں۔ ہر ایک کو اندھیرے میں رکھنے کی

عادت تھی ان کی۔ کسی کو بتایا شادی نہیں ہوئی۔ کسی سے کہہ دیا دو بیویاں ہیں۔ کسی کو ایک بتایا۔ کسی کو چار چار تک بتا دیا۔ اب ایسے من موجی انسان کا کیا بھروسا جناب۔"

"کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ مقتول کی کسی سے دشمنی تھی؟"

"وہ ایک سچے اور کھرے انسان تھے جناب! ایسے انسان کا تو ہر کوئی دشمن ہوجاتا ہے۔"

"ہم نے تو سنا ہے کہ وہ ایک جھوٹے انسان تھے؟"

"یہ بھی دشمنی کی وجہ ہوسکتی ہے جناب۔ ہمارے معاشرے میں لوگ نہ جھوٹے کو چھوڑتے ہیں نہ سچے کو۔"

"کمال ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"ایسا ہی ہے جناب۔ یہ معاشرہ سچ اور جھوٹ کو اپنے مفاد کے انداز میں تولتا ہے۔ اگر جھوٹ سننے سے اس کے خوابوں کی تسکین ہورہی ہو۔ وہ سمجھ رہا ہو کہ آنے والا ملک اور قوم کے لیے بہت زبردست تبدیلیاں لے آئے گا۔ پورے ملک میں خوش حالی ہوگی۔ سب کے حالات بدل جائیں گے۔ ہر شخص کو عزت کی روٹی ملے گی۔ عورتوں کی عزتیں محفوظ رہیں گی۔ کوئی عورت تیزاب سے جھلسی ہوئی نہیں ہوگی۔ گیس اور بجلی کی لوڈشیڈنگ نہیں ہوگی۔ اس کی عزتِ نفس مجروح نہیں ہوا کرے گی۔ تو یہ معاشرہ ایسے جھوٹ خوشی خوشی نہ صرف سن لیتا ہے جبکہ جھوٹ بولنے والے کے حق میں فلک شگاف نعرے بھی لگاتا ہے۔ سیاست دانوں نے ہمارے معاشرے کی یہ کمزوری بھانپ لی ہے اس لیے وہ بے تکان جھوٹ بولتے جاتے ہیں۔"

"اور معاشرے کو سچ کس وقت برداشت نہیں ہوتا۔"

"جس وقت اسے آئینہ دکھایا جائے۔ جس وقت یہ بتایا جائے کہ تم خود غرض اور بے رحم ہوگئے ہو۔ تم قانون کی پروا نہیں کرتے۔ تم یتیموں اور ناداروں کی دولت پر پرورش پا رہے ہو۔ تم بجلی چوری کرتے ہو۔ گیس چوری کرتے ہو۔ پڑوسیوں کو پریشان کرکے رکھ دیا ہے۔ مذہب کی تجارت کررہے ہو تو اس وقت معاشرے کو سچی باتیں پسند نہیں آتیں۔ وہ ایسا سچ بولنے والے کے خلاف شور کرنے لگتا ہے۔ اگر ہتھے چڑھ جائے تو اس کا منہ کالا کرکے اس کو گدھے پر بٹھا دیتا ہے۔"

عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ عام سا نظر آنے والا یہ شخص عام نہیں بلکہ بہت خاص تھا۔ وہ ایسی ایسی باتیں کررہا تھا جو باتیں کسی کو بھی بیدار کرنے کے لیے بہت تھیں۔

"کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ مقتول کے گھر والے کہاں رہتے ہوں گے؟"

"جناب والا! مقتول میں ایک خوبی یہ تھی کہ اس نے ہر کسی کو اپنا ہی سمجھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس معاشرے کا ہر بوڑھا اس کا باپ... ہر بوڑھی اس کی ماں ہے۔ ہر جوان لڑکی اس کی بہن اور ہر جوان لڑکا اس کا بھائی ہے۔ اس سے اندازہ لگالیں جناب والا کہ اس ملک میں اس کے کتنے باپ ہوں گے۔ کتنی مائیں ہوں گی اور کتنے بھائی بہن ہوں گے۔"

"پھر بھی کوئی نہ کوئی تو اس کا اپنا ہوگا؟"

"کاش اس کا کوئی اپنا ہوسکتا جناب والا۔" میر کلو نے کہا۔ "اس دور میں کوئی کسی کا ہوا ہے؟"

"اگر تم سے یہ کہا جائے کہ مقتول، مقتول نہیں ہے تو تمہیں کیا محسوس ہوگا؟"

"میں اس بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا جناب عالی۔"

"کیا تمہیں مقتول کو زندہ دیکھ کر حیرت نہیں ہوگی؟" جج نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں جناب والا۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ یہاں زندہ کون ہے۔ ہم لوگ تو زندگی کی پرچھائیاں ہیں۔ ہم زندہ کہاں ہیں۔ کیا ہماری اداس آنکھوں میں زندگی کی کوئی رمق دکھائی دیتی ہے؟ نہیں جناب والا! ہرگز نہیں۔ ہم میں سے کوئی زندہ نہیں ہے۔ ہم سب مقتول ہوچکے ہیں، قتل ہوچکے ہیں۔ مہنگائی کے ہاتھوں، بدعنوانی کے ہاتھوں، کرپشن کے ہاتھوں، دہشت گردی کے ہاتھوں، ہم سب مرچکے ہیں جناب والا۔ اس لیے اگر مقتول بھی سامنے آکر کھڑا ہوجائے تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوگی بلکہ اس بات کا دکھ ہوگا کہ وہ دوبارہ اس درد بھری دنیا میں واپس کیوں آگیا۔"

عدالت میں پھر سناٹا تھا۔

میر کلو کی آواز بازگشت بنی ہوئی تھی۔

عدالت کا وقت بھی ختم ہوچکا تھا۔ میر کلو نے ایک نظر سب کی طرف دیکھا اور کمرائے عدالت سے باہر نکل آئے۔

جس وقت اسے گھیر گھار کر جھوٹی گواہی کے لیے عدالت لایا جارہا تھا، اس وقت ایک عام سا آدمی تھا لیکن باہر جاتے ہوئے وہ عام آدمی نہیں تھا بلکہ بہت بڑا انسان تھا۔

انہونی

روبینہ رشید

علم... فہم و دانش کا ایک ایسا دریا ہے... جو انسانی ذہن کو سیراب اور شاداب کرتا ہے... وہ بھی علم کا ایک ایسا ہی سمندر تھا... اس کی زندگی عظیم کارنامے کا ایک سلسلہ تھی... کامیابیاں اس کے ہم رکاب تھیں... مگر اچانک... اس کامیابی کے سفر میں رکاوٹوں اور مداخلتوں کا ایسا طوفان آیا کہ اس کے قدم ڈگمگا گئے... اَن تھک محنت کا صلہ اس کے ہاتھوں سے ریت کے مانند پھسلتا چلا گیا... اس کی زندگی کی گرفت دشمن کے چکڑاؤ میں اس طرح آئی کہ وہ کچھ ہوتا چلا گیا... جس کا دور دور تک وہم و گماں بھی نہیں تھا...

حادثات و واقعات کے تانے بانوں میں جکڑی ایک محب وطن کہانی کے رموز...

وہ دیوانوں کی طرح کچھ تلاش کر رہا تھا۔

امجد بٹ کا اگر کوئی جاننے والا اسے اس حال میں دیکھتا تو غالباً اپنی آنکھوں پر یقین نہیں کرتا۔ اس کی نفاست پسندی نہ صرف سول سروس اس کے بیوروکریٹ دوستوں بلکہ بڑے بڑے مقتدر حلقوں میں تسلیم کی جاتی تھی مگر اس وقت اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا لباس ملگجا سا ہو رہا تھا۔ اس کی میز پر کاغذات کا انبار لگا ہوا تھا۔ اگرچہ وہ سب کاغذ کسی نہ کسی حوالے سے انتہائی اہم تھے مگر اس وقت اس کے لیے ان کی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اسے صرف اس خط کی تلاش تھی۔

وہی اس کی زندگی کی ضمانت بن سکتا تھا۔

اس نے چند لمحے پہلے خود اسے اپنی انتہائی خفیہ تجوری سے نکالا تھا اور اب وہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو چکا تھا۔ اس کی سب تیاریاں مکمل تھیں۔ اسے فوراً یہاں سے نکل جانا تھا مگر وہ منحوس کاغذ... اسے ہر صورت اس کے پاس ہونا چاہیے۔

”کہیں تمہیں اس کی تلاش تو نہیں؟“ اس آواز پر وہ اچھل پڑا۔ وہ اس کی میز سے تھوڑے سے فاصلے پر کھڑا تھا۔ امجد کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ تو اسے دیر ہو گئی تھی۔

”اوہ خدایا...“ اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

”ملک اور قوم کا سودا کرنے والوں کو خدا بھی یاد آتا ہے؟“ آنے والے نے کاٹ دار لہجے میں سوال کیا۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں خوفناک ریوالور تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ وہی خط جو امجد تلاش کر رہا تھا۔ امجد نے گہری سیاہ آنکھوں والے سفاک چہرے کی جانب دیکھا۔

”مجھے ایک موقع دو... میں سب ٹھیک کر دوں گا۔“ وہ گھگھیایا۔

”اب تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“ اس کی سرد آواز میں قطعیت تھی۔ اس نے ریوالور بلند کیا اور بولا۔ ”گڈ بائے مسٹر سیکریٹری۔“

امجد نے رحم طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر سر میں اتر جانے والے شعلے نے اسے لمحے بھر میں خاموش کر دیا۔

☆☆☆

موسم کافی سے زیادہ گرم تھا۔

محکمۂ موسمیات کی پیش گوئی کے برعکس آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ تیزی سے فیروز آباد کی جانب بڑھ رہا تھا۔ یہ علاقہ دارالحکومت سے پینتالیس پچاس میل کے فاصلے پر تھا۔ یہاں زیادہ تر بیوروکریٹس، اعلیٰ افسران اور امراء کے فارمز اور ولاز نما کاٹیجز بنے ہوئے تھے۔ اس کالونی کو انتہائی خوب صورتی سے بنایا گیا تھا۔ شہروں کے شور و شغب اور آلودگی سے دور سکون سے وقت گزارنے کے لیے وہ بہترین جگہ تھی۔ ڈاکٹر سجاد کا گھر وہیں تھا۔ دارالحکومت میں وہ ایک بہترین اپارٹمنٹ میں قیام پذیر تھے مگر چھٹیوں اور عموماً ویک اینڈ پر وہ یہیں آ جایا کرتے تھے۔ وہ خود ان کے ہمراہ ایک بار یہاں آ چکا تھا۔

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا، دن کے دو بج رہے تھے۔ وہ اپنے مشن کا پہلا حصہ ختم کر چکا تھا، اب اسے دوسری چیزوں پر توجہ دینی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اسے اس معاملے سے نمٹنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ آج اسے اس سازش کے ماسٹر پلان کو لازماً آشکار کرنا تھا اور پھر ان غداروں کا خاتمہ کرنا تھا جن کی وجہ سے ڈاکٹر سجاد کو زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ ڈاکٹر سجاد کا خیال آتے ہی اس کے جبڑے بھینچ گئے۔ وہ ایک محبِ وطن اور قابل و ذہین انسان تھے جن کی انسانیت، انصاف پسندی اور خوش اخلاقی کے دشمن بھی مداح تھے۔ اگر انہیں کچھ اور وقت مل جاتا تو وہ ملک کے لیے مزید بہت کچھ کر سکتے تھے۔

ان کی حفاظت کے خیال سے کہیں نہ کہیں غلطی ضرور ہوئی تھی۔ ان کی حفاظت کے ذمے داران کو ادراک ہونا چاہیے تھا کہ ان کی زندگی انتہائی اہم ہے۔ وہ گزشتہ کئی ہفتوں سے ایک مشن کے سلسلے میں ملک سے باہر تھا۔ ڈاکٹر سجاد ملک کی ایٹمی طاقت کو دگنا کرنے کے پروجیکٹ کو ناکامی سے کامیابی کی منزل تک پہنچانے والے سائنس داں تھے۔ پروجیکٹ ”حمزہ“ ریٹائرمنٹ سے قبل ان کا آخری پروجیکٹ تھا اور ملکی سلامتی کے لیے اس کی اہمیت ٹرپل اے سے بھی زیادہ تھی۔ وہ اس بات کو بخوبی جانتے تھے پھر نہ جانے ان سے ایسی غلطی کیسے ہو گئی۔ اس نے افسوس سے سوچا۔ سیکرٹ ایجنسی کے بہترین کمانڈو کی حیثیت سے وہ کچھ عرصے ان کے ساتھ رہ چکا تھا اور انہیں اچھی طرح جانتا تھا۔

جذبات سے دور رہنا اور ہر سوچ اور رشتے کو ذہن سے جھٹک کر اپنے مقصد پر فوکس رکھنا ان کی تربیت کا پہلا اصول تھا اور وہ... خضر علی خان سیکرٹ ایجنسی کا نمبر ون کمانڈو تھا۔ یہ اس کا گھمنڈ یا انا نہیں تھی، اعداد و شمار اسے ثابت کرتے تھے۔ آج تک وہ کسی مشن میں ناکام نہیں ہوا تھا۔ ملک سے غیر مشروط محبت اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ وہ میجر فراست علی خان کا بیٹا تھا جو جامِ شہادت نوش کر کے ملک کے اعلیٰ اعزاز حاصل کرنے والوں میں سے ایک تھے۔ سرور فیروز نے اس مشن کے لیے اس کا انتخاب خاص طور پر کیا تھا۔ اس کے لیے اسے چھٹیوں سے واپس بلوایا گیا تھا۔ یہ ملکی سلامتی اور وقار کا معاملہ تھا اس لیے ایجنسی نے فوری طور پر پروجیکٹ ”حمزہ“ کی فائل کے حصول اور ذمے داروں سے نمٹنے کا فیصلہ کیا تھا۔ معاملے کی حساسیت کی وجہ سے اس کا منظرِ عام پر آنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ مشن

غیر ارادی طور پر اس کے لیے صرف کام نہیں تھا بلکہ ڈاکٹر صاحب سے انسیت اسے کسی حد تک ذاتی رنگ میں ڈھال چکی تھی۔ اہم وزارت کے غدار سیکریٹری کے بعد اب اسے دوسری مشتبہ شخصیت کی تلاش تھی۔ اس کی مکمل نشاندہی نہیں ہوسکی تھی مگر جس پر شک تھا اس کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں نفرت اتر آئی تھی۔ محبت کے نام پر دھوکا... یہ ہرگز قابلِ معافی نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب بہت نفیس طبیعت کے مالک تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد ملک کی سلامتی اور ترقی تھا اور انتہائی دکھ کی بات یہ تھی کہ اس شخص کو اس نے دھوکا دیا تھا جسے وہ اپنی زندگی میں سب سے زیادہ پیار کرتے تھے، جس پر وہ سب سے زیادہ بھروسا کرتے تھے... ان کی اپنی بیٹی... وہ اس کا اتنا ذکر کرتے تھے کہ خضر کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اسے اچھی طرح جانتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ دل ہی دل میں اسے دیکھنے اور ملنے کی تمنا کا اسیر ہوچکا تھا مگر... یہ سب اس سب سے بہت پہلے کی بات تھی۔

'جو بھی تھا' اس نے خود کو سمجھایا۔ جذبات... عقل خصوصاً ایک سیکرٹ ایجنٹ کے سب سے بڑے دشمن ثابت ہوسکتے تھے۔ اسے خود پر مکمل کنٹرول رکھنا تھا۔ ڈسپلن ہی اس کے لیے کامیابی کی کنجی تھی اور اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی۔ وہ اب اپنی منزل سے کچھ ہی دور تھا۔ چاروں طرف ہریالی نظر آرہی تھی۔ کھیتوں اور باغات کے سلسلے کے خاتمے کا مطلب منزل پر پہنچ جانا تھا۔ دوپہر کے وقت اور گرمی کی شدت کی وجہ سے سڑک ویران پڑی تھی۔ اسے پورے سفر میں کوئی دوسری گاڑی نظر نہیں آئی تھی۔ اسی لیے کچھ دور سڑک پر کھڑی سیاہ کار نے فوراً ہی اس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ اس کا بونٹ اٹھا ہوا تھا۔ جس بات نے اسے زیادہ متوجہ کیا، وہ کار کے باہر پریشان حال کھڑی ایک عورت تھی۔ اس کی عمر بمشکل تیس سال ہوگی۔ اس کی گود میں دو ڈھائی سال کا بچہ تھا جو دودھ کی بوتل منہ سے لگائے ہوئے تھا۔ خضر جلد سے جلد اپنی منزل پر پہنچ کر اپنا کام نمٹانا چاہتا تھا مگر اتنی تیز دھوپ میں اس عورت اور بچے کو نظر انداز کرنا اسے معیوب سا لگا۔ اس نے قریب پہنچ کر گاڑی روک لی۔

"پلیز ہماری مدد کریں۔" وہ اسے دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھی۔ "پتا نہیں اسے کیا ہوگیا ہے؟ اچانک ہی بند ہوگئی اور میرا فون بھی چارج نہیں ہے۔" وہ لجاجت سے بولی۔

خضر نے اثبات میں سر ہلایا۔ گاڑی کو سائڈ میں روک کر وہ اترا اور خاتون کی طرف اپنا موبائل بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لیجیے آپ اس سے کال کرلیں۔"

"شکریہ۔" اس نے اس کا فون لے لیا۔ خضر نے اس دوران اس کی گاڑی کے انجن کا جائزہ لیا، وہ بالکل ٹھنڈا پڑا ہوا تھا۔

"آپ کافی دیر سے یہاں کھڑی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں... نہیں' صرف پانچ منٹ ہی ہوئے ہوں گے۔"

خضر یک دم چوکنا ہوگیا۔ وہ صاف جھوٹ بول رہی تھی۔ "شکر ہے کہ آپ آگئے۔" اب وہ اس کے فون پر نمبر دبا رہی تھی۔ خضر کی نگاہیں اسی پر تھیں۔ اس نے جتنے نمبر دبائے تھے' وہ نہ تو کسی لینڈ لائن کے ہوسکتے تھے اور نہ ہی کسی سیل فون کے... کہیں کوئی بڑی گڑبڑ تھی۔ اس کی چھٹی حس مسلسل ریڈ سگنل دے رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے فون واپس لیتا، اس کے تربیت یافتہ کانوں نے کسی کے قدموں کی ہلکی سی چاپ کو محسوس کیا۔ وہ تیزی سے آواز کی سمت مڑا۔

"بس... بالکل حرکت نہیں... ورنہ جان سے جاؤ گے۔" ایک گھبرائی ہوئی نروس آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ لڑکی کا ہم عمر تھا۔ شکل سے پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں چھوٹا ریوالور تھا جو اس نے خضر کی طرف اٹھا رکھا تھا۔

"تمہارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ نکالو... جلدی فوراً... اور ہاں... ہمیں اس کار کی بھی ضرورت ہے... چابیاں بھی دو۔" وہ واضح طور پر شدید ٹینشن کا شکار تھا۔ خضر جانتا تھا کہ ایسے لوگ دوسروں اور خود اپنے لیے بھی سیکیورٹی رسک سے کم نہیں ہوتے۔

"اوکے... میں دیتا ہوں۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"انور... حمید کہاں ہے؟" وہ لڑکی یکلخت بولی۔

"چپ رہو تم..." وہ غرایا۔ "تم نے میرا نام کیوں لیا جاہل عورت؟"

"دیکھو... میں تمہیں پیسے اور چابیاں دے رہا ہوں مگر مجھے اس کے لیے بٹوا نکالنا ہوگا۔" خضر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ اس کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں تھا۔ نیکی کر دریا میں ڈال غالباً اسی کو کہتے ہیں۔ ایسے

ہی لوگوں نے بے حسی کو کلچر بنا دیا تھا کہ اب کوئی کسی کو مصیبت میں دیکھ کر بھی مدد کرنے سے ڈرتا تھا۔ وہ صرف ریوالور نکالنے کی مہلت چاہتا تھا۔ اسی وقت تین چیزیں ایک ساتھ ہوئیں۔ اسے اپنے عقب میں کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے تیزی سے اپنا ریوالور نکالنے کی کوشش کی اور عین اسی وقت اس کے سر پر گویا آسمان آگرا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ستارے سے اڑ رہے تھے۔ زمین پر گرتے گرتے اسے اپنے کندھے میں آگ بھرتی محسوس ہوئی۔ 'اسے یہاں رکنا نہیں چاہیے تھا' اس نے سوچا مگر اب اس فیصلے تک پہنچنے میں اسے خاصی دیر ہو چکی تھی۔

☆☆☆

سرور فیروز پروجیکٹ "حمزہ" کی تازہ ترین رپورٹ دیکھ رہا تھا۔

"خضر کی کیا خبر ہے؟" اس نے اپنے اسسٹنٹ جمال احمد سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"اور اس کی ٹریکنگ ڈیوائس کیا بتا رہی ہے؟"

"کچھ بھی نہیں... اور یہی زیادہ پریشانی کی بات ہے۔ یا تو وہ خراب ہوگئی ہے... یا پھر... وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔"

سرور فیروز کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ یہ الیکٹرانک ڈیوائس بھی ڈاکٹر سجاد کی ایجاد تھی۔ اسے خاص کمانڈوز کے جسم میں نیورولوجیکل امپلانٹ کر دیا جاتا تھا۔ جب تک وہ سانس لیتے رہتے، ان کے بارے میں معلومات حاصل رہتیں موت کی صورت میں یا رینج سے بہت زیادہ دور ہونے کی صورت میں ڈیوائس کام کرنا بند کر دیتی تھی مگر بہرحال اس میں کوئی خرابی بھی ہوسکتی تھی اور اس وقت سرور فیروز اس کے سوا اور کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

جمال کے جانے کے بعد سرور فیروز نے ایک گہری سانس لی۔ صورت حال ہر لمحے خراب ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے ڈاکٹر سجاد کا قتل، پھر ڈاکٹر صاحب کے سابق اسسٹنٹ افتخار رسول کا اچانک غائب ہو جانا اور اب خضر کی گمشدگی... اسے یہ سب بالکل ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی اہم اور بنیادی چیز ان کی نگاہوں سے اوجھل تھی۔ پروجیکٹ حمزہ ملک اور ایجنسی کے لیے بے حد اہم تھا اور اسے کسی بھی حال میں متاثر نہیں ہونا چاہیے تھا۔

ڈاکٹر سجاد جیسے شخص سے اسے ایسی غلطی کی بالکل امید نہیں تھی کہ وہ ایک انتہائی اہم اور حساس فائل کو انہیں بتائے بغیر اپنے گھر پر رکھیں گے۔ آخر انہیں اپنی اس غلطی کی قیمت جان دے کر چکانی پڑی۔ اس نے افسوس سے سوچا اور اب خضر... وہ کہاں تھا؟ وہ ان کا بہترین کمانڈو تھا۔ اس نے دراز کھول کر خضر کی فائل نکالی۔

عمر تینتیس سال، قد چھ فٹ دو انچ، وزن 180 پاؤنڈز، کمانڈو نمبر: 1، آئی کیو، بہترین سے بھی زیادہ، صحت شاندار، مدافعتی قوت: ناقابلِ مقابلہ... زخموں کی فوری ریکوری اور صحت یابی کی پراسرار صلاحیت، ایجنسی کے پاس اس سے بہتر ایجنٹ موجود نہیں تھا اور اب وہ لاپتا تھا۔

اگر خضر کی جلد ہی خبر نہیں ملتی تو اسے کسی اور کو کام مکمل کرنے کے لیے بھیجنا پڑتا۔ خضر کے بعد اس کا دوسرا انتخاب صفدر ہی ہوسکتا تھا مگر ابھی وہ اس بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ کچھ بھی سوچنا نہیں چاہ رہی تھی مگر یہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ اگر انسان کے پاس بھی کوئی ایسا ریموٹ کنٹرول ہوتا جس سے وہ جب چاہتا دماغ کے سوچنے والے بٹن کو آف کرسکتا تو کتنی سہولت ہو جاتی مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ وہ گہری سانسیں لیتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو وہ چند لمحے سیاہ ٹیلی فون سیٹ کو گھورتی رہی۔ پرانے انداز کا یہ سیٹ اس کے بچپن سے اس گھر میں موجود تھا۔ گھنٹی مسلسل بجے جا رہی تھی، آخر اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ڈاکٹر ایلیا سجاد... میں ڈاکٹر فریدوں بول رہا ہوں۔ کیسی ہو تم...؟" ڈاکٹر فریدوں اس کے اسپتال کے انتظامی امور کے سربراہ تھے۔

"جی ڈاکٹر... میں ٹھیک ہوں۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"ایلیا... میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تمہارے لیے مشکل وقت ہے۔ تمہارے والد تمہارے لیے پورا خاندان تھے۔ اس صدمے کو برداشت کرنا آسان نہیں ہے مگر... زندگی میں آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ تمہیں ان کے بغیر جینا سیکھنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے والد بھی یہی چاہتے ہوں گے۔"

"جی سر..." اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

"میرا مسئلہ یہ ہے کہ بورڈ مجھ سے اس بات پر جواب طلبی کرسکتا ہے کہ میں نے تمہیں ایک ماہ کی چھٹی کیسے

دے دی جبکہ تمہیں جوائن کیے تین ماہ بھی پورے نہیں ہوئے، مجھے انہیں بتانا ہوگا کہ چھٹیوں کے اختتام پر تم اسپتال واپس آرہی ہو یا نہیں؟ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ ایلیا! تم ایک بہترین ڈاکٹر ہو... اور اسپتال کو تمہاری ضرورت ہے۔" وہ بولے۔

"شکریہ سر... میں بہت ممنون ہوں۔ پلیز آپ مجھے اگلے ہفتے تک کا وقت دے دیں۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر! مگر پیر یا منگل تک مجھے ضرور کال کرلینا۔" انہوں نے جواب میں کہا اور سلسلہ منقطع ہوگیا۔

ریسیور رکھ کر وہ وہیں پڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ خود زندگی کی طرف لوٹنا چاہتی تھی، بس اسے یہ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کی ابتدا کہاں سے کرے۔

اسے اپنا کام پسند تھا۔ شہر کے سب سے بڑے اسپتال میں نوکری یقیناً اس کے کیریئر کے لیے بہترین آغاز تھا۔ کیا اسے واپس چلے جانا چاہیے یا یہاں رہ کر پاپا کی کتابوں پر کام کرنا چاہیے؟ کچھ دیر پہلے وہ خاصی بھوک محسوس کررہی تھی مگر اب اس کی اشتہا کہیں کھوگئی تھی، بالکل ویسے ہی جیسے اس کی زندگی سے اس کے تمام اپنے دور جا چکے تھے۔ پہلے اس کی ممی جب وہ صرف دس سال کی تھی اور اب پاپا... اس کا کوئی بھائی یا بہن نہیں تھی۔ نانا، نانی تو اس کی پیدائش سے بھی پہلے اللہ کو پیارے ہوچکے تھے۔ دادا اس کی پیدائش کے ایک سال بعد ٹریفک حادثے میں چل بسے تھے جبکہ دادی اس کی ممی کے انتقال سے ایک سال پہلے چل بسی تھیں۔ کچھ دور کے رشتے دار تھے مگر وہ ان کے نام تک نہیں جانتی تھی۔ یعنی وہ اس دنیا میں تنہا تھی۔ یہ احساس اس تکلیف دہ شدت کے ساتھ اسے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ پاپا اور وہ ہی ان کا پورا خاندان تھے۔ پاپا اگرچہ حکومت کے انتہائی حساس ادارے میں اہم پوزیشن پر تھے مگر اس کے لیے وہ ہر وقت موجود رہتے تھے۔ انہوں نے اسے کبھی ماں کی کمی بھی محسوس نہیں ہونے دی۔ یہ گھر ان دونوں کو بہت پسند تھا۔ ایلیا نے اپنی پڑھائی لاہور میں حاصل کی تھی مگر ہر چھٹیوں پر وہ اور پاپا یہیں آکر رہتے... وہ کہا کرتے تھے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ تمام وقت یہیں گزاریں گے اور اپنی کتابوں پر کام کریں گے۔ انہوں نے اسے جینا سکھایا تھا اور اب وہ خود چلے گئے تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ ان کے بغیر کیسے رہے گی... کیا کرے گی؟ اس نے آنکھوں میں بھر آنے والے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی۔ وہ اس حادثے کو یاد نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ اسپتال میں تھی جب اسے پاپا کے سیڑھیوں سے گر جانے کی خبر ملی۔ وہ پہلی فلائٹ سے اسلام آباد پہنچی... مگر پاپا جاچکے تھے، اس سے ملے بغیر... اسے کچھ بتائے بغیر...

ان کے محکمے کے لوگوں نے اور پھر سرور فیروز سب نے اسے یہی بتایا کہ وہ سیڑھی سے پھسل گئے تھے جس کی وجہ سے ان کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی... مگر کیوں اور کیسے... اس وقت ایلیا کے سوال تھے بھی نہیں، اسے تو بس اتنا پتا تھا کہ پاپا بہت دور جاچکے ہیں اور اب وہ ان کی آواز کبھی نہیں سن پائے گی...

"بس..." وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔ پاپا یقیناً اس کی موجودہ ذہنی حالت پر خوش نہیں ہوں گے۔ وہ اسے ایک مکمل اور پریکٹیکل شخصیت کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس نے خود کو یاد دلایا... انہیں گئے تین ہفتے اور ایک دن ہوچکا تھا مگر وہ اب تک یہ فیصلہ بھی نہیں کرپائی تھی کہ اسے اپنی زندگی کے ساتھ کرنا کیا ہے۔ پہلے اس نے اسپتال چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ یہیں پاپا کی یادوں کے ساتھ رہنا چاہتی تھی مگر اب اسے اسپتال واپس جانا ہی بہتر لگ رہا تھا۔ یہی پاپا چاہتے تھے کہ وہ چند سال وہاں تجربہ حاصل کرے اور پھر ان کے واحد قریبی دوست ڈاکٹر اسحاق کا اسپتال چلائے مگر یہ بعد کی بات تھی۔ اس وقت اسے خود کو سنبھالنے کے لیے کام کے ڈھیر میں گم ہوجانا چاہیے۔ یہی سوچتی ہوئی وہ کچن کی جانب بڑھ گئی۔ یہ وسیع کچن کم ڈائننگ روم اس کی پسندیدہ جگہ تھی یہیں ایک دیوار پر ان کی بہت سی تصاویر سجی تھیں۔ وہ ہر دفعہ ایک نئی تصویر لگایا کرتے۔ یوں یہ تصویریں نہیں، ان کی یادیں تھیں۔ اس کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھر گئیں۔ 'شاید اب زندگی کبھی بھی پہلے جیسی نہیں ہوسکتی۔' اس نے سوچا پھر بھی ڈاکٹر فریدوں ٹھیک کہہ رہے تھے۔ وہ کل صبح انہیں فون کرکے اپنی واپسی کے بارے میں بتادے گی۔ اس نے فیصلہ کیا۔

☆☆☆

فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ وہ چند لمحے خوف زدہ انداز میں سیل فون کو گھورتا رہا پھر اس نے مجبوراً اسے کان سے لگایا۔ "ہیلو..."

"مجھے بتاؤ کیا ہورہا ہے، کیا تمہیں وہ فائل مل گئی؟"

"نہیں، ابھی تک نہیں... مگر میں جلد ہی..."

"مجھے کہانیاں مت سناؤ... کیا تم نے کل کا اخبار نہیں پڑھا؟ امجد مر چکا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے، انہیں ہم تک

پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟" دوسری طرف سے کاٹ دار لہجے میں سوال کیا گیا۔

"میں کوشش کررہا ہوں۔"

"مگر یہ کافی نہیں ہے۔" وہ غرایا۔ "یا تو تمہیں اس فائل کو تلاش کرنا ہوگا یا ہم دونوں کو مرنے کے لیے تیار ہونا ہوگا۔ وہ بہت زیادہ انتظار نہیں کریں گے۔"

"میں اس ہفتے کے اندر اسے تلاش کرلوں گا۔" وہ پُریقین انداز میں بولا۔

"جیسے ہی فائل ہاتھ لگے، مجھے فون کرنا اور یاد رکھو... تمہیں وہاں کوئی سراغ نہیں چھوڑنا ہے۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔" اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ اُسے معلوم تھا کہ اسے جلد از جلد اس مسئلے کو حل کرنا تھا، کسی بھی قیمت پر...

☆☆☆

رات گئے تک ایلیا نے بہت سا کام نمٹا لیا تھا۔ پاپا کے زیرِ استعمال تمام اہم چیزیں ان کے کمرے میں موجود الماری اور ڈیوائڈر میں رکھ دی گئی تھیں۔ اس وقت وہ ان کے کمرے میں ہی تھی۔ کمرے میں سب کچھ بالکل ویسا ہی تھا جیسا ان کی زندگی میں ہوا کرتا تھا۔ اس نے ان کی الماری کھولی، ہینگرز پر ان کے کپڑے اسی طرح موجود تھے۔ وہ انہیں کسی کو دینے پر خود کو تیار نہیں کرپائی تھی۔ ان چیزوں کے وہاں ہونے سے اسے ڈھارس سی محسوس ہوتی تھی جیسے پاپا وہاں موجود ہیں۔ جیسے وہ ابھی لوٹ آنے والے ہوں۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑی رہی پھر بیڈروم سے ملحق اسٹڈی میں داخل ہوئی۔ دروازے والی دیوار کو چھوڑ کر کمرے کی تینوں دیواریں بک شیلف اور ان پر سجی کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ان کی میز پر ان کا کمپیوٹر، رائٹنگ پیڈ، ٹیلی فون، آنسرنگ مشین سب کچھ ویسے کا ویسا موجود تھا۔ سامنے بڑے سے مگ میں بہت سے پین، بال پوائنٹس اور پنسلیں موجود تھیں۔ یہ مگ اس نے انہیں ان کی سالگرہ پر دیا تھا۔ اس پر اس کی اور پاپا کی تصویر کندہ تھی۔ اس سے پہلے ڈاکٹر ہونے کے باوجود وہ نہیں جانتی تھی کہ بعض اوقات آنسو آنکھوں سے نہ بہنے کے باوجود پورے وجود کو تکلیف کے سیلاب میں ڈبو سکتے ہیں اور یادیں دل پر نہ بھرنے والی خراشیں بھی ڈال سکتی ہیں۔ اس نے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی مگر ان کی کرسی پر بیٹھتے ہی وہ بالآخر اس کے گالوں پر بہہ نکلے۔ وہ ان دنوں میں کئی بار سوچنے کے باوجود ان کی اسٹڈی میں نہیں آسکی تھی مگر اب اسے یہاں بھی چیزیں ٹھیک ٹھاک کرنا ہی تھیں۔ وہ لاہور واپس جانے سے پہلے سب چیزوں کو محفوظ اور سیٹ کرلینا چاہتی تھی۔ خود پر قابو پاتے ہوئے وہ ان کی تمام اشیا کو دیکھتی جارہی تھی۔ میز کی دراز کی چیزوں کو ٹھیک کرتے اور سامان کو ان کے اندر رکھنے کے دوران درمیانی دراز میں اس کا ہاتھ لکڑی کے کسی ابھرے ہوئے ٹکڑے سے ٹکرایا اور دیکھتے ہی دیکھتے دراز میں ایک گہری سی خفیہ دراز نمودار ہوگئی۔ وہ ایک لمحے کو ششدر سی رہ گئی۔ اس نے اندر دیکھا، سامنے ایک سرخ رنگ کی فائل رکھی تھی۔ اس پر واضح الفاظ میں "ٹاپ کانفیڈینشل" کے الفاظ موجود تھے۔ اس نے جھجکتے ہوئے اسے کھولا۔ پہلے صفحے پر پروجیکٹ حمزہ لکھا تھا۔ پاپا کی ساری فائلوں پر ریٹائرمنٹ سے پہلے کی تاریخیں تھیں مگر اس پر ماہِ قبل کی تاریخ پڑی تھی۔ اس میں کچھ کاغذ موجود تھے مگر انہیں غالباً کسی کوڈ میں تحریر کیا گیا تھا۔ فائل کے پچھلے حصے میں ایک چھوٹا سا کور بنا ہوا تھا جس میں ننھی سی یو ایس بی موجود تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے یو ایس بی کو دیکھا پھر اسے دوبارہ کور میں رکھ دیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ پاپا ریٹائر ہوچکے تھے مگر شاید وہ محکمے کے ساتھ کسی پروجیکٹ پر کام کررہے ہوں۔ اس نے سوچا مگر ان کی موت کے بعد سرور فیروز نے خود اسے بتایا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ پھر یہ فائل اس طرح اتنی خفیہ جگہ پر چھپائی گئی تھی۔ یعنی انہیں شک تھا کہ یہ کسی کے ہاتھ لگ سکتی ہے۔ وہ بہت بے کلی محسوس کررہی تھی۔

سامنے ٹیبل پر ٹیلی فون کے ساتھ آنسرنگ مشین بھی موجود تھی۔ اس نے توجہ بٹانے کے لیے پرانے پیغامات سننا شروع کردیے۔ معمول کے پیغامات کے دوران ایک بھرائی ہوئی آواز نے اسے چونکا دیا۔ بولنے والا انتہائی عجلت میں محسوس ہورہا تھا۔

"سجاد! مجھے فوراً کال کرو... یہ انتہائی اہم ہے۔ یہ پروجیکٹ حمزہ کے بارے میں ہے۔ میرا... میرا خیال ہے کہ ہم مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔"

اس نے وہ پیغام دوبارہ سنا... کچھ نہ کچھ، کہیں نہ کہیں غلط تھا۔ اس پیغام میں کسی کا نام نہیں تھا مگر فون نمبر موجود تھا۔ اس نے کچھ سوچے سمجھے بغیر اس نمبر کو ڈائل کیا۔ تین گھنٹیوں کے بعد ایک کمپیوٹرائزڈ آواز ابھری جو اسے اپنا پیغام ریکارڈ کرانے کو کہہ رہی تھی۔ اس نے جواب میں اپنا

نام بتا کر فوراً کال کرنے کا پیغام ریکارڈ کرادیا اور ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

یکلخت اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ وہ اس نمبر پر پہلے بھی ایک پیغام ریکارڈ کرا چکی تھی۔ پاپا کے جانے کے۔۔ دس بارہ دن بعد گھر کے نمبر پر لگی آنسرنگ مشین میں موجود پیغامات کا جواب دیتے ہوئے اس نے اس نمبر پر بھی کال کی تھی تب بھی وہاں آنسرنگ مشین ہی لگی ہوئی تھی جس پر اس نے اپنا پیغام ریکارڈ کرایا تھا... ''یہ نمبر کس کا تھا؟'' وہ مسلسل سوچ رہی تھی۔ اس کے پاس پاپا کا ذاتی نمبر بھی موجود تھا۔ اس نے دوبارہ فائل کھولی، اس میں موجود یو ایس بی کو نکال کر پاپا کے کمپیوٹر میں لگایا۔ اس میں موجود تمام تفصیلات کوڈ میں ہی تھیں، صرف پاپا کے سابق اسسٹنٹ افتخار رسول کی ایک ای میل موجود تھی۔ اس ای میل کے آخر میں نام کے ساتھ ان کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ نمبر پڑھتے ہی ایلیا اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ وہ نمبر افتخار رسول کا ہی تھا۔

اس کے پاپا کو اسی نمبر سے فون کیا گیا تھا... وہ کسی مصیبت میں پھنس سکتے تھے اور کیوں...؟ یہ سوال اس کے دل و دماغ پر چھاتا جا رہا تھا۔ آخر یہ سب کیا ہو رہا تھا، پاپا کے ساتھ کیا ہوا تھا... ان کی موت واقعی ایک حادثہ تھی یا...؟ اس خیال سے ہی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی... نہیں نہیں... یہ ممکن نہیں... اس نے یو ایس بی کمپیوٹر سے نکالی، اسے فائل کے کور میں رکھ کر فائل کو واپس اسی خفیہ خانے میں رکھ دیا۔ یقیناً پاپا نے کچھ سوچ کر ہی یہاں رکھا ہوگا۔ اس نے سوچا، اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ وہ کچھ کھا کر اب آرام کرنا چاہتی تھی۔ ڈنر... ٹیلی ویژن... گرم پانی سے غسل اور پھر ایک اچھی آرام دہ نیند... اس کے علاوہ اب وہ کچھ نہیں کرے گی۔ اس نے اپنے آپ کو بتایا اور پھر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

درد، تکلیف اور مدہوشی کے درمیان اسے دور سے چمکتی روشنی نظر آئی۔ اس کی پلکیں منوں وزنی ہو رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر روشنی کی جانب دیکھا۔ وہاں تک پہنچنا اسے ناممکن سا لگ رہا تھا مگر اس نے اس کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ وہ بہت زیادہ تھکا ہوا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی... وہ بالآخر وہاں تک پہنچ گیا۔

یہ کوئی مکان تھا جس کے دروازے پر لگے تیز گیٹ لیمپس اسے یہاں تک لے آئے تھے۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ آہنی گیٹ کے آس پاس کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بغیر سوچے سمجھے گیٹ پر چڑھ کر مکان میں اتر گیا۔ یہ اس کے لیے ذرا بھی مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ چھوٹے سے لان اور پارکنگ ایریا کو عبور کر کے وہ برآمدے اور پھر اندرونی دروازے کے پاس پہنچ گیا۔

☆☆☆

وہ ڈنر کے لیے سینڈوچ تیار کر رہی تھی مگر نہ جانے کیوں اسے بار بار شدید خوف کا احساس ہو رہا تھا۔ ڈر گویا کپکپی بن کر اس کے وجود میں پھیل رہا تھا۔ شاید یہ بھوک کی وجہ سے ہو رہا ہو... اس نے سوچا اور سینڈوچ کا چھوٹا سا نوالہ توڑا مگر اس سب کے باوجود وہ خود کو اس عجیب سے احساس میں گھرا پا رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے یہاں تنہا رہنے کی عادی تھی اور پہلے اسے اس طرح ڈر کبھی نہیں لگا تھا۔ آج سب کچھ ہی عجیب ہو رہا تھا۔ اس کا ذہن پھر اس فائل اور... یو ایس بی نما چیز کی طرف بھٹک گیا مگر اس نے شعوری طور پر خود کو وہ سب سوچنے سے روکا کھانا تو اس سے ویسے بھی نہیں کھایا جا رہا تھا لہٰذا اس نے برتن دھو کر اوپر بیڈ روم میں جانے کا ارادہ کیا۔ وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہی تھی کہ چھوٹے سے لاؤنج کے پار بنے بیرونی دروازے کی ناب گھومی۔ وہ ایک دم ساکت سی ہو گئی۔ دروازہ آہستگی سے کھلا تھا اور وہاں... وہ اس کے سامنے کھڑا تھا... ایک لمبا چوڑا سایہ... اس کا دل گویا دھڑکنا بھول گیا۔ وہ آہستگی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ روشنی میں آ گیا۔ ایلیا اب اسے واضح طور پر دیکھ سکتی تھی۔ وہ ایک طویل القامت اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ عام حالت میں وہ شاید اچھا خاصا ہینڈسم شخص نظر آتا مگر اس وقت اس کی حالت بہت بری تھی۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

ایلیا اسے پھیلی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اسے تیزی سے اوپر کی جانب بھاگنا چاہیے... اس نے سوچا مگر اس کے حرکت کرنے سے قبل ہی شاید اس نے اس کا ذہن پڑھ لیا تھا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے اس کا ہاتھ اپنی مضبوط گرفت میں جکڑ لیا۔ وہ چیخنا چاہ رہی تھی مگر اس سے پہلے ہی اس کی گرفت کمزور پڑی اور پھر وہ دھڑام سے فرش پر جا گرا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا... ایلیا حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

کافی دیر تک ایلیا اپنی جگہ ساکت کھڑی رہی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ انسانیت اور پھر ڈاکٹر ہونے کا خیال اسے زمین پر پڑے شخص کا جائزہ لینے پر اکسا رہا تھا مگر وہ اس کے قریب جاتے ہوئے ڈر بھی رہی تھی۔ جب کئی لمحوں تک وہ اسی طرح بے حس و حرکت پڑا رہا، تب وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کی گردن پر ہاتھ رکھا۔ وہ سانس لے رہا تھا اگرچہ اس کی نبض بہت آہستہ چل رہی تھی۔ نبض دیکھتے ہوئے وہ چونک اٹھی۔ وہ تیز بخار میں گویا تپ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کمرے کی بقیہ لائٹس جلا دیں۔ اب وہ اسے بہتر طور پر دیکھ سکتی تھی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس کے کپڑے سوکھے کیچڑ سے بھرے ہوئے تھے۔ الجھے ہوئے بالوں میں مٹی، پتے اور چھوٹے موٹے ٹکڑے پھنسے ہوئے تھے۔ اس کے ماتھے، چہرے اور گردن پر کئی خراشیں موجود تھیں۔ کندھے پر خون کا خاصا بڑا دھبا سوکھا ہوا تھا جو کہ ظاہری بات تھی کہ ان خراشوں سے نہیں بنا تھا۔ اس خون کی وجہ تسمیہ جاننے کے لیے اس نے اس کی قمیص کو ہٹایا۔ کندھے سے ذرا نیچے ایک گہرا زخم موجود تھا۔ اس نے اسے دیکھ کر گہری سانس لی اور اسے بمشکل ہلکی سی کروٹ دلا کر کندھے کی پچھلی سمت کا معائنہ کیا۔ گولی ہڈی کو چھوتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اوپری سطح پر زخم نے مندمل ہونا بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ قدرے تشویش سے اپنے غیر متوقع مریض کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی تشویش کی وجہ وہ زخم نہیں تھا۔ وہ اس کے تیز بخار سے پریشان تھی۔ اس کی وجہ کوئی انفیکشن ہو سکتا تھا۔ اس کے جسم پر اس ایک زخم کے علاوہ اور کوئی بڑی چوٹ نظر نہیں آ رہی تھی پھر اس کی اس بے ہوشی کی وجہ صرف بخار ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے اس کے سر کا جائزہ لیا۔ سر کے پچھلے حصے پر اس کے گھنے بالوں میں اس کا ہاتھ ایک اچھی خاصی گومڑ نما چوٹ سے ٹکرایا۔ اس نے اس کا قریب سے جائزہ لیا۔ وہاں خون کا کوئی نشان نہیں تھا مگر نچلے حصے میں اچھا خاصا گومڑ سا بنا ہوا تھا۔ اسے یا تو کسی بھاری چیز سے زوردار چوٹ لگائی گئی تھی یا پھر وہ کسی حادثے کا شکار ہوا تھا۔ اس کا دماغ بار بار پولیس اور اسپتال کی تکرار کر رہا تھا مگر اسے فی الحال اس اجنبی کو پہلے صوفے تک لے جانا تھا۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ اسے اسپتال لے جانا تھا۔ ان دونوں کاموں کے لیے اسے نوازش خان کو بلانا ہوگا۔ اس نے سوچا۔ چوکیدار کا خیال آتے ہی اسے اجنبی کے اس طرح اندر گھس آنے کا خیال آیا۔ آخر اس کی موجودگی میں وہ کیسے اندر آ گیا... اس نے موبائل پر نوازش خان کا نمبر ملایا۔

''اندر آؤ...'' کال ریسیو ہونے پر اس نے خشک لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ تیر کی سی تیزی سے اندر پہنچے گا اور ہوا بھی ایسے ہی... وہ چراغ کے جن کی طرح وہاں حاضر ہو گیا تھا... زمین پر پڑے اجنبی کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا پھر اچھلا اور... تیزی سے اس کی جانب آیا۔

''یہ... یہ کون اے... یہ خدائی خوار اندر کیسے آ گیا؟ بی بی صاب! آپ ٹھیک اے؟ آپ کو چوٹ موٹ تو نہیں آئی؟ آپ نے اس کو گولی مار دیا؟ یہ مر گیا اے...؟'' وہ بوکھلاہٹ میں سوال پہ سوال کیے جا رہا تھا۔

''اس کا جواب تو تمہیں دینا چاہیے خان... تمہاری موجودگی میں یہ اندر کیسے آ گیا؟'' وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔

نوازش خان لڑکپن سے اس کے پاپا کے لیے کام کر رہا تھا۔ ایلیا جانتی تھی کہ وہ انتہائی وفادار انسان ہے اور اپنی ڈیوٹی کو عبادت سے کم نہیں مانتا۔

''ام شرمندہ اے... بی بی صاب! کل حلیم کھایا تھا... شوق میں زیادہ کھا گیا، بس باتھ روم تک گیا تھا۔ اس کے علاوہ تو ام گیٹ کے پاس سے ہٹا بھی نہیں اے۔'' وہ بہت شرمندہ نظر آ رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں ہے خان۔'' وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ''اس نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ خود ہی بے ہوش ہو گیا۔ شاید یہ بے چارہ کسی حادثے کا شکار ہوا ہے۔ تم اسے ذرا صوفے پر لٹا دو... ہم اسے اسپتال لے چلیں گے۔''

''ٹھیک ہے بی بی...'' اس نے اس کی مدد سے اسے صوفے پر لٹا دیا۔ صوفے پر لٹاتے ہوئے وہ بے ہوشی کی حالت میں کچھ بڑبڑایا تھا۔

''یہ... یہ کچھ کہہ رہا ہے بی بی صاب...'' نوازش خان بولا۔

''اچھا... سننے دو... شاید اس کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے۔'' وہ اس کے ہونٹوں کے پاس اپنا کان لے جاتے ہوئے بولی۔ اس کی بڑبڑاہٹ آہستہ آہستہ دھیمی ہوتی جا رہی تھی مگر جو چند الفاظ اس کی سمجھ میں آئے تھے، انہوں نے اسے گنگ سا کر دیا۔

"ڈاکٹر سجاد... ڈاکٹر صاحب... افتخار رسول... غدار۔" وہ اب بالکل خاموش ہو چکا تھا۔ ایلیا اسے گھورے جا رہی تھی۔ اس کے تصور میں نہ چاہتے ہوئے بھی وہ قاتل اور پھر وہ پیغام در آیا تھا۔

"ہم مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔" اس نے غور سے اجنبی کی طرف دیکھا۔ وہ اب پہلے کی طرح بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔

"بی بی صاب... ام گاڑی نکالے؟" وہ اپنے خیالوں میں اتنی مگن تھی کہ نوازش خان کی آواز پر اچھل سی پڑی۔

"نہیں نہیں... اس کا زخم اتنا گہرا نہیں ہے۔ ہم اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کریں گے... تم اسے گیسٹ روم میں پہنچا دو۔" وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

اسے بستر پر لٹانے کے بعد اس نے خان کی مدد سے اس کے زخم کی ڈریسنگ کر دی تھی۔ اس کے سر کی چوٹ پر درد کم کرنے کا اسپرے اور پھر دوا بھی لگا دی تھی۔ بخار اور انفیکشن کے تدارک کے لیے انجکشن بھی دے دیا تھا۔ اس سب کے باوجود اس کی نیند نہیں ٹوٹی تھی۔

"ام یہاں اندر رکے بی بی صاب...؟ کہیں اس کو ہوش آ گیا اور یہ کوئی چور مور ثابت ہوا تو پھر..." وہ اپنے پستول کو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"ہاں مگر تم لاؤنج میں بیٹھو... میں یہاں ہوں۔ اگر ضرورت ہوئی تو تمہیں آواز دوں گی۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے... ام ادر اے... آپ کے لیے چائے کافی کچھ بنائے؟"

"ہاں مگر پہلے تم دروازے چیک کرو... پھر میرے لیے ایک اچھی سی چائے بنا دو۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

وہ چاہتی تھی کہ اسے اس کے سامنے ہوش آ جائے۔ وہ سب کچھ جاننا چاہتی تھی۔ صبح یقیناً وہ اتھارٹیز اور اس کے گھر والوں سے بات کرتی... اس کے ہوش میں آنے کے بعد... ابھی تو سوال یہ تھا کہ وہ اس کے پاپا کو کس طرح جانتا تھا پھر ان کے پرانے اسسٹنٹ کا نام اور... غدار... وہ کسے غدار کہہ رہا تھا... یہ معاملہ کیا تھا؟ وہ اس بارے میں جو کچھ بھی جاننا چاہتی تھی، وہ اسے اس اجنبی سے ہی معلوم ہو سکتا تھا۔ اسے اب اس کے ہوش میں آنے کا انتظار تھا۔ اب یہ وقت ہی بتانے والا تھا کہ اس کا فیصلہ درست تھا یا غلط...

☆☆☆

"بی بی صاب... بی بی صاب..." خان کی آواز پر ایلیا کی آنکھ کھلی۔ وہ دروازے پر کھڑا اسے آواز دے رہا تھا۔ رات نہ جانے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ اٹھتے ہی اس کی نظر بستر پر پڑی۔ وہ اب بھی گہری نیند سو رہا تھا۔ ہاتھ کے اشارے سے خان کو جواب دیتی ہوئی وہ باہر نکل آئی۔

"بی بی صاب... یہ زندہ ہے...؟" وہ خاصی تشویش سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں... ہاں خان زندہ ہے۔"

"شکر ہے اللہ صاب کا... ام تو ڈر رہا تھا۔" وہ مطمئن ہو کر بولا۔

"صفیہ آ گئی ہے؟" کچن میں برتنوں کی آواز سن کر اس نے پوچھا۔

"جی بی بی صاب... اب اس کا طبیعت ٹھیک ہے... اس نے آپ کا ناشتا بھی بنا لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم چلو میں اپنے کمرے سے آ رہی ہوں۔"

اپنے کمرے سے واپسی پر وہ پھر گیسٹ روم میں آئی۔ وہ اسی طرح سو رہا تھا۔ رات بھر میں اس نے کروٹ تک نہیں بدلی تھی حتیٰ کہ اس نے... دو دفعہ اسے جگانے کی کوشش بھی کی تھی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔ اس نے اس کی نبض دیکھنے کے لیے اس کا ہاتھ پکڑا۔ اسے چھوتے ہی اسے حیرت کا جھٹکا لگا اس کا بخار اتر چکا تھا۔ اس کے ماتھے پر حیرت سے بل سا پڑ گیا۔ اتنی جلد اس کا بخار کیسے اتر سکتا تھا؟ اسے تو زیادہ برے نتائج کی امید تھی۔ احتیاطاً اس نے تھرمامیٹر سے چیک کرنا مناسب سمجھا۔ ٹمپریچر بالکل نارمل تھا۔ وہ حیرت زدہ تھی مگر بعد میں ثابت ہوا کہ یہ تو ابتدا تھی۔ اس کے معائنے پر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کے چہرے اور ہاتھوں پر موجود خراشیں تقریباً بھر چکی تھیں۔ گولی کا زخم بھی خاصا بہتر تھا۔ ایک ہی رات میں وہ کئی دن پرانا زخم لگنے لگا تھا۔ "یہ ناممکن ہے۔" وہ بڑبڑائی پھر گویا اس نے امتحان کے طور پر اس کے سر کے پچھلے حصے کو ہاتھ لگایا۔ حیرت کا ایک اور جھٹکا وہاں اس کا منتظر تھا۔ وہ گومڑ اب بالکل ہلکے سے ابھار کی طرح باقی رہ گیا تھا۔ اس قدر جلد ریکوری حیران کن تھی۔ اس نے ایسے کیسز کے بارے میں پڑھا تھا مگر اس کے لیے یہ پہلا تجربہ تھا۔ اسے ڈاکٹر اسحاق کا خیال آیا۔ وہ بہترین ڈاکٹر تھے اور ان کا اسپتال

دارالحکومت کے بہترین اسپتالوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ وہ یقیناً اس بارے میں بتا سکیں گے۔ اس نے سوچا مگر پتا نہیں وہ اس اجنبی کے بارے میں کیا محسوس کریں۔ وہ بچپن سے ان سے ہر بات کرتی آئی تھی۔ پاپا کے بعد وہی واحد انسان تھے جن سے وہ اتنا قریب تھی۔ پاپا کو تو پھر بھی کبھی غصہ آ جاتا تھا مگر اس نے انہیں کبھی ناراض یا غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ ان سے اس کے بارے میں بات کر سکتی تھی... اس نے بستر پر لیٹے اجنبی کو غور سے دیکھتے ہوئے فیصلہ کیا۔

☆☆☆

سرور فیروز اپنی کرسی پر خاموشی سے بیٹھا جمال احمد سے خضر کے حوالے سے تازہ ترین رپورٹ سن رہا تھا۔ اس کی تلاش تندہی سے جاری تھی۔ ایجنٹوں نے دارالحکومت سے فیروز آباد تک کے راستے کو چھان پھٹک لیا تھا۔ انہیں وہاں سے کچھ بال، جلد کے ٹکڑے، جما ہوا خون ملا تھا جو ڈی این اے ٹیسٹ کے مطابق خضر کا تھا... یعنی وہ وہاں تھا۔ اس کے بعد وہ خود کہیں چلا گیا یا اسے لے جایا گیا تھا۔ بس اس کے آگے وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔

"وہ کسی اسپتال یا کلینک نہیں پہنچا ہے... ہم نے مُردہ گھروں کو بھی چیک کر لیا ہے۔" سرور نے اس بات پر ایک ابرو اٹھا کر جمال کو گھورا۔

"وہ زندہ ہے... میں یہ بات تمہیں کس طرح سمجھا سکتا ہوں؟"

"سر! آئی ایم سوری، اس کی ڈیوائس کے کام نہ کرنے کی ایک وجہ اور ہو سکتی ہے۔ میں نے اس حوالے سے اسپیشلسٹ ڈویژن میں ڈاکٹر شمشاد سے بات کی ہے، ان کا کہنا ہے کہ اس کے سر پر زوردار چوٹ یا چوٹیں لگنے کی صورت میں ہونے والا نیورولوجیکل ڈیمج اس ڈیوائس کو ناکارہ کر سکتا ہے۔"

"یہی ہوا ہے..." سرور میز پر مکا مار کر بولا۔ "اسی وجہ سے ہم اسے ٹریس نہیں کر پا رہے ہیں۔ جمال! مجھے اڑتالیس گھنٹوں میں خضر چاہیے زندہ یا... مُردہ۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟ ٹیم تیار کرو... یہ اس وقت تمہارا سب سے اہم مشن ہے۔"

"جی سر... کیا خضر کے ادھورے مشن کے لیے کسی اور کو بھیجا جائے؟"

"مشن...؟" سرور نے سوچ کر کہا۔ "نہیں، فی الحال نہیں۔ یہ تفتیش چند دن انتظار کر سکتی ہے۔ ایلیا سجاد کہیں غائب نہیں ہو رہی۔ تم بس وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔"

☆☆☆

وہ مشینی انداز میں ناشتا کر رہی تھی۔ اس کا ذہن اس اجنبی کے متعلق سوچنے میں مصروف تھا۔ "ناشتے کے فوراً بعد وہ اسے جگانے کی کوشش کرے گی۔" اس نے سوچا۔ اس کا اس طرح مسلسل گہری نیند سونا اسے پریشان سا کر رہا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اس نے گیسٹ روم کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

"بی بی... ڈاکٹر اسحاق صاحب کا فون ہے۔" صفیہ نے فون اٹھاتے ہی اسے پکارا۔

"السلام علیکم ڈاکٹر انکل..." اس نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام... کیسی ہے میری بیٹی؟ مجھے رات دن تمہاری فکر رہتی ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر تم میری بات مان کر کچھ دن میرے گھر رک جاتیں..." وہ نرمی سے بولے۔

"انکل! میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اچھا، یہ بتاؤ کیا ہو رہا ہے؟ آج کا کیا پروگرام ہے؟"

"ڈاکٹر انکل... میں آج شاید آپ کی طرف آ رہی ہوں... آپ کے اسپتال..."

"ضرور بیٹا... میں انتظار کروں گا۔"

فون بند کرنے سے پہلے اس نے کئی بار سوچا کہ انہیں اس اجنبی کے بارے میں بتائے مگر پھر اس نے فون پر بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

فون رکھ کر وہ تیزی سے گیسٹ روم کی طرف بڑھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ہکا بکا سی رہ گئی۔

وہ بستر پر نہیں تھا... خوف اور گھبراہٹ نے یک دم اس کے وجود پر حملہ کر دیا۔ چادر زمین پر گری پڑی تھی۔ کمرے کی کھڑکی بند تھی۔ دروازے سے وہ باہر آیا نہیں تھا... پھر وہ کہاں چلا گیا؟ باتھ روم... اسے فوراً خیال آیا کہ شاید وہ وہاں ہو۔ وہ یہ سوچ کر آگے بڑھی ہی تھی کہ اچانک کسی نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے ہینڈ لاک میں جکڑ لیا۔

وہ... وہی تھا۔ وہ اس طاقتور گرفت کو پہچان سکتی تھی۔

"پلیز مجھے چھوڑ دو۔" وہ نرمی سے بولی۔ "میں تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گی... میں ایک ڈاکٹر ہوں اور تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔"

اس کی گرفت قدرے ہلکی پڑ گئی پھر اس کے ہاتھ ایلیا کی گردن کو چھوڑ کر اس کے کندھوں پر آگئے۔ ایلیا نے اس دوران میں اپنا رخ اس کی طرف کرلیا تھا۔ وہ اس کی دماغی حالت کو سمجھ رہی تھی۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم ہوش میں آگئے... کون ہو تم؟ کیا نام ہے تمہارا...؟'' وہ اس کے سوالوں کے جواب میں اسے مسلسل دیکھے جارہا تھا۔ اس کی آنکھیں ایلیا کے چہرے پر جمی تھیں۔ اب وہ بالکل بیمار نہیں لگ رہا تھا۔ ایلیا کے سوال پر اس نے غالباً جواب دینے کے لیے منہ کھولا، کچھ بولنے کی کوشش کی پھر کسی قدر الجھن کے ساتھ منہ بند کرلیا۔

''جواب دو... مگر ٹھہرو... ہم یہاں بستر پر بیٹھ جاتے ہیں۔'' ایلیا نے نرمی سے کہا اور آہستگی سے اس کے ہاتھ ہٹا کر بستر کے کونے پر بیٹھ گئی۔ وہ چند لمحے کھڑا رہا پھر وہ بھی اسی کی طرح بستر کے دوسرے کونے پر بیٹھ گیا۔

''مجھے اپنی نبض چیک کرنے دو...'' ایلیا نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کی نبض بالکل نارمل انداز میں چل رہی تھی۔ ''زبردست۔'' وہ بولی۔

جواب میں اس نے بالکل ایلیا کے انداز میں اس کی کلائی تھامی اور ایک لمحے بعد بولا۔ ''زبردست۔''

ایلیا الجھن کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آواز خاصی بھاری تھی اور وہ کچھ اس طرح بول رہا تھا جیسے وہ بولنا سیکھ رہا ہو... یا اس کا گلا خشک ہو۔ ایلیا تیزی سے سوچ رہی تھی۔ اس کی اس کیفیت کی وجہ سر کی چوٹ ہوسکتی تھی اور شاید... شدید پیاس بھی...

''میرا خیال ہے کہ تمہیں پانی پینا چاہیے۔'' اس نے بیڈ سائڈ پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی ڈال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے چونکنے کے انداز میں گلاس اور پھر ایلیا کی طرف دیکھا جیسے وہ سمجھ نہ پارہا ہو کہ اسے کیا کرنا ہے۔ ایلیا نے گلاس اس کے ہونٹوں سے لگانے کی کوشش کی مگر وہ تیزی سے کھڑا ہوگیا۔ اس کے چہرے پر کچھ اتنی وحشت تھی کہ ایلیا کا دل ایک لمحے کو خوف سے اچھل کر حلق میں آگیا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ خود پر قابو پا کر بولی۔

''یہ دیکھو... اسے اس طرح پیتے ہیں۔'' اس نے گلاس اپنے منہ سے لگایا اور چند گھونٹ پانی پیا۔ ''شکر ہے اللہ کا۔'' وہ عادتاً بولی اور اس کی طرف گلاس بڑھایا۔

وہ اب بھی ایک لمحے کے لیے ہچکچایا پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے گلاس تھام کر پانی کا چھوٹا سا گھونٹ لیا... پھر گویا مطمئن سا ہو کر گلاس منہ سے لگا لیا اور ایک سانس میں خالی کردیا۔ اس کے اشارے پر ایلیا نے ایک گلاس پانی اور دیا۔ وہ بے صبری سے پانی پی رہا تھا۔ تیزی کی وجہ سے پانی اس کی ٹھوڑی سے بہہ رہا تھا۔ پانی پی کر اس نے گلاس ایلیا کی جانب بڑھایا اور بولا۔ ''شکر ہے اللہ کا۔''

ایلیا کا دل بھر آیا... اسے یقین تھا کہ اس اجنبی کا اس کے پاپا سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ پاپا کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، شاید وہ ہی اسے بتا سکتا تھا... مگر اس سے بھی پہلے وہ ایک انسان تھا... بھوکا... پیاسا اور زخمی... اسے اس وقت مدد کی ضرورت تھی۔ وہ ایک ڈاکٹر تھی۔ پاپا نے اسے ہمیشہ انسانیت کے احترام کا درس دیا تھا اور پھر ایک بات وہ محسوس کرسکتی تھی کہ وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچانے والا تھا۔ وہ کسی بچے کی طرح بے ضرر تھا... وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

اگلے دو تین گھنٹے وہ سب بہت مصروف رہے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے اسے کھانا کھلایا... اسے اندازہ تھا کہ وہ بھوکا ہے مگر اس قدر بھوکا ہوگا، یہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ صفیہ نے آلو بھرے پراٹھے بنائے تھے۔ وہ پانچ پراٹھے کھانے کے بعد بھی بھوکا تھا پھر اس نے اس کے لیے چکن سینڈوچز بنائے۔ وہ، وہ بھی کھا گیا... بسکٹ... فروٹ، ایلیا کو اسے پانی کی طرح کھانا بھی کھا کر دکھانا پڑا۔ پھر وہ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

اس کے لیے ہر چیز گویا نئی تھی۔ وہ کسی بچے کی طرح اٹک اٹک کر بول رہا تھا مگر اس کی یاد رکھنے اور سیکھنے کی صلاحیت بھی بے انتہا نظر آرہی تھی۔ جو لفظ وہ سن رہا تھا، وہ اس کی یادداشت کا حصہ بنتا جارہا تھا۔ وہ کچھ بھی کرنے سے پہلے کسی چھوٹے بچے کی طرح اجازت طلب نظروں سے ایلیا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

'اسے کیا کرنا چاہیے؟' وہ مسلسل سوچ رہی تھی۔ 'اسے اس اجنبی کو ڈاکٹر انکل کے پاس لے جانا ہوگا تاکہ اس کا مکمل چیک اپ ہوسکے، اس کے بعد ہی کچھ ہو پائے گا۔' وہ بالآخر فیصلے پر پہنچ گئی۔

''خان... ہمیں ان صاحب کو ڈاکٹر انکل کے پاس لے جانا ہوگا۔ میں بابا کی جرسی اور جینز نکالتی ہوں... تم پلیز اس کے نہانے اور تیار ہونے میں مدد کردو۔'' اسے یاد آیا تھا کہ وہ ایک سال قبل ان کے لیے ایک نیلی جینز لائی تھی جو اوور سائز ہونے کی وجہ سے ویسی کی ویسی پڑی تھی۔ ان کی الماری ٹھیک کرتے ہوئے اسے وہ نظر آئی تھی، وہ اسے نکال کر لے آئی۔ وہ خان کے ساتھ باتھ روم میں جانے پر اچھا

خاصا ہچکچا رہا تھا مگر ایلیا کے سمجھانے پر بمشکل تیار ہوگیا۔

''خان، تم نے احتیاط کرنی ہے... اسے کچھ یاد نہیں ہے بس سمجھ لو کہ یہ ایک چھوٹا سا بچہ ہے... جسے سب سکھانا پڑ رہا ہے۔ تم اسے ناراض مت ہونے دینا... سمجھ گئے نا؟''

''آپ فکر نہیں کرو بی بی صاب... ام اس کا خیال رکھے گا... اللہ صاب خوش ہوگا۔'' وہ سر ہلا کر بولا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ ڈاکٹر انکل کی طرف جانے کے لیے تیار تھے۔ نہانے اور تیار ہونے کے بعد وہ پہچان میں نہیں آرہا تھا۔ ہلکی بڑھی ہوئی شیو اس کے چہرے پر خوب جچ رہی تھی۔

پاپا کی وفات کے بعد وہ اس طرح پہلی بار گھر سے نکل رہی تھی۔ ڈاکٹر انکل کی اس کال کے بعد اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچی۔ اس دن کی یاد اس کی آنکھوں میں آنسو لے آئی تھی۔ وہ باہر نکلی تو ڈائننگ ٹیبل کے پاس اسے کھڑا دیکھ کر رک گئی۔ وہ ایلیا اور ڈاکٹر سجاد کی تصویر کے پاس کھڑا اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا... وہ دو لمحے اس کی محویت دیکھتی رہی پھر بولی۔

''آؤ چلیں، ہمیں دیر ہورہی ہے۔''

☆☆☆

پینتالیس منٹ بعد وہ ڈاکٹر اسحاق کے اسپتال میں موجود ان کے دفتر کی انتظار گاہ میں بیٹھے تھے۔ چند لمحوں بعد ان کی اسسٹنٹ نور جہاں نے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

''تم یہاں بیٹھو... میں ابھی آرہی ہوں۔'' وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے اس سے بولی۔ خدا جانے وہ کیا سمجھا مگر چپ چاپ بیٹھا رہا۔

''شکر ہے کہ تم گھر سے نکلیں... تمہیں یہاں دیکھ کر بہت اچھا لگ رہا ہے ایلی۔'' ڈاکٹر نے کمرے کے دروازے پر اس کا استقبال کیا۔

''مجھے بھی۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''میں پوری کوشش کررہی ہوں انکل... مجھے معلوم ہے پاپا بھی یہی چاہتے ہوں گے۔''

''یقیناً... وہ ہرگز یہ برداشت نہیں کرتا کہ تم اس کی وجہ سے زندگی سے دور ہوجاؤ... پھر تم کب اسپتال جوائن کررہی ہو؟''

''دیکھیے مجھے ڈاکٹر فریدوں کو پیر کو فون کرنا ہے مگر... ابھی مجھے آپ سے ایک اور مسئلے پر بات کرنی ہے۔''

''مسئلہ...؟'' وہ متوجہ ہو کر بولے۔

''جی اور وہ... باہر موجود ہے۔ آپ کہیں تو میں اسے اندر بلاؤں؟'' وہ انہیں گزشتہ رات کی تمام تفصیلات بتانے کے بعد بولی۔

''اوکے... اسے لے آؤ۔'' وہ سوچ میں ڈوب گئے۔ غیر ارادی طور پر انہوں نے سگریٹ سلگا لیا تھا۔ وہ اس کے پاپا کا برانڈ ہی پیتے تھے۔ ایلیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

وہ اسے لانے کے لیے کمرے سے باہر نکلی مگر وہاں پہنچتے ہی ٹھٹک کر رہ گئی۔ وہ سامنے بنی شیلف سے ایک موٹی سی کتاب نکالے نہایت توجہ سے پڑھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ کتاب لیے اس کے پاس آگیا۔ ڈاکٹر صاحب کے کلینک میں داخل ہوتے ہوئے وہ قدرے نروس تھا اور چونکنے انداز میں اردگرد دیکھتا رہا تھا۔

''تم نے رات اس کے سر پر گومڑ دیکھا تھا؟'' ڈاکٹر اسحاق اس کا معائنہ کرتے ہوئے بولے۔

''جی... عجیب بات یہ ہے کہ اب وہ غائب ہونے کی حد تک کم ہوگیا ہے۔''

''اوکے۔'' ان کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں نظر آرہی تھیں۔ ''اور یہ تمہارے لفظوں اور ایکشن کی نقل کرتا ہے؟''

''جی، بالکل کسی ننھے بچے کی طرح... مگر اس کے سیکھنے کی رفتار بھی بہت زیادہ ہے۔''

''اور یہ پڑھ لیتا ہے؟'' انہوں نے اس کے ہاتھ میں موجود کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، اس نے اناٹومی سے متعلق اس کتاب کا پورا پیراگراف زبانی سنادیا۔

''ہوں، اس نے خود ہی جواب دے دیا ہے۔'' ڈاکٹر اسحاق اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔

''آپ کیا کہتے ہیں؟''

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اسے کسی نیورولوجسٹ کے پاس لے جانا چاہیے۔ چوٹ لگنے سے مکمل یا جزوی طور پر یادداشت کا کھو جانا ممکن ہے مگر جس طرح تم نے بتایا کہ اسے کھانا کھانا اور پانی پینا بھی سکھانا پڑا ہے یہ کسی اور جانب اشارہ کررہا ہے۔''

''گلوبل امنیشیا؟'' ایلیا نے پوچھا۔

''ہاں اور اس حوالے سے ہمیں اس کا اسکین اور دیگر ٹیسٹ کرانے ہوں گے۔''

''آپ کے خیال میں کسے دکھانا چاہیے؟''

''ڈاکٹر سہیل آفندی بہترین رہے گا۔ میں ابھی اس

سے وقت لیتا ہوں۔'' وہ فون کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے۔

ایلیا کا ذہن اب دوسرے مسئلے کی جانب متوجہ تھا۔ اسے اصولاً اب پولیس سے بھی رابطہ کرنا تھا، پتا نہیں اس کے خاندان کا کیا حال ہوگا؟ اس نے سوچا۔

''ڈاکٹر سہیل نے کل صبح گیارہ بجے کا وقت دیا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب کی آواز نے اسے چونکایا۔ وہ اس دوران میں اپنا کام کر چکے تھے۔

''ٹھیک ہے پھر مجھے اجازت دیجیے۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

''اوکے... تم انہیں کتاب رکھنے دو اور ذرا میری بات سنو۔''

وہ اس کے دروازے کے پاس پہنچنے کے بعد بولے۔ ایلیا نے اسے شیلف کی طرف جانے کا اشارہ کیا اور دروازہ بند کر کے واپس ڈاکٹر اسحاق کی میز کے قریب آگئی۔

''ایلی... تمہیں اس کے متعلق پولیس کو انفارم کرنا چاہیے پھر جیسا وہ تجویز کریں... میرا مطلب ہے کہ وہ ایک اجنبی ہے آخرکار... کہیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔'' انہوں نے اس کی توقع کے عین مطابق کہا۔

''جی ڈاکٹر انکل... وہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ اصل میں کل رات بے ہوشی کی حالت میں اس نے کئی دفعہ پاپا اور ان کے اسسٹنٹ کا نام لیا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے یقین ہے کہ وہ ان کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اسی وجہ سے میں اسے پولیس کے حوالے نہیں کرنا چاہتی۔''

''اوہ... تم نے یہ مجھے نہیں بتایا تھا۔''

''جی... اور وہ بالکل بے ضرر ہے۔ کسی بچے کی طرح میرا حکم مانتا ہے۔'' وہ بولی۔ ''مجھے ڈر ہے کہ پولیس کے سوال جواب اور طریقۂ کار اس کے لیے مزید مسائل نہ کھڑے کریں۔'' وہ اب بھی انہیں اس فائل اور اپنے خدشات کے بارے میں آگاہ نہیں کر پائی تھی۔

''میرا ایک دوست ہے، میں اس سے بات کرتا ہوں۔ وہ اس حوالے سے ہماری مدد کر سکتا ہے۔'' انہوں نے فون کا ریسیور اٹھاتے ہوئے چند لمحے بات چیت کے بعد فون بند کر دیا۔

''لو، ہمارا کام ہوگیا۔ تم جاتے ہوئے سینٹرل آفس میں صائم احمد شیخ سے ملتی جاؤ۔ تفصیلات وہ تم سے پوچھ لے گا اور اس کے فنگر پرنٹس وغیرہ لے کر سسٹم پر ڈال دے گا۔ اگر اس کے بارے میں کہیں کوئی رپورٹ ہوئی ہوگی تو فوراً پتا چل جائے گا۔ اور ہاں، میں نے اسے اس کی ذہنی حالت کے بارے میں بتا دیا ہے لہٰذا وہ ایسا کوئی سوال وغیرہ نہیں کرے گا جس سے اس پر کوئی بُرے اثرات مرتب ہوں... تم بالکل فکر مت کرنا۔''

''بہت شکریہ انکل۔'' ایلیا نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کا ایک بڑا مسئلہ حل ہوگیا تھا۔ سچ یہی تھا کہ فی الوقت وہ خود پولیس سے رابطہ نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ پہلے وہ اس پہیلی کو خود حل کرنا چاہتی تھی۔

واپسی کے سفر میں وہ دونوں زیادہ تر خاموش رہے۔ پولیس ہیڈ آفس میں صائم احمد نے انگلیوں کے نشانات لے کر اسے رخصت کر دیا اور اس کام میں اس نے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کیا تھا۔ گھر کی طرف واپسی کے سفر میں وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ بے شک وشبہ کہہ سکتی تھی کہ وہ ایک خاص انسان تھا۔ وہ ہر چیز انتہائی تیزی سے سیکھ رہا تھا۔ ان چوبیس گھنٹوں میں وہ اس سے بہت مانوس ہوگئی تھی۔ اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، وہ خان کے ساتھ آگے پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ باہر دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر تجسس کی چمک تھی۔

'خدا جانے کون تھا یہ...؟ کہاں سے آیا تھا؟ اس کا خاندان اس کا منتظر، اس کی تلاش میں ہوگا۔ اس کی ماں... باپ... بیوی... بچے... منگیتر یا دوست؟ پتا نہیں کون کہاں اس کا منتظر ہوگا؟ اس نے سوچا یہ جو بھی ہے، اسے بہت جلد یہاں سے چلا جانا ہے اس لیے اس کے بارے میں اتنا ہی سوچنا چاہیے جتنا ضروری ہے۔' اس نے خود کو سمجھایا۔

''بی بی صاب... اس صاب کا نام کیا ہے؟'' خان کے سوال پر اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''نام؟'' وہ خود بھی اس سوال پر سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس کا جواب دینا ایلیا کی ذمے داری ہو۔

''ہاں... تمہارا کوئی نام تو بہرحال ہونا چاہیے۔'' وہ مسکرائی۔

''تو جب تک تمہیں اپنا نام یاد نہیں آجاتا ہم تمہارا نام... غالب رکھ دیتے ہیں... ٹھیک ہے؟'' اس وقت اس کے ذہن میں پاپا کے پسندیدہ شاعر کا نام ہی آیا تھا۔

''غالب صاب... اچھا نام ہے بی بی صاب... صاب جی اس نام کے آدمی کے شعر سنایا کرتے تھے۔''

خان یک دم بولا اور پھر بالکل چپ ہوگیا۔
''ہاں خان...'' وہ جواب میں مسکرائی۔ ''تو بس طے ہوگیا... تمہیں غالب نام پسند ہے...؟'' اس نے پوچھا۔
''غا...لب...'' وہ آہستگی سے بولا پھر مسکرایا۔ ایلیا بھی جواباً مسکرائی پھر اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکالیا۔

☆☆☆

اس رات ڈنر ایک کھیل بن گیا تھا۔ غالب اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانے پر مصر تھا۔ وہ ایک نوالہ اسے کھلاتا اور پھر اس کے ہاتھ سے ایک نوالہ کھاتا۔ وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا۔ صفیہ سے بھی اس کی فوری دوستی ہوگئی تھی۔ صفیہ برسوں سے ان کے ساتھ رہ رہی تھی۔ وہ شادی کے دو سال بعد بیوہ ہوگئی تھی۔ ایک حادثے کے نتیجے میں اس کی ملاقات ڈاکٹر سجاد سے ہوئی تھی اور تب ہی انہوں نے اسے ملازمت دے دی تھی۔ وہ بہت اچھا کھانا پکاتی تھی۔
کھانے کے بعد وہ غالب اور صفیہ کو ٹی وی دیکھتا چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے اوپر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ باتھ لینے اور کپڑے بدلنے کے بعد وہ نیچے آئی تو غالب لاؤنج میں نہیں تھا۔
''یہ کہاں گیا؟'' اس نے صفیہ سے پوچھا۔
''یہیں... ڈائننگ روم میں...'' اس نے اس کے اشارے پر مڑ کر دیکھا، وہ اس کے پاپا کی تصویر کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔
''یہ میرے پاپا ہیں۔'' اس نے اس کے قریب جا کر آہستگی سے بولا۔ اس کی آواز پر اس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کا چہرہ بالکل بدل گیا۔ وہ اسے اتنی سختی سے دیکھ رہا تھا کہ ایک لمحے کو ایلیا خوف زدہ ہوگئی۔
''یہ... ڈاکٹر سجاد... میرے پاپا...'' اس نے فریم پر انگلی رکھ کر دوبارہ کہا۔ وہ غور سے اس کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔
''زبردست...'' وہ جواباً بولا۔
''کیا تم انہیں جانتے ہو؟'' ایلیا نے پوچھا۔
''پتا نہیں...'' وہ کندھے اچکا کر بولا تو وہ گہری سانس لے کر بولی۔
''چلو اب سونے کا وقت ہوگیا ہے۔''
اسے اس کے کمرے میں پہنچا کر وہ اوپر آگئی۔ صفیہ لاؤنج میں سو رہی تھی۔ خان گیٹ پر چوکنا تھا۔ یعنی اب وہ اطمینان سے سو سکتی تھی۔ یوں بھی آج وہ بہت زیادہ تھک گئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سوچا۔

☆☆☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔
وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کھڑکی سے آنے والی ہوا اسے اچھی لگ رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور باہر سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آرہی تھی۔ اس نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں پلکیں جھپکائیں۔
اب اسے کہیں درد نہیں ہو رہا تھا، کندھے میں بھی نہیں... مگر اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اس نے اس لڑکی کے بارے میں سوچا۔ 'اس کی آنکھیں... اس کا چہرہ... اس کی آواز... اس کی مسکراہٹ... وہ بہت اچھی ہے۔' اس نے قطعیت سے سوچا۔ 'مگر اس کا نام کیا ہے؟' اسے اس کا نام معلوم نہیں تھا۔ وہ اسے غالب کہہ رہی تھی مگر پتا نہیں کیوں اسے یہ نام اپنا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اپنے دوست کو ڈاکٹر کہہ رہی تھی اور تصویر والے آدمی کو اپنے پاپا... ڈاکٹر سجاد... یہ نام...
'ہاں، وہ ڈاکٹر سجاد کو جانتا تھا... پتا نہیں کیسے...؟ اور وہ... پتا نہیں کہاں گئی ہے...؟' اس نے بے چینی سے چاروں طرف دیکھا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ اسے اس کو ڈھونڈنا تھا۔ اس نے سوچا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسے یاد تھا کہ شام کو وہ اوپر گئی تھی۔ کمرے سے نکل کر اس کی نظر صوفے پر سوتی صفیہ پر پڑی۔ 'یہ وہ نہیں تھی۔'
وہ خاموشی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر کئی دروازے تھے، اس نے پہلا دروازہ کھولا... مگر وہ خالی تھا۔ اس نے دوسرا دروازہ کھولا۔ کمرے میں نائٹ بلب کی اچھی خاصی روشنی تھی۔ وہ وہاں بستر پر سو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے اطمینان کی سانس لی اور اندر داخل ہوگیا۔ وہ اس کے بستر کے کونے پر بیٹھا ہی تھا کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔
''تم... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' وہ اسے دیکھ کر اچھل پڑی تھی۔ وہ بے انتہا خوف زدہ نظر آرہی تھی۔
''تم... تم ڈر کیوں رہی ہو؟'' اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ ''ہم تو دوست ہیں نا... تم نے کہا تھا نا صبح...'' وہ بچوں کی طرح بول رہا تھا۔
''ہاں... ہم دوست ہیں غالب... اصل میں، میں سو رہی تھی نا۔ تمہیں اس طرح اچانک دیکھ کر ڈر گئی۔'' وہ اپنا نچلا ہونٹ عادتاً چباتے ہوئے بولی۔ ''مجھے لگا کہ شاید تمہاری طبیعت خراب ہوگئی ہے۔''

''نہیں... نہیں، میں اب بالکل ٹھیک ہوں... دیکھو۔'' وہ جھک کر اپنے کندھے کی چوٹ کی گویا پریذنٹیشن دیتے ہوئے بولا۔ ''مجھے درد بھی نہیں ہو رہا۔''
''گڈ۔'' ایلیا کو اس کے انداز پر ہنسی آگئی۔ اس کا زخم اب تقریباً بالکل ٹھیک ہو چکا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ خاموش ہوگئی۔
''کیا ہوا...؟'' وہ پھر فکرمند ہوگیا۔
''کچھ نہیں... میں حیرت زدہ ہوں۔ تمہارا زخم بہت جلد ٹھیک ہوگیا ہے۔ عموماً ایسا نہیں ہوتا۔'' وہ بولی۔
''یعنی جب تم حیرت زدہ ہوتی ہو تب بھی ڈرتی ہو؟'' وہ اب بھی الجھا ہوا تھا۔
''کبھی کبھی۔'' وہ مسکرائی پھر اس کی الجھن دور کرنے کے لیے بولی۔ ''دیکھو، تم میرے لیے اجنبی ہو۔ میں تمہارا نام تک نہیں جانتی اس لیے میں تھوڑا ڈر گئی تھی۔''
''مگر تم تو مجھے غالب کہتی ہو نا... کیا یہ تمہارے لیے کافی نہیں ہے؟'' ایلیا کو اس کے جواب پر ہنسی آگئی۔
''اب میں خوف زدہ نہیں ہوں... ٹھیک ہے؟''
''ٹھیک ہے۔'' وہ بھی فوراً مان گیا۔
ایلیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم نیچے اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ... صبح ہمیں ڈاکٹر کے پاس بھی جانا ہے۔''
''اچھا۔'' وہ نیم دلی سے کھڑا ہوگیا پھر واپس بیٹھ گیا۔
''اب کیا ہوا؟'' ایلیا نے اسے گھورا۔
''مجھے تمہارا نام معلوم نہیں ہے۔ اگر مجھے تمہیں بلانا ہو تو میں تمہیں کیسے بلاؤں گا؟'' وہ قدرے فکرمندی سے پوچھ رہا تھا۔
''میرا نام ایلیا ہے۔'' وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولی۔
''ایل یا...'' اس نے اس کا نام دہرایا۔
''ہاں... اور اب چلو بھاگو۔'' وہ ہنسی۔
''اب ٹھیک ہے۔'' وہ اس کی ہنسی سے خوش ہوگیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر سہیل آفندی نے غالب کے تمام ٹیسٹ لے لیے تھے۔ اسکین کے بعد انہیں کچھ دیر انتظار کرنے کو کہا گیا تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد انہیں کمرے میں بلایا گیا۔
''آپ کا اندیشہ ٹھیک محسوس ہو رہا ہے ڈاکٹر ایلیا... چوٹ نے ان کے سر کے پچھلے حصے کو خاصا نقصان پہنچایا ہے مگر اس کے علاوہ بھی کچھ ہے... آیئے آپ خود دیکھیے۔'' وہ اسکین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ڈاکٹر کا جملہ ختم ہونے سے پہلے وہ اٹھ کر ان کے قریب پہنچ گئی۔
''یہ دیکھیے۔'' انہوں نے کھوپڑی کے نیچے اسٹیل کوڈ کے قریب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''یہاں کچھ ہے جو نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ بھی اسے دیکھ سکتی تھی۔ وہ بہت چھوٹی سی چیز تھی۔ ''یہ کیا ہو سکتا ہے؟''
''یہ دھات نہیں ہے مگر ہے کچھ اور... اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں میڈولا کے قریب اسے آپریٹ کرنا ہوگا۔''
ایلیا کے لیے اس کے بارے میں سوچنا بھی ناممکن تھا۔ وہ کیسے کسی اجنبی کے بارے میں ایسی اجازت دے سکتی تھی۔
''اس کا اس حالت سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''میرا خیال ہے کہ نہیں... اس کی یادداشت جانے کی وجہ تو سر پر لگنے والی چوٹ ہی ہے۔'' ڈاکٹر نے قطعیت سے کہا۔
''اور ڈاکٹر، یادداشت کی واپسی کے امکانات...؟'' جواب وہ خود بھی جانتی تھی مگر وہ ماہرانہ رائے چاہتی تھی۔
ڈاکٹر سہیل نے جواب میں گہری سانس لی۔ ''انسان کا جسم اور سسٹم پروردگار کا بہت بڑا معجزہ ہے ڈاکٹر... عام حالات میں میرا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ شاید یہ ناممکن ہے۔ گلوبل امنیشیا میں ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ کچھ کچھ یاد آسکتا ہے لیکن مریض کو بچوں کی طرح سب کچھ سکھانا پڑتا ہے مگر یہاں پھر وہی بات آجاتی ہے کہ اللہ نے انسان کو بہت طاقت عطا فرمائی ہے پھر اصل مسیحا تو وہی ہے اور بعض اوقات وہ ہو جاتا ہے جس پر میڈیکل سائنس ششدر رہ جاتی ہے۔''
ایلیا نے سر ہلایا۔ وہ یہ جانتی تھی۔
''مگر تم نے بتایا کہ اس کے سیکھنے کی رفتار بہت تیز ہے؟''
''جی... بہت زیادہ، یہ سیکنڈز کے حساب سے سیکھ رہا ہے۔ وہ کار چلا سکتا ہے، جذبات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔''
''زبردست...'' اسے شک تھا کہ ڈاکٹر سہیل اس کی بات پر یقین نہیں کریں گے۔
پھر بھی وہ بولی۔ ''اس کے کندھے پر گولی کا تازہ زخم

تھا اور دو دن میں وہ زخم بھر گیا۔"

ڈاکٹر سہیل نے اس کے کندھے کا معائنہ کیا۔

"ناقابلِ یقین... میں نے کہا نا کہ قدرت کے کرشمے میڈیکل سائنس کو حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مجھے یقین نہیں آرہا اور اگر یقین کرتا ہوں تو میرے اندر کا ڈاکٹر اسے انڈر آبزرویشن رکھ کر اس کے سسٹم کو سمجھنا چاہے گا۔"

اس کے جملوں نے ایلیا کو یک دم ذہنی تناؤ کا شکار کر دیا۔ یہ ناممکن تھا۔ وہ کسی کو غالب پر تجربہ کرنے کی اجازت نہیں دے گی، اپنے جذبے کی شدت پر وہ خود بھی حیران رہ گئی تھی۔

"مگر افسوس میں یہ نہیں کر سکوں گا کیونکہ یہ درست نہیں ہوگا۔ وہ خود اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے، نہ ہی اس کے خاندان والے موجود ہیں اور اب وہ بہتر ہے مگر... جب ممکن ہو... مجھے ضرور اس سے ملوایئے گا۔"

"ضرور ڈاکٹر۔" ایلیا نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ ڈاکٹر سہیل سے ضروری احتیاطی تدابیر سمجھ کر باہر آگئی۔

گھر پہنچ کر اس نے ڈاکٹر اسحاق کو رپورٹ دے دی تھی۔

"بہت خوب... ایلی! میں نے صائم سے بات کی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ گزشتہ ایک ہفتے میں اس علاقے میں کسی کی گمشدگی کی رپورٹ نہیں کی گئی ہے نہ ہی ایسا کوئی ٹریفک حادثہ ہوا ہے اور نہ ہی کسی جھگڑے کی رپورٹ ہوئی۔ باقی اس نے اس کے فنگر پرنٹس سب سسٹم میں ڈال دیے ہیں۔ اگر کوئی معلومات ملیں تو وہ رابطہ کرے گا۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر انکل۔"

"میں پریشان ہوں کہ آگے کیا ہوگا... اگر اسے کچھ یاد نہ آیا... اگر اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا تو تم کیا کرو گی؟ تمہیں ویسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں... کہو تو میں تمہاری آنٹی کو کچھ دنوں کے لیے تمہارے پاس بھیج دوں؟"

"نہیں نہیں انکل... پھر آپ کیا کریں گے؟" وہ ہنسی۔ "آپ تو ان کے ہاتھ کا کھانا ہی کھاتے ہیں... یاد ہے نا؟ ویسے بھی صفیہ اور خان ہیں نا یہاں... آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے... مگر مجھ سے وعدہ کرو کہ تمہیں ذرا بھی پریشانی ہوگی تو مجھے بتاؤ گی۔"

"بالکل اور کسے کہوں گی انکل... پاپا کے بعد آپ ہی تو میری فیملی ہیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

رات کے کھانے کے بعد وہ اسے اور صفیہ کو گپ شپ کرتا چھوڑ کر ڈاکٹر صاحب کی اسٹڈی میں جا بیٹھی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد سے اس نے ان کی ڈاک بھی چیک نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب بہت منظم طبیعت کے مالک تھے اور ہمیشہ اسے بھی یہی نصیحت کرتے تھے۔ انہوں نے ہر چیز کے لیے اپنی جگہ اور سسٹم بنا رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے اچانک چلے جانے کے بعد ان کی ڈاک اپنی جگہ پر جمع ہو رہی تھی۔ اس نے ٹرے کو خالی کرنا شروع کیا۔ تعزیتی خطوط... بلز... ممبر شپ کارڈ سے گزرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں وہ لفافہ آیا۔ وہ بھی عام بزنس سائز کا تھا۔ اس پر سجاد کے نام اور پتے کے علاوہ کچھ بھی تحریر نہیں تھا۔ اس نے احتیاط سے لفافہ کھولا۔ اس کی چھٹی حس نہ جانے کیوں یکلخت جاگ اٹھی تھی۔ لفافے میں صرف ایک کاغذ تھا جسے دُہرا تہ کیا گیا تھا۔ اس نے اسے کھولا۔ وہ بالکل سفید کاغذ تھا جس کے درمیان میں سیاہ روشنائی سے ہاتھ سے سات الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

"تمہاری موت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔"

اس کی آنکھیں ان لفظوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بار بار انہیں پڑھ رہی تھی مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ یوں جیسے نظروں اور دماغ کا کنکشن منقطع ہو گیا ہو... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ خط اس کے پاپا کو کون بھیج سکتا تھا۔ اس کے پاپا کی موت کا فیصلہ... یہ سب ناممکن تھا مگر یہ ہو رہا تھا۔

'اسے یہ اطلاع دینی چاہیے...' وہ بے ساختہ فون کی طرف بڑھی۔ وہ یک دم ٹھٹک گئی مگر کسے... ڈاکٹر انکل؟ وہ اس کے بارے میں کیا جانتے ہوں گے؟

شاید کچھ بھی نہیں...

پھر کرنل سرور فیروز...؟ مگر اس نے تو کہا تھا کہ پاپا کی ریٹائرمنٹ کے بعد سے ان کی ان سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ ریسیور ہاتھ میں لیے چند لمحے سوچتی رہی۔ اس کا دل انتہائی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے لفافے اور اس کاغذ کا جائزہ لیا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا... نہ کوئی پتا نہ فون نمبر... لفافے پر موجود پوسٹل ٹکٹ پر پاپا کی موت سے تین دن قبل کی تاریخ موجود تھی۔ یہ خط اسلام آباد سے بھیجا گیا تھا... مگر کون... کون اس کے پاپا کی جان لینا چاہتا تھا؟ ان کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ وہ نچلا ہونٹ دانتوں سے چباتے ہوئے مسلسل سوچ رہی

تھی۔ کیا پاپا کو قتل کیا گیا تھا...؟ اضطراب اسے کچھ سوچنے بھی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے پھر توجہ سے اس جملے کو پڑھا۔ اسے ہاتھ سے تحریر کیا گیا تھا۔ یہ طرزِ تحریر... شاید اس سے کچھ معلوم ہو سکے۔ اس نے سوچا، اچانک اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ اس نے تیزی سے میز کی آخری دراز کھولی۔ خفیہ خانہ کھول کر وہ پُراسرار فائل نکالی۔ اس میں موجود یو ایس بی کو کمپیوٹر میں لگایا اور اس میں موجود رپورٹ کے آخر میں پاپا کے اسسٹنٹ افتخار رسول کے خط تک پہنچی۔ اسے یاد تھا کہ اس ٹائپ شدہ خط کے آخر میں اس کے ہاتھ سے کیے گئے دستخط تھے۔ ان دستخط کو دیکھتے ہوئے اس کا دل رک سا گیا۔ وہ وہی لکھائی تھی، تمام الفاظ ایک ہی انداز میں بنے ہوئے تھے۔ آئی، اے، ایس بالکل اسی طرح لکھے ہوئے تھے۔ وہ بلاشک و شبہ اس کی ہی تحریر تھی۔ اس نے افتخار رسول کی شکل یاد کرنے کی کوشش کی... مگر وہ اس سے سالوں پہلے صرف ایک بار اور وہ بھی چند لمحوں کے لیے ملی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ اس کا چہرہ یاد نہیں کر پائی تھی۔

افتخار رسول نے یہ خط ان کی موت سے تین دن قبل بھیجا تھا۔ یقیناً وہ پوسٹ ہونے کے ایک دن بعد یہاں پہنچا ہوگا۔ اسے معلوم تھا کہ پاپا ڈاک کھولنے میں سست تھے، خاص طور پر جب وہ کسی کام میں مصروف ہوتے۔ ان کا کہنا تھا کہ اہم یا فوری باتوں کے لیے کوئی خط نہیں لکھتا۔ وہ ڈاک جمع کرتے تھے اور آرام سے فرصت کے دن ڈاک چیک کرتے۔ یہ خط انہوں نے نہیں دیکھا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اس نے یہ خط کیوں لکھا؟ انہیں فون کیوں نہیں کیا؟ کیا اسے شک تھا کہ فون سنا جا رہا ہوگا؟ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔

"کیا... کیا ہوا ایلیا... تم ڈر رہی ہو... کیوں؟"

غالب کی آواز نے اسے بے اختیار اچھلنے پر مجبور کر دیا۔

"نہیں... نہیں، سب ٹھیک ہے۔" وہ خط ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔ پھر اس نے کمپیوٹر سے یو ایس بی نکال کر فائل میں رکھی اور فائل دراز میں رکھ دی۔ غالب کے سامنے وہ خفیہ دراز نہیں کھولنا چاہ رہی تھی۔ 'وہ اسے بعد میں اندر رکھ دے گی۔' اس نے سوچا۔

"میں صرف تھوڑی تھک گئی ہوں۔" وہ اس کی سوالیہ نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ دروازے کے پاس آکر اسے رکنا پڑا۔ وہ دروازے کے درمیان کھڑا تھا اور اس کا ہٹنے کا کوئی ارادہ نظر نہیں آرہا تھا۔

"کیا یہ... پریشانی تمہارے پاپا کے بارے میں ہے؟"

اس کے سوال نے ایلیا کو حیران کر دیا۔ "میرے پاپا مر چکے ہیں... میں نے بتایا تھا نا۔" وہ بمشکل بولی۔

"تو کیا تم ان کے مرنے کی وجہ سے خوف زدہ ہو؟" اس نے متانت سے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی۔

"مت ڈرو۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گہرے لہجے میں بولا۔ "میں ہوں نا تمہارے ساتھ... کوئی بھی تمہیں ذرا سا بھی ڈرا نہیں سکتا۔" وہ پورے یقین سے بولا۔

ایلیا اس کے چہرے کو دیکھتی رہ گئی۔ نہ جانے کیوں... مگر اسے ان الفاظ پر مکمل بھروسا تھا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ اس اجنبی کے ساتھ مکمل طور پر محفوظ ہے۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ قدرے سنجیدہ اور خاموش نظر آرہا تھا۔ ایلیا خود اپنی سوچوں میں اتنی مگن تھی کہ اس کے رویّے کے الجھاؤ کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے پائی۔ وہ خط اور بہت سے سوالات اس کے ذہن کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھے مگر صفیہ نے اس تبدیلی کو محسوس کر لیا۔

"شاید اسے کچھ کچھ یاد آرہا ہے... آج اس کا رویّہ بالکل الگ سا ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔" طبی نقطۂ نظر سے یہ اتنی جلد ممکن نہیں تھا مگر وہ اس کی ہیلنگ پاور سے واقف تھی اس لیے سوچ میں پڑ گئی۔

"بی بی صاب... باہر انسپکٹر زمان آیا ہے۔" اسی وقت خان نے آکر اطلاع دی۔ "کیا میں اس کو منع کر دوں؟"

"انسپکٹر زمان... یہ کیوں آیا ہے؟" اس کا نام سن کر ایلیا کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ اس علاقے کا ایس ایچ او تھا۔ پاپا سے اس کے چچا کی اچھی سلام دعا تھی۔ وہ ان کے ساتھ ان کے گھر آیا کرتا تھا۔ ایلیا کو شروع ہی سے وہ بہت بُرا لگتا تھا۔ خصوصاً اس کی آنکھیں اسے کسی زہریلے سانپ کی یاد دلاتی تھیں۔ دو سال پہلے اس نے اسے پروپوز کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایلیا کے انکار پر وہ قابو سے باہر ہو گیا تھا اور اسے باقاعدہ دھمکانے کی کوشش بھی کی تھی جس پر ڈاکٹر صاحب نے اس کے چچا کو بلوا کر انہیں خوب ڈانٹا ڈپٹا

تھا۔ اس کے بعد وہ کبھی ان کے گھر تو نہیں آیا مگر اتفاقاً کہیں آمنا سامنا ہونے پر وہ اسے جن نظروں سے گھورتا تھا، اس کا تصور کر کے ایلیا پر خوف، گھن اور غصے کی ملی جلی کیفیت طاری ہوتی۔ اس وقت اس کا یہاں آنا اس کے لیے کسی بُری خبر سے کم نہیں تھا۔

"نہیں خان... آنے دو... ہمیں دیکھنا ہوگا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔" وہ ایک لمحہ سوچ کر بولی۔ "ایک منٹ رکو..." اس نے مڑ کر کرسی پر بیٹھے غالب کو دیکھا۔ "غالب! پلیز تم کمرے میں چلے جاؤ۔"

"تم اس شخص سے نہیں ملنا چاہتیں؟" اس نے ہلے بغیر بھاری آواز میں پوچھا۔

"نہیں... مگر وہ یہاں کا ایس ایچ او ہے اور شاید کسی وجہ سے آیا ہو۔ اس لیے میں اس سے مل رہی ہوں مگر میں یہ نہیں چاہتی کہ وہ تم سے کوئی سوال جواب کرے... میں اس پر ذرہ بھر بھی اعتماد نہیں کرتی۔"

وہ جواب میں سر ہلا کر کمرے میں چلا گیا۔ ایلیا درحقیقت اس سے نہیں ملنا چاہتی تھی۔ ان حالات اور اس ذہنی کیفیت میں تو بالکل نہیں... مگر چھپنا بہرحال کبھی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتا... اور یہ وہ جانتی تھی۔ خان اس کے اشارے پر کمرے سے باہر نکل گیا۔ چند لمحے بعد انسپکٹر زمان کمرے میں داخل ہوا۔

"تمہیں مجھ سے کچھ کام ہے؟" اس کے بیٹھنے اور سلام دعا کے بعد ایلیا نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"مجھے انکل کی تعزیت کرنا تھی... میں لاہور ٹریننگ پر گیا تھا، ابھی لوٹا ہوں۔ افسوس ہوا ان کے حادثے کی خبر سن کر۔"

"شکریہ۔" ایلیا بمشکل بولی۔

"اب تو تم اس دنیا میں اکیلی رہ گئی ہو۔ میں نے سوچا کہ تمہیں تسلی دے آؤں کہ تم خود کو تنہا مت سمجھنا۔" وہ خبیثانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"شکریہ... مگر میں اکیلی نہیں ہوں۔ ڈاکٹر انکل آتے رہتے ہیں۔" وہ رکھائی سے بولی۔

"وہ ٹھیک ہے مگر ایسے کب تک چل سکتا ہے۔ آخر تمہیں اپنے بارے میں کچھ تو سوچنا ہی پڑے گا۔" وہ صوفے پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"وہ میرا مسئلہ ہے زمان صاحب... اب اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں کچھ مصروف ہوں۔"

"کمال ہے... یہ گھر آئے مہمان سے ملنے کا طریقہ تو نہیں ہوا۔" اس نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر کہا۔ "مجھے تم سے تمہاری اس مصروفیت سے زیادہ ضروری بات کرنا ہے... اور تم..." اس نے صوفے کے پیچھے کھڑی صفیہ کو گھورا۔ "تم چائے بناؤ... ایلیا! تم نے ملازمین کو حد سے زیادہ سر چڑھا رکھا ہے۔"

"زمان... گیٹ آؤٹ... ناؤ۔" معاملہ اب اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔

"میں نہیں جارہا... کم از کم اپنی بات پوری کیے بغیر تو ہرگز نہیں۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "اور تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ تم میری بات سن لو۔"

ایلیا کو خود پر قابو پانے میں چند لمحے لگے پھر وہ بولی۔

"بولو کیا کہنا چاہتے ہو تم...؟"

"یہی کہ جو دو سال پہلے ہوا تھا، وہ غلط تھا۔ اب نہ تو میرے چاچا جی حیات ہیں نہ تمہارے پاپا... مگر میں ہوں... اور میں وہی چاہتا ہوں جو تب چاہتا تھا۔"

"میں فی الحال شادی کے بارے میں نہیں سوچ رہی ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے... نہ سہی شادی... ساتھ تو رہ سکتے ہیں۔" وہ شیطانی انداز میں مسکرایا۔ ایلیا یقین نہ آنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں نوکروں سے باہر پھنکواؤں؟" وہ غصے میں چیخ پڑی۔

"ذرا سوچ کر... میں اس علاقے کا ایس ایچ او ہوں، بہت مہنگی پڑ سکتی ہے اب یہ اداکاری تمہیں..." وہ بھی جواباً غرایا۔ "اپنی بے عزتی میں بھولا نہیں ہوں اور اب موقع آیا ہے تمہیں مزہ چکھانے کا..."

"بکواس مت کرو۔" ایلیا کا ہاتھ گھوما مگر زمان نے تھپڑ پڑنے سے پہلے ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر موڑ دیا۔

"ایلیا بی بی، ہوش میں آجاؤ۔" وہ بولا۔

"میرا ہاتھ چھوڑو۔" وہ زور سے بولی۔

"تم کیا کر رہے ہو... چھوڑو بی بی کو... خان... خان۔" صفیہ بھی چیخ پڑی۔

"چھوڑو۔" اس سرد آواز پر زمان نے ایلیا کا ہاتھ چھوڑ دیا اور مڑ کر اسے غور سے دیکھا۔

"تم کون ہو؟ اور یہاں کر کیا رہے ہو بھئی...؟" وہ اسے دیکھ کر بولا۔

"یہاں سے نکل جاؤ..." غالب اسی لہجے میں بولا۔

ایلیا حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس وقت وہ ایک

بالکل مختلف شخص نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سفاک سی چمک نظر آرہی تھی۔

"میں نے تم سے ایک سوال پوچھا ہے... کون ہو تم...؟" زمان نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اور میں کہہ رہا ہوں کہ محتاط رہو ورنہ میں تمہاری زندگی کا آخری ملنے والا شخص بھی ہو سکتا ہوں۔" وہ ملائمت سے بولا۔

زمان چند لمحے بالکل خاموش رہا پھر آگے بڑھا۔

"لگتا ہے کہ تمہیں ٹھیک کرنا پڑے گا۔" ایلیا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر اس دوران میں لمحے سے بھی کم وقت میں زمان زمین پر پڑا نظر آیا۔

"نہیں... نہیں... غالب..." اس نے بولنے کی کوشش کی مگر غالب کی گھورتی نظروں نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔ زمان اٹھ کر اس پر جھپٹا مگر اس کے ایک مکے نے اسے پھر زمین چٹا دی۔ اس بار کھڑے ہوتے ہوئے اس نے اپنا ریوالور نکال لیا۔ ایلیا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ اسے اسی بات کا خوف تھا مگر غالب بجلی کی سی تیزی سے گھوما اور اس کے پیروں نے دیکھتے ہی دیکھتے زمان کے ہاتھ کے ریوالور کو دوسری جانب اڑا پھینکا۔ اس کے بعد اس نے زمان کو گریبان سے پکڑ کر اس کا ہاتھ موڑ دیا۔ ایلیا ساکت کھڑی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ صاف نظر آرہا تھا کہ غالب جو کر رہا ہے وہ اس میں ماہرانہ صلاحیت رکھتا ہے۔

"تم نے میرا ہاتھ توڑ دیا ہے۔" زمان یکلخت چلایا۔

"پلیز غالب... چھوڑ دو اسے۔" ایلیا بولی تو اس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "اور تم..." وہ زمان کی طرف مڑی۔ "فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔"

"رکو..." غالب نے اس کا ریوالور اٹھا کر اس میں سے گولیاں نکال لیں اور اسے اس کی جانب اچھال دیا۔ "یہ لیتے جاؤ۔ اور ہاں... واپس مت آنا۔"

"میں یہ بھولوں گا نہیں۔" زمان کمرے سے نکلتے ہوئے بولا مگر وہ وہاں رکا نہیں۔

ایلیا عجیب سی نظروں سے غالب کو دیکھ رہی تھی۔ 'کون ہو سکتا ہے یہ... کوئی فوجی... کمانڈو...؟' اس کا ذہن سوالیہ نشانوں سے بھر رہا تھا۔ پہلی بار اسے اس سے خوف آرہا تھا... 'یہ شخص خطرناک ہو سکتا ہے' اس نے سوچا۔ جس طریقے سے وہ لڑ رہا تھا، وہ آسانی سے زمان کو ختم کر سکتا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ صرف دو دن پہلے یہ شخص موت کے دہانے پر کھڑا تھا۔ وہ برین ٹراما کا شکار تھا۔ اسے گولی لگی تھی اور کچھ لمحے پہلے وہ ایک طاقتور جنگلی جانور کی طرح لڑ رہا تھا۔

"تمہیں چوٹ لگی ہے؟" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دیکھتے ہوئے بولا۔

"نہیں، میں ٹھیک ہوں... تمہیں تو کوئی چوٹ نہیں لگی نا؟" وہ دیکھ رہی تھی کہ اسے خراش تک نہیں آئی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ مسکرایا۔ "وہ واپس نہیں آئے گا۔" وہ گویا اسے یقین دلا رہا تھا۔

"ہاں۔" ایلیا کو اندازہ تھا کہ زمان واپس نہیں آئے گا۔

ہاں، اب وہ چھپ کر یقیناً کوئی بڑی سازش کرے گا اور یہی چیز اسے پریشان کر رہی تھی۔

"تم میرے ہوتے ہوئے پریشان نہیں ہو سکتیں۔" اس نے گویا اس کا ذہن پڑھ لیا اور اس کے بالوں کو نرمی سے چھوتے ہوئے بولا۔ اس کی نظریں ایلیا کے چہرے پر جمی تھیں اور ان میں اس وقت جو تھا، اس نے ایلیا کے دل کو چھو لیا تھا۔

"میں پریشان نہیں ہوں۔" وہ مسکرائی۔ "اور تمہارے ہوتے ہوئے... تو بالکل بھی نہیں..."

☆☆☆

"سر..."

سرور فیروز کو محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اسے آوازیں دے رہا ہے مگر وہ خواب سے بیدار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ اس خواب سے جہاں وہ اپنی بیوی مہ جبیں اور دونوں بیٹوں کے ساتھ تھا... ان کے اپنے گھر میں... کھانے کی ٹیبل پر... یہ واقعی اب اس کے لیے خواب بن چکا تھا۔ مہ جبیں کی خاندان میں سب سے آگے نکلنے کی دوڑ نے انہیں زندگی میں سب کچھ ہارنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو بہت یاد کرتا تھا۔ انہیں امریکا شفٹ ہوئے تین سال گزر چکے تھے۔ اس دوران میں وہ کُل ملا کر تین ماہ ان کے ساتھ گزار پایا تھا۔ اب وہ بھی وہاں اتنے مگن ہو چکے تھے کہ واپس لوٹنے پر تیار نہیں تھے... عجیب زیاں تھا جس کا احساس اسے بہت تاخیر سے ہو رہا تھا اور وہ بھی خواب میں... کاش وہ انہیں واپس لا سکتا...

"سر۔" اس بار پکارنے والی آواز اتنی تیز تھی کہ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ نہ جانے کس وقت میز پر سر رکھے اسے

نیند آگئی تھی۔ اس نے پلکیں جھپکا کر سامنے کھڑے جمال کی طرف دیکھا۔ جمال کے پیچھے دیوار پر لگی گھڑی رات کا ایک بجا رہی تھی پھر اس نے دوبارہ اپنے اسسٹنٹ کو گھورا جو اس وقت بھی نک سک سے درست اور تروتازہ لگ رہا تھا۔

''کیا مصیبت آگئی ہے؟''

''سر! ہم نے خضر کو ڈھونڈ لیا ہے۔'' وہ پُرجوش انداز میں بولا۔

''اوہ...'' اس خبر سے وہ پوری طرح بیدار ہوگیا۔ ''تفصیلات بتاؤ۔''

''آج صبح ہی اس کی انگلیوں کے نشانات سسٹم میں ڈالے گئے تھے۔ جیسے ہی یہاں اس کی شناخت ہوئی، ہم حرکت میں آگئے... کل صبح وہ پولیس ہیڈ آفس آیا تھا۔''

''وہ اب کہاں ہے اور اس کی حالت کیسی ہے؟''

''اسے کچھ یاد نہیں ہے مگر... عجیب بات یہ ہے سر کہ وہ ڈاکٹر ایلیا سجاد کے ساتھ آیا تھا... وہ اس کے ساتھ ہی رہ رہا ہے۔'' وہ نروس انداز میں بولا۔ ''ہماری ٹیم فیروز آباد کے قریب موجود ہے۔ سلمان ان کو لیڈ کر رہا ہے، بس آپ کے حکم کا انتظار ہے۔''

''اوکے... تھوڑی دیر کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' وہ غرایا۔ اس کے جانے کے بعد وہ چند لمحے سوچتا رہا۔ خضر ایجنسی کا بہترین ایجنٹ تھا، وہ اسے کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا تھا۔ ایجنسی کے اصول و قواعد کے مطابق ایسی مخدوش حالت میں کسی بھی ایجنٹ کو زندہ چھوڑنا مقصد اور ایجنسی دونوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا تھا مگر... وہ سوچتا رہا۔ جہاں تک اس کی ذہنی حالت کا تعلق تھا، اسے یقین تھا کہ وہ جلد ٹھیک ہوجائے گا۔ اس کی بحالی کی رفتار ناقابلِ یقین تھی اور یقیناً خدا کا یہ تحفہ اس کی ذہنی صحت کو جلد از جلد بہتر کرسکتا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھا اور چند قدم ٹہلنے کے بعد جیب سے فون نکالا۔ اس سلسلے میں وہ کسی پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''فیروز اسپیکنگ...'' رابطہ ہوتے ہی وہ بولا۔ ''سلمان! ہاں میں جانتا ہوں۔ اب جو تمہیں کہا جارہا ہے، اسے غور سے سنو... تمہیں خضر کو زندہ واپس لانا ہے... تم سمجھ رہے ہو نا؟ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ ہمیں وہ زندہ اور صحیح حالت میں درکار ہے۔''

''اوکے سر... اور سر! اس خاتون کے بارے میں کیا حکم ہے؟ ڈاکٹر ایلیا سجاد... وہ وہاں موجود ہے۔''

سرور فیروز، ایلیا کو اس کے بچپن سے جانتا تھا مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ملکی سلامتی پر سمجھوتا ناممکن تھا۔ افتخار رسول کے فون پر اس کی آواز ریکارڈ تھی جو یہ بتانے کو کافی تھی کہ وہ اس سازش میں شامل تھی۔ اس نے تھوک نگلا اور گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''اسے مار دو... وہ سیکیورٹی رسک قرار دی گئی ہے، اسے زندہ نہیں بچنا چاہیے۔''

☆☆☆

وہ گہری نیند سے اچانک بیدار ہوا تھا۔

اسے ہر طرف خطرہ محسوس ہورہا تھا۔ کچھ ہونے والا تھا۔ یقیناً کچھ بُرا ہونے والا تھا۔ وہ چند لمحے ساکت پڑا کچھ سننے اور محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر تیزی سے اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ انہیں یہاں سے نکل جانا چاہیے... فوراً... وہ تیزی سے کمرے سے نکلا اور سیڑھیوں کی جانب لپکا۔ اس کے دماغ میں گویا کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ''بھاگو، یہاں سے نکل جاؤ۔'' وہ دوسروں کی موجودگی محسوس کر رہا تھا۔ ان کے کپڑوں کی سرسراہٹ... ان کی سانسیں... ان کے ہتھیار... ان کے قدموں کی دھمک... وہ کہیں بہت قریب تھے۔

''ایلیا...'' اس نے اس کے کمرے میں داخل ہوکر اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔

''کک... کیا ہوا...؟'' وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''فوراً اٹھو... ہمیں یہاں سے نکلنا ہے جلدی...''

''کہاں...؟ مگر کیوں؟ کیا ہوا ہے؟'' وہ بستر سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پارہی تھی۔

''جلدی... جوتے پہنو...'' وہ ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے سرگوشیانہ انداز میں بولا۔ ''ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ یہاں بہت خطرہ ہے۔'' ایلیا کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی کھڑی ہوگئی۔ اس نے آرام دہ جینز اور لمبا سا کرتہ پہن رکھا تھا۔ کرسی پر رکھی چادر اور چپل پہننے میں اسے ایک لمحہ لگا۔ اس نے ایلیا کا ہاتھ پکڑا اور دروازے کی جانب بڑھا مگر پھر ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا۔

نیچے لاؤنج میں ہونے والی ہلکی سی آہٹ اسے یہ سمجھانے کے لیے کافی تھی کہ آنے والے گھر میں داخل ہوچکے ہیں۔ اس نے آنکھیں بند کر کے غور سے سننے کی کوشش کی۔ اس کا ادراک نیچے ہونے والی نقل و حرکت کو اس کے سامنے تصویر کر رہا تھا۔ وہ یقیناً دو سے زائد لوگ تھے۔ وہ ایلیا کا ہاتھ تھامے آہستگی سے کمرے سے نکلا۔ سیڑھیوں کے ساتھ بنی الماری کا دروازہ کھول کر اسے

حفاظت سے اندر کھڑا کردیا۔ اس کے بعد وہ خود بھی جسم سکیڑ کر دروازے کی آڑ میں اس طرح کھڑا ہوا کہ اسے باہر کا منظر صاف نظر آسکے۔

پہلے ایک شخص اوپر آیا اور سامنے سے گزر گیا، پندرہ بیس سیکنڈ بعد دوسرا آیا۔ اس نے تیزی سے باہر نکل کر اس کی گردن اپنے بازوؤں میں دبوچ کر موڑ دی۔ لمحوں میں وہ زمین پر مردہ پڑا تھا۔ غالب لپک کر پھر الماری کی آڑ میں ہوگیا۔ اسے دوسرے شخص کے ایلیا کے کمرے سے نکلنے کا انتظار تھا۔ وہ جیسے ہی باہر نکلا، غالب کی کِک کسی تلوار کی طرح اس کی شہ رگ پر پڑی۔ وہ آواز نکالے بغیر زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ اس کے گرتے ہی اس نے ایلیا کا ہاتھ پکڑا اور سیڑھیوں کی جانب دوڑ لگا دی۔ ان کا کم از کم ایک ساتھی نیچے ضرور موجود ہوگا۔ اس نے سوچا، چند لمحوں بعد ہی انہیں تیسرا آدمی ڈاکٹر صاحب کی اسٹڈی سے باہر نکلتا نظر آیا۔ غالب اس کے لیے تیار تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی زمین پر لیٹا نظر آیا۔

''کچن کے پیچھے والا دروازہ باہر کھلتا ہے نا؟'' اس نے سرگوشی کے انداز میں ایلیا سے پوچھا۔ اس کے اثبات میں سر ہلاتے ہی وہ اسے تقریباً کھینچتا ہوا باہر نکل گیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ صرف تین نہیں ہوں گے۔ انہیں امید ہوگی کہ وہ دونوں اس وقت سو رہے ہوں گے اور انہیں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اس لیے صرف وہی اندر داخل ہوئے۔ باقی گھر کے باہر ان کے سگنل کا انتظار کر رہے ہوں گے اور جب انہیں مسلسل خاموشی ملے گی تو وہ یقیناً اندر آئیں گے۔ برآمدے سے گزر کر وہ پچھلی دیوار کے پاس کھڑا رہا۔ اسے شک تھا کہ شاید پیچھے بھی کوئی موجود ہوسکتا ہے مگر یہ خطرہ اسے لینا ہی تھا۔ دیوار کی ایک سمت بنی کیاری پر چڑھ کر اس نے باہر جھانکا۔ باہر کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کے بعد اس نے ایلیا کی جانب دیکھا، اس کے لیے یقیناً یہ آسان نہیں تھا۔ غالب نے اسے تقریباً اٹھا کر دیوار پار کی۔ وہ دونوں دیوار کے ساتھ چپکے چپکے سنسان اندھیرے کا حصہ بن گئے۔ اس نے غالب کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور وہ دونوں مسلسل بھاگے جارہے تھے۔ تھوڑی سی دیر میں ان کے فرار کا راز کھل جانے والا تھا اور پھر حقیقتاً وہ لوگ ان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ ایلیا کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ بہت خوف زدہ تھی... آخر یہ سب ہو کیا رہا تھا؟ یہ کون لوگ تھے؟ کیوں اس کے پیچھے پڑے تھے؟ یقیناً ان کا تعلق اس خط والے معاملے سے تھا... اس کے پاپا مر چکے تھے۔ اسے ایمان کی حد تک یقین تھا کہ وہ کسی غلط کام میں ملوث نہیں ہوسکتے تھے۔ یقیناً کہیں کوئی غلطی تھی... اگر کسی نے انہیں قتل کیا تھا، تب بھی یہ یقیناً کوئی غلط فہمی تھی۔

''افتخار رسول۔'' اچانک اس کے ذہن میں یہ نام گونجا۔ اسے اس کو ڈھونڈنا چاہیے... اسی نے پاپا کو خطرے کے متعلق اور پھر موت کی دھمکی کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ وہی ان سوالات کے جواب دے سکتا تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے مسلسل سوچ رہی تھی۔ جیسے ہی اس مشکل سے نکلے گی، وہ یہ کام سب سے پہلے کرے گی مگر کیا وہ بچ پائے گی؟ شاید یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ کچھ جانتی ہے ورنہ وہ اس کے پیچھے کیوں لگے ہوتے... اگر آج وہ ماری گئی تو وہ حقیقت کا چہرہ کبھی نہیں دیکھ پائے گی اور نہ ہی پاپا کو انصاف دلا پائے گی۔

اچانک سائیں سے کوئی چیز ان کے قریب سے گزر کر درخت میں گھس گئی۔ ایلیا کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی... تو وہ آپہنچے تھے اور فائر کر رہے تھے۔

غالب اس مشکل گزار پہاڑی راستے پر درختوں کے درمیان اس چابک دستی سے دوڑ رہا تھا جیسے اسے اندھیرے میں سب دکھائی دے رہا ہو۔ ایلیا بُری طرح ہانپ رہی تھی، یک دم وہ اپنی ہی جھونک میں غالب کی پیٹھ سے ٹکرائی۔ اس نے چونک کر دیکھا... وہ رک گیا تھا۔

''کیا ہوا...؟''

''ہمیں... کودنا ہوگا۔'' وہ آواز دبا کر بولا۔

''کیا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ جواب میں غالب نے اسے اپنے برابر لا کر نیچے کی طرف اشارہ کیا۔

''ہمیں یہاں سے کودنا ہوگا۔'' ایلیا کا دل گویا حلق میں آگیا۔ وہ اس وقت ایک خاصی اونچی پہاڑی کی چوٹی پر تھے اور نیچے تیز دریا بہہ رہا تھا۔

''نہیں... ہم نہیں کود سکتے۔'' وہ بے اختیار لرز کر بولی۔ ''یہ تو سیدھی سادی خودکشی والی بات ہے۔''

''کودنا ہوگا ایلیا۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''یہی بچاؤ کا آخری راستہ ہے۔'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی، وہ اسے اپنے بازوؤں میں لے کر کود گیا۔ فلموں میں جب کوئی اس طرح پہاڑی سے پانی میں چھلانگ لگاتا ہے تو اسے نیچے پہنچنے میں کافی دیر لگتی ہے مگر حقیقت یہاں مختلف ہی تھی۔ وہ ایک لمحے میں خاصی قوت سے پانی سے ٹکرائے تھے۔ سطح پر پلٹتے ہی وہ اسے پکڑ کر پیچھے کی طرف تیرنے لگا۔ ایلیا کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آرہا تھا۔ وہ کسی سامان کی

طرح اس کے ساتھ کھنچے جارہی تھی۔ یہ سب کیا ہو گیا تھا اور پتا نہیں کیا ہونے والا تھا۔ کچھ دیر میں وہ پہاڑ کے ایک کنارے تک پہنچ گئے۔ غالب نے پیروں تلے زمین آتے ہی اسے اتھا لیا۔ تھوڑا آگے جا کر انہیں قدرتی طور پر ایک غار نما چٹان نظر آئی۔ اس وقت چھپنے کے لیے یہی مناسب ترین جگہ تھی۔ غالب نے اندر پہنچ کر اسے نیچے اتارا اور سہارا دے کر دیوار کے ساتھ بٹھا کر خود بھی اس کے برابر آبیٹھا۔ ایلیا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ 'خدا جانے خان اور صفیہ پر کیا گزری ہوگی؟' اس نے سوچا۔ اس نے گردن موڑ کر برابر میں بیٹھے ہانپتے ہوئے غالب کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں اندھیرے سے قدرے مانوس ہو گئی تھیں مگر وہ اس کا چہرہ صاف طور پر نہیں دیکھ پا رہی تھی۔ اگر وہ نہ ہوتا تو آج شاید وہ بھی مر چکی ہوتی، اپنے پاپا کی طرح... قتل ہو گئی ہوتی... اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس وقت غالب کے علاوہ کچھ سوچنا نہیں چاہ رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس کا دل کسی نام پر دھڑک رہا تھا پھر ایک خیال نے گویا اس کے دل پر خراش سی ڈال دی۔ کیا وہ جلد ہی اپنا ماضی یاد کر پائے گا... اور کیا ہوگا اگر اس کی بیوی یا منگیتر موجود ہوئی...؟ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ نہیں نہیں، وہ اتنی خود غرض نہیں ہو سکتی کہ ایسی خواہش کرے۔ اسے اپنے بارے میں سب جاننے اور اپنی زندگی جینے کا حق ہے۔ وہ صرف دعا کر سکتی تھی کہ سب کچھ یاد آنے کے بعد بھی وہ اسے یاد رکھے کیونکہ اب شاید وہ اس کے سوا اس کی طرح کسی کو یاد نہیں کر سکتی تھی۔

☆☆☆

اس نے پہلی گھنٹی پر فون اٹھالیا...

"کام ہو گیا؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ اس نے جواب دینے کے لیے حلق صاف کیا۔ جواب آسان نہیں تھا۔ کاش کوئی معجزہ ہو جاتا، اس نے سوچا... مگر وہ اتنا خوش قسمت نہیں تھا۔

"نہیں، میں اسے حاصل نہیں کر پایا۔" وہ بالآخر بولا۔

"کیا تمہیں اس کا مطلب معلوم ہے؟" کچھ لمحے کی خاموشی کے بعد پوچھا گیا۔

"ہاں... مگر یقین کرو کہ میں نے وہاں کی مکمل تلاشی لی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ بھی وہاں نہیں تھی... یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہاں کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔"

"تم ٹھیک سمجھے ہو... معلوم ہوا ہے کہ ایجنسی کو اس پر شک ہے۔ انہوں نے تفتیش اور اس کے خاتمے کے لیے اپنا ایجنٹ بھیجا تھا مگر کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ پھر انہوں نے دوسری ٹیم بھیجی مگر پہلا ایجنٹ اسے بچالے گیا۔"

"کیوں...؟"

"میں نے کہا نا کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ سنا ہے کہ اس کے سر پر کوئی چوٹ لگی تھی اور یادداشت کھو گئی ہے۔ اب وہ ہی اس کی حفاظت کر رہا ہے اور اس کو خبر بھی نہیں کہ جو اسے بچا رہا ہے، وہ اسے مارنے کے لیے ہی آیا تھا۔ ہے نا دلچسپ بات...؟"

"پھر اب میں کیا کروں؟" اس نے پوچھا۔ اسے معلوم تھا کہ فائل نہ ملنے کی صورت میں وہ دونوں بھی اچھی بھلی بُری حالت میں مارے جائیں گے۔

"وہ اب مشکلات کا شکار ہے۔ یقیناً جلد ہی وہ جان جائے گی کہ اس کے باپ کو قتل کیا گیا ہے پھر وہ یقیناً کسی ایسے شخص سے رابطہ کرے گی جس پر اسے اعتماد ہو۔ ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا۔ لگتا ہے کہ وہ سب کچھ جان گئی ہے اور وہ فائل اس کے قبضے میں ہے۔ تمہیں سگنل ملتے ہی اس کا پتا لگا کر وہ فائل حاصل کرنی ہوگی اور اس کا کام تمام کرنا ہوگا۔ یاد رکھو وہ... بچنا نہیں چاہیے۔" کسی رسمی جملے کے بغیر رابطہ منقطع ہو گیا۔

اسے قتل کرنا پسند نہیں تھا... وہ قاتل نہیں سائنس داں تھا مگر اسے اب یہ کام کرنا ہی تھا۔ خود کو بچانے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

☆☆☆

اسے سانسیں بحال کرنے میں کچھ وقت لگ گیا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا اور یہ بھی کہ وہ خود یہ سب کس طرح کر پا رہا تھا؟ اس نے مڑ کر برابر بیٹھی ایلیا کی جانب دیکھا، وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"ایلیا! یہ سب کیا ہو رہا ہے... مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ یہ سب کیوں ہوا ہے؟"

"غالب... میرا خیال ہے کہ اس کا تعلق پاپا سے ہے۔ میرے پاپا سائنس داں تھے اور حکومت کے ساتھ کام کرتے تھے۔" اس نے مختصر الفاظ میں ساری کہانی سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو تمہارے خیال میں انہیں قتل کیا گیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

ایلیا نے جواب میں صرف سر ہلایا پھر آنکھوں میں در آنے والے آنسوؤں کو حلق کی جانب دھکیلتے ہوئے بمشکل

بولی۔ "میں نے ان کے فون میسیجز میں ایک پیغام سنا پھر ایک خط ملا جو ان کے سابق اسسٹنٹ افتخار رسول کی طرف سے تھا۔ وہ سب اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔"

"افتخار رسول..." اسے یہ نام بہت شناسا لگا۔ یہ ساری تفصیل اس کے ذہن میں نہ جانے کیوں عجیب سی الجھن اور اضطراب پیدا کر رہی تھی۔

ایلیا نے اسے اس پراسرار فائل کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ وہ اسے سمجھ نہیں پائی ہے۔

"تمہارے والد حکومت کے لیے کس طرح کا کام کرتے تھے؟"

"وہ ایٹمی سائنس داں تھے اور ٹاپ سیکرٹ پروجیکٹس پر کام کرتے تھے۔ یہاں ایک خصوصی ایجنسی ہے جہاں کے ڈائریکٹر سرور فیروز ان کے اچھے دوست تھے مگر ریٹائرمنٹ کے بعد ان سے ان کا رابطہ نہیں تھا۔"

ایجنسی اور سرور فیروز کے الفاظ کڑکتی بجلی کی طرح اس کے ذہن پر گرے۔ وہ یکلخت کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے ٹہلنے کے بعد وہ واپس آکر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ اس کا ردِ عمل سمجھ نہیں پائی تھی۔

"غالب..."

"ایلیا... میں کچھ دیر سوچنا چاہ رہا ہوں، تم آرام کر لو۔ ہم یہاں سے صبح ہونے کے بعد ہی نکل سکیں گے۔" اس کی آواز میں اتنی سختی تھی کہ ایلیا ڈر سی گئی۔ وہ اس اجنبی کو ذرا بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ کافی دیر وہ گھٹنوں پر سر رکھے چپ چاپ بیٹھی رہی پھر نہ جانے کب تھکن اس پر حاوی ہو گئی اور نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ غالب تھوڑا آگے کھڑا باہر کا جائزہ لے رہا تھا۔

ایلیا آنکھ کھلتے ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور آہستگی سے چلتی ہوئی اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔

"تم اٹھ گئیں؟" اس نے اس کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔

"ہاں۔" ایلیا کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آگئی۔ "ہم یہاں سے باہر کیسے نکلیں گے؟"

"جیسے آئے تھے۔" وہ بھی مسکرایا۔ چٹان سے باہر نکل کر وہ چند لمحوں کے لیے ساکت رہ گئی۔ نیچے دریا تھا جہاں سے وہ اس چٹان تک پہنچے تھے اور اوپر پہاڑ موجود تھا۔ یہاں سے نکلنے کے لیے انہیں یا تو پہاڑ پر چڑھنا تھا یا پھر دوبارہ پتھروں پر چلتے ہوئے دریا تک جانا تھا۔

"ہم نیچے جائیں گے۔" وہ گویا اس کا ذہن پڑھتے ہوئے بولا۔ "اگر ہم گرے بھی تو پانی کی وجہ سے بچت ہونے کی امید ہے۔" وہ مسکرایا۔

"مگر اس پتلی سی چٹان سے نیچے جانا بھی آسان نہیں ہے۔" وہ لرز کر بولی۔

"ناممکن نہیں ہے۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں آگے جاؤں گا۔"

ایلیا نے کبھی اسکول کالج میں بھی کسی اسپورٹس میں حصہ نہیں لیا تھا اور یہاں اچانک زندگی اولمپک مقابلہ بن کر اس کے سامنے آگئی تھی۔ غالب نے اس کے دیکھتے ہی دیکھتے چٹان کے بیرونی حصے کو پکڑا اور آہستہ آہستہ پتھروں پر پیر جماتے ہوئے کھسکنے لگا۔ وہ غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے اشارے پر اس نے بھی کگر کے اوپری حصے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ سخت چٹان اس کی انگلیوں میں چبھ رہی تھی مگر اسے آگے بڑھنا تھا۔

"اوہ..." اچانک اس کا سیدھا پیر پھسل گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چٹان کو جکڑا اور دوبارہ پیر جمانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ وہ بار بار کوشش کر رہی تھی مگر اب وہ باقاعدہ کگر سے لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ شل ہو رہے تھے۔ وہ خود اپنی آنکھوں سے اپنی انگلیوں کو سلوموشن میں چٹان سے پھسلتے دیکھ رہی تھی۔ وہ گرنے والی تھی اور اتنی خوف زدہ تھی کہ اس کے لبوں سے آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ غالب نے عین وقت پر اس کی جانب دیکھا اور حیران رہ گیا۔ چٹان ایلیا کے ہاتھ سے نکل گئی۔ غالب نے اپنے بازو کھولے۔ کسی ماہر غوطہ خور کی طرح اس کی جانب ہلکورا لے کر چھلانگ لگائی۔ وہ اس سے پہلے نیچے گرا تھا اور وہ سیدھی اس پر آئی تھی۔ غالب نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے خود سے لپٹا لیا اور وہ پانی میں جا گرے۔ اس نئی افتاد نے ایلیا کے ہوش و حواس چھین لیے تھے۔ غالب نے تیرتے ہوئے اسے ایک ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ اس کا سر پانی سے باہر رہے... جس کی وجہ سے اس کی اپنی رفتار بھی بہت سست تھی۔ اسے کنارے پر پہنچنے میں خاصی دیر لگی تھی۔ کنارے پر پہنچتے ہی غالب نے گہری سانس لی۔ وہ بہت زیادہ تھک گیا تھا۔ اس نے بے ہوش ایلیا کو زمین پر ڈالا اور خود بھی وہیں گر پڑا... مگر دس پندرہ منٹ بعد وہ اٹھ بیٹھا۔ انہیں جلد از جلد کسی محفوظ جگہ پہنچنا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ان پر حملہ کرنے والے اتنی جلد ہار نہیں مانیں گے۔ یعنی یہ جو بھی کچھ تھا، وہ ابھی ختم نہیں ہوا

تھا۔

☆☆☆

وہ کافی دیر سے درختوں کی اس جھنڈ نما جگہ پر چھپے ہوئے تھے۔ جب ان کے کپڑے خشک ہو گئے تب وہ وہاں سے نکلے... ایلیا اب کافی بہتر تھی۔

یکلخت وہ چلتے چلتے رک گیا اور کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ ''شاید ہم سڑک کے قریب ہیں۔'' وہ بولا۔ ''مجھے ٹریفک کی آواز محسوس ہو رہی ہے۔''

''شکر ہے۔'' ایلیا نے کہا۔ ''ہمیں فوراً پولیس اسٹیشن پہنچنا چاہیے۔''

''نہیں... مجھے اس وقت یہ مناسب نہیں لگ رہا۔'' وہ بولا۔

''پھر... ہم کیا کریں گے؟ کہیں سے فون مل جائے تو میں ڈاکٹر انکل کو فون کر دوں۔ وہ آ کر ہمیں لے جائیں گے۔''

''مجھے نہیں معلوم۔'' وہ سوچ میں پڑا ہوا تھا۔

ایلیا اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ انکل پر بھی بھروسا نہیں کر پا رہا تھا۔

''وہ میرے لیے خاندان کی طرح ہیں... پاپا کے بچپن کے دوست ہیں وہ...'' اس نے گویا اسے جتایا۔

''دیکھتے ہیں۔'' اس کے انداز نے ایلیا کو خاموش ہونے پر مجبور کر دیا۔ اتنی دیر میں وہ سڑک پر پہنچ گئے تھے۔ وہاں انہیں آنے والی پہلی کار میں ہی لفٹ مل گئی۔ وہ دونوں میاں بیوی پنڈی جا رہے تھے۔ دونوں ہی پڑھے لکھے اور خوش اخلاق تھے۔ ان کی عمریں پینتیس سے چالیس کے درمیان تھیں۔ مرد کا نام سبحان تھا۔ وہ ایک تعمیراتی کمپنی میں کام کرتا تھا جبکہ اس کی بیوی شکیلہ اسکول ٹیچر تھی۔

غالب نے انہیں ڈکیتی اور پھر راستہ بھٹک جانے کی فی البدیہہ داستان سنائی تھی۔ ان سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ اس وقت پنڈی سے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلے پر تھے۔ وہ دونوں میاں بیوی تھوڑی دیر میں ہی ان سے گھل مل گئے۔ شکیلہ تو ایلیا کے ڈاکٹر ہونے کا علم ہونے کے بعد سے اس سے مختلف بیماریوں کے بارے میں ہی گفتگو کیے جا رہی تھی جو اس کے خیال میں اسے لاحق ہو سکتی تھیں۔

''میرے خیال میں تو آپ آج کی رات ہمارے پاس ہی رک جائیں۔'' راستے میں شکیلہ بولی۔ ''گھر پہنچتے پہنچتے تین تو بج ہی جائیں گے۔ آپ دونوں کتنے تھکے ہوئے ہیں۔ جس طرح بھائی صاحب نے پانی پیا ہے، اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ بھوک بھی بہت لگی ہو گی۔ گھر ٹیلی فون کر دینا تا کہ کوئی پریشانی نہ ہو... کیوں سبحان...؟'' اس نے جواب طلب نگاہوں سے شوہر کو دیکھا۔

''ہاں... ہاں، کیوں نہیں۔'' وہ بولا۔ ''آپ دونوں ہمیں بہت اچھے لگے ہیں۔ اگر آپ کو کوئی مسئلہ نہ ہو تو ہمیں بہت خوشی ہو گی۔ آپ نے تو ویسے بھی لاہور جانا ہے۔''

غالب نے انہیں یہی بتایا تھا کہ وہ دونوں لاہور سے اسلام آباد گھومنے پھرنے آئے تھے۔

''یہ تو بہت اچھا ہو گا... میں کسی گیسٹ ہاؤس میں جانے کا ہی سوچ رہا تھا۔'' وہ بولا۔

''لو جی آپ بھائی کے ہوتے ہوئے گیسٹ ہاؤس جاؤ گے... نہیں نہیں، اب تو پکا گھر ہی چلیں گے۔''

''آپ کو زحمت ہو گی۔''

''کوئی زحمت نہیں جی۔ ہم لاہور آئیں گے تو آپ کے گھر رہ لیں گے... کیوں شکیلہ؟''

''بالکل بالکل...'' وہ بولی۔

ان کے لیے تو یہ جوڑی غیبی امداد بن گئی تھی۔ بغیر پیسے اور کریڈٹ کارڈ وہ کسی ہوٹل میں نہیں جا سکتے تھے۔ 'کل تک یقیناً کوئی راستہ نکل آئے گا۔' ایلیا نے مطمئن ہو کر سوچا۔

گھر پہنچتے ہی شکیلہ نے ایلیا کو نہانے بھیجا اور خود فریج کی تلاشی پر مامور ہو گئی۔

''ہماری بیگم صاحبہ ہفتے میں ایک دن خوب سارے کھانے پکا کر فریز کر لیتی ہیں پھر پورا ہفتہ آسانی رہتی ہے۔'' سبحان نے غالب کو بتایا۔ ''بچے تو ہمارے کوئی نہیں ہیں... بس گھومنے پھرنے کا شوق ہے مگر میں باہر کا کھانا بالکل نہیں کھاتا۔'' وہ بولے جا رہا تھا۔ شکیلہ نے اتنی دیر میں کھانا لگا لیا تھا۔

''بھائی صاحب، آپ اب کھانا کھا کر ہی نہائیے گا... اور پھر آرام کر لیجیے گا۔'' وہ بے تکلفی سے بولی۔

کھانے سے فراغت کے بعد انہوں نے فلیٹ کا دوسرا بیڈ روم ان کے سپرد کر دیا۔ ''آرام کر لیں... پھر شام کو باہر چلیں گے... ہاں آپ نے فون کرنے تھے نا، یہ لیجیے۔'' وہ ایک سیل فون ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''کیا میں ڈاکٹر انکل کو فون کروں؟'' ان کے جاتے ہی ایلیا نے پوچھا۔ ''وہی ہماری مدد کر سکتے ہیں۔''

''تم ان پر اعتماد کرتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، وہ میرے لیے پاپا کی طرح ہیں غالب...''

”مگر وہ تمہارے پاپا نہیں ہیں۔“ وہ بولا پھر چند لمحے چپ رہنے کے بعد کھڑا ہو گیا۔ ”میں نہا لیتا ہوں...“ شکیلہ اور سبحان نے انہیں کپڑے فراہم کر دیے تھے۔ ”تم اتنی دیر میں انہیں فون کر لو اگر تمہیں ان پر یقین ہے تو...“

”مجھے ہے۔“ وہ بہت یقین سے بولی۔

”پھر ٹھیک ہے۔“ وہ مسکرایا اور باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ ایلیا نے ڈاکٹر اسحاق کا نمبر ملایا۔ انہوں نے دوسری گھنٹی پر فون اٹھا لیا تھا مگر وہ ان کی آواز نہیں سن پا رہی تھی۔ آخر اس نے لاؤڈ اسپیکر کھولا تب آواز سمجھ میں آئی۔ سیٹ میں یقیناً کوئی خرابی تھی۔ اتنی دیر میں وہ فون کاٹ چکے تھے، ایلیا نے دوبارہ نمبر ملایا۔

”میں ایلیا ہوں ڈاکٹر انکل...“ رابطہ ملتے ہی وہ بولی۔

”اوہ میری بیٹی! کہاں ہو تم؟ میں اس قدر پریشان ہوں۔ شکر ہے کہ تمہاری آواز سننے کو ملی۔“ وہ واقعی بہت پریشان تھے یعنی انہیں اس کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔

”انکل... کوئی مجھے مارنا چاہتا ہے۔“ ان کی آواز سن کر اس کا دل بھر آیا۔ ”وہ میرے گھر میں گھس آئے تھے۔“

”میں جانتا ہوں۔ مجھے شیخ نے بتایا ہے، وہ حکومت کے آدمی تھے ایلیا...“

”سرکاری لوگ... مگر وہ کیوں؟ وہ کیوں مجھے مارنا چاہیں گے؟ وہ کیوں میرے پیچھے پڑے ہیں؟ میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ ہیجانی انداز میں بولی۔

”اوہ خدا... تم کچھ نہیں جانتیں ایلیا... وہ تمہارے پیچھے نہیں ہیں، وہ اس کے پیچھے ہیں... وہ شخص جسے تم میرے پاس لے کر آئی تھیں۔ تمہیں تو وہ بچانے آئے تھے۔“

”مجھے بچانے...“ ایلیا کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ”مجھے کیا ہوا ہے... مجھے کس سے خطرہ ہے؟“

”ایلیا! تم نے شاید سنا نہیں ہے، تمہیں خطرہ کسی اور سے نہیں اس شخص سے ہے جو تمہارے ساتھ ہے۔“ وہ ڈانٹنے والے انداز میں بولے۔

”کیا؟“ یہ ناممکن تھا۔ وہ کئی بار اس کی جان بچا چکا تھا۔ ”یہ ناممکن ہے انکل... غالب ایسا نہیں کر سکتا۔“

”اس کا اصل نام خضر ہے ایلیا... وہ شاید دہشت گردوں کا ساتھی ہے۔ اسے تمہارے پاپا کی کسی فائل کی تلاش ہے اور اسے تمہیں قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔“ ایلیا کے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ ”نہیں انکل! یہ نہیں ہو سکتا۔“

”میری بات سنو... وہ راستے میں زخمی ہوا اور اس کی یادداشت چلی گئی۔ اس کے اپنے مشن کو پورا نہ کر پانے کی یہی واحد وجہ ہے۔ اب اگر اس کی یادداشت واپس آ گئی یا کچھ بھی یاد آ گیا تو وہ یقیناً اپنا کام ختم کرے گا... وہ تربیت یافتہ کمانڈو ہے اور اس کا مشن تمہیں ختم کرنا ہے۔“

ایلیا کو محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا جسم مفلوج ہو گیا ہو۔

”آپ یہ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟ وہ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔“ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔

”ایلیا... اس نے تمہارے باپ کو بھی قتل کیا ہے۔“ اس جملے نے ایلیا کو آگ کے شعلوں میں پھینک دیا۔ ”اور یہ سب مجھے صائم شیخ نے بتایا ہے۔ جو لوگ کل تمہارے گھر میں گھسے تھے، وہ تمہیں خاموشی سے اس کی گرفت سے نکال لینا چاہتے تھے۔“ وہ خاموشی سے ان کی بات سن رہی تھی۔

☆☆☆

دو گھنٹے بعد ایلیا نے آنکھیں کھولیں۔ سامنے صوفے پر وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ اس کے فون بند کرنے کے بھی کئی منٹ بعد باتھ روم سے نکلا تھا اس لیے ایلیا کو یقین تھا کہ وہ کچھ بھی سن نہیں پایا ہو گا۔ وہ اپنی جگہ لیٹی چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔

ڈاکٹر انکل کی باتوں نے اسے بہت بڑا دھچکا پہنچایا تھا۔ وہ اب زندگی بھر کسی پر اعتماد نہیں کر سکتی تھی۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ بھروسا مند نظر آنے والا یہ مضبوط چہرہ اتنا دھوکا دے سکتا تھا۔ وہ اس کے پاپا کا قاتل تھا اور کتنی عجیب بات تھی کہ اس کے باوجود اس کے دل کا ایک حصہ مسلسل اس کی وکالت کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر انکل کو غلط معلومات ملی ہوں... مگر یہ وہ جانتی تھی کہ وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ وہ اس کے پاپا کی تصویر کو کئی بار نہایت محویت سے دیکھتا رہا تھا۔ شاید وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو... وہ غالب کے بغیر کیسے رہ سکے گی؟ یہ سوال اس کے دل پر خراشیں بنا رہا تھا۔ اگر وہ اس کے پاپا کا قاتل تھا تو اسے اس گناہ کی سزا ملنی ہی چاہیے۔ اس نے گالوں پر آنے والے آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کیا۔ وہ اپنے پاپا کے قاتل سے پیار کیسے کر سکتی تھی اور کر بھی لیا تھا تو وہ خود اپنے آپ کے سامنے بھی اس کا اقرار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ

خاموشی سے بستر سے کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر انکل نے اسے کہا تھا کہ وہ غالب کو اس بات کا علم نہ ہونے دے کہ وہ حقیقت جان گئی ہے اور جیسے ہی وہ سو جائے یا اسے موقع ملے، وہ وہاں سے نکل آئے۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہاں سے دو بلاک کے فاصلے پر موجود عمارت کی پارکنگ میں دو لوگ اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ان کا تعلق حکومت کے ادارے سے ہو گا جو اسے وہاں سے حفاظت سے لے آئیں گے۔ اسے وہاں موجود سفید ٹویوٹا کو دیکھنا ہو گا جس کا نمبر انہوں نے اسے بتا دیا تھا۔ اس کے بعد ایک ٹیم یہاں آ کر غالب یا خضر جو بھی اس کا نام تھا، اسے گرفتار کر لے گی۔

دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رک گئی۔ اس نے اپنے احمق دل کو مڑ کر دیکھنے سے روکا مگر وہ من مانی پر تلا ہوا تھا۔ وہ مڑ کر اسے آخری بار دیکھ لینا چاہتی تھی۔ وہ تیزی سے مڑ کر صوفے کے قریب آئی... ایک لمحہ اسے دیکھتی رہی اور پھر کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

خضر اپنی جگہ اس وقت تک ساکت لیٹا رہا جب تک وہ کمرے سے باہر نہیں نکل گئی۔ اس کے نکلتے ہی وہ تیزی سے کھڑا ہوا، جوتے پہنے اور کمرے سے باہر نکلا۔ وہ اسے زیادہ دور نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ سبحان اور اس کی بیوی بھی شاید آرام کر رہے تھے۔ وہ بہ آسانی فلیٹ سے باہر نکل آیا۔ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر جب وہ سڑک پر پہنچا تو وہ اسے اگلے بلاک کی جانب جاتی نظر آئی۔ وہ اس کی نظر میں آنے سے بچتا ہوا اس کے پیچھے چل پڑا۔

اس نے فون پر اس کی گفتگو کا آخری حصہ سن لیا تھا۔ شاور بند کرتے ہی اس کے حساس کان لاؤڈ اسپیکر سے نکلنے والی ہلکی آواز بھی آسانی سے محسوس کر سکتے تھے۔ وہ شخص ایلیا کو وہاں سے بھاگ جانے کو کہہ رہا تھا، اس کے مطابق وہ اسے مارنے آیا تھا۔ اس بات نے اسے چراغ پا کر دیا تھا۔ اس کے دل کا ایک حصہ اس بات کو ناممکن قرار دے رہا تھا مگر اندر کہیں کوئی آواز اسے الجھن میں ڈال رہی تھی۔

یہ سوچ کہ وہ ایلیا کو نقصان پہنچا سکتا ہے، اس کے دل میں خنجر کی طرح اتر گئی تھی۔ وہ اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا، نہ ہی کسی اور کو اس کی اجازت دے سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے انکل کو کسی اور نے یہ سب بتایا ہو مگر اس کا دل کہہ رہا تھا کہ ایلیا کسی خطرے میں پھنسنے جا رہی ہے۔ اس نے یہ گفتگو سنتے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے اس جال میں پھنسنے نہیں دے گا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا مگر وہ ان دو افراد سے اسے بچائے گا اور اگر کوئی اسے گرفتار کرنے اس فلیٹ تک آئے گا تو اسے یہ کمرا خالی ملے گا۔

ایلیا اور وہ دونوں ہی اتنی دیر میں پارکنگ لاٹ تک پہنچ چکے تھے۔ وہاں آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ جب وہ اس سفید ٹویوٹا تک پہنچی، خضر ایک ستون کے پیچھے چھپا ان کی آواز سن رہا تھا۔ ایلیا کو دیکھ کر گاڑی سے دو افراد اترے۔ وہ سوٹ میں ملبوس تھے مگر خضر کے دماغ میں انہیں دیکھتے ہی خطرے کی گھنٹی بجی تھی۔ وہ انہیں پہچانتا نہیں تھا مگر وہ یہ بات شرطیہ طور پر کہہ سکتا تھا کہ وہ اچھے لوگ نہیں تھے۔

”ڈاکٹر ایلیا؟“ ان میں سے ایک نے پوچھا۔ ایلیا کا سر اثبات میں ہلتے دیکھ کر وہ بولا۔ ”اور وہ... وہ وہیں ہے؟“

”ہاں... انکل نے کہا تھا کہ غالب کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“ اس کی آواز خوف اور تکلیف سے بھرائی ہوئی تھی

”اس کا نام خضر ہے ڈاکٹر ایلیا اور وہ ایک قاتل ہے۔“ ان میں سے ایک بولا۔ ”اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو اس کے لیے پریشان نہیں ہوتا۔“ خضر ان کی آوازیں...

بہ آسانی سن رہا تھا۔

"خضر۔" اس نے اپنا نام دہرایا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ اسی کا نام ہے مگر کیا پھر ان کا الزام بھی درست ہے؟ کیا وہ ایک قاتل ہے؟ نہیں، یہ ضروری نہیں تھا، اس نے سر جھٹکا۔

"آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔" دوسرا آدمی بولا۔

"نہیں... میں خود ڈاکٹر انکل کے پاس چلی جاؤں گی۔" وہ ہچکچا کر بولی۔

اگلے ہی لمحے اس شخص کے ہاتھ میں ریوالور نظر آیا۔ اس نے اس کی نال ایلیا کی طرف بڑھائی اور دوسرے شخص سے بولا۔ "انہیں اندر بٹھاؤ۔"

خضر بمشکل خود پر قابو کیے ہوئے تھا۔ اسے موقع کا انتظار تھا۔ ایلیا اس دوران میں پریشان سی کھڑی تھی۔ وہ ان دونوں کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی مگر اب وہ کیا کر سکتی تھی۔ اس نے قدم بڑھایا۔

"نہیں... مت بیٹھو..." خضر دل ہی دل میں بولا اور عین اسی لمحے وہ رک گئی جیسے اس نے اس کے دل کی آواز سن لی ہو۔

"ہمیں مجبور مت کرو۔" پہلا شخص غرایا۔ "ہم تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔ ہمیں صرف وہ فائل چاہیے۔"

"فائل...؟" ایلیا ساکت ہو گئی۔ "کون سی فائل؟"

"مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو... تم نے فون کا جواب دیا تھا اور تم سب جانتی ہو... بولو کہاں ہے فائل؟" وہ اب اس سے یہیں فیصلہ کن گفتگو کر رہے تھے۔

"ہاں، ہمیں صرف اس کی جگہ بتا دو اور فوراً... ورنہ تم بھی اپنے باپ کی طرح اللہ کو پیاری ہو جاؤ گی۔" دوسرے شخص نے سفاکانہ انداز میں کہا۔

"یعنی... تم نے... تم نے پاپا کو قتل کیا ہے؟" ایلیا بمشکل بولی۔

"نہیں، ہم نے نہیں... اس کے اپنے ساتھی نے... اس شخص نے جس پر اسے بہت اعتماد تھا۔" وہ مضحکہ خیز انداز میں بولا۔

ایلیا کا دل اس کے حلق میں دھڑک رہا تھا۔ یقیناً افتخار رسول... اس نے سوچا۔ "مجھے کسی فائل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ آخر اس میں ایسی کیا چیز ہے جس کی وجہ سے میرے پاپا کو قتل کر دیا گیا؟"

"واہ... کتنی معصوم ہو تم..." لمبا شخص ہنسا۔

"ذرا دیکھو اسے... وہ اسے کیا سمجھتے ہیں اور اسے کچھ بھی معلوم نہیں... اس بار ایجنسی بھی غلط فہمی کا شکار ہو گئی۔"

"ایجنسی..." یہ لفظ کسی تیز رفتار گولی کی طرح خضر کے دماغ میں لگا تھا۔ وہ اس لفظ کو جانتا تھا۔ اس کے اندر اس لفظ کی گردان ہو رہی تھی۔ فوراً اس نے خود کو ڈانٹا... اس وقت ایلیا کو اس کی ضرورت ہے۔

"ایجنسی...؟ یہ کیا ہے...؟" ایلیا نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

"یہ وہ جگہ ہے جہاں سے تمہارا دوست غالب آیا ہے۔ جس کے لیے تمہارے پاپا جیسے سائنس داں کام کرتے تھے۔" وہ بولا۔ "اب گاڑی میں بیٹھ جاؤ اگر زندہ رہنا چاہتی ہو تو..."

اس کے جملے نے ایلیا کے گرد سب کچھ چکرا دیا تھا۔ یعنی خضر اس کے پاپا کا قاتل نہیں تھا... یہ اس نے کیا کیا؟ اب کیا ہوگا؟ وہ کہاں آ پھنسی تھی؟ سامنے موجود دونوں افراد اسے سفاکانہ نظروں سے گھور رہے تھے۔ ان کے پستول اس کی طرف اٹھے ہوئے تھے اور وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے، یہ وہ سمجھ گئی تھی۔

"مجھے پاپا کے کام کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔ یقین کیجیے کہ مجھے کسی فائل کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں ہے۔" فائل کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے میز کی خفیہ دراز میں رکھی وہ سرخ فائل آ گئی۔

"تمہیں سب یاد آ جائے گا... اسے گاڑی میں ڈالو۔ ہمیں یادداشت واپس لانے کے کافی گُر معلوم ہیں۔ تمہیں فائل یاد آ جائے گی، مطمئن رہو۔" لمبے شخص نے سرد انداز میں کہا۔ اس کے آگے بڑھتے ہی ایلیا بھاگنے کی کوشش میں رپٹ کر زمین پر گری۔ اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی۔

"اس کا منہ بند کرو۔" لمبے قد والا غرایا۔ دوسرے کا تھپڑ ایلیا کے منہ پر پڑا تھا۔ اس نے بالوں سے پکڑ کر اسے کھڑا کیا مگر اسی وقت ان کے سروں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ان کے سر آپس میں زور سے ٹکرائے۔ پھر وہ اچھلتے ہوئے زمین پر گرے اور بے حس و حرکت ہو گئے۔ ایلیا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ معجزہ کیسے ہوا۔ اچانک وہ اس کے سامنے آ گیا۔

"تم ٹھیک ہو؟" وہ اسے چند لمحے دیکھتی رہی پھر اس

سے لپٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر یکلخت ایک جھٹکے سے اس سے الگ ہو گئی۔ اس کے ذہن میں ڈاکٹر انکل کے جملے گونج رہے تھے۔

"مجھ سے دور رہو۔" وہ بولی۔

"ایلیا! ہمارے پاس اس سب کے لیے وقت نہیں ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم تم کون ہو، تمہارا مشن کیا ہے۔"

اس کے جواب پر وہ اسے گھورتا رہا پھر اس نے سفید کرولا کا دروازہ کھولا۔ اسے اندر دھکیل کر دروازہ بند کیا اور دوسری جانب بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔

کار تیزی سے زمین پر پڑے مُردہ افراد سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

"تو مشن ناکام ہو گیا۔"

سرور فیروز نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"سر... خضر اسے بچا کر لے گیا۔ ہمارے تین آدمیوں کا نقصان ہوا۔" سلمان بولا۔

یہ معاملہ ان کے لیے دردِ سر بنتا جا رہا تھا۔ وزارت کی جانب سے بھی دباؤ بڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر سجاد کی حب الوطنی پر کسی کو شک نہیں تھا۔ انہوں نے غلطی یہ کی تھی کہ انہوں نے اپنے آخری پروجیکٹ پر ریسرچ بڑھاتے ہوئے اتھارٹیز کو اعتماد میں نہیں لیا تھا۔ افتخار اور امجد بٹ اس معاملے میں دشمنوں سے مل گئے تھے۔ اس سے متعلق ان کے پاس ثبوت موجود تھے۔ ان کے ساتھ ایک تیسری ہستی بھی تھی جس نے اس پروجیکٹ کی دشمنوں کو فروخت کے منصوبے پر ان دونوں کا ساتھ دیا تھا۔ ان کی معلومات کے مطابق وہ شخصیت ڈاکٹر صاحب کی کوئی قریبی ہستی تھی۔ افتخار رسول کے فرار کے بعد اس کے نمبر پر صرف ایلیا سجاد کی کال آئی تھی۔ اگر اس کو وہ نمبر معلوم تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ تیسری شخصیت وہ ہی ہو سکتی تھی۔ وہ اس کے خاتمے سے پہلے صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ فائل کہاں تھی اور یہ کہ دشمن اس بارے میں کس حد تک جانتے ہیں مگر وہ ان کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور شاید اب خبردار بھی ہو گئی ہو۔ خضر... جسے اس کام کے لیے مناسب ترین سمجھا گیا تھا، وہ ہی اس کا نجات دہندہ بن گیا تھا۔

خضر جسے وہ ہر صورت بچانا چاہتا تھا مگر اب یہ لگتا تھا کہ اُسے بھولنا ہوگا۔ خضر کے مقابلے کے لیے اسے اس کے مطابق کسی ایجنٹ کا انتخاب کرنا تھا اور وہ... صفدر کے سوا

فارمولا

پروفیسر نے کلاس میں کہا۔ "اگر فلاڈلفیا اور نیو یارک کا فاصلہ سو میل ہے، شکاگو اور فلاڈلفیا میں ایک ہزار میل کی دوری ہے اور لاس اینجلز دو ہزار میل دور ہے تو بتاؤ کہ میری عمر کیا ہے؟"

پچھلی نشست سے صرف ایک لڑکے نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ پروفیسر کے اشارے پر اس نے اٹھ کر کہا۔

"چوالیس سال!"

"ویری گڈ!" پروفیسر نے مسرت آمیز حیرت سے کہا۔ "تم نے کس فارمولے سے یہ حساب نکالا؟"

"بس اندازہ تھا... میرا ایک بھائی ہے، بائیس سال کا... اور وہ نیم پاگل ہے... میں نے سوچا کہ آپ یقیناً چوالیس سال کے ہوں گے۔"

کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے جمال کی طرف دیکھا۔

"صفدر کو بلاؤ... اب وہی اس معاملے کو دیکھے گا۔"

صفدر، خضر کی ٹکر کا ایجنٹ تھا۔ آخری مشن میں وہ خاصا زخمی ہو گیا تھا جس کی وجہ سے نان آپریشنل اور ان گراؤنڈ تھا مگر اب خضر کے مقابلے میں وہی ان کا ہتھیار بن سکتا تھا۔

☆☆☆

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" خاصی دیر بعد بالآخر ایلیا نے پوچھا۔

وہ خاموشی سے کار چلا رہا تھا۔ اس کے سوال پر اس نے دیکھا۔ "تمہارے گھر..." اس نے جواب دیا۔

"گھر... کیا تمہیں معلوم نہیں کہ وہ محفوظ نہیں ہے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"اس وقت وہی ہمارے لیے سب سے محفوظ جگہ ہے۔ وہ وہاں دوبارہ نہیں آئیں گے... اور انہیں اس بات کی امید بھی نہیں ہوگی کہ ہم وہاں جا سکتے ہیں۔"

اس کی بات ایلیا کو مناسب لگی۔

باقی کا راستہ وہ دونوں بالکل خاموش رہے۔ ایلیا اپنی سوچوں میں گم تھی۔ 'نہ جانے خان اور صفیہ کہاں ہوں گے۔' اس نے سوچا۔

گھر میں کوئی بھی نہیں تھا، سب کچھ اپنی جگہ پر تھا۔ یہ محسوس تک نہیں ہو رہا تھا کہ وہاں دو پارٹیاں تلاشی لے چکی

ہیں۔ گھر میں داخل ہوتے ہی پاپا کی یاد اور ان کی موت کے تصور نے ایلیا کو سوگوار کر دیا۔ وہ دروازے بند کرتا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم اپنا کام ختم کیوں نہیں کر لیتے؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"کیسا کام؟" اس نے ٹھٹک کر پوچھا۔

"انہوں نے تمہیں مجھے مارنے کے لیے بھیجا تھا نا... ماردو مجھے... یہ پاپا کو قتل کرنے سے تو آسان ہی ہوگا نا؟" وہ اس کے قریب آکر اس کے ہاتھ اپنی گردن پر رکھتے ہوئے بولی۔ "اس ساری بھاگ دوڑ کا کیا مقصد ہے؟"

"میں نے تمہارے پاپا کو قتل نہیں کیا۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں یہ نہیں بتا سکتا کہ کس طرح... مگر وہ میرے دوست تھے، یہ میں جانتا ہوں۔"

"مگر تم یہاں تو مجھے مارنے ہی آئے تھے نا؟"

"مجھے نہیں پتا... ایجنسی کے لفظ کو میں جانتا ہوں مگر باقی مجھے کچھ یاد نہیں آرہا۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"تو پھر تمہاری یادداشت کی واپسی کے بعد کیا چیز مجھے تم سے بچائے گی؟" اس نے پوچھا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر میں خود تمہیں نقصان پہنچاؤں، یہ ناممکن ہے ایلیا... تم میرے لیے زندگی کی طرح ہو..." اس کی آنکھیں یہ ثابت کر رہی تھیں کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ "میں تمہیں بچاؤں گا... میرا یقین کرو۔"

ایلیا ایک لمحے اسے دیکھتی رہی۔ اس کا دل یقین کے سمندر میں ڈوب رہا تھا۔

"ٹھیک ہے... میں ابھی آرہی ہوں۔" وہ مسکرائی۔ وہ پورے گھر کا جائزہ لے کر آیا تب وہ کچن میں موجود تھی۔ اس نے چولہا جلا رکھا تھا اور اس پر کاغذ جل رہے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"وہ فائل... جو اس سارے مسئلے کی جڑ ہے جس کی وجہ سے پاپا... کی جان گئی۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"تم اب مطمئن ہو؟" خضر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

"ہاں۔"

"اب تھوڑا آرام کرلو۔" اس نے صوفے پر بیٹھ کر آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

صفدر نے پارکنگ لاٹ کا معائنہ کیا، یہیں سے دو افراد کی لاشیں ملی تھیں۔ انہیں وہاں ان دونوں کی موجودگی کی خبر ملی تھی۔

اس کا فون تھرتھرایا۔ اس نے اسے کان سے لگایا اور بولا۔ "وہ یہاں سے جا چکے ہیں۔"

"انہیں ڈھونڈو۔" دوسری طرف سرور فیروز تھا۔

"اور اگر ضروری ہو تو دونوں کو ختم کردو۔"

صفدر نے فون بند کیا۔ وہ انہیں تلاش کرسکتا تھا۔ یہ اس کے لیے مسئلہ نہیں تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس صورتِ حال میں خضر کیا کرے گا... وہ کہاں گیا ہوگا؟

وہ یقینی طور پر کہہ سکتا تھا۔ وہ مسکرایا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

ایلیا صبح خاصی تر و تازہ تھی۔ اس فائل کے جلتے ہی اس کے ذہن سے ایک بوجھ سا اتر گیا تھا جیسے اس نے پاپا کی موت کا بدلہ لے لیا ہو۔ خضر اس کے پاپا کا قاتل نہیں تھا۔ یہ یقین اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آیا۔ پہلے اس نے سوچا کہ وہ ڈاکٹر انکل کو فون کرے مگر پھر اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔ وہ جتنا کم جانیں، یہ ان کے لیے ہی بہتر تھا۔

وہ کچن میں اپنے اور خضر کے لیے ناشتا بنا رہی تھی۔ ناشتے کی ٹرے تیار تھی۔ بس ہاتھ میں رکھا پراٹھا پلیٹ میں رکھ کر وہ اسے آواز دے گی۔ اس نے سوچا مگر جب وہ پراٹھا پلیٹ میں رکھنے کے لیے مڑی تو یک دم ساکت سی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں موجود چمچ پراٹھے سمیت زمین پر جا گرا... خوف گویا اس کے سامنے مجسم ہوگیا۔

وہ اس کے سامنے موجود تھا۔

خضر کی طرح لمبا... کسرتی جسم، مضبوط کاٹھی۔ اس کی نیلی آنکھیں ایلیا پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی نال ایلیا کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔

"حرکت مت کرنا۔" اس کی سرد آواز نے ایلیا کی سماعت کو چھوا۔

"تم... تم کون ہو؟" الفاظ اس کے منہ سے سرگوشی کے انداز میں برآمد ہوئے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا، خضر اس کے پیچھے نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک رائفل تھی۔ یہ اسے کہاں سے ملی... ایلیا کے دماغ میں سوال آیا۔ اس کے چہرے پر آنے والے تاثرات دیکھ کر آنے والا خضر کی جانب مڑ گیا۔

چند لمحے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

"تم کون ہو؟" خضر نے پوچھا۔

"تم جانتے ہو، میں کون ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ اس کی آواز میں کچھ ایسا تھا جو ایلیا کو لرزا رہا تھا۔ وہ بالکل خضر جیسا لگ رہا تھا۔

"کون ہو تم؟" خضر نے رائفل اس کی پشت پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"خضر! اسے نیچے رکھ دو۔" وہ ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر بولا۔ ایلیا کا دل دھڑک رہا تھا۔ یہ شخص ان دونوں کو مار ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ چند قدم آگے بڑھی... وہ خضر کو کسی انتہائی قدم سے روکنا چاہتی تھی۔

"تم اپنی جگہ پر رہو۔" وہ اس کی طرف مڑے بغیر غرایا۔ ایلیا ساکت ہوگئی۔ 'یہ یقیناً خضر سے زیادہ خطرناک ہے۔' اس نے سوچا۔

خضر اسے گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کون ہو تم...؟" وہ اسے اجنبی نہیں لگ رہا تھا مگر وہ اسے پہچان بھی نہیں پا رہا تھا۔

"صفدر۔" یہ نام اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ "دیکھو خضر! تمہیں یاد ہو یا نہ ہو مگر تم مجھے ہرا نہیں سکو گے۔ اگر تم نے مجھے مار بھی دیا تو وہ کسی اور کو بھیجیں گے۔ تم بچ نہیں سکو گے اس لیے یہ جھگڑا بند کردو۔" وہ بولا۔

"اور ایلیا...؟"

"وہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے خضر... میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور صبر تو اتنا بھی نہیں جتنا وقت... مجھے اپنا کام ختم کرنا ہے۔ میں تمہیں بچانا چاہتا ہوں... تم درمیان سے ہٹ جاؤ۔"

"میری زندگی میں یہ ممکن نہیں ہے۔" وہ مضبوطی سے بولا۔

"تو پھر پہلے تم جاؤ گے۔" صفدر نے سفاکی سے کہا۔ اس کا ریوالور والا ہاتھ بلند ہوا۔ ایلیا اسی لمحے اپنی جگہ سے ہلی تھی۔

"نہیں، تم اسے نہیں مار سکتے۔" وہ یک دم خضر کے سامنے آگئی۔ صفدر کی انگلیاں ٹریگر دبا چکی تھیں۔ اس سے پہلے کہ خضر، ایلیا تک پہنچتا، اس نے اس کے پیٹ سے خون کا فوارہ نکلتے اور اسے زمین پر گرتے دیکھا۔

"نہیں۔" اس کے منہ سے چیخ دھاڑ بن کر نکلی۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا اور اس نے ایلیا کو زمین پر گرنے سے بچا لیا۔

ماہی گیر

راشد نے اپنے نئے پڑوسی کو رات کے کھانے پر بلایا تاکہ ایک دوسرے کے بارے میں جان پہچان ہو جائے۔ نئے پڑوسی نے کھانے کے بعد بات چیت کے درمیان سوال کیا۔

"آپ کی مصروفیت کیا ہوتی ہے؟" اس پر راشد کا 8 سال کا بیٹا فوراً بول پڑا۔

"ابو ماہی گیر ہیں مچھلیاں پکڑتے ہیں۔"

راشد کی بیوی نے تیزی سے بیٹے کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ "بیٹے! یہ کیا کہہ رہے ہو۔ تمہارے ابو کا ماہی گیری سے کیا واسطہ... وہ اسٹاک بروکر ہیں نہ کہ ماہی گیر۔"

جس پر بیٹے نے جواب دیا۔ "نہیں ممی! جب بھی میں ابو کے دفتر جاتا ہوں تو وہ فون پر کسی سے بات کرنے کے بعد ہمیشہ خوشی سے دونوں ہاتھوں کو ملتے ہوئے کہتے ہیں۔ میں نے ابھی ابھی ایک اور بڑی مچھلی پھانسی ہے... مچھلیاں تو ماہی گیر ہی پھانستے ہیں نا!"

نادیدہ محبت

چار شادی شدہ سہیلیاں گپ شپ کر رہی تھیں۔ اچانک ایک نے تجویز پیش کی کہ وہ چاروں موبائل فون پر اپنے اپنے شوہروں کو محبت بھرا پیغام بھیجیں اور دیکھیں کہ کیا جواب آتا ہے۔ چاروں نے لکھا: ڈارلنگ! مجھے تم سے بہت پیار ہے۔"

ایک کے شوہر کا فوری جواب آیا۔ "خیریت تو ہے... کہیں تم نے کوئی خطرناک ایکسیڈنٹ تو نہیں کر دیا؟"

دوسرے نے لکھا: "سیدھی بات کیا کرو... یہ بتاؤ کہ تمہیں کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟"

تیسرا جواب آیا: "اب کیا کر دیا تم نے... اس بار میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔"

چوتھے نے اپنی بیوی کا نمبر SAVE نہیں کیا ہوا تھا۔ وہ تجویز دینے والی کا شوہر تھا۔ اس نے لکھا۔ "ڈارلنگ! میں بھی آپ کو دل و جان سے چاہتا ہوں لیکن آپ نے اپنا پیارا سا نام نہیں لکھا۔ کون ہیں آپ اور کہاں رہتی ہیں؟"

کوٹری سے حمیرا اقبال کا تعاون

"چلو خضر... اسے چھوڑو اور چلو۔" صفدر نے کہا۔
"نہیں... صفدر... پلیز ہمیں اسے اسپتال لے جانا ہے۔"
"یہ غدار ہے، ان غداروں کی ساتھی... تمہیں یاد نہیں کہ اس نے ڈاکٹر سجاد کے ساتھ بھی غداری کی ہے۔"
"یہ سچ نہیں ہے... اسے اس بارے میں کچھ معلوم بھی نہیں تھا۔ وہ پروجیکٹ حمزہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ بولا۔
"پروجیکٹ حمزہ۔" اچانک اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ ہاں... وہ خضر تھا... اسے یاد آیا ڈاکٹر سجاد کے قتل کے بعد وہ اس مشن پر تھا۔ امجد بٹ اور افتخار رسول... اور اسے تیسرے سازشی کی تلاش تھی... انہیں یقین تھا کہ وہ ایلیا ہے... مگر وہ نہیں تھی... وہ معصوم تھی۔ اسے اس بارے میں واقعی کچھ معلوم نہیں تھا۔
"صفدر... مجھے یاد آ گیا ہے سب... یہ معصوم ہے، اسے واقعی کچھ معلوم نہیں ہے۔" وہ بولا۔
"کیا تمہیں یقین ہے؟" صفدر نے ریوالور جیب میں رکھ لیا۔
"ہاں صفدر... اور ہر صورت میں یہ تمہاری حراست میں ہوگی اور میں بھی... پلیز اسے بچا لو۔" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ صفدر حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ شخص جسے پتھر کہا جاتا تھا، ون مین آرمی... محبت نے اسے اس قدر گداز بنا دیا تھا۔

☆☆☆

اسپتال میں گزرا وہ ایک دن انتہائی مشکل تھا۔ ایلیا کی سرجری کی گئی تھی۔ چوبیس گھنٹوں بعد اسے خطرے سے باہر قرار دیا گیا تھا۔ اس دوران میں سرور فیروز نے خضر سے لاتعداد سوالات کیے اور انہیں کسی حد تک یقین آ گیا تھا کہ ایلیا ڈاکٹر سجاد کے قتل اور اس سازش میں بالکل ملوث نہیں تھی مگر پھر وہ تیسرا ساتھی کون تھا؟ یہی ان کی سوچ کا مرکز تھا۔
خضر کے کئی میڈیکل چیک اپ ہوئے تھے۔ ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق اس کی ذہنی حالت بالکل نارمل تھی۔ کمال کی بات یہ تھی کہ ماضی کی یاد کے ساتھ ساتھ اسے ایلیا اور اس سے متعلق تمام باتیں بھی بخوبی یاد تھیں۔
وہ چیک اپ اور سوالات سے فراغت پاتے ہی ایلیا کے کمرے میں چلا آیا۔
ڈاکٹرز کے مطابق اس کی سرجری کامیاب ہوئی تھی۔ گولی نکال دی گئی تھی اور وہ خطرے سے باہر تھی۔ اب انہیں اس کے ہوش میں آنے کا انتظار تھا۔

☆☆☆

وہ کچھ محسوس کر رہی تھی۔
آوازیں... یہ آوازیں اس کے شعور کو جھنجوڑ رہی تھیں... خضر... ہاں، یہ آواز تو اسی کی ہے۔ وہ مسکرائی یا پھر خواب جیسے اس عالم میں اسے ایسا محسوس ہوا۔ وہ کہاں تھی؟ یہ وہ نہیں جانتی تھی پھر دوسری آواز نے شناخت کی سرحد عبور کی۔ ڈاکٹر انکل... شکر ہے کہ وہ آ گئے۔ اب وہ ضرور ان کی مدد کریں گے... غیر ارادی طور پر اس کی پلکیں جھپکیں۔ آنکھیں کھلیں اور پھر روشنی کے جھماکے نے اسے دوبارہ آنکھیں بند کرنے پر مجبور کر دیا۔
اس ایک لمحے سے بھی کم وقت میں اسے اپنے سامنے خضر کا چہرہ نظر آیا۔
ذہن کی اسکرین پر یکلخت گویا فلم سی چلنے لگی۔ صفدر... وہ خضر پر گولی چلانے ہی والا تھا۔ اس نے اسے روکنے کی کوشش کی... گولی کا چلنا... آگ کا شعلہ گویا اس کے پیٹ میں جا گھسا تھا اور پھر وہ ناقابلِ بیان تکلیف... جو اس کے وجود پر حاوی ہوتی چلی گئی۔ خضر کی نگاہیں جن میں پریشانی، بے بسی اور گھبراہٹ نمایاں تھی... اور پھر سب کچھ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔
اب وہ کہاں تھی؟
کیا وہ مر چکی تھی؟ اس نے گھبرا کر دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ شروع میں سب کچھ دھندلا دھندلا تھا پھر منظر واضح ہوتا چلا گیا۔ اس نے سامنے رکھے مانیٹر کو غور سے دیکھا جو اس کے دل کی دھڑکنوں کا حساب کر رہا تھا۔ تو وہ اسپتال میں تھی۔
"شکر ہے... تمہیں ہوش آ گیا میری بچی۔" اس نے غور سے سامنے دیکھا۔
"انکل..." وہ مسکرائی۔ اس کا گلا انتہائی خشک تھا۔
"پانی۔" وہ بمشکل بولی۔
خضر یکدم اس کے سامنے آیا۔ وہ اب ڈاکٹر انکل اور اس کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا کپ تھا جس میں اسٹرا بھی موجود تھی۔
"سب ٹھیک ہے ایلیا... اب تم جلد ہی... ٹھیک ہو جاؤ گی۔" وہ اسے پانی پلاتے ہوئے بولا۔ پانی اس کے خشک گلے کو بہت اچھا لگا تھا، شاید اس کی سرجری ہوئی ہے۔ اس نے سوچا۔
"صفدر... وہ کہاں ہے؟ کیا ہوا تھا؟ تم ٹھیک ہو نا؟" وہ سب جان لینا چاہتی تھی۔
"تم اپنے ذہن پر زیادہ زور مت ڈالو۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ "صفدر میری بات سمجھ گیا۔ وہی تمہیں میرے ساتھ اسپتال لایا اور تمہیں گرتے دیکھ کر مجھے نہ جانے کس طرح سب کچھ یاد آ گیا... اب تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"
"سچ... تمہیں سب یاد آ گیا اور تم مجھے نہیں بھولے؟" اس نے جذبات میں آ کر اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔
"نہیں... تمہیں بھولنا اتنا آسان کام ہے بھی تو نہیں... اگر بھول جاتا تو ڈر تھا کہ تم پھر میرے سر پر ڈنڈا نہ مار دو۔" وہ مسکرایا۔ "بس اب کوئی سوال نہیں..."
"اوکے سر۔" وہ بھی مطمئن انداز میں مسکرا دی۔
"میں ان دونوں آدمیوں کی وجہ سے بہت شرمندہ ہوں ایلیا! مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ ان غنڈوں کے ساتھی ہیں۔ مجھے جو بتایا گیا میں نے تم سے کہہ دیا۔" ڈاکٹر انکل نے آگے آتے ہوئے کہا۔
"آدمی... کون...؟" وہ ایک لمحے کو گڑبڑا گئی پھر اسے وہ لمبا اور چھوٹا شخص اور ان کے ریوالور یاد آئے۔ اگر خضر نہ آتا تو وہ یقیناً اسے مار ڈالتے۔
"نہیں انکل! ایسا مت کہیں، آپ کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔"
"پھر بھی... مجھے ان پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے تھا۔"
"مگر انہوں نے کہا تھا کہ میرے پاپا کو ان کے قریبی ساتھی نے مارا ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو چمک اٹھے۔
"کیا؟" وہ زور سے چونکے۔ ایلیا نے ان کی طرف دیکھا۔ انہیں واقعی حیرت زدہ ہی ہونا چاہیے۔ انہیں اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس نے سوچا۔
"مجھے لگتا ہے کہ وہ افتخار رسول ہی ہو سکتا ہے۔"
"میں... میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔" وہ بہت پریشان نظر آ رہے تھے۔
"ایلیا! میرے خیال میں یہ ان باتوں کے لیے مناسب وقت نہیں ہے۔ انکل کو تم بعد میں بھی تفصیلات بتا سکتی ہو۔" خضر نے اسے سمجھایا۔
"مگر انہیں معلوم ہونا چاہیے۔" وہ بولی۔ "انہیں بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔"
"خطرہ... یہ سب کیا ہے؟ مجھے بتاؤ ایلیا؟" ڈاکٹر اسحاق بولے۔
"آپ کو معلوم ہے نا کہ پاپا ٹاپ سیکرٹ پروجیکٹس پر کام کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک پروجیکٹ کی انفارمیشن کے حصول کے لیے ان کو قتل کر دیا گیا۔"
"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ کوئی سجاد جیسے شخص کو قتل کر سکتا ہے۔" وہ بولے۔
"مگر ایسا ہوا ہے۔" وہ بھیگے ہوئے کمزور لہجے میں بولی۔ "جن لوگوں نے انہیں مارا، وہی مجھے بھی قتل کرنے کی کوشش کر رہے تھے... مگر میں نے انہیں ہرا دیا۔ اب وہ فائل انہیں کبھی نہیں مل سکتی... کبھی نہیں۔"
"کیا مطلب؟" ڈاکٹر اسحاق اس کے مزید قریب آ گئے اور انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ان کی گرفت خاصی سخت تھی۔ ایلیا نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا پھر گویا تناؤ کو ختم کرنے کے لیے مسکرائی۔
"ایلیا! مجھے بتاؤ کہ اس بات کا مطلب کیا ہے؟" وہ بولے۔ "اب بھی وہ اسے کیوں حاصل نہیں کر پائیں گے کا مطلب کیا ہے؟" ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔
"ایلیا نے اسے جلا دیا ہے۔" خضر آگے بڑھ کر بولا۔ اسے یہ سب ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ ڈاکٹر کے رویے کی کوئی بھی وجہ ہو سکتی تھی مگر خضر کے دماغ میں سرخ بتی جل رہی تھی۔
"ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ خضر کی طرف دیکھ کر غرائے۔
"مجھے اس بات پر یقین نہیں ہے۔ ایلیا! بتاؤ سچ کیا ہے؟"
"یہ سچ کہہ رہا ہے انکل۔" ایلیا بمشکل بولی۔ اس کا دماغ اسے جو سمجھا رہا تھا، دل اسے ماننے پر تیار نہیں تھا... نہیں... یہ ہو ہی نہیں سکتا... اس نے سر جھٹکا۔
"میں نے اس فائل اور ٹیپ کو جلا دیا ہے انکل... اس کی وجہ سے پاپا کی جان گئی اور میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ اور خون بہنے کا سبب بنے۔"
"اوہ احمق لڑکی۔" ڈاکٹر نے سر پکڑ لیا۔ "اس کی قیمت جانتی ہو تم؟ پچاس کروڑ سے زائد۔" انہوں نے یکلخت جیب سے ریوالور نکال کر ایلیا پر تان لیا۔ "اگر میں انہیں یہ فائل نہیں دے پایا تو وہ مجھے قتل کر دیں گے۔"
ایلیا سکتے کے عالم میں انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل چیخ چیخ کر دعا کر رہا تھا کہ یہ سب خواب ہو۔ ڈاکٹر انکل ایسا نہیں کر سکتے مگر حقیقت دل کی تمناؤں کے ساتھ چلنے کی پابند نہیں ہوا کرتی۔ خضر خاموشی سے ڈاکٹر اسحاق کو گھور رہا تھا۔ اسے وہ ریوالور ایلیا سے دور کرنا تھا، اس کے بعد ڈاکٹر

اس کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔

"کیوں...؟ کیوں انکل! آپ نے یہ سب کیوں کیا؟ پیسے کے لیے؟" اس نے آگے بڑھ کر انہیں جھنجوڑنے کی کوشش کی مگر درد کی تیز لہر نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

"ہاں اور کیا..." ڈاکٹر اسحاق دیوانگی بھرے لہجے میں بولے۔ "پیسے کے لیے... کیا میں ساری عمر بس تمہارے باپ کو کامیاب ہوتے دیکھتا رہتا۔ مجھے موقع ملا اور میں نے اس سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ بات کی تھی اس سے... جب وہ جان ہی گیا تھا تو سمجھایا تھا اسے کہ میرے راستے میں نہ آئے مگر اس پر ایمان داری کا بھوت سوار تھا... نہیں مانا... کیا کرتا؟ اسے خاموش کرنا ضروری تھا... مارنا پڑا اسے... مگر وہ فائل نہیں مل سکی۔"

"آپ نے... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ ایسا کر سکتے ہیں۔" وہ ہوش اور بے ہوشی کے درمیان ڈولتے ہوئے بولی۔

"کیوں؟ کیوں نہیں کر سکتا... میں اور تمہارا باپ ایک ساتھ بڑے ہوئے۔ ایک ساتھ پڑھا مگر ہر کامیابی اس کے حصے میں آئی... میں تو بس اس کو آگے بڑھتے دیکھتا رہا، کیا کمی تھی مجھ میں؟ مگر مجھے موقع نہیں ملا، وہ کامیاب ہوتا گیا۔ مجھے بھی پیسا چاہیے۔ میں جس اسپتال کو چلا رہا ہوں نا، وہ بھی تمہارے باپ کی ملکیت ہے جو مجھے آخرکار تمہارے حوالے کرنا تھا۔ یہ موقع ایسا تھا جب میں ایک ساتھ کروڑوں کما سکتا تھا۔"

"اس لیے تم نے افتخار رسول کے ساتھ ساز باز کی؟" اس بار خضر بولا۔

"ہاں۔" ڈاکٹر نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "افتخار نے مجھے اس بارے میں بتایا۔ امجد کے پاس بڑی آفر موجود تھی۔ ہم تینوں نے منصوبہ بنایا۔ مجھے وہ فائل حاصل کرنا تھی کیونکہ میں ہی سجاد کی چیزوں تک جا سکتا تھا۔ ہمیں اس کے لیے بڑی رقم کا ایڈوانس بھی مل گیا اور میں نے ملک سے باہر اپنا سیٹ اپ بنانا شروع کر دیا۔ اب اگر اس نے وہ فائل برباد کر دی ہے تو..." وہ انتہائی نفرت سے ایلیا کو گھور کر بولے۔

"ہاں... ایلیا نے اسے جلا ڈالا ہے۔" خضر اسے باتوں میں لگا کر ریوالور حاصل کرنا چاہتا تھا۔ "ڈاکٹر! جب یہ سب شروع ہوا کیا تمہیں اس وقت سے معلوم تھا کہ تمہیں اپنے دوست کو مارنا پڑے گا؟"

"نہیں، مگر مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ مانے گا نہیں... ایلیا! مجھے وہ فائل چاہیے۔ اب اچھے بچوں کی طرح سچ سچ بتاؤ تم نے اسے کہاں چھپایا ہے... میں اس کہانی پر یقین نہیں کر سکتا... تم دونوں جھوٹ بول رہے ہو۔"

"سب ٹھیک ہے؟" صفدر کے اچانک سوال نے ان تینوں کو چونکا دیا۔ خضر کے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔ اس نے ڈاکٹر کے ریوالور والے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں جکڑا اور اسے پیچھے گھسیٹ لیا۔ کھینچ تان میں وہ دونوں زمین پر جا گرے۔ ڈاکٹر اسحاق نے مزاحمت کی کوشش کی مگر چند لمحوں بعد ہی وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے۔

ایلیا پھٹی پھٹی نظروں سے ان کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"ایلیا! تم ٹھیک ہو نا؟" خضر ڈاکٹر کی جانب سے فراغت پا کر اس کی طرف لپکا پھر وہ سامنے کھڑے صفدر کی جانب مڑا۔ "تم نے سن لیا نا سب... صفدر! اب تو تمہیں مکمل یقین آ گیا..."

"کس بات کا یقین؟" ایلیا نے چونک کر پوچھا۔

"یہ تفصیل تمہیں سرور صاحب خود بتا دیں گے۔ وہ اسپتال میں ہی ہیں۔ پہلے میں اس آستین کے سانپ کو اس کی جگہ پر پہنچا دوں۔" صفدر نے ڈاکٹر کو اسٹریچر پر ڈلواتے ہوئے کہا۔

"یہ... صفدر کیا کہہ رہا ہے؟ کون سی تفصیل...؟"

ایلیا نے خضر کی جانب دیکھا۔

"تھی ایک غلط فہمی... جس نے مجھے تم سے قریب ہونے کا موقع دیا۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ ہونی ہو کر رہتی ہے تو سمجھ لو کہ ایک انہونی کے یقین نے اس ہونی کو ممکن بنا دیا۔" خضر اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے بولا۔

"تم کیا کہہ رہے ہو... میرا تو سر چکرا گیا ہے۔" ایلیا نے اسے گھورا۔

"تم زیادہ مت سوچو... اور بس آرام کرو... پلیز۔" خضر نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

اب وہ اسے کیا بتاتا کہ انہیں اس پر شک تھا۔ اب اس مثلث کا صرف ایک کردار ان کی دسترس سے باہر تھا مگر پروجیکٹ حمزہ محفوظ تھا۔ افتخار رسول جلد یا بدیر ان کے یا پھر دشمنوں کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچنے والا تھا۔

ایلیا محفوظ تھی اور اللہ کے کرم سے اسے سب کچھ یاد تھا۔ اس کا سر بے اختیار سجدے میں جھک گیا۔ ایلیا اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

انتظار

کاشف زبیر

پہاڑ جیسی زندگی کی سیاحی آسان نہیں... تہ در تہ پیچیدہ اور گھور اندھیروں میں ٹٹول ٹٹول کر سفر کرنے والوں کی کہانی... ان اندھیروں میں حالات یک بعد دیگرے اس قدر الجھتے چلے جاتے ہیں کہ یہ پتا نہیں چلتا کہ کون سے واقعہ مقدم ہے... آنکھوں کی روشنی سے محروم لڑکی کے حالاتِ زیست... خوشیوں کا ایک لامتناہی انتظار سایہ بہ سایہ اس کے ہمراہ تھا...

دھوپ چھاؤں کے طویل سفر میں اپنے پرائے کی پہچان کرا دینے والا سرورق

وہ زمین پر بیٹھی ہاتھ سے ٹٹول رہی تھی۔ کچھ سوکھی شاخیں اس کے ہاتھ میں آئیں تو اس نے انہیں مٹھی میں دبا لیا۔ وہ یونہی بیٹھے بیٹھے بے آواز سرک رہی تھی اور اس کے ہاتھ زمین ٹٹول رہے تھے۔ اچانک ایک کرخت مردانہ آواز گونجی۔ "شہنا! مجھے معلوم ہے تو کہاں ہے... تو چھپی نہیں رہے گی۔"

اس نے آواز سے سمت کا تعین کیا اور اسی طرح آگے بڑھتی رہی۔ ساتھ ہی وہ راستے میں سوکھی ٹہنیاں زمین پر

www.paksociety.com

رکھتی جارہی تھی۔ بالآخر وہ ایک بڑے درخت تک پہنچ گئی۔ اس نے ٹٹول کر اس کا تنا دیکھا۔ پھر اسے تھام کر کھڑی ہوئی اور تنے سے پشت لگالی۔ وہ ساکت تھی اور تمام توجہ سماعت پر دے رہی تھی۔ اچانک سوکھی ٹہنی چٹخنے کی آواز آئی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ چند لمحے بعد پھر ویسی ہی آواز آئی اور اس بار یہ خاصی نزدیک سے آئی تھی۔ اس نے سانس روک لی۔ آنے والا خاصا نزدیک آگیا تھا اور اب وہ اپنے کانوں سے اس کے قدموں کی آہٹیں سن سکتی تھی۔ زمین سے اٹھتے ہوئے اس نے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا لیا تھا۔ آنے والا اسی درخت کی طرف آرہا تھا۔ یہ اس چھوٹے سے جنگل کا سب سے بڑے تنے والا درخت تھا۔ بہت اونچا اور بہت گھنا۔ جیسے ہی آدمی پاس آیا، اس نے پتھر ایک طرف اچھال دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ گھومی اور درخت کے تنے کے ساتھ گھومتی ہوئی نکلی اور آدمی کو پکڑ لیا۔

''شہنا۔'' آدمی نے کہا لیکن اس بار اس کے لہجے میں شفقت تھی۔

''بابا۔'' وہ ہنسی۔ وہ بہت دیر سے اپنی ہنسی دبا رہی تھی۔ ''میں آج جیت گئی۔''

داؤد خان تقریباً تیس برس کا جوان اور خوش رو شخص تھا۔ وہ طویل قامت اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کے نقوش لڑکی کے چہرے پر موجود تھے۔ وہ اس کی بیٹی تھی۔ اس نے محبت سے اسے بازو کے گھیرے میں لے لیا۔

''میری بیٹی... اللہ ہمیشہ تجھے کامیاب کرے۔''

''بابا۔'' دس سالہ شہنا گل نے باپ کو پکڑ لیا۔ ''آپ میری آنکھ ہو۔''

''ہاں، میں اپنی بیٹی کی آنکھ ہوں۔'' اس نے شہنا کے سر پر پیار کیا اور پھر اسے لے کر جنگل سے باہر آگیا۔ جنگل کے فوراً بعد باغات تھے۔ سیب، آڑو اور خوبانی کے درخت تھے۔ ان کے بعد سرخ اینٹوں اور کھپریل کی چھت والا مکان تھا۔ اس کے گرد سرخ اینٹوں سے چار دیواری بنی ہوئی تھی۔ جنگل سے نکلتے ہی شہنا نے باپ سے الگ ہو کر اپنی نابیناؤں والی چھڑی کھول لی تھی اور اس سے ٹٹول کر راستہ دیکھنے لگی۔ ساتھ ہی وہ داؤد سے بات کر رہی تھی۔ اس کی ماں اس کی پیدائش کے وقت انتقال کر گئی تھی۔ روما گل صرف انیس برس زندہ رہی اور اسے صرف ایک سال کی ازدواجی زندگی نصیب ہوئی تھی۔ جب شہنا دنیا میں آئی تو اس سے چند لمحے پہلے روما دنیا سے جا چکی تھی۔ اسے اپنی بیٹی کی ایک جھلک بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

داؤد کی حالت صدمے سے غیر ہو گئی تھی۔ روما اس کی خالہ کی بیٹی ہی نہیں، اس کی محبت بھی تھی۔ ماں نہیں مان رہی تھی مگر اس نے ضد کر کے یہ رشتہ کرایا۔ پھر کتنے چاؤ اور ارمان سے وہ اسے بیاہ کر لایا تھا اور وہ ایک صرف ایک سال میں اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ پھر اس کے حواس بحال ہوئے تو اسے شدت سے اس بچی پر غصہ آنے لگا جس نے آکر روما کو اس سے دور کر دیا تھا۔ وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ اسے مار نہ بیٹھے۔ وہ روما کو مٹی کے سپرد کر کے آیا تو اس نے پہلی بار بیٹی کے رونے کی آواز سنی۔ اس آواز نے اس پر عجیب اثر کیا۔ اسے لگا کہ وہ اسے پکار رہی ہے، فریاد کر رہی ہے کہ یہ کیسا ظلم ہے کہ ماں سے قدرت نے محروم کیا لیکن باپ ہوتے ہوئے بھی اس سے دور ہے۔ وہ کھنچا ہوا اس کے پالنے تک چلا آیا۔ پھر اس نے پہلی بار اسے دیکھا۔ شہنا نے سیکڑوں بار یہ ساری کہانی سنی تھی اور ہر بار اسے لگتا کہ وہ پہلی بار سن رہی ہے۔ وہ ہر بار پوچھتی۔ ''بابا! پھر کیا ہوا... جب تم نے پہلی بار مجھے دیکھا؟''

''پھر مجھے تجھ سے دنیا میں سب سے زیادہ محبت ہو گئی۔'' داؤد نے کہا۔ یہ سچ صرف اتنے فرق سے سچ تھا کہ داؤد نے دنیا میں سب سے زیادہ محبت روما سے کی تھی۔ وہ آج بھی اس سے محبت کرتا تھا۔ صرف بیس سال کی عمر میں وہ اس سے جدا ہوئی تھی اور آج اس بات کو دس سال ہو گئے تھے مگر اسے ایک لمحے کے لیے بھی دوسری شادی کا خیال نہیں آیا۔ وہ جوان تھا پیسا بھی تھا۔ ماں باپ اور دوسروں نے بہت دباؤ ڈالا مگر اس نے دوسری شادی کو ہمیشہ ٹال دیا۔ ماں باپ گزر چکے تھے اور اب اس دنیا میں اس کا ایک بھائی تھا۔ ان کے باپ نے تربیلا جھیل کے درمیان... ان ویران پہاڑوں میں کوئی چالیس برس پہلے یہ جگہ حکومت سے لی تھی۔ اس وقت بہت سستی مل رہی تھی۔ یہاں پانی تھا مگر زمین بہت ناہموار اور کسی قدر بنجر تھی۔ زمین بخت خان نے بہت محنت سے اسے آباد کیا۔ وہ پشاور کا رہنے والا تھا مگر رشتے داری کے جھگڑوں سے تنگ آکر وہ یہاں ویرانے میں آکر بس گیا۔ اس وقت ڈیم زیرِ تعمیر تھا۔ یہاں سے قریب ترین سڑک بھی آٹھ میل دور ہری پور جانے والی ہائی وے تھی۔ چند سال بعد وہ بیوی اور بیٹے سعود کو یہاں لے آیا۔

داؤد یہیں پیدا ہوا تھا۔ اس وقت تک زمین بخت اپنی زمین کے بڑے حصے کو باغ میں تبدیل کر چکا تھا۔

یہاں اس نے پھلوں کے بہترین درخت لگائے۔ سعود کم عمری سے باپ کے ساتھ زمین پر لگ گیا تھا۔ مگر تقریباً دو مربع زمین پر کام کرنا ان دونوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے زمین بخت پشاور سے کچھ لوگوں کو لایا اور انہیں اپنی زمین پر آباد کیا۔ اب وہ اس کے باغ میں کام کرتے تھے۔ یہاں سے قریب ترین گاؤں بھی پانچ میل دور سڑک کے پاس آباد تھا۔ وہاں اسکول تھا اور داؤد نے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ سعود کو پڑھنے لکھنے سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ مشکل سے پانچ جماعت تک پہنچا اور اس نے مزید پڑھنے سے انکار کر دیا۔ تعلیم کے معاملے میں وہ غبی تھا مگر زمین کے معاملات میں اس کا دماغ خوب چلتا تھا۔ اسی نے باپ کو مشورہ دیا کہ زمین کے عقب میں موجود پہاڑ اور جنگل کی ملکیت حاصل کر لے۔ بیٹے کے مشورے پر زمین بخت نے یہ زمین بھی حاصل کر لی۔

زمین بخت کی شادی تاخیر سے ہوئی تھی۔ وہ کمانے میں لگا رہا تھا۔ اڑتیس برس کی عمر میں اس کی شادی ہوئی۔ وہ چالیس سال کا تھا جب سعود پیدا ہوا اور جب داؤد پیدا ہوا تو وہ پینتالیس برس کا ہو چکا تھا، شاید اسی لیے اس نے اپنے بیٹوں کی شادیاں جلدی کی تھیں۔ داؤد کی شادی کے دو سال بعد وہ نمونیے کے حملے میں چل بسا۔ اپنی موت سے چار دن پہلے تک وہ زمین پر کام کرتا رہا تھا۔ اپنی زندگی میں اس نے زمین کے دو الگ الگ حصے کر دیے تھے اور باقاعدہ وصیت میں انہیں سعود اور داؤد کے نام کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا، سگے بھائیوں میں خون ریزی کی سب سے بڑی وجہ یہی زمین ہوتی ہے۔ اس لیے اس نے پہلے ہی سدباب کر دیا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس ویرانے میں جہاں یہ دو بھائی ہی تھے، وہ آپس میں مل جل کر اور پیار محبت سے رہیں گے۔

داؤد کو پڑھنے کا شوق تھا۔ اسکول کی تعلیم کے بعد وہ نوشہرہ کیڈٹ کالج چلا گیا۔ اس نے وہیں سے گریجویشن کیا۔ اس کا رجحان فوج کی طرف تھا مگر زمین بخت نے اسے اجازت نہیں دی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر وہ فوج میں چلا گیا تو اس کی زندگی بھائی سے الگ ہو جائے گی اور سعود اکیلا رہ جائے گا۔ مجبوراً گریجویشن کے بعد داؤد واپس گھر آگیا اور زمین بخت نے اس کی شادی کر دی۔ سعود اس سے پانچ سال بڑا تھا اور اس کی شادی بھی پانچ سال پہلے ہوئی تھی۔ لیکن اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ تعلیم اور پھر مزاج میں فرق کی وجہ سے دونوں بھائیوں میں ایک غیر محسوس سی جھجک تھی۔ وہ آپس میں بے تکلف نہیں تھے البتہ داؤد بڑے بھائی کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔ باپ کے بعد اس نے سعود سے کہا کہ وہ اب اس خاندان کا بڑا ہے۔ سعود سنجیدہ اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا شخص تھا۔ زمین الگ ہو گئی تھی لیکن کام کرنے والے ملازمین مشترک تھے اور ان کے معاملات سعود دیکھتا تھا۔

اب تک داؤد باپ والے گھر میں رہ رہا تھا جو سعود والے حصے میں تھا۔ باپ کے بعد اس نے اپنے حصے پر اپنا گھر بنوانا شروع کر دیا اور جب شہنا دو سال کی ہوئی تو وہ یہاں منتقل ہو گئے۔ یہ خوب صورت اور کسی قدر شہری طرز کا گھر تھا۔ شہنا کی دیکھ بھال اور گھر کے کاموں کے لیے دو ملازمائیں تھیں۔ ان کے آدمی زمین پر کام کرتے تھے اور داؤد ان پر اعتبار کرتا تھا۔ اس لیے جب اسے کہیں باہر جانا ہوتا تو اسے شہنا کی زیادہ فکر نہیں ہوتی تھی۔ انہی دنوں شہنا کی آنکھوں کے مسئلے کا حتمی طور پر پتا چلا۔ اندازہ تو چند مہینے کی عمر میں ہو گیا تھا کہ اسے ٹھیک سے نظر نہیں آتا ہے مگر دو سال کی عمر میں جب اسلام آباد کے ایک اچھے اسپتال میں اس کا چیک اپ ہوا تو پتا چلا کہ اس کی بینائی نہ ہونے کے برابر ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ تاریکی اور روشنی میں فرق محسوس کر سکتی ہے۔ اس کے ریٹنا میں مسئلہ تھا اور اس وقت اس کا کوئی علاج بھی نہیں تھا۔ یہ داؤد کے لیے دوسرا صدمہ تھا۔ شہنا ساری عمر دیکھنے سے قاصر رہے گی۔ یہ داؤد کے لیے دہرا صدمہ تھا۔

پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود شہنا کی آنکھ بنے گا۔ اس کی بچی بینائی سے محروم افراد کی طرح گھر تک محدود نہیں رہے گی۔ وہ چھوٹی سی تھی کہ داؤد اسے باہر لے جانے لگا۔ اسے زمین پر اور جنگل میں گھماتا پھراتا۔ کبھی کبھی وہ اسے تربیلا کی جھیل تک لے جاتا۔ اب یہ علاقہ کسی قدر آباد ہو گیا تھا۔ جو زمین کسی زمانے میں بے آباد تھی، اب اس پر کہیں کہیں کھیتیاں اور باغات لہلہانے لگے تھے۔ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے گاؤں بس گئے تھے۔ مگر یہ سو پچاس گھروں والے گاؤں تھے۔ بجلی اور بعض جگہوں پر گیس اور فون کی سہولت آگئی تھی۔ بعض جگہوں پر شہر کے لوگوں نے بڑے بڑے بنگلے بنا لیے تھے۔ سڑکیں بن گئی تھیں اور دوسری سہولیات بھی آگئی تھیں۔ یہاں آس پاس نابینا بچوں کے لیے کوئی اسکول نہیں تھا اور وہ شہنا کو دور نہیں بھیج سکتا تھا اس لیے داؤد نے خود پہلے بریل سیکھی اور پھر اس کی مدد سے شہنا کو پڑھانے لگا۔ پانچ سال کی عمر میں اس نے اسکول جانا شروع کیا۔ یہ ایک پرائیویٹ اسکول تھا جہاں شہنا سن کر یاد

کرتی تھی اور باقی داؤد اسے پڑھاتا تھا۔ وہ خود اسے روز اسکول چھوڑنے اور لینے جاتا تھا۔ پھر گھر میں پڑھاتا تھا۔ داؤد کے پاس جو علم تھا، وہ اسے شہنا کو منتقل کر رہا تھا۔

نابینا بچوں کی طرح شہنا کی سماعت اور یادداشت بہت تیز تھی۔ وہ معمولی سی آہٹ سن لیتی تھی اور جو ایک بار سنتی اسے یاد ہو جاتا۔ ذہن کے ساتھ داؤد اس کی جسمانی تربیت بھی کر رہا تھا۔ وہ اسے ورزش کراتا۔ اسے ساتھ لے کر جاگنگ کرتا اور ہفتے میں ایک بار اسے شوٹنگ پریکٹس کراتا تھا۔ اس کے پاس پستول اور رائفل دونوں تھے اور اس نے شہنا کو دونوں کا استعمال سکھایا تھا۔ دیکھنے والوں کو تعجب ہوتا تھا کہ داؤد اپنی نابینا بیٹی کو ہتھیار چلانا سکھا رہا ہے۔ مگر داؤد کو پروا نہیں تھی اور شہنا اس سے بہت خوش تھی۔ اس کی دسویں سالگرہ پر داؤد نے اسے ایک چھوٹا مگر خوب صورت ہاتھی دانت کے دستے والا خنجر دیا۔ اس کے ساتھ نیام بھی تھی۔ اس نے شہنا سے کہا۔ ”یہ تیری حفاظت کے لیے ہے۔“

”میرے محافظ تو آپ ہو۔“

”ہاں لیکن کبھی میں نہیں ہوا تو تمہیں اپنی حفاظت آپ کرنی ہوگی۔“

شہنا پریشان ہوگئی۔ ”آپ کیوں نہیں ہوگے؟“

داؤد نے رسانیت سے اسے سمجھایا۔ ”شہنا! میں انسان ہوں اور ہر انسان نے ایک وقت اس دنیا سے جانا ہے۔ جب میرا بلاوا آئے گا تو میں بھی چلا جاؤں گا۔“

”نہیں... اللہ آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔“ شہنا باپ سے لپٹ گئی۔

داؤد نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”میری بھی یہی خواہش ہے کہ میں ہمیشہ تیرے ساتھ رہوں مگر ضروری نہیں ہے کہ انسان کی ہر خواہش پوری ہو۔“

اس رات شہنا نے بہت گڑگڑا کر اللہ سے دعا کی کہ اس کا باپ ہمیشہ اس کے ساتھ رہے۔

☆☆☆

وہ تین افراد تھے اور ایک گاڑی میں سوار تھے۔ چند گھنٹے پہلے انہوں نے ایک سنار کی دکان میں ڈکیتی کی واردات کی تھی۔ دکان راولپنڈی کے پاس علاقے میں تھی اور خلافِ توقع اس ڈاکے میں انہیں سونے کے بسکٹس سے بھرا ایک سوٹ کیس ہاتھ لگا تھا۔ اس میں بیس کلوگرام سونا تھا۔ اس کے علاوہ پونے دو لاکھ روپے اور زیورات کی صورت میں بھی ڈھائی کلوگرام سونا تھا مگر اصل چیز سونے کے بسکٹس تھے۔ یہ خالص سونا تھا اور اس پر ایک مشہور غیر ملکی گولڈ ڈیلر کی مہر بھی تھی۔ سنار نے مزاحمت کی تو انہوں نے فائرنگ کر دی۔ سنار مارا گیا اور اس کا ملازم زخمی ہوا۔ وہ دکان سے نکل کر فرار ہو گئے۔

صبح کا وقت تھا اور بہت کم لوگ تھے۔ واردات کے لیے انہوں نے گاڑی چھینی تھی اور یہ کام انہوں نے واردات سے ایک گھنٹا پہلے کیا تھا۔ صغیر احمد ان کا سرغنہ تھا۔ وہ عادی مجرم اور پہلے بھی ڈکیتی اور قتل کی کئی وارداتوں میں ملوث رہ چکا تھا مگر عدالت نے عدم ثبوت کی بنا پر اسے بری کر دیا۔ وہ تقریباً چالیس برس کا تھا۔ سرخ و سفید رنگت، سلیقے سے بنے بالوں اور نرم نقوش کی وجہ سے صغیر احمد مجرم کے بجائے اوپری طبقے کا کوئی آسودہ حال شخص لگتا تھا۔ مگر اس کا روپ صرف دھوکا تھا۔ اندر سے وہ نہایت سفاک شخص تھا۔ سنار کو اسی نے شوٹ کیا تھا۔ امانت اور جہانگیر اس کے ساتھی تھے۔ وہ بھی سکہ بند جرائم پیشہ تھے اور ان کی عمر ہی اس دشت کی سیاحی میں گزری تھی۔ ان کی عمریں تیس سے پینتیس کے درمیان تھیں اور وہ کئی سالوں سے ایک ساتھ کام کر رہے تھے۔ کیونکہ کام پوری پلاننگ اور ہاتھ پاؤں بچا کر کرتے تھے اس لیے اب تک پولیس اور جیل سے بچے ہوئے تھے۔

پہلے صغیر اکیلا تھا پھر جہانگیر اور امانت بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ وہ باقاعدہ پلاننگ کر کے واردات کرتے تھے۔ وہ بڑا ہاتھ مارنے سے گریز کرتے۔ کیونکہ دارالحکومت ہونے کی وجہ سے یہاں پولیس زیادہ مستعد تھی اور بڑے ہاتھ مارنے والے عام طور سے زیادہ دن بچتے نہیں تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس سنار سے انہیں چند لاکھ روپے نقد اور چند کلوگرام سونے کے زیورات ہاتھ آئیں گے مگر اس غیر متوقع کامیابی نے ان کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے تھے۔ اس سونے کی مالیت اس وقت بھی دو کروڑ روپے کے آس پاس تھی۔ سنار کو شوٹ کرتے ہی وہ وہاں سے نکل بھاگے۔ جائے واردات سے دور نکلنے کے بعد انہوں نے ایک جگہ گاڑی روک کر آپس میں مشورہ کیا تو جہانگیر نے مشورہ دیا۔ ”معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے۔ پولیس سرگرمی سے تلاش کرے گی۔“

”اس لیے نہیں کہ ایک بندہ مر گیا ہے بلکہ اس لیے کہ ہم نے دو کروڑ روپے کا سونا لوٹا ہے۔“ امانت نے تلخی سے کہا۔ ”وہ سونے کے لیے ہمیں سرگرمی سے تلاش کریں گے۔“

”تب کیا کریں؟“ امانت نے پوچھا۔

”میرا مشورہ ہے کہ سونا کہیں چھپا دیتے ہیں اور باقی سونا اور رقم آپس میں بانٹ کر کچھ عرصے کے لیے الگ ہو جاتے ہیں۔ پھر حالات دیکھ کر سونا نکال لیں گے۔“ صغیر احمد نے سوچ کر کہا۔ ”میری نظر میں ایک جگہ ہے لیکن یہاں سے دور اور دوسرے صوبے میں ہے۔“

”یہ اچھی بات ہے۔“ امانت نے کہا۔ ”ہمیں فوری روانہ ہو جانا چاہیے، ایسا نہ ہو پولیس ناکے لگا دے۔“

ان کا خوف بجا تھا۔ گاڑی چوری کی تھی اور ان کے پاس اسلحہ اور لوٹ کا مال بھی تھا۔ وہ روک لیے جاتے تو اس کے بعد یا تو مقابلے میں مارے جاتے یا پھر جیل مقدر بنتی۔ راولپنڈی سے نکل کر وہ ہری پور کی طرف جانے والی سڑک پر آ گئے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد وہ سڑک سے بائیں طرف ایک چھوٹی اور کسی قدر خستہ حال سڑک پر مڑے۔ یہاں چھوٹی پہاڑیاں اور ٹیلے تھے۔ ان کے درمیان گہری کھائیاں تھیں۔ سڑک ان کے بیچ سے بل کھاتی گزر رہی تھی۔ مزید ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ایک چھوٹی سی پہاڑی کے ساتھ رکے۔ یہاں دور تک کوئی آبادی یا آباد زمین نظر نہیں آ رہی تھی۔ صغیر ڈرائیونگ کر رہا تھا اور اس دوران میں وہ زیادہ تر خاموش رہا جیسے کچھ سوچ رہا ہو جبکہ امانت اور جہانگیر مستقبل کے پلان بنا رہے تھے۔ اچانک صغیر نے کار ایک ویران جگہ روک لی اور نشیب میں اشارہ کیا۔ ”اس جگہ جنگل ہے اور وہاں جانور چرانے والے نہیں آتے۔ ہم وہاں سونا آرام سے چھپا سکتے ہیں۔“

وہ گاڑی سے اتر کر نیچے آئے۔ سردیوں کے ابتدائی دن تھے مگر سورج جلدی غروب ہو جاتا تھا۔ تین بجے سورج مغربی افق کی طرف جھکنے لگا۔ سونے والا بریف کیس امانت نے اٹھا رکھا تھا۔ یہ خاصا وزنی تھا اور جہانگیر کے پاس وہ بیگ تھا جس میں زیور اور نقد رقم تھی۔ صغیر سب سے پیچھے تھا۔ ان دونوں کو پتا نہیں چلا کہ کب صغیر نے خاموشی سے پستول نکال لیا۔ اس نے عقب سے جہانگیر کو گولی ماری اور وہ کراہ کر گرا تو امانت گھبرا کر مڑا۔ صغیر کو پستول کے ساتھ اور جہانگیر کو گرتے دیکھ کر وہ چلایا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”یہ...“ صغیر نے کہتے ہوئے اسے بھی گولی مار دی۔ اس نے یہ کام مکمل سکون سے کیا تھا جیسے وہ اپنے برسوں پرانے ساتھیوں کو نہیں بلکہ بازو پر بیٹھ جانے والے مچھر کو مار رہا ہو۔ پھر اس نے دونوں کو چیک کیا۔ جہانگیر زندہ تھا۔ اس نے ایک بار پھر اس پر گولی چلائی اور وہ بھی ختم ہو گیا۔ صغیر نے اطمینان سے ان کے پاس سے تمام چیزیں

نکال لیں جن سے ان کی شناخت ہوسکتی تھی۔ پھر اس نے ان کے کپڑے بھی اتار لیے اور ان کی ایک گٹھری بنالی۔ لاشیں اس نے ایک گڑھے میں ڈال دیں اور گڑھا مٹی اور پتھروں سے بھر دیا۔ اسے دو گھنٹے لگے تھے۔ پھر وہ تمام چیزوں کے ساتھ واپس سڑک تک آیا۔ اس ویرانے میں لاشیں ملنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس نے انہیں چھپا بھی دیا تھا۔ کار میں بیٹھ کر وہ آگے روانہ ہوا اور ایک جگہ دیکھ کر امانت اور جہانگیر کا سامان اور کپڑے کھائی میں اچھال دیے۔ یہاں اگر وہ کسی کو مل بھی جاتے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کچھ دیر بعد اس نے گاڑی ایک چھوٹے سے پہاڑ کے ساتھ روکی جس پر چھوٹی جھاڑیاں اور پودے تھے لیکن اوپر درخت نظر آرہے تھے۔ اس نے سونے والا بریف کیس نکالا اور اوپر چڑھنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا اسے معلوم تھا کہ سونا کہاں چھپانا ہے۔

بڑی مشکل سے وہ اوپر پہنچا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ برسوں سے شہر میں رہنے کے بعد پہاڑوں پر چلنے کی عادت نہیں رہی تھی۔ پہاڑی کے دوسری طرف جنگل.... تھا اور اس کے نیچے باغ تھے۔ صغیر جانتا تھا کہ جن کے یہ باغات ہیں، یہ جنگل بھی انہی کی ملکیت ہے۔ وہ نیچے جنگل میں آیا اور کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جو اسے یاد رہے۔ بالآخر اسے ایک بڑا درخت دکھائی دیا، اس کا تنا بہت ہی بڑا تھا۔ یہ گھنا اور اونچا بھی تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا تو اسے درخت کی دو موٹی جڑوں کے درمیان خلا نظر آیا۔ اس نے ایک ڈنڈی اندر ڈال کر چیک کیا اور پھر خلا کو بڑا پا کر اس نے بریف کیس اس میں ڈال دیا۔ وہ اتنا اندر چلا گیا کہ بالکل پاس سے دیکھنے پر بھی نظر نہیں آرہا تھا مگر اس کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے مٹی و پتھر لا کر اس خلا میں بھر دیے اور آخر میں اس پر خشک پتے بکھیر دیے۔ وہ مطمئن تھا۔ یہ درخت وہ کسی صورت نہیں بھول سکتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ سونا زیادہ دن یہاں نہیں رہے گا۔ وہ جلد اسے واپس نکال لے گا۔ ابھی پاؤں سے پتے بکھیر رہا تھا کہ اچانک کسی نے اسے للکارا۔

"کون ہو... یہاں کیا کر رہے ہو؟"

اس نے بھڑک کر پستول نکالا اور اس طرف فائر جھونک دیا۔ دوسری طرف سے چیخ سنائی دی۔ صغیر پلٹ کر بھاگا۔ وہ ڈھلان کے کنارے تک پہنچا تھا کہ عقب سے اس پر فائرز ہوئے مگر وہ بچ نکلا۔ ہانپتے کانپتے ہوئے اس نے ڈھلان عبور کی اور نیچے گاڑی تک آیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اسے کوئی پیچھے آتا دکھائی نہیں دیا مگر اس کے باوجود وہ خوف زدہ تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے اسے آگے بڑھا دیا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے بھی وہ بار بار مڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا۔ ایک بار اس نے مڑ کر دیکھا اور جب سیدھا ہوا تو سامنے سے آنے والی ایک تیز رفتار وین سر پر آچکی تھی۔ اس نے آخری وقت میں تصادم سے بچنے کی کوشش کی لیکن دنوں گاڑیاں ٹکرائیں۔ ایک دھماکا ہوا۔ صغیر اچھل کر اسٹیئرنگ سے ٹکرایا اور پھر اسے ہوش نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

شہنا محسوس کر رہی تھی کہ گاڑی بلندی کی طرف جارہی ہے۔ موسم کسی قدر بہتر ہوا تھا۔ جب وہ اسلام آباد سے روانہ ہوئی تو موسم خاصا گرم تھا۔ گزشتہ کئی روز سے بارش نہیں ہوئی تھی اور اسی لیے گرمی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔ "بابا! ہم کہاں ہیں؟"

"بی بی، ہم ہری پور روڈ پر مڑ گئے ہیں۔" ڈرائیور نے ادب سے جواب دیا۔ "آپ کا گھر دس میل دور رہ گیا ہے۔"

اب تک کار کی کھڑکیاں بند تھیں اور اے سی آن تھا۔ شہنا نے ڈرائیور سے کہا۔ "بابا! اے سی آف کر کے کھڑکیاں کھول دو۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ شہنا نے چہرہ کسی قدر کھڑکی سے باہر نکالا اور ہوا کو اپنے چہرے پر محسوس کرنے لگی۔ یہ جانی پہچانی ہوا تھی۔ اپنے اندر خنکی اور مخصوص پہاڑی نباتات کی خوشبو سموئے ہوئے۔ وہ دس سال بعد واپس آرہی تھی۔ دس سال پہلے وہ یہاں سے گئی تو دس سال کی بچی تھی۔ اب وہ بیس سال کی نوجوان اور حسین لڑکی تھی۔ اس کے سرخی مائل سیاہ بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور آنکھوں میں ایسی چمک تھی کہ دیکھنے والا اسے نابینا تسلیم ہی نہیں کر سکتا تھا۔ گلابی رخساروں پر لمبی سیاہ پلکیں نمایاں تھیں۔ بدن چھریرا اور کسی قدر دراز قد تھا مگر نسوانی دلکشی بھی نمایاں تھی۔ موسم کی مناسبت سے اس نے لان کا ہلکا نیلا سوٹ پہن رکھا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد یہ لمبی سیاہ سرکاری کار فارم کی طرف جانے والے راستے پر مڑی۔ دس سال پہلے یہ راستہ کچا تھا مگر اب پختہ کر دیا گیا تھا۔ کار سرخ چار دیواری کے پاس رکی اور ڈرائیور نے اتر کر گیٹ بجایا۔ فوراً ہی اندر سے ایک جوان عورت نمودار ہوئی۔ وہ لپک کر آئی۔

"شہنا بی بی آگئی ہیں؟"

"جی، بی بی آگئی ہیں۔" ڈرائیور نے کہا۔ اس دوران میں ایک ادھیڑ عمر آدمی بھی آگیا۔ اس نے گیٹ کھولا

اور ڈرائیور گاڑی اندر لے آیا۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا تو شہنا نیچے اتر آئی۔ عورت آگے آئی اور بولی۔

"بی بی، میں ریحانہ ہوں۔ ادھر آپ کی خادمہ اور یہ میرا شوہر ہے شریف گل... یہ آپ کی زمین کا نگران ہے، آپ جانتی ہیں۔ اسے خان جی نے مقرر کیا تھا اور ادھر مکان کی دیکھ بھال بھی کرتا ہے۔ ڈرائیونگ جانتا ہے۔ آپ کو کہیں آنا جانا ہوگا تو یہی ڈرائیو کرے گا۔"

شہنا نے ہاتھ آگے کیا تو ریحانہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ شہنا مسکرائی۔ "میں شریف گل کو جانتی ہوں، اپنے گھر واپس آکر اور تم لوگوں سے مل کر خوشی ہوئی۔"

"ہمیں بھی بی بی... میری ماں شاہینہ بی بی نے آپ کو پالا ہے۔"

"مجھے یاد ہے... اور مجھے شاہینہ کی وفات کا بھی پتا چلا تھا۔" شہنا کا لہجہ دکھی ہو گیا۔ "مگر اس وقت میں آنہیں سکی تھی۔"

"بی بی، وہ بھی آخر وقت تک آپ کو یاد کرتی رہیں۔ جب آپ یہاں سے گئیں تو وہ بہت دکھی تھیں۔"

شریف گل نے بیوی کو آنکھیں دکھائیں۔ "کیا بی بی کو باہر کھڑا رکھنا ہے، آج دھوپ بھی تیز ہے۔"

ریحانہ اسے اندر لے آئی اور ڈرائیور ڈکی سے سوٹ کیس اتارنے لگا۔ ان میں شہنا کا سامان تھا۔ ایک بڑا بیگ اس کے پاس تھا۔ وہ ریحانہ نے اٹھا لیا۔ اس میں شہنا کی اہم چیزیں اور دستاویزات تھیں۔ ریحانہ اسے براہ راست اس کے کمرے میں لے آئی۔ ریحانہ نے اسے کمرے کے بارے میں بتایا۔ "بی بی، یہ تقریباً ویسا ہی ہے جیسا آپ کے جاتے وقت تھا۔ بس قالین خراب ہو گیا تھا تو وہ بدلوایا ہے۔ دیواروں پر نیا رنگ ہوا ہے۔ شریف نے خود سارا فرنیچر پالش کیا ہے۔"

شہنا نے گہری سانس لی۔ واقعی کمرے میں پالش اور رنگ کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ سب کچھ شہنا کے ذہن میں تھا۔ اس نے چند قدم چل کر الماری کو چھوا اور پھر بالکل درست انداز میں اس کا ہینڈل پکڑا۔ لاک میں چابیاں جھول رہی تھیں۔ کال بیل بجی تو ریحانہ باہر چلی گئی۔ شریف نے اسے بلایا تھا۔ ویسے وہ مکان میں آتا جاتا رہتا تھا مگر اب مالکن آگئی تھی تو رواج کے مطابق وہ اندر نہیں آسکتا تھا اسی لیے اس نے ریحانہ کو باہر بلایا۔ وہ سوٹ کیس لے آیا تھا۔ ریحانہ نے سوٹ کیس کمرے میں پہنچائے اور بولی۔ "بی بی، ڈرائیور واپس جانے کی اجازت طلب کر رہا ہے۔"

انڈا

"تم نے تخلیق کے نام پر ایک سطر لکھی، نہ کوئی شعر کہا۔ پھر تمہیں نامور ادیبوں کی تحریر پر تنقید کرنے کا کیا حق ہے؟" مصنف نے ناقد پر برہم ہوتے ہوئے غصے سے کہا۔

"تنقید کرنے کے لیے ادیب یا شاعر ہونا بالکل ضروری نہیں ہے۔" ناقد نے سکون سے کہا۔ "انڈا مرغی تخلیق کرتی ہے۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے اپنی پوری زندگی میں کبھی انڈا نہیں دیا ہوگا لیکن آپ انڈے کے بارے میں مرغی سے زیادہ جانتے ہیں اور اس پر سیکڑوں صفحات لکھ سکتے ہیں۔"

(انتخاب: ریاض بٹ، حسن ابدال)

شہنا باہر آئی۔ "بابا رک جاؤ، کھانا کھا کر جانا۔"

"نہیں بی بی، صاحب نے جلد آنے کو کہا تھا۔"

شہنا نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے بابا... تم جاؤ، تمہارا بہت شکریہ۔"

ڈرائیور سلام کر کے چلا گیا۔ اتنی دیر میں شریف گل نے لسی اور خشک خوبانی سے اس کی تواضع کر دی تھی۔ ریحانہ نے کھانا تیار کر لیا تھا۔

دوپہر کا کھانا اس نے دیر سے کھایا تھا اس لیے وہ آرام کرنے کے بجائے ریحانہ کی مدد سے پورے گھر میں گھومنے لگی۔ یہ گھر اس کی یادداشت میں مکمل طور پر موجود تھا لیکن وہ اپنی یادوں کو تازہ کرنا چاہتی تھی۔ دھوپ کم ہوئی تو وہ باہر نکل آئی۔ ریحانہ اسے پودوں اور درختوں کے بارے میں بتارہی تھی جو اس دوران میں لگے تھے یا کاٹ دیے گئے تھے۔ اس کے لیے باغ کے بڑے حصے کو لان کی صورت دی گئی تھی تاکہ وہ بلا رکاوٹ واک کر سکے۔ ریحانہ اسے بتارہی تھی کہ شریف گل اور دوسرے ملازموں نے محنت کر کے باغات کو پہلے سے اچھا کر دیا تھا۔ وہ باقاعدگی سے نئی اقسام کے درخت لگاتے رہے تھے جو زیادہ اور اچھی پیداوار دیتے تھے۔ شریف گل نے پھل یہاں آڑھتیوں کو دینے کے بجائے ایسا بندوبست کیا تھا کہ وہ اسے براہِ راست شہر کی منڈی میں لے جا کر فروخت کرتا تھا۔ منڈی میں اس کے کچھ واقف کار تھے اس لیے وہ براہِ راست بھی فروخت کرتا تھا، اس سے قیمت زیادہ مل جاتی تھی۔

"بی بی، میں آپ کو پورا باغ گھماؤں گی۔"

"ریحانہ... میں کل چلوں گی۔" شہنا نے کہا۔ "ایسا

کرو میرے لیے چائے لے آؤ۔“

”آپ بیٹھیں بی بی، میں ابھی لاتی ہوں۔“

شہنا وہیں لان میں رکھی کرسیوں پر آگئی۔ وہ شام کی ہلکی خنک ہوا سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ ریحانہ اور شریف نے اس کا مکان اور باغ بہت سنبھال کر رکھے تھے۔ دس منٹ میں شہنا چائے اور اس کے ساتھ کچھ ریفریشمنٹ کا سامان لے آئی۔ وہ پڑھی لکھی تھی اور شہر کے طور طریقوں سے واقف تھی۔ اس لیے شہنا فوراً ہی اس سے انسیت محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ یہاں کے بارے میں بتا رہی تھی کہ اچانک شہنا نے پوچھا۔ ”تم نے برابر والوں کے بارے میں نہیں بتایا۔“

ریحانہ ایک لمحے کو چپ ہوئی پھر اس نے کہا۔ ”بی بی، میں انتظار کر رہی تھی کہ آپ پوچھیں تو میں بتاؤں۔“

”سعود چچا کا کوئی سراغ ملا؟“

”نہیں بی بی۔“ ریحانہ ہچکچائی۔ ”پر شریف کا کہنا ہے ان کا اپنی بیوی اور بیٹے سے رابطہ ہے۔“

شہنا چونکی۔ ”کیا یہ بات سب جانتے ہیں؟“

”یہاں رہنے والے تو سب جانتے ہیں لیکن آپ جانتی ہیں یہاں لوگ ہی کتنے ہیں۔ بس یہ دو گھر اور ان کی زمینوں اور گھروں میں کام کرنے والے لوگ ہیں۔ اس لیے باہر کا کوئی آدمی واقف نہیں ہے۔“

”شریف کیسے جانتا ہے؟“

”اس نے خود ایک بار بڑے خان جی کو ان کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔“

”وہ اب تک قانون کا سامنا کرنے کے بجائے اس سے بچتے پھر رہے ہیں۔“ شہنا نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”کیا فائدہ... اب بھی تو وہ کہیں چھپ کر رہ رہے ہیں۔ چھپ کر بیوی اور بیٹے سے ملتے ہیں۔“

بات چھڑی تو اسے سب یاد آنے لگا۔ اپنے باپ کا آخری وقت جب وہ نیم بے ہوشی میں اسے پکار رہا تھا اور پھر اسے اسپتال لے جایا گیا جہاں سے اس کی لاش واپس آئی تھی۔ اس شہنا کو ایسا لگا جیسے باپ کے ساتھ وہ بھی مر جائے گی۔ باپ کے بغیر زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ شہنا خود پر قابو پانے لگی۔ اس کا دکھ ہرا ہو گیا تھا۔ ریحانہ نے محسوس کر لیا اس لیے اس نے بات پلٹ دی۔ اس رات جب شہنا سونے کے لیے کمرے میں آئی تو تھکے ہونے کے باوجود اسے نیند نہیں آئی اس کے بجائے ماضی اس کی آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگا۔

☆☆☆

وہ شام شہنا کے ذہن میں ہمیشہ تازہ رہی جب اس نے باغ میں رسی کودتے ہوئے فائرنگ کی آواز سنی تو اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے چلا کر شاہینہ کو آواز دی۔ ”بی جی... بابا کہاں ہیں؟“

شاہینہ اندر سے بھاگی آئی۔ وہ بھی پریشان تھی کیونکہ یہ جگہ نہایت پُرامن تھی اور یہاں شاذ ہی فائرنگ ہوتی تھی اور وہ بھی یہ لوگ خود کرتے تھے۔ پریکٹس کرتے یا کبھی باغوں میں گھس آنے والے جنگلی جانوروں کو ڈرانے کے لیے ہوائی فائرنگ کرتے تھے مگر یہ فائرنگ غیر متوقع تھی۔ شاہینہ دروازے تک گئی۔ کچھ دیر میں شریف اور دوسرے لوگ آگئے۔ انہوں نے زخمی داؤد کو اٹھا رکھا تھا۔ اس کے سینے میں گولی لگی تھی اور وہ نیم بے ہوش تھا۔ جب ملازم فائرنگ کی آواز پر وہاں پہنچے تو انہوں نے داؤد کو زمین پر گرے پایا اور سعود ہاتھ میں رائفل لیے ایک طرف بھاگ رہا تھا۔ شریف گل فوری طور پر داؤد کو گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے گیا۔ شہنا چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ وہ بھی ساتھ جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے باپ کا بے ہوش جسم ٹٹول رہی تھی۔ داؤد شہنا کو پکارتے پکارتے بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کا خون شہنا کے ہاتھوں پر لگ گیا تھا۔ شاہینہ نے بہ مشکل اسے قابو کیا۔

داؤد کو اسپتال پہنچنا نصیب نہیں ہوا اور وہ راستے ہی میں دم توڑ گیا۔ اس دوران میں دوسرے ملازمین سعود کو تلاش کر رہے تھے مگر وہ غائب تھا۔ کئی گھنٹے بعد شریف پولیس اور داؤد کی موت کی اطلاع کے ساتھ آیا تو شہنا بے ہوش ہو گئی۔ اس کی بے ہوشی اتنی بڑھی کہ اسے بھی اسپتال لے جانا پڑا۔ اس دوران میں رشنا اپنے شوہر ولی خان کے ساتھ آگئی تھی۔ ولی خان اسلام آباد میں سترہ گریڈ کا افسر تھا۔ خود رشنا بھی تعلیم یافتہ تھی۔ شہنا اس سے مانوس تھی۔ اسے رشنا میں ماں کی مہک محسوس ہوتی تھی مگر اسے خالہ کے پاس جانے اور اس کے ساتھ رہنے کا موقع کم ملتا تھا۔ اس وقت تو وہ بچی تھی لیکن بعد میں اس نے محسوس کیا کہ رشنا اور اس کے باپ داؤد کے درمیان ایک ان کہی سی کشیدگی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کا ذکر بہت کم کرتے تھے اور جب ملتے تو بہت کم بات کرتے تھے۔ ایک بار شہنا نے باپ سے پوچھا مگر اس نے ٹال دیا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

پولیس نے ابتدائی تفتیش کے بعد سعود پر فرد جرم عائد کر دی اور اس کی تلاش شروع کر دی۔ ملازموں سے

بیانات لیے گئے اور سعود کے غائب ہونے کے بعد اس کے ملازموں کو حراست میں لے لیا مگر چند دن بعد انہیں چھوڑ دیا گیا۔ سب نے ایک ہی بیان دیا تھا کہ انہیں نہیں معلوم کہ دونوں بھائی جنگل کی طرف کیا کرنے گئے تھے اور وہاں کیا واقعہ پیش آیا۔ لیکن جب فائرنگ ہوئی تو وہ سب بھاگے تھے اور وہاں انہوں نے داؤد کو زخمی اور سعود کو رائفل بدست فرار ہوتے دیکھا تھا۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ دونوں بھائیوں میں کوئی تنازعہ بھی تھا تو وہ اس سے لاعلم تھے۔ سعود کی بیوی غزالہ نے بھی یہی کہا کہ اس کے شوہر کا اپنے بھائی سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ دونوں میں معمول کے تعلقات تھے۔ زمین اور اس قسم کا کوئی تنازعہ نہیں تھا کیونکہ دونوں کی زمین بالکل الگ تھی۔ اسے بھی نہیں معلوم تھا کہ سعود کیوں رائفل لے کر نکلا تھا؟

داؤد کی تدفین کے بعد رشنا شہنا کو اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ خالہ تھی اور اس کا حق بھی تھا پھر اس نے عدالت سے مختار نامہ بھی حاصل کر لیا۔ اب وہ شہنا کی گارجین بھی تھی۔ اس نے شہنا کو اسلام آباد میں نابینا بچوں کے اسکول میں داخل کرا دیا۔ شہنا باپ کے بعد بہت دن بے چین رہی۔ وہ بار بار رشنا سے پوچھتی کہ اس کا قاتل پکڑا گیا اور رشنا کے پاس ایک ہی جواب ہوتا کہ پولیس قاتل کا سراغ نہیں لگا سکی۔ رفتہ رفتہ شہنا نے خود پر قابو پا لیا۔ رشنا نے اسے بہت سمجھداری سے تعلیم اور دوسرے مشغلوں کی طرف متوجہ کیا۔ اس نے شہنا کے لیے ایک خاص کمپیوٹر منگوایا جو آواز کے ذریعے کام کرتا اور بتاتا تھا۔ اس کی مدد سے شہنا نے انٹرنیٹ کا استعمال سیکھا۔ اسی طرح اس کے لیے خاص موبائل فون لیا گیا جسے وہ آسانی سے آپریٹ کر سکتی تھی۔

رفتہ رفتہ رشنا کی زبانی شہنا کو بہت سی ایسی باتوں کا علم ہوا جن سے وہ پہلے لاعلم تھی۔ داؤد اور سعود کی ماں رشنا اور روما کی خالہ تھی مگر اس کا رویہ روما سے اچھا نہیں تھا حالانکہ وہ اس کی سگی بھانجی تھی۔ وجہ صرف یہ تھی کہ داؤد نے ضد کر کے اس سے شادی کی تھی۔ اس کی ماں اس رشتے پر آمادہ نہیں تھی کیونکہ وہ رشنا، روما کی ماں سے خفا رہتی تھی۔ بہن سے ناپسندیدگی کا یہی جذبہ روما سے نفرت کی وجہ بن گیا اور جب وہ ماں بننے والی تھی تو اس نے روما کو اتنا تنگ کیا اور ذہنی اذیت دی کہ اس کا بلڈ پریشر مستقل ہائی رہنے لگا۔ پھر جب ڈلیوری کا وقت آیا تو داؤد اسے ایک نزدیکی اسپتال لے گیا جہاں موجود لیڈی ڈاکٹر سے کیس قابو نہیں ہوا اور روما بچ نہیں سکی۔ رشنا سمجھتی تھی کہ خالہ کی دی ہوئی اذیتیں اپنی جگہ لیکن اس کی بہن کو داؤد کی بے پروائی نے موت کے منہ میں دھکیلا۔ اگر وہ اسے اس عام اسپتال کے بجائے شہر کے کسی اچھے اسپتال لے جاتا تو شاید اس کی زندگی بچ جاتی۔

شہنا حیران تھی، اس کی دادی ایسی عورت تھی تب ہی شاید داؤد نے اسے ماں کے سپرد نہیں کیا تھا اور اس کی پرورش کے لیے ملازمہ رکھی تھی۔ شہنا سات سال کی تھی تب اس کی دادی کا بھی انتقال ہو گیا۔ شہنا کو اس کے بارے میں بہت کم یاد تھا اور وہ دادی کے پاس بہت کم جاتی تھی۔

”تو بابا اور آپ کے درمیان خراب تعلق کی یہ وجہ ہے؟“

”ہاں۔“ رشنا بولی۔ ”داؤد بنیادی طور پر بہت اچھا آدمی تھا لیکن وہ اپنی ماں کے اثر میں تھا۔“

”بابا ماما سے بہت محبت کرتے تھے۔“ شہنا نے باپ کا دفاع کیا۔ ”اسی لیے تو انہوں نے دادی کے بہت کہنے کے باوجود دوسری شادی نہیں کی۔“

”ہاں، روما سے اس کی محبت شبہے سے بالاتر ہے۔“ رشنا نے گہری سانس لی۔ ”اس نے تمہیں بھی نہیں دیکھا تھا۔“

”ہاں وہ سمجھتے تھے کہ ماما میری وجہ سے مری ہیں۔ انہوں نے مجھے بہت بار بتایا۔ پر جب انہوں نے مجھے دیکھا تو پھر سب بھول گئے۔“

رشنا نے اسے خود سے لگا لیا۔ ”شہنا! وہ تم سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس نے بہت پہلے مجھ سے کہا تھا کہ اگر اسے کچھ ہو تو میں تمہیں اپنے پاس رکھوں۔ یوں سمجھ لو تم اس کی وصیت کے مطابق میرے پاس ہو۔“

”اللہ کا شکر ہے کہ آپ ہیں ورنہ پتا نہیں میرا کیا ہوتا۔“

رشنا، روما سے چند سال بڑی تھی اور اس کی شادی بھی پہلے ہوئی تھی لیکن اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ شادی سے پہلے رشنا کو بعض طبی مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا جس کی وجہ سے اس کے ماں بننے کا امکان بہت ہی کم تھا۔ کئی بار وہ امید سے ہوئی لیکن معاملہ ابتدائی مرحلے میں ختم ہو گیا۔ اس نے ہر ممکن علاج کرایا۔ غیر ملکی ڈاکٹرز تک سے علاج کرایا مگر اس کے نصیب میں اولاد کی خوشی نہیں تھی۔ شہنا کی آمد کے کچھ عرصے بعد ولی خان کی رشتے کی ایک بھتیجی رافیہ ان کے گھر آگئی۔ اس کی ماں ایک وبا کی نذر ہو گئی تھی اور پھر باپ بھی غائب ہو گیا۔ سب سے نزدیکی رشتے دار ولی خان تھا اس لیے قبائلی رواج کے مطابق رافیہ اس کے حوالے کی گئی۔

رافیہ سرخی مائل رنگ اور کسی قدر بڑے نقوش والی لڑکی تھی۔ جسامت بھی بڑی تھی مگر جسم بہت متناسب تھا۔

شہنا اور رافیہ کی پہلے دن سے بہت اچھی بننے لگی۔ رافیہ عمر میں شہنا سے دو سال بڑی تھی۔ وہ ایک نارمل اسکول میں پڑھ رہی تھی۔ البتہ دونوں ہی ایک کلاس میں تھیں اس لیے اسکول کے بعد دونوں ایک ساتھ ایک ہی کالج میں داخل ہوئیں۔ رافیہ کی وجہ سے شہنا کے لیے کالج کی تعلیم بہت آسان ہوگئی۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ رہتی اور ہر جگہ وہی اسے لاتی لے جاتی۔ کیونکہ وہاں نابینا لڑکیوں کے لیے الگ سے کوئی انتظام نہیں تھا۔ وہ لیکچر ریکارڈ کر لیتی تھی اور بعد میں سن کر ذہن نشین کر لیتی۔ پیپرز دینے کے لیے کوئی لڑکی اس کے ساتھ جاتی تھی۔ وہ بولتی جاتی اور وہ لڑکی لکھتی تھی۔ گریجویشن کے دوران شہنا نے انگلش لینگویج کورس کیا کیونکہ انگریزی میں بریل بکس اور آڈیو بکس دستیاب تھیں۔ اس نے انگریزی ادب کی بے شمار کتابیں اور آڈیو بکس حاصل کر لی تھیں۔

ولی خان کم گو اور زیادہ تر اپنے آپ میں مگن رہنے والا شخص تھا۔ دفتر سے آنے کے بعد وہ اپنے کمرے یا اسٹڈی تک محدود رہتا۔ ان دنوں وہ اٹھارہ گریڈ میں تھا اور وزارت داخلہ میں ایک اہم پوسٹ پر کام کر رہا تھا۔ اس نے کبھی شہنا کی موجودگی پر اعتراض نہیں کیا بلکہ وہ اس کا ہر ممکن خیال رکھتا تھا۔ اگرچہ شہنا کو کوئی مالی مسئلہ نہیں تھا لیکن اس کے سارے اخراجات ولی خان ہی برداشت کرتا تھا۔ جتنا جیب خرچ رافیہ کو ملتا تھا، اتنا ہی اسے بھی ملتا تھا۔ رشنا اس سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ وہ اس کا ہر ممکن خیال رکھتی تھی۔ شہنا یہاں آ کر بہت خوش تھی اور سوائے باپ کی جدائی کے اسے اور کوئی دکھ نہیں تھا۔ جن دنوں وہ اور رافیہ گریجویشن کا امتحان دے رہی تھیں، اچانک ہی رشنا کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا، اس نے کچھ ٹیسٹ کرائے اور دوائیں بھی دیں مگر رشنا کی طبیعت نہیں سنبھلی۔

پھر رشنا کی طبیعت اتنی تیزی سے خراب ہوئی کہ سب ہی پریشان ہوگئے۔ اس کا صحت مند جسم گھل رہا تھا، رنگت پیلی پڑ گئی تھی اور آنکھیں جیسے اندر چلی گئی تھیں۔ اس بار ولی خان نے رشنا کے انکار کے باوجود اسے اسپتال میں داخل کرایا جہاں اس کے تمام ٹیسٹ ہوئے اور ڈاکٹروں نے شبہ ظاہر کیا کہ اس کے جگر میں مسئلہ ہو رہا ہے مگر خرابی ڈاکٹرز کی سمجھ میں بھی نہیں آرہی تھی۔ بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ جگر کسی وجہ سے اپنا کام ٹھیک سے نہیں کر پا رہا۔ اس کا علاج جاری تھا مگر وہی کیفیت تھی کہ جوں جوں علاج کیا، مرض بڑھتا گیا۔ جس دن شہنا اور رافیہ کا رزلٹ آیا اسی دن رشنا کی حالت اچانک بگڑی۔ وہ گھر میں تھی۔ ولی خان اسے فوری طور پر اسپتال لے گیا مگر اس کی سانسیں پوری ہو چکی تھیں۔ اسپتال پہنچنے کے چند منٹ بعد رشنا نے آخری سانس لی۔

باپ کے مرنے کے بعد شہنا کے لیے یہ دوسرا بڑا صدمہ تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس سے ماں کی طرح پیار کرنے والی خالہ اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اس کا رو رو کر برا حال تھا۔ رافیہ بھی غم زدہ تھی مگر وہ خود کو اور شہنا کو بھی سنبھال رہی تھی۔ رشنا صرف پچاس برس زندہ رہی۔ موت سے دو مہینے پہلے تک وہ اتنی صحت مند تھی کہ چالیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ رشنا کی شدید بیماری کے باوجود شہنا کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اچانک دنیا سے رخصت ہو جائے گی۔ جب دکھ ذرا ہلکا ہوا تو اسے اپنی فکر لاحق ہوئی کہ اب وہ کہاں جائے گی۔ خالو سے رشتہ خالہ کی زندگی کی حد تک تھا۔ اب وہ یہاں نہیں رہ سکتی تھی۔ شریف گل سے اس کی ملاقات ایک دو بار ہوئی تھی، اس سے رشنا خود ملتی تھی۔ وہ رشنا کی وفات پر آیا تھا اور اس نے شہنا سے کہا۔

”بی بی، اب آپ خود مختار ہیں اگر چاہیں تو واپس اپنے گھر آجائیں۔ وہاں آپ کو کوئی تکلیف یا مسئلہ نہیں ہو گا۔“

شہنا نے سوچنے کے بعد واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کا ارادہ ماسٹرز کرنے کا تھا مگر اب وہ یہاں نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے ولی خان کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو اس نے اس سے اتفاق کیا۔ ”یہی مناسب ہے... رشنا کی زندگی میں بات اور تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم میری ذمے داری نہیں رہی ہو۔ جب تمہیں کوئی مشکل ہو یا میری ضرورت ہو تو تم بلا جھجک مجھے کال کر سکتی ہو۔“

”خالو، میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔ آپ نے مجھے اتنے سال اپنے گھر میں رکھا۔“

”تم میری بیٹی کی طرح ہو۔“ ولی خان نے شفقت سے کہا۔ ”میری تو خواہش تھی کہ تم یہیں رہو لیکن اب مناسب ہے تم واپس چلی جاؤ۔ ویسے بھی اپنے باپ کی زمین اور گھر کو سنبھالنا ہوگا۔ تم گریجویٹ ہو اور ذہین بھی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم جلد سب سنبھال لوگی۔“

رافیہ اس کے جانے پر اداس تھی۔ اس نے گریجویشن کے بعد جرنلزم میں ماسٹرز کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لیا

تھا۔ اس نے شہنا سے کہا۔ ''شاید اب میں بھی یہاں نہ رہوں اور ہاسٹل شفٹ ہوجاؤں۔''

''کیوں؟ خالو تمہارے چچا ہیں اور ان سے دور کا رشتہ بھی ہے۔''

''پھر بھی یہ بات اچھی نہیں ہوگی۔'' رافیہ نے آہستہ سے کہا۔ ''ہم دونوں یہاں رہیں گے تو لوگ باتیں بنا سکتے ہیں۔''

شہنا کو تعجب ہوا مگر وہ خود ایسی سوچ نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے اسے خیال نہیں آیا۔ رافیہ نے کہا تو پھر اسے خیال آیا کہ واقعی لوگ ایک جوان لڑکی کے ایک مرد کے ساتھ اکیلے رہنے پر باتیں بنا سکتے ہیں۔ بے شک وہ آپس میں چچا بھتیجی کا رشتہ کیوں نہ رکھتے ہوں۔ ''تب ٹھیک ہے... تم مجھ سے ملنے آؤ گی؟''

''کیوں نہیں، پہلے سیمسٹر کے بعد چند دن کی چھٹیاں ملیں گی تو تم سے ملنے آؤں گی۔''

''میں تم سے رابطہ رکھوں گی۔ جہاں میرا گھر ہے وہاں موبائل سگنل نہیں آتے لیکن کچھ دور سگنل ہیں۔ میں وہاں آکر تم سے بات کروں گی۔''

وہاں سے آتے ہوئے وہ بہت اداس تھی۔ رافیہ اس کی ایک دوست تھی۔ اس سے بچھڑنے کا دکھ ہوا۔ پھر اسے رشنا یاد آرہی تھی۔ محبت کرنے والے رشتے داروں سے محروم ہوکر زندگی کیسی لگتی ہے، یہ اس نے اب جانا تھا؟ دنیا میں اب اس کا خون کا ایک ہی رشتہ تھا اور وہ اس کا تایا تھا جو اس کے باپ کا مبینہ قاتل تھا اور مفرور تھا۔ سعود کا ایک بیٹا سرمد خان تھا اور رشنا اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اپنے باپ کی زمینیں اب وہی سنبھال رہا تھا۔ کبھی کبھی شہنا سوچتی کہ اگر اس کے باپ پر اس کے تایا نے گولی چلائی تھی تو انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ کیا زمین اور جائداد کے لیے؟ مگر یہ ان کو پھر بھی نہیں ملی۔ وہ خود بھی دربدر مارے مارے پھر رہے تھے۔ البتہ وہ اپنے پیار کرنے والے باپ سے محروم ہوگئی۔ اسے نیند نہیں آئی تو وہ اٹھ کر پورے گھر میں گھومتی رہی۔ پھر داؤد کی اسٹڈی میں آئی۔ یہاں اسے باپ کی مہک محسوس ہوئی۔

صبح ریحانہ اندر آئی اور اس نے شہنا کے دروازے پر دستک دی۔ ''بی بی، اٹھ جائیں میں ناشتا بنا رہی ہوں۔''

جب کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے اندر جھانکا اور شہنا کو غائب پاکر پریشان ہوگئی۔ اس نے دوسرے بیڈ رومز میں دیکھا اور آخر میں اسٹڈی والے کمرے میں جھانکا تو شہنا کو کرسی پر سوتے پاکر سکون کا سانس لیا۔ اس نے آہستہ سے شہنا کو ہلایا۔ ''بی بی، اٹھ جائیں۔ آپ یہاں سوگئی تھیں۔''

شہنا چونکی۔ ''نیند نہیں آرہی تھی تو یہاں آگئی پھر کرسی پر آنکھ لگ گئی۔''

''بی بی اگر اکیلے میں خوف آتا ہے تو میں آجایا کروں رات میں؟''

''نہیں ریحانہ تمہارا شکریہ... میں ڈرتی نہیں ہوں۔''

وہ واش روم سے آئی تو ریحانہ ناشتا بنا رہی تھی۔ اس نے رات میں ہی پوچھ لیا تھا کہ شہنا کو کیا کیا پسند ہے۔ وہ اس کی پسند کا ناشتا بنا رہی تھی اور اس کے سامنے رکھ رہی تھی۔ شہنا کو اس کا بنایا ہوا ناشتا پسند آیا۔ گزشتہ روز دونوں وقت کا کھانا بھی اچھا تھا۔ شہنا کی تعریف نے ریحانہ کو خوش کردیا۔ اس نے بتایا کہ اسے تقریباً تمام ڈشز بنانی آتی ہیں اور جو نہیں آتیں، وہ اس کی خاطر سیکھ لے گی۔ بس وہ اسے اپنی پسند کے کھانوں کے بارے میں بتایا کرے۔ ناشتے کے بعد شریف گل آگیا۔ وہ شہنا کو زمین اور پیداوار کے بارے میں بعض معاملات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ دو گھنٹے تک اسے بتاتا رہا۔ شریف گل چاہتا تھا کہ اپنے پھلوں کی پیداوار خود شہر تک لے جائے کیونکہ ڈیزل کی قیمت بڑھنے سے اب ٹرانسپورٹ بہت مہنگی اور مشکل سے دستیاب ہونے لگی تھی۔ آڑو، خوبانی اور لوکاٹ کی فصل مختلف مہینوں میں تیار ہوتی تھی۔ پھر شریف کچھ زمین پر مٹر اور بند گوبھی بھی لگانے لگا تھا۔ اس نے شہنا سے کہا۔ ''بی بی، چار مہینے ہمیں ٹرانسپورٹ چاہیے ہوتی ہے اور سمجھ لیں سو درمیانے ٹرک کا مال جاتا ہے۔ جتنا کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے، اتنے میں تو ایک ٹرک آجائے۔''

شہنا کا بینک اکاؤنٹ پہلے اسلام آباد میں تھا لیکن جب اس نے واپس آنے کا فیصلہ کیا تو ولی خان نے اس کا بینک اکاؤنٹ ہری پور شفٹ کرادیا۔ تب شہنا کو اپنی مالی پوزیشن کا علم ہوا۔ اس کے اکاؤنٹ میں تقریباً بانوے لاکھ روپے موجود تھے۔ کچھ رقم اسے داؤد سے ورثے میں ملی تھی اور باقی رقم گزشتہ دس سالوں میں باغات سے آمدنی کی صورت میں حاصل ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی ملکیت میں بیس تولے سے اوپر کا زیور تھا۔ یہ زیور بھی بینک لاکر میں رکھوا دیا تھا۔ شہنا حیران ہوئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے اکاؤنٹ میں اتنی رقم موجود ہے۔ شہنا نے شریف گل سے پوچھا۔ ''ٹرک کتنے میں آئے گا؟''

''بڑا ٹرک تو ساٹھ لاکھ تک میں آتا ہے۔ لیکن ہمیں چھوٹا ٹرک درکار ہے جو تقریباً نیا بارہ تیرہ لاکھ روپے میں آجاتا ہے۔ یہ سستا پڑتا ہے اور جب ہمارا کام نہیں ہوگا تو اسے لوڈنگ پر چلا سکتے ہیں۔ اس سے یہ اپنا خرچہ نکال لے گا۔''

شہنا کو ان چیزوں کا پتا نہیں تھا اس لیے وہ اس سے سوال کرتی تھی۔ مطمئن ہوکر شہنا نے اسے ٹرک خریدنے کی اجازت دے دی۔

''ٹھیک ہے، تم ٹرک دیکھ لو۔''

شہنا نے اسے اجازت دے دی۔

شریف گل نے دو دن میں ٹرک دیکھ کر اور مکینک سے چیک کرا کے سودا کرلیا۔ مکان کے پورچ میں اتنی جگہ تھی کہ اس میں ٹرک آسانی سے آجاتا۔ شہنا نے اس دوران میں زمین کا معائنہ کرلیا تھا۔ جب وہ باغات میں جاتی تو ریحانہ اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ وہ اسے ایک ایک چیز کا بتاتی۔ پھر ایک دن وہ ریحانہ کے ساتھ نکلی۔ باغات کے سرے تک آکر اس نے جنگل کے آغاز میں ریحانہ کو روک دیا۔

''تم یہیں رکو، یہاں سے میں خود جاؤں گی۔''

''آپ اکیلے۔'' ریحانہ فکرمند ہوگئی۔ ''بی بی، جنگل بہت ناہموار اور اونچا نیچا ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' شہنا نے اعتماد سے کہا۔ ''جب میں یہاں تھی تو بہت بار اکیلے گھومتی تھی۔ بابا یہیں رک جاتے تھے۔''

''بی بی، اس بات کو دس سال ہوچکے ہیں۔''

''مجھے سب یاد ہے اور تم فکر مت کرو۔ اگر کوئی مشکل ہوئی تو میں تمہیں آواز دے دوں گی۔''

مجبوراً ریحانہ وہیں رک گئی۔ وہ مطمئن نہیں تھی لیکن شہنا اس کی مالکن تھی۔ حکم ماننا ریحانہ کی مجبوری تھی۔ وہ اسے چھڑی سے زمین ٹٹول کر جاتے دیکھ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ یہ سارا جنگل شہنا کا دیکھا بھالا تھا۔ اس کے لیے داؤد نے کناروں کی نشان دہی کے لیے رسی کی باڑھ لگائی تھی جس پر چھوٹی گھنٹیاں لٹکی ہوتی تھیں اور جب اس کی چھڑی کسی باڑھ سے ٹکراتی تو اسے پتا چل جاتا کہ وہ کسی کنارے تک پہنچ گئی ہے اور اس سے آگے جانا خطرناک ہوسکتا ہے۔ اب اسے نہیں معلوم تھا کہ وہاں رسی اور گھنٹیاں تھیں یا نہیں۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کہاں سے جنگل میں داخل ہوئی ہے۔ وہ بڑے تنے والے درخت کی طرف بڑھ رہی تھی۔

وہ چھڑی سے زمین ٹٹولتی تھی۔ اتنے برسوں کے ساتھ کے بعد چھڑی اس کے ہاتھ کی طرح ہوگئی تھی۔ وہ اس سے چھوکر چیز کی ساخت اور بناوٹ تک محسوس کرلیتی تھی۔ پھر بھی اسے شبہ ہوتا تو وہ جھک کر بیٹھ کر دیکھتی۔ اسی طرح ٹٹولتی ہوئی وہ بالآخر بڑے درخت کے تنے تک پہنچ گئی۔ یہ پہاڑ کی چوٹی سے کوئی پچاس گز نیچے تھا۔ اس نے اس کا تنا ٹٹولا۔ پھر اسے محسوس کرتی ہوئی نیچے اپنی پسند کی جگہ بیٹھ گئی۔ یہاں درخت کی کچھ جڑیں اس طرح سے ابھری ہوئی تھیں کہ ایک نشست سی بن گئی تھی۔ وہ اس پر بیٹھ جاتی تھی۔ لیکن اس بار جب اسے وقت ہوئی تو اسے یاد آیا کہ وہ اب دس سال کی

تعصب

☆...... نیویارک کی ایک شاہراہ پر ایک کتا ایک بچے پر جھپٹا۔ اس سے قبل کہ کتا اپنا کام دکھاتا، ایک راہ گیر نے کتے کی گردن دبوچ لی اور اس وقت تک اسے نہ چھوڑا جب تک کتا مر نہ گیا۔ ایک بڑے امریکی اخبار کا نمائندہ یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے راہ گیر کی تصویر بناتے ہوئے کہا۔ ''صبح اخبار کے صفحہ اول پر ایک تصویر اور خبر ہوگی جس کی سرخی یہ ہوگی۔ ''ایک نیویارکر نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر ایک بچے کی جان بچائی۔''

''سرخی تو خوب ہے لیکن میں نیویارکر نہیں ہوں۔'' راہ گیر نے کہا۔

''تو پھر سرخی یہ ہوگی، ایک امریکی نے جان پر کھیل کر بچے کو بچالیا۔'' رپورٹر نے کہا۔

''یہ سرخی بھی عمدہ ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ میں امریکی بھی نہیں ہوں۔'' راہ گیر بولا۔

''تو پھر تم کون ہو؟'' رپورٹر نے قدرے تیزی سے پوچھا۔

''سب سے پہلے میں ایک مسلمان ہوں۔ نیویارکر امریکی یا برٹش کی بات بعد میں آتی ہے۔'' جواب ملا۔

اگلے روز اسی اخبار کے صفحہ اول پر شائع ہونے والی خبر کی سرخی یہ تھی۔ ''ایک بنیاد پرست مسلمان نے پالتو کتے کی گردن مروڑ ڈالی۔''

محمد محسن فاروقی، ہائی سیکیورٹی نیو سینٹرل جیل ملتان

بچی نہیں بلکہ بیس سال کی جوان لڑکی ہے۔ اس کا جسم بھر گیا تھا اور اسی لیے یہ جگہ اس کے لیے چھوٹی پڑ گئی تھی۔ وہ بے ساختہ ہنسی۔ وہ خود کو وہی چھوٹی سی بچی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے تنے سے سر ٹکایا تو اسے باپ یاد آیا اور اس کی ہنسی رک گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

وہ اٹھی اور چھڑی سے ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھی۔ یہاں لمبے تنے والے بے شمار درختوں کا ایک جھنڈ تھا جس میں وہ اپنے باپ کے ساتھ چھپنے کا کھیل کھیلتی تھی۔ یہ جگہ ہموار تھی اور وہ آرام سے چلتی پھرتی تھی۔ وہ چھڑی سے راستہ دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک چھڑی خلا میں گئی اور اس کے قدم لڑکھڑائے کہ کسی نے اس کا بازو تھام لیا۔ ہاتھ کی مردانہ سختی محسوس کر کے اس کے منہ سے ہلکی چیخ نکلی اور اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر بازو پکڑنے والے نے اسے پیچھے کھینچ لیا۔ شہنا خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا دوسرا ہاتھ اپنی جینز کی جیب کی طرف بڑھ رہا تھا کہ پکڑنے والے نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ایک سخت مردانہ آواز نے کہا۔ ''ابھی تم نیچے گرتیں۔ تم اتنے عرصے بعد آئی ہو اور تمہیں نہیں معلوم یہاں سے پہاڑی کا کنارہ دوسری طرف گر گیا ہے اور یہاں خلا ہے۔''

شہنا کا ہاتھ رک گیا۔ ''کون ہو تم؟''

''میں... سرمد خان ہوں، سعود خان کا بیٹا۔''

شہنا ایک لمحے کو خاموش رہی پھر اس نے تلخی سے کہا۔ ''تب مجھے کیوں بچایا...؟''

''اس لیے کہ میں نہیں چاہتا کہ ہمارے خاندان پر مزید کوئی الزام آئے۔'' سرمد کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔ ''مہربانی کر کے اب یہاں اکیلے آنے سے گریز کرنا۔''

شہنا کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا لیکن اس نے اپنا ظاہر سرد رکھا تھا۔ قدموں کی آہٹ نے بتایا کہ سرمد وہاں سے جا رہا ہے۔ شہنا کو تعجب ہوا کہ وہ اس کے آتے قدموں کی آہٹ کیوں نہیں سن سکی۔ شاید اس وقت وہ ماضی میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے احتیاط سے آگے جا کر پہاڑی کا کنارہ چیک کیا۔ پھر اس نے ایک پتھر نیچے اچھالا اور آواز سے اسے اندازہ ہوا کہ یہاں زمین تقریباً تیس چالیس فٹ نیچے ہے۔ اسے جھرجھری آ گئی۔ سرمد نے اسے بروقت روکا تھا۔ اگرچہ اس نے بتا دیا تھا کہ اسے اس سے کوئی ہمدردی نہیں بلکہ اس نے اپنے خاندان کو مزید کسی الزام سے بچانے کے لیے ایسا کیا تھا۔ شہنا کو خیال آیا کہ کیا وہ اسے دیکھ کر یہاں آیا تھا یا اتفاق سے موجود تھا؟ سرمد اس سے پانچ برس بڑا تھا۔ سعود نے اسے کم عمری میں پڑھنے کے لیے بورڈنگ بھیج دیا تھا کیونکہ اس کے خیال میں یہاں کوئی اسکول اچھا نہیں تھا اس لیے شہنا اس سے بہت کم ملتی تھی۔ اس کے پاس اپنے تایا اور اس کے خاندان کے بارے میں زیادہ یادداشتیں نہیں تھیں۔ لمبے درختوں والے جھنڈ کا کچھ حصہ بھی نیچے گر گیا تھا۔ اس لیے یہ جگہ اب خطرناک ہو گئی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ یہاں تک نہیں آئے گی۔

☆☆☆

موسم سرد ہو چلا تھا۔ یہ جگہ بلند تھی۔ شریف گل نے اسے بتایا کہ یہ جگہ سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ بلند تھی۔ سردیوں میں یہاں برف باری بھی ہوتی تھی۔ نومبر سے لے کر مارچ کے آخر تک سردی شدید ہوتی تھی۔ ایسے میں آتش دان کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ یہاں بڑے درختوں کی کمی تھی اور جو تھے ان کو بھی نہیں کاٹا جاتا تھا۔ اس لیے کچھ چھوٹے جھاڑی نما درخت اگائے جاتے تھے جو تیزی سے بڑھتے تھے اور پھر ان کی لکڑی کو کوئلے میں بدل کر گھروں میں گرمائش کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ متوسط لوگ چولھے میں بھی یہی جلاتے تھے۔ صاحب حیثیت لوگ ایل پی جی استعمال کرتے تھے۔

آڑو اور خوبانی اتر رہی تھی۔ لوکاٹ پہلے ہی اتارا جا چکا تھا۔ شریف گل اپنی نگرانی میں پھل اتروا کر پیک کرواتا تھا۔ پیٹیوں اور دوسرے پیکنگ کے سامان کا بندوبست وہ پہلے ہی کر لیتا تھا۔ مزدور بھی پرانے اور تجربہ کار ہوتے تھے۔ ان کی مدد سے وہ پھل جلدی اتروا کر پیک کرا لیتا تھا اور منڈی میں جلدی پھل پہنچنے کی وجہ سے اسے اچھی قیمت مل جاتی تھی اور پھل بھی اعلیٰ معیار کا ہوتا تھا۔ شہنا تقریباً روز ہی چکر لگاتی تھی۔ وہ کچھ دیر باغ میں گزارتی اور شریف گل اسے مکمل رپورٹ دیتا کہ آج کتنا پھل نکلا اور پیک کیا گیا تھا۔ ایک دن وہ اترواتا تھا اور دوسرے دن منڈی جاتا تھا۔ صبح فجر سے لے کر رات تک وہ چار چکر لگا لیتا تھا۔ گزشتہ ڈیڑھ مہینے سے پھل کی اترائی کا کام جاری تھا۔

☆☆☆

سورج ڈوبتے ہی تاریکی تیزی سے چھانے لگی۔ ایک کار ہری پور روڈ پر نمودار ہوئی اور پہاڑی کے ساتھ رک گئی جس کے پیچھے جنگل اور باغات تھے۔ اسٹیئرنگ سیٹ پر ایک ہڈ پوش تھا۔ کار کنارے پر کھڑی کر کے وہ نیچے اتر آیا۔ اس نے خود کو پوری طرح چھپا رکھا تھا۔ درمیانی سے کسی قدر

بہتر جسامت کے ساتھ وہ بہت چاق و چوبند لگ رہا تھا۔ اس کا اندازہ اس کے پہاڑی پر چڑھنے کے انداز سے ہو رہا تھا۔ تاریکی کے باوجود وہ تیزی سے اوپر پہنچ گیا۔ اوپر آ کر وہ زمین پر لیٹے لیٹے ڈھلان سے نکلا اور چند لمحے خاموشی سے جنگل کا جائزہ لیتا رہا۔ یہاں کسی قدر روشنی تھی.... پھر جب یہ روشنی بھی ختم ہو گئی تو وہ حرکت میں آیا اور زمین پر جھکے جھکے بڑے تنے والے درخت کی طرف بڑھا۔ درخت کے نزدیک آ کر اس نے ایک بار پھر پورے جنگل کا جائزہ لیا۔

جب اسے اطمینان ہو گیا کہ یہاں کوئی نہیں ہے تو اس نے اپنے اپر سے ایک چھوٹی کھرپی برآمد کی اور اس سے درخت کی ابھری ہوئی جڑوں کے درمیان موجود مٹی کھودنے لگا۔ وہ بہت آہستگی سے اور کم سے کم آواز کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ مٹی نرم کر کے وہ اسے ہاتھ سے ہٹاتا تھا۔ رفتہ رفتہ جڑوں کے درمیان خلا نمایاں ہونے لگا۔ جیسے جیسے مٹی نکل رہی تھی، وہ اندر سے نرم اور آسانی سے نکل رہی تھی۔ تقریباً ایک فٹ تک کھدائی کر کے اس نے ہاتھ اندر ڈال کر ٹٹولا مگر کچھ نہ پا کر وہ مزید کھدائی کرنے لگا۔ کچھ دیر میں اس نے جڑوں کے اس خلا کے اندر ساری مٹی نکال دی۔ اب اس کے ہاتھ جڑوں سے ٹکرا رہے تھے اور وہاں سونے والا بریف کیس نہیں تھا جبکہ اسے یہیں ہونا چاہیے تھا۔ اندر سے نکالی گئی مٹی ایک طرف ڈھیر تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنا اطمینان کیا اور باقاعدہ لیٹ کر ہاتھ اندر ڈالا اور نتیجہ حسب سابق نکلا۔

اس نے زمین سے اٹھ کر مٹی کے ڈھیر کو ٹھوکر ماری۔ وہ بریف کیس یہاں نہ پا کر پریشان تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں ٹہلتا رہا پھر اس نے مٹی دوبارہ خلا میں ڈالی اور باقی ادھر ادھر پھیلا کر کھدائی کے نشانات مٹائے۔ کھرپی جھاڑ کر اپر میں رکھی اور دوبارہ نیچے کی طرف چل پڑا۔ اس بار اسے احتیاط سے کام لینا پڑا کیونکہ تاریکی مکمل ہو گئی تھی۔ نیچے آ کر اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ مگر پہاڑ والے حصے سے نکلتے ہی سامنے سے ایک فور وہیل ڈرائیو نمودار ہوئی اور اس کی تیز روشنی اس پر پڑی۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور اس نے بروقت اسٹیئرنگ گھمایا۔ فور وہیل ڈرائیو اس کی کار کے پاس سے گزر گئی تھی۔ وہ بال بال بچا تھا۔

☆☆☆

شہنا نے شریف گل سے کہا تھا کہ وہ اس کے لیے کوئی اچھی گاڑی دیکھے۔ جیپ آرام دہ سواری نہیں تھی۔ شہنا کے کہنے پر شریف گل نے ایک پراڈو دیکھی۔ چند سال پرانا ماڈل تھا لیکن بہت اچھی حالت میں اور قیمت بھی مناسب تھی۔ بائیس سو سی سی کا انجن پہاڑی سفر کے لیے بہترین تھا۔ ڈیلر شریف گل سے واقف تھا اس نے گاڑی اسے ٹیسٹ ڈرائیو کے لیے دے دی۔ شہنا کو کچھ ذاتی سامان اور سردیوں کے لحاظ سے سامان لینا تھا۔ اس نے رافیہ کو کال کی کہ وہ اسلام آباد آ رہی ہے۔ پھل اتروائی میں وقفہ آیا تھا اس لیے شریف گل اس کے ساتھ جا سکتا تھا۔ شہنا نے سوچا کہ دو دن وہاں رکے گی، رافیہ کے ساتھ شاپنگ کرے گی اور واپس آ جائے گی۔ اس دوران میں گاڑی کی ٹیسٹنگ بھی ہو جائے گی۔ ویسے گاڑی بہت آرام دہ اور بہترین فکسچر کے ساتھ تھی۔ رافیہ اس کی آمد کا سن کر خوش ہو گئی۔ وہ ابھی تک ولی خان کے ساتھ رہ رہی تھی۔ شہنا صبح روانہ ہوئی تھی۔ وہ پیچھے بیٹھی تھی اور شریف گل ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ اس کی شریف گل سے کئی ... بار گفتگو ہوئی تھی اور بعض اوقات تو دن میں دو تین بار ہوتی تھی لیکن اب تک وہ اس سے چچا سعود کے بارے میں بات نہیں کر سکی تھی۔ راستے میں اسے خیال آیا اور اس نے کہا۔

''شریف! مجھے ریحانہ نے بتایا ہے کہ تایا سعود اپنے گھر آتے جاتے ہیں اور تم نے بھی انہیں دیکھا ہے؟''

''یہ درست ہے بی بی۔'' شریف نے کہا۔ ''دو سال پہلے میں نے خود انہیں اپنے گھر میں جاتے دیکھا تھا۔''

''دوسروں نے بھی دیکھا ہوگا؟''

''تقریباً سب ہی ملازموں نے مختلف مواقع پر انہیں دیکھا ہے۔ آپ جانتی ہیں ہم سب ملازم جو دونوں کی زمین پر کام کرتے ہیں، ایک ہی خاندان اور قبیلے سے ہیں۔ ہماری آپس میں رشتے داریاں اور ملنا جلنا ہے۔ جو بات ایک کو پتا ہوتی ہے وہ دوسرے کو بھی پتا چل جاتی ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' شہنا نے کہا۔ شریف گل اور دوسرے ملازم ان کے قبیلے کے تھے اور دور پرے کے رشتے دار بھی لگتے تھے۔

''بڑے خان جی کے ملازموں نے بھی کئی بار انہیں دیکھا۔ وہ چپکے سے رات کے وقت آتے ہیں اور رات ہی میں چلے جاتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے ابتدائی تفتیش کے بعد پولیس نے کیس بند کر دیا ہوگا؟''

''ایسا ہی ہوا ہے بی بی... پھر جب کوئی پوچھنے والا نہ ہو تو

پولیس کہاں کچھ کرتی ہے۔" شریف گل نے کہا۔ "ہم ملازم لوگ ہیں ہمیں کہاں منہ لگاتے وہ..."

شہنا کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے کہا۔ "تم نے یا کسی اور ملازم نے پولیس کو اطلاع نہیں دی۔"

شریف گل نے دبی زبان میں کہا۔ "کئی بار خیال آیا مگر بی بی آپ کے خاندان کا نمک کھایا ہے۔ بس اسی خیال سے ہمت نہیں ہوئی۔"

شہنا نے سوچا تو اسے شریف گل ٹھیک لگا۔ وہ برسوں سے اس خاندان کا ملازم تھا۔ زمین بخت اس کے باپ کو یہاں لایا تھا۔ خود شہنا نے سوچا کہ اگر اسے موقع ملا تو کیا وہ پولیس کو تایا سعود کے بارے میں اطلاع دے سکے گی؟ تو اس کے اندر سے نفی میں جواب آیا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے گہری سانس لی۔ "شریف! وہ آخری بار کب نظر آئے؟"

"تقریباً چھ مہینے پہلے... آپ کی واپسی سے چار مہینے پہلے کی بات ہے۔ گرمی بہت تھی تو اکثر مرد باہر سور ہے تھے تب رستم نے دیکھا تھا۔ وہ بڑے خان جی کی زمین پر کام کرتا ہے۔ بڑے خان جی اس وقت اپنے گھر سے نکل رہے تھے۔"

"کچھ پتا ہے وہ کہاں رہتے ہیں؟"

"بی بی، ہم نے صرف ان کو آتے جاتے دیکھا ہے ورنہ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں سے آتے ہیں اور کہاں چلے جاتے ہیں؟"

شہنا حیران تھی کہ کیا وہ اپنی باقی ساری عمر بھی روپوشی میں گزاریں گے۔ ابھی ان کی عمر صرف پینتالیس سال تھی اور آگے بہت ساری عمر پڑی تھی۔ وہ اسلام آباد پہنچ گئے۔ شہنا نے ولی خان کو اطلاع نہیں دی تھی کیونکہ اس نے رافیہ کو بتا دیا تھا کہ وہ آرہی ہے۔ رافیہ گرم جوشی سے ملی۔ "شکر ہے تم آگئیں۔ میں بہت بور ہو رہی تھی۔"

"کیوں، آج کل یونیورسٹی نہیں جا رہیں؟"

"نہیں، میں نے یونیورسٹی چھوڑ دی۔" رافیہ بولی۔ "مزید پڑھنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔"

یہ بات ٹھیک تھی۔ رافیہ ذہین طالبہ نہیں تھی بس پاس ہو جاتی تھی۔ "پھر تم کیا کرو گی؟"

"جاب تلاش کر رہی ہوں۔" وہ بولی۔

شہنا نے اسے یاد دلایا۔ "تم نے کہا تھا کہ تم الگ ہو جاؤ گی؟"

رافیہ خاموش ہوئی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "تم جانتی ہو میرا کوئی اور سہارا نہیں ہے اور نہ ہی تمہاری طرح آمدنی کا ذریعہ ہے۔ میں کس طرح یہاں سے جا سکتی ہوں۔"

شہنا شرمندہ ہو گئی۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ واقعی رافیہ کا سارا انحصار ولی خان پر تھا۔ اس نے کہا۔ "رافیہ! تم میرے ساتھ چلو... جب تک جاب کا نہیں ہو جاتا تم میرے پاس رہو۔ تمہارا دل بھی لگے گا اور میرا بھی دل لگے گا۔ میرا علاقہ بہت خوب صورت ہے۔ تم دیکھو گی تو وہاں سے آنے کو دل نہیں چاہے گا۔"

"میں سوچوں گی۔" رافیہ نے ہچکچا کر کہا۔

"نہیں، سوچو مت چلو۔" شہنا نے اصرار کیا۔

رافیہ نے وعدہ کیا کہ وہ سنجیدگی سے سوچے گی۔ کیونکہ وقت کم تھا اس لیے شہنا اس کے ساتھ اسی دن شاپنگ کے لیے نکل گئی۔ رافیہ اس کی شاپنگ دیکھ کر حیران ہوئی۔ "لگتا ہے تمہارے پاس بڑی دولت آگئی ہے؟"

"ہاں، اللہ کا شکر ہے۔ مجھے تو خود نہیں معلوم تھا کہ میرے اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہے اور باغات سے کتنی آمدنی آتی ہے۔ مجھے تو خالہ رشنا نے رکھا تھا اور خالو ملازمت پیشہ آدمی ہیں۔ وہ ایک حد سے زیادہ خرچ نہیں کر سکتے تھے۔ زمین سے جتنی آمدنی آتی تھی، وہ خالہ میرے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتی تھیں۔ ویسے انہوں نے کبھی کوئی کمی نہیں رکھی، ہمیشہ مجھ پر حیثیت سے بڑھ کر خرچ کیا۔"

"یہ تو ہے۔ وہ بہت اچھی تھیں۔"

وہ تقریباً سارا دن باہر رہیں۔ شاپنگ کے علاوہ گھومتی پھرتی اور کھاتی پیتی رہیں۔ شام ہونے پر وہ گھر آئیں۔ ولی خان نہیں آیا تھا۔ وہ ان کی آمد کے کچھ دیر بعد آیا۔ وہ بھی شہنا سے گرم جوشی سے ملا۔ اس نے شکوہ کیا کہ وہ جا کر اسے بھول گئی ہے۔ بس چند ایک بار رابطہ کیا۔ شہنا نے کہا۔ "خالو، ایسا نہیں ہے... وہاں رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ موبائل استعمال کرنے کے لیے بھی کئی میل دور ہری پور جانا پڑتا ہے۔ جتنی بار میں ہری پور، آپ کو لازمی کال کی مگر اکثر آپ آفس میں ہونے کی وجہ سے ریسیو نہیں کرتے تھے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ میں نے بعد میں دیکھا تو کئی بار تمہاری کال آئی ہوئی تھی۔" ولی خان نے کہا۔ وہ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھا پھر اٹھ کر چلا گیا۔ ڈنر کے وقت اس نے شہنا سے کہا۔ "اب تم آئی ہو تو کئی دن رکنا۔ رافیہ کا دل بھی بہل جائے گا۔"

"نہیں خالو، مجھے کل واپس جانا ہے... پھل اتر رہا ہے، کچھ دن کا موقع ملا تو آئی ہوں۔ میں رافیہ سے کہہ رہی ہوں یہ میرے ساتھ چلے اور کچھ دن وہیں رہے۔"

"ہاں کیوں نہیں... یونیورسٹی چھوڑ دی ہے۔ اب سارا دن گھر میں بور ہوتی ہے۔" ولی خان نے کہا۔

شہنا کا کمرا بند تھا اس لیے وہ رافیہ کے کمرے میں سوئی تھی۔ اس میں ڈبل بیڈ تھا۔ دونوں آرام سے سو سکتی تھیں۔ رات کسی وقت شہنا کی آنکھ کھلی تو اس نے محسوس کیا کہ رافیہ بیڈ پر نہیں ہے۔ وہ کچھ دیر جاگتی رہی۔ پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح اس نے رافیہ سے پوچھا۔ "تم واش روم گئی تھیں؟"

"نہیں تو..." اس نے انکار کیا۔ "میں تو ساری رات سوتی رہی۔"

شہنا کو حیرت ہوئی۔ رافیہ بیڈ پر نہیں تھی اور وہ تقریباً دس پندرہ منٹ جاگتی رہی تھی۔ اس دوران میں وہ واپس نہیں آئی تھی لیکن اس نے بحث نہیں کی۔ ممکن ہے کوئی وجہ ہو اور رافیہ تسلیم نہیں کر رہی ہو۔ ناشتے پر رافیہ نے اعلان کیا کہ وہ شہنا کے ساتھ جا رہی ہے۔ شہنا خوش ہو گئی۔ "واٹ اے سرپرائز۔"

"اچھی بات ہے۔" ولی خان نے کہا۔ "کتنے دن کے لیے جا رہی ہو، میں ڈرائیور بھیج دوں گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" شہنا نے کہا۔ "رافیہ جب کہے گی، شریف گل اسے چھوڑ جائے گا۔"

"نہیں، تم کال کر دینا میرا ڈرائیور آجائے گا۔" ولی خان نے حتمی لہجے میں کہا اور میز سے اٹھ گیا۔ جانے سے پہلے اس نے شہنا سے روانگی کا پوچھا۔ اس نے بتایا۔

"ہم دوپہر کے بعد نکلیں گے۔ مجھے کچھ چیزیں اور لینی ہیں اور پھر شام سے پہلے واپس پہنچنا ہے۔"

"ٹھیک ہے پھر تم سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ میں وہی اپنے وقت پر واپس آؤں گا۔" ولی خان نے کہا اور پھر اس نے رافیہ کو اشارہ کیا تو وہ اٹھ کر اس کے ساتھ ذرا دور چلی گئی۔ ولی خان نے آہستہ سے کہا۔ "تم بس دو تین دن رکنا... پھر مجھے کال کر دینا۔"

رافیہ نے سر ہلایا۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ ولی خان دفتر چلا گیا۔ رافیہ واپس آئی تو شہنا نے اچانک اس سے پوچھا۔ "خالو تم سے جلد آنے کا کیوں کہہ رہے تھے؟"

رافیہ چونکی۔ "تم نے سن لیا؟"

"ہاں، تم بھول رہی ہو میری سماعت بہت تیز ہے۔"

"شاید وہ اب اکیلے رہ گئے ہیں اس لیے مجھے جلدی واپس آنے کو کہہ رہے ہیں۔"

"لیکن میں بتا دوں کہ میں تمہیں جلد نہیں آنے دوں گی۔" شہنا نے کہا۔

"دیکھو اگر انہوں نے ڈرائیور بھیج دیا تو میں مجبور ہو جاؤں گی۔ بہرحال ان کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔"

شہنا نے حیرت سے کہا۔ "ٹھیک ہے، تم ان کی ذمے داری ہو لیکن ضروری تو نہیں ہے تم بالکل ان کی مرضی کے مطابق چلو۔"

"تم نہیں جانتیں ہو، رشنا آنٹی اور تمہارے بعد یہاں کیا تبدیلی آئی ہے۔" رافیہ دبے لہجے میں بولی۔ "میں بہت مشکل میں پڑ گئی ہوں لیکن اس بارے میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔"

شہنا تجسس میں پڑ گئی۔ مگر اب وقت نہیں تھا۔ واپس جانا تھا اور اس سے پہلے بہت کام تھا۔ شریف نے اس سے کہا کہ وہ اسے مارکیٹ چھوڑ کر منڈی جائے گا۔ کچھ حساب کتاب کرنا تھا اور چیک لینا تھا۔ وہ دوپہر سے پہلے نکل گئے۔ شریف نے انہیں سپر مارکیٹ چھوڑا اور خود چلا گیا۔ شہنا اور رافیہ نے گھوم پھر کر خریداری کی۔ شہنا نے اس کے لیے بھی گرم چیزیں لیں کیونکہ اس کے علاقے میں سردی بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ اسلام آباد میں موسم ابھی خوشگوار تھا۔ رافیہ منع کرتی رہی لیکن شہنا نے اس کی بھی شاپنگ کی۔ جب تک انہوں نے لنچ کیا، شریف آگیا اور وہ واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہ ڈھائی بجے نکلے تھے اور ساڑھے چار بجے واپس پہنچے تھے۔ شہنا نے راستے میں ہری پور کی ایک عورت کو اپنے سوٹ سلنے کو دیے۔ وہ اسی سے سوٹ سلواتی تھی۔ رافیہ نے گاڑی سے اترتے ہی کہا۔ "شہنا! تم نے سچ کہا تھا، یہ علاقہ بہت خوب صورت ہے۔ خزاں میں اتنا خوب صورت ہے تو بہار میں کتنا ہو گا۔"

"تم بہار میں آنا تب دیکھنا۔" شہنا نے فخر سے کہا۔ "میرے دادا پشاور سے آئے تھے لیکن میرا علاقہ اب یہی ہے۔"

کچھ دیر میں سورج غروب ہو گیا اور وہ اندر جانے پر مجبور ہو گئے۔ نومبر کے آغاز میں سردی بڑھ گئی تھی۔ ریحانہ سامان لے گئی تھی۔ شریف گل رکا ہوا تھا۔ وہ گاڑی کے بارے میں شہنا کی رائے لینا چاہ رہا تھا کیونکہ وہ اسے واپس کرنے جا رہا تھا۔ شہنا نے اس سے کہا۔ "تم سودا کر لو... لیکن ادائیگی کے لیے کچھ مہلت لے لو۔ رقم آئے گی تو

ادائیگی کردیں گے۔"

شریف گل خوش ہوگیا۔ "بی بی، اچھی گاڑی ہے۔ طویل ڈرائیو میں کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔"

شریف منڈی سے چیک لے آیا تھا، اسے وہ بھی جمع کرانے تھے۔ وہ ہری پور چلا گیا۔ رافیہ نے رشک سے کہا۔ "شہنا! تمہیں کتنے اچھے ملازم ملے ہیں۔"

"ہاں واقعی صرف ملازم نہیں، مجھے تمام ہی لوگ بہت اچھے ملے ہیں۔ جیسے خالہ، خالو اور تم۔"

"خالو۔" رافیہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں بتاؤں گی کہ وہ کتنے اچھے ہیں۔"

"تم نے وہاں بھی کہا تھا۔ ایسی کیا بات ہے؟" شہنا کو تجسس ہونے لگا۔

"رات میں بتاؤں گی۔" رافیہ بولی۔ "ابھی تو تمہاری ملازمہ آس پاس ہی گھوم رہی ہے۔"

ریحانہ رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ اس نے سارا سامان اور رافیہ کا ذاتی سامان بھی شہنا کے بیڈ روم میں رکھ دیا تھا۔ اگرچہ اس کا بیڈ چارپائی چھ کا تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ وہ دونوں آرام سے لیٹ سکتی ہیں۔ رافیہ زیادہ سامان نہیں لائی تھی۔ اس کا چھوٹا سا ہینڈ بیگ تھا جس میں چند جوڑے اور کچھ چیزیں تھیں۔ شہنا اسے اپنا گھر دکھانے لگی۔ شہنا نے ڈرائنگ روم شہری انداز میں سجایا تھا، یہاں سب نیا تھا۔ رافیہ کو یہ پسند آیا۔

"تم نے اچھا کیا جو سٹنگ شہری اسٹائل کی کی ہے۔"

"البتہ باقی گھر ویسا ہی ہے جیسا بابا کے وقت میں تھا۔"

"کسی چیز کو دیکھ کر لگتا نہیں ہے کہ یہ دس سال سے بغیر استعمال کے ایسے ہی پڑی رہی۔ ہر چیز بہت اچھی حالت میں ہے۔"

"یہ سب ریحانہ اور شریف گل کی محنت کا نتیجہ ہے۔" شہنا نے کہا۔ "انہوں نے اپنی ذمے داریوں سے بڑھ کر کیا اور کبھی اس کا صلہ طلب نہیں کیا۔"

"بی بی، ہمیں سب تو ملتا ہے۔" ریحانہ نے قہوے کی ٹرے ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "سب تو دیا ہوا ہے اور آپ کا ہی ہے۔ آپ اتنا اعتماد کرتی ہو کہ لاکھوں روپیا شریف کے پاس ہوتا ہے۔ وہ خود حساب دیتا ہے۔ آپ نے کبھی حساب نہیں مانگا۔"

"آدمی حساب اس وقت مانگتا ہے جب شک ہو۔" شہنا نے کہا۔ "اور خود اس وقت حساب دیتا ہے جب اس کا دل اور نیت صاف ہو۔"

"آپ نے بہت اچھی بات کی بی بی۔" ریحانہ خوش ہوکر بولی۔

رافیہ قہوہ لے کر نہانے چلی گئی۔ یہاں کچن کے ساتھ لکڑی کے کوئلے سے چلنے والا گیزر لگا ہوا تھا جو گھر میں گرم پانی دیتا تھا۔ ریحانہ برتن اٹھانے آئی تو اس نے شہنا سے کہا۔ "بی بی، آپ کی دوست شادی شدہ ہیں؟"

"نہیں۔" شہنا نے بتایا۔ "ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔"

"پر بی بی ان کی چال ڈھال اور جسم بالکل شادی شدہ عورتوں جیسا ہے۔"

"ریحانہ... بعض لڑکیوں کا جسم ایسا ہی ہوتا ہے۔" شہنا نے کہا۔ "میں دس سال اس کے ساتھ رہی ہوں۔"

"معافی بی بی۔" ریحانہ نے جلدی سے کہا۔ "اگر آپ کو برا لگا ہو تو؟"

"کوئی بات نہیں... کھانا کب تک بنے گا؟"

"ایک گھنٹا اور لگے گا بی بی... اگر بھوک لگی ہے تو جلدی لگا دوں گی۔ سالن بن گیا ہے پر پلاؤ میں کچھ وقت ہے ابھی۔"

"نہیں، تم ایک ساتھ لگانا۔" شہنا اٹھ گئی۔ "میں ذرا اپنا سامان دیکھ لوں۔"

وہ کمرے میں آکر لائی ہوئی چیزیں اپنی جگہوں پر رکھنے لگی۔ رافیہ کچھ دیر بعد باتھ روم سے نکلی۔ اس نے صرف تولیا لپیٹ رکھا تھا۔ وہ اپنے کپڑے لے کر نہیں گئی تھی۔ پھر اس نے تولیا بھی ہٹا دیا اور کپڑے بدلنے لگی۔ شہنا کو نظر نہیں آرہا تھا لیکن اس نے کپڑوں کی سرسراہٹ سے اندازہ لگا لیا۔ اسے عجیب لگا۔ بے شک اسے نظر نہیں آرہا تھا لیکن وہ سن اور سمجھ تو سکتی تھی۔ لباس پہن کر رافیہ نے کہا۔

"بہت مزہ آیا۔ یہاں پانی میں عجیب سی خوشبو ہے۔"

"ہاں یہ نباتی پانی ہے۔ یہاں زمین کا پانی بھی بہت اچھا ہوتا ہے لیکن یہ پانی اوپر ایک چشمے سے آتا ہے۔ یہاں تک پانی کی لائن بچھائی ہوئی ہے۔ اسٹوریج ٹینک بھی ہے اور براہِ راست بھی آتا ہے۔ سردیوں میں جب برف پڑتی ہے اور پانی جم جاتا ہے تب کچھ مسئلہ ہوتا ہے۔ پینے کے لیے تو بہت ہی اچھا ہے۔"

"ہاں میں نے جب سے پانی پیا ہے تب سے پیٹ میں چوہا ریس شروع ہوگئی ہے۔ حالانکہ دوپہر میں خوب کھایا تھا۔"

"بس کچھ دیر میں کھانا لگ جائے گا۔" شہنا نے اسے تسلی دی۔

آتش دان میں کوئلہ جل رہا تھا اور کمرا خوش گوار حد تک گرم تھا۔ رافیہ آتش دان کے سامنے بیٹھ کر بال خشک کرنے لگی۔ "بہت خوب صورت کمرا ہے خاص طور سے یہ آتش دان۔"

شہنا ولی خان کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھی۔ "رافی! تم خالو کے بارے میں کیا کہہ رہی تھیں؟"

رافیہ کے ہاتھ رک گئے۔ پھر اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تمہیں یہ سن کر دھچکا لگے گا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

شہنا ششدر رہ گئی۔

☆☆☆

کوٹھری کا دروازہ کھلا اور جیل گارڈ نے کرخت لہجے میں کہا۔ "اوئے چل باہر آ۔"

صغیر احمد خاموشی سے اٹھ کر باہر آیا۔ اتفاق سے اس کوٹھری میں وہ اکیلا تھا کیونکہ اس کے دو ساتھی گزشتہ روز بعض معافیوں کی وجہ سے اچانک رہائی پا گئے تھے۔ اس کی رہائی میں ابھی بہت چار سال باقی تھے۔ اس نے گارڈ سے نہیں پوچھا کہ اسے کہاں لے جایا جارہا ہے۔ گارڈ اسے جیل کے دفاتر والے حصے میں ایک کمرے میں لایا۔ اسے چند ایک بار یہاں آنے کا موقع ملا تھا جب مرمت اور رنگ و روغن کے لیے قیدیوں سے بیگار لیا جاتا تھا۔ اس کمرے میں ایک بالٹی میں گرم پانی، صابن اور تولیا موجود تھا۔ گارڈ نے اس سے کہا۔ "نہالو... تمہارے پاس بیس منٹ ہیں۔"

آخری بار اسے مہینا پہلے نہانے کا موقع ملا تھا اس لیے اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ بالٹی خاصی بڑی تھی اور اس نے جسم کا سارا میل بہا دیا۔ نہا دھو کر وہ ہلکا ہوگیا تھا۔ وہ کپڑے پہننے جارہا تھا کہ گارڈ اندر آیا۔ اس نے حکم دیا۔ "رک جاؤ... تمہارے بال کاٹنے ہیں اور شیو بنانی ہے۔"

اس نے تولیا باندھ لیا۔ ایک قیدی اندر آیا جو یہی کام کرتا تھا۔ اس نے خاموشی سے اس کے بال کاٹے اور اسٹائل بنایا پھر اس نے شیو بنائی۔ وہ اپنا کام کرکے چلا گیا۔ گارڈ پھر اندر آیا۔ اس نے ہینگر پر ایک مناسب قسم کا تھری پیس سوٹ لیا ہوا تھا۔ وہ اس کے حوالے کیا اور حکم دیا۔ "یہ پہنو۔"

گارڈ سوٹ دے کر باہر چلا گیا تھا، اس نے سوٹ پہنا مگر اس کے پاؤں خالی تھے۔ وہ ابھی سوچ رہا تھا کہ

آگے کیا ہوگا؟ گارڈ پھر اندر آیا۔ اس بار اس نے جوتے موزے اٹھا رکھے تھے۔ انہیں پہنا تو گارڈ اسے باہر لے آیا جہاں ایک بند وین اس کی منتظر تھی۔ اسے وین کے پچھلے حصے میں بٹھا دیا گیا۔ وہ جیل میں رہتا تھا اور آئے دن اس قسم کے ڈرامے دیکھتا تھا۔ جیل میں بعض قیدی رات کی تاریکی میں باہر جاتے تھے اور بعض کئی کئی دن باہر رہتے تھے پھر اسی طرح خاموشی سے واپس آجاتے تھے۔ پہلے وہ پُرسکون تھا مگر جیسے ہی وین جیل سے نکلی، وہ فکرمند ہوگیا۔ ایک گھنٹے بعد وین رکی، عقبی دروازہ کھلا اور ایک سوٹ پوش شخص نے اسے نیچے آنے کو کہا۔ وہ نیچے آیا تو اس نے دیکھا کہ یہ ایک سادہ سرکاری عمارت تھی۔ شام کا وقت ہونے کی وجہ سے ملازمین چھٹی کرکے جا چکے تھے اور عمارت کی پارکنگ خالی تھی۔ سوٹ پوش اسے عمارت کے اندر ایک کمرے میں لایا۔ وہاں بٹھا کر خود چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک ملازم آیا اور ٹرے سے تین عدد جام رکھ کر چلا گیا۔ تینوں میں بے رنگ سیال تھا۔ کچھ دیر بعد دروازہ پھر کھلا اور ایک شخص اندر آیا۔ اسے دیکھ کر وہ بے ساختہ کھڑا ہوگیا۔ ”تم...؟“

”صغیر احمد۔“ آنے والا ولی خان تھا۔ ”کیسے ہو؟“

”جو شخص دس سال سے جیل میں سڑ رہا ہو وہ کیسا ہو سکتا ہے؟“ اس نے تلخی سے کہا۔ ”میں نے تمہیں کتنی بار پیغام بھیجا مگر تم نے جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔ اب کیسے خیال آگیا تمہیں؟“

”تمہیں غلط سزا نہیں ہوئی تھی۔“ ولی خان آگے آیا۔ اس کے ساتھ وہی سوٹ پوش تھا۔ وہ میز پر صغیر احمد کے ساتھ آبیٹھے۔ ”سنار کے زخمی ملازم نے تمہیں شناخت کیا تھا۔ تم ہی نے اس پر گولی چلائی تھی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں نے یہ قتل کیا اور مجھے سزا بھی ہو گئی۔“ صغیر احمد بولا۔ ”تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟“

آنے والے نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”تمہارا مجھ سے تعلق ہے اور پچھلے دنوں میں تمہارے کیس کی فائل دیکھ رہا تھا تو مجھے اس میں ایک نئی چیز نظر آئی۔“

”کیسی چیز؟“

”اس واردات میں سنار کی دکان سے ایک بریف کیس بھی لوٹا گیا تھا جس میں بیس کلوگرام سونا تھا۔ اس کی موجودہ مالیت تقریباً دس کروڑ روپے سے اوپر ہے۔“

”میں نے ایسا کوئی بریف کیس نہیں دیکھا تھا۔“ صغیر احمد نے جلدی سے کہا۔

”مجھ سے جھوٹ مت بولو...“ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”کیونکہ میں واحد شخص ہوں جو تمہیں جیل سے نکال سکتا ہے اور تمہاری باقی ماندہ سزا معاف کرا سکتا ہے۔“ وہ کہتے ہوئے ذرا آگے جھکا۔ ”دوسرے تم بھول رہے ہو کہ تمہاری ایک بیٹی بھی ہے جو میرے پاس ہے۔“

صغیر احمد کا چہرہ ست گیا۔

☆☆☆

شہنا کو یقین نہیں آرہا تھا کہ ولی خان اس فطرت کا آدمی ہوسکتا ہے۔ جس لڑکی نے اس کے گھر میں پرورش پائی اور جو عمر میں اس کی بیٹی جیسی تھی، وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے رافیہ سے کہا۔ ”کیا انہیں شرم نہیں آئی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”ان کا کہنا ہے کہ اس میں کوئی شرعی یا اخلاقی قباحت نہیں ہے۔ میری ان سے شادی ہوسکتی ہے۔“

”ٹھیک ہے پر انہوں نے تمہیں بیٹی کی طرح پالا ہے۔“

”ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے مجھے کبھی بیٹی کی نظر سے نہیں دیکھا۔“

”اس طرح تو میرا بھی ان سے ایسا رشتہ نہیں تھا۔“ شہنا کو غصہ آرہا تھا۔ ”میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس قدر تعلیم یافتہ اور مہذب نظر آنے والا شخص اندر سے ایسا نکلے گا۔“

”سوچا تو میں نے بھی نہیں تھا... لیکن میں ان کے سہارے پر ہوں... میرا اور کوئی نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں ہے تمہارا... کیا میں نہیں ہوں؟“ شہنا نے کہا۔ ”اب تم میرے پاس رہوگی، واپس نہیں جاؤ گی۔“

”نہیں، وہ مجھے زبردستی لے جاسکتے ہیں۔“ رافیہ سہم گئی۔

”کسی کی ہمت نہیں ہے اس فارم سے کسی کو زبردستی لے جائے۔“

”تم بھول رہی ہو کہ وہ ایک طاقتور سرکاری افسر ہے۔“

”ہوں گے... لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی زندگی پر قابض ہوجائیں۔“

”تم کیا کروگی؟“ رافیہ نے پوچھا۔

”میں کل ہی ان کو کال کرکے کہتی ہوں کہ میں نے تمہیں اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ مجھے ایک دوست کی ضرورت ہے جو ہمہ وقت میرے ساتھ رہے۔ وہ ڈرائیور سے تمہارا سامان بھجوادیں۔“

”اور اگر انہوں نے ڈرائیور بھیج دیا۔“

”رافی... ہمت کرو، تم انکار کردینا۔ کوئی تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کرسکتا۔ اگر کسی نے کی تو میرے ملازم ہیں، وہ اسے دیکھ لیں گے۔“

رافیہ ڈر رہی تھی اور شہنا اسے تسلی دے رہی تھی۔ بالآخر رافیہ ہمت کرنے پر آمادہ ہوگئی۔ پھر اس نے عجیب سی بات کی۔ ”شہنا! مجھے شک ہے رشنا آنٹی کی موت طبعی نہیں تھی۔“

شہنا چونک گئی۔ ”کیا... کیا کہا تم نے؟“

”تم نے سوچا نہیں کہ وہ چند مہینے پہلے بالکل ٹھیک اور صحت مند تھیں اور اچانک ہی بیمار ہوگئیں... پھر بیماری بھی ایسی کہ ڈاکٹرز کی سمجھ میں نہیں آئی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے رخصت ہوگئیں۔“

”میں نے ایسا نہیں سوچا۔“

”ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ ان کے جگر میں مسئلہ تھا اور تم جانتی ہو کسی قسم کا زہر جگر پر اثر کرتا ہے... خاص طور سے سلو پوائزن۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ ولی خان...“

”جو شخص اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی پر نظر رکھ سکتا ہو، وہ سب کرسکتا ہے۔“ رافیہ نے تلخی سے کہا۔ ”تم نے تو اس پر بھی نہیں سوچا تھا لیکن میں آنٹی اور تمہارے بعد اس کے ساتھ رہی ہوں۔ میں اب اس کی اصلیت اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ میں بتا نہیں سکتی کہ اس شخص سے اپنی عزت کیسے بچائی ہے میں نے۔“

شہنا کے لیے یہ تمام انکشافات حیرت انگیز تھے۔ اس رات وہ دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ رافیہ اس کے خاندان کے بارے میں سب جانتی تھی۔ شہنا نے اسے بتایا کہ کس طرح اس کے کزن سرمد نے اسے پہاڑی سے گرنے سے بچایا تھا۔ رافیہ نے اس سے کہا۔ ”تمہیں بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔ جو تمہارے بابا کے ساتھ ہوا، وہ تمہارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔“

شہنا خاموش رہی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”سچی بات ہے مجھے آج تک یقین نہیں آیا ہے کہ سعود تایا ایسی حرکت کرسکتے ہیں۔“

”تب وہ غائب کیوں ہیں... پولیس کا سامنا کیوں نہیں کرتے؟“ رافیہ کے اس سوال کا شہنا کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ رات دیر سے سوئی تھیں اس لیے صبح دیر سے اٹھی تھیں۔ شریف گل چیک جمع کرا کے آگیا تھا۔ اس نے سلپس شہنا کو بھجوائی تھیں۔ ڈیلر تاخیر سے ادائیگی پر مان گیا تھا اس لیے وہ گاڑی بھی لے آیا تھا۔ اس نے پچاس ہزار بیعانہ دے دیا تھا۔ انہوں نے ناشتا کیا اور پھر شریف کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ ایک جگہ جہاں سگنل موجود تھے، وہاں انہوں نے گاڑی رکوائی اور شہنا نے شریف سے کہا۔

”شریف! ہمیں اکیلے میں بات کرنی ہے۔“

”ٹھیک ہے بی بی، میں باہر موجود ہوں۔“ شریف نے کہا اور گاڑی سے اتر گیا۔ شہنا نے بول کر ولی خان کا نمبر ملایا۔

”شہنا بیٹی کیسی ہو؟“ ولی خان کی شفقت آمیز آواز آئی۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ شہنا نے بہ مشکل خود پر قابو پایا ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا بول دے کہ وہ اسے بیٹی نہ کہے۔

”رافیہ کیسی ہے، وہ واپس آنا چاہتی ہے؟“

”نہیں، اس کے برعکس اب وہ ہمیشہ میرے پاس رہے گی۔ میں نے اس لیے کال کی ہے کہ آپ اس کا سامان بھجوادیں۔“

”ہمیشہ کے لیے مگر اس کا تو...“

”پلیز... میں نے کہا نا، وہ میرے ساتھ رہے گی۔ اب آپ جو چاہے کریں۔“ شہنا نے کہتے ہوئے کال کاٹ

مردُود

کلینک میں مریض آیا جس کے دونوں کان بُری طرح جھلسے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر نے اس کا داہنا کان دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کیسے ہوا؟“

”میں فون کے قریب استری کر رہا تھا۔ فون کی گھنٹی بجی تو میں نے ریسیور کے بجائے گرم استری کان سے لگالی۔“

”اور دوسرا کان؟“ ڈاکٹر نے سوال کیا۔ ”وہ کیسے جلا؟“

”اسی مردود نے دوبارہ فون کیا تھا اور استری میرے دوسرے ہاتھ میں تھی۔“

رحیم یار خان سے سلیم کی بے بسی

دی۔ رافیہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا کہا انہوں نے؟"

"میں نے سنا ہی نہیں... بس بتا دیا اب ان کی ذمے داری ختم... یہ بتاؤ تمہاری کوئی اہم چیز تو وہاں نہیں ہے؟"

"نہیں... بس کپڑے اور معمول کی چیزیں ہیں۔"

"بس تو چھوڑو کوئی ضرورت نہیں ہے ان چیزوں کی۔" شہنا نے کہا۔ اسی لمحے موبائل کی بیل بجی۔ رنگ ٹون کے درمیان بلند آواز سے کال کرنے والے کا نام بھی آ رہا تھا۔ مشینی آواز کہہ رہی تھی۔ "ولی خان کالنگ۔"

شہنا نے کال کاٹ دی۔ پھر اس نے شریف کو بلایا اور اسے کپڑا مارکیٹ چلنے کو کہا۔ رافیہ کے منع کرنے کے باوجود اس نے اس کے لیے کپڑے لیے اور انہیں سلنے کے لیے دے دیا۔ موسم کے لحاظ سے سویٹر، جیکٹ، اونی ٹوپیاں، دستانے اور جوتے بھی لیے تھے۔ رافیہ نے واپس آ کر اس سے کہا۔ "تم بہت کر رہی ہو۔ میرا اتنا حق نہیں ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" شہنا نے کہا۔ "کیا ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ نہیں ہے؟ پھر ہم دس سال ایک ساتھ رہے اور تم نے میرے لیے کتنا کیا۔ ایک ایک موقع پر میرا خیال رکھا تو کیا میں کہوں کہ میرا تم پر حق نہیں ہے۔"

"وہ الگ بات ہے لیکن اس طرح مجھے ڈیپنڈ ہونا پسند نہیں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے، تم اسے پسند نہیں کرو گی اس لیے میرے ذہن میں ایک خیال آ رہا ہے۔"

"کیسا خیال؟"

"دیکھو، میں دیکھ نہیں سکتی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے مجھے اچھے لوگ ملے ہیں مگر وہ ملازم ہیں۔ مجھ سے ایک حد سے زیادہ بے تکلف نہیں ہو سکتے۔ مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے جو میرے مزاج کا ہو اور میں اس سے ہر بات کر سکوں۔ پھر مجھے بہت سے معاملات میں مددگار کی ضرورت ہے۔ یوں سمجھ لو کہ مجھے ایک سیکریٹری کی ضرورت ہے۔"

خلافِ توقع رافیہ فوراً مان گئی۔ اس نے خوش ہو کر کہا۔ "یہ تو اچھا سوچا تم نے... مجھے جاب کی ضرورت ہے۔ میں تمہارے پاس کام کروں گی تو تم پر بوجھ بھی نہیں ہوں گی۔"

"بس تو آج سے تم میری سیکریٹری ہو۔ تم میرے ساتھ رہو گی۔ ہر چیز میری ذمے داری ہو گی۔ تنخواہ تم جو چاہے مقرر کر لو۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے؟ جب ہر چیز کا ذمہ تم لے رہی ہو۔"

اگلے دن شہنا نے شریف گل اور ریحانہ کو بتایا کہ اس نے رافیہ کو بہ طور سیکریٹری رکھ لیا ہے۔ وہ دونوں خوش ہو گئے۔ شریف گل نے کہا۔ "یہ تو اچھی بات ہے بی بی، میرا بہت سا کام آسان ہو جائے گا۔"

رافیہ کے لیے برابر والا بیڈ روم سیٹ کر دیا گیا۔ داؤد کی اسٹڈی کو اس نے دفتر بنا لیا تھا اور وہاں کام کرتی تھی۔ اگرچہ کام زیادہ نہیں تھا۔ زمینوں اور فصل سے متعلق ریکارڈ تھا جو چند فائلوں میں آ گیا تھا۔ اسی طرح خرچ اور آمدنی کا ریکارڈ تھا۔ روزمرہ کے امور تھے جن کو درج کیا جاتا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ دونوں ساتھ ہوتی تھیں۔ لنچ کے بعد رافیہ دفتر میں اپنا کام نمٹاتی تھی اور پھر اس کی چھٹی ہو جاتی۔ اس کے بعد کا وقت وہ اپنی مرضی سے گزارتی تھی۔ مگر عملاً وہ رات سونے تک شہنا کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ شہنا بہت خوش تھی۔ ابتدائی چند دن اسے دھڑکا لگا رہا کہ کہیں ولی خان نہ آ جائے اور وہ رافیہ کو زبردستی لے جانے پر نہ تل جائے۔ رافیہ اگرچہ بالغ تھی مگر اس کی تحویل میں تھی۔ قانونی لحاظ سے وہ اس کا گارجین تھا اور وہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتی تھی۔ شہنا نے سوچ لیا تھا کہ اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو وہ اپنے وکیل سے بات کرے گی۔ زمینوں سے متعلق معاملات کے لیے برسوں سے ایک وکیل مقرر تھا۔ اگرچہ اسے شاذ ہی دو تین برس بعد کوئی زحمت دی جاتی تھی۔

مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ چند دن بعد ولی خان کا ڈرائیور رافیہ کا سامان دے گیا۔ ساتھ ہی اس نے رافیہ کو ایک لفافہ بھی دیا جو ولی خان نے اسے بھیجا تھا۔ مگر رافیہ نے شہنا کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ حالانکہ لفافہ شہنا کی موجودگی میں دیا گیا تھا۔ اسے مناسب نہیں لگا کہ وہ خود سے رافیہ سے اس بارے میں پوچھے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بتا دے گی مگر اس نے لفافے پر چپ سادھ لی تھی۔ سردی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا اور باغات سے تمام پھل اتر گیا تھا۔ اب معمول کی دیکھ بھال رہ گئی تھی۔ اس لیے شریف گل نے ٹرک بار برداری پر لگا دیا۔ زمین کا ایک ملازم عدنان ٹرک چلاتا تھا۔ وہ شریف کا کزن تھا۔ ٹرک اب ہری پور کے ایک ٹرک اسٹینڈ پر ہوتا تھا۔ شریف ہر دوسرے تیسرے دن چکر لگاتا اور عدنان سے حساب کر لیتا تھا۔ خرچ کی رقم اسے دے کر باقی بینک میں جمع کرا دیتا۔

تمام ملازمین کو بہ شمول شریف اور ریحانہ، مہینے کے مہینے تنخواہ دی جاتی تھی۔ شریف گل کیونکہ نگراں اور ذمے دار تھا اس لیے اس کی تنخواہ زیادہ تھی۔ اب تک تنخواہ رشا مقرر کرتی رہی تھی۔ جب سب کچھ شہنا کے ہاتھ میں آیا تو اس نے شریف گل کی تنخواہ میں پچاس فیصد اضافہ کیا۔ اسی تناسب سے باقی ملازمین کی تنخواہیں بھی بڑھائیں۔ اسے جان کر حیرت ہوئی کہ ریحانہ کی کوئی تنخواہ نہیں تھی، وہ ایسے ہی کام کر رہی تھی۔ شہنا نے اس کی بھی تنخواہ مقرر کی اور اسے پچھلے واجبات بھی ادا کیے۔ دونوں میاں بیوی اور باقی ملازمین بہت خوش تھے۔ فصل کی رقم آئی تو شہنا نے گاڑی کی مکمل ادائیگی کر کے اسے اپنے نام کرا لیا۔ جیپ اس نے شریف گل کے سپرد کر دی تھی۔ اس روز شریف صبح سے نکلا ہوا تھا۔ اسے سامان بھی لانا تھا اس لیے وہ اب شام یا رات تک آتا۔

وسط نومبر کی اس صبح کچھ دیر کے لیے سورج نکلا اور پھر بادل گھر کر آئے اور بارش شروع ہو گئی۔ شہنا ناشتے کے بعد کمرے میں تھی اور ایک آڈیو ناول سن رہی تھی۔ وہ سنگل ائرفون استعمال کرتی تھی تاکہ کوئی دوسرا اسے پکارے تو اسے آواز آ جائے۔ رافیہ اپنے کمرے میں تھی۔ ایک گھنٹے بعد اسے خیال آیا اور اس نے ریحانہ کو آواز دی۔ وہ صفائی کر رہی تھی۔ اس کی آواز پر وہ آئی۔ ”جی بی بی؟“

”رافیہ کہاں ہے؟“

”بی بی، وہ کچھ دیر پہلے باہر گئی تھیں، ابھی تک نہیں آئی ہیں۔“

شہنا حیران ہوئی۔ ”اس موسم میں؟“

”ہاں بی بی لیکن وہ پوری طرح تیار ہو کر گئی ہیں۔ چھتری بھی لی ہے۔“

رافیہ ایک گھنٹے بعد واپس آئی۔ اس نے خود شہنا کو بتایا۔ ”میرا دل چاہ رہا تھا بارش میں باہر گھوموں۔“

”مگر موسم بہت سرد ہے خدانخواستہ بیمار پڑ جاؤ گی۔“

”کچھ نہیں ہوتا۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”ویسے بھی میں پوری طرح پہن کر اور چھتری لے کر گئی تھی۔ سچ میں بہت مزہ آیا۔“

”تم کہاں گئی تھیں؟“

”اوپر باغ کے ساتھ جو جنگل ہے میں وہاں گئی تھی۔“ رافیہ نے کہا۔ ”مائی گاڈ... وہاں سے چاروں طرف کا منظر کیا خوب صورت نظر آتا ہے۔“

شہنا کو عجیب سا لگا۔ یہ جنگل اس کا تھا۔ اس کی یادوں کا ایک حصہ تھا اور سچ مچ بھی مشترکہ طور پر اس کی ملکیت تھا۔ اسے لگا جیسے رافیہ نے وہاں جا کر اس کی پرائیویسی میں دخل دیا ہو۔ مگر اس نے فوراً اس سوچ کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اس نے خود سے کہا۔ ”کیا ہوا جو رافیہ وہاں چلی گئی۔“

رافیہ نے بھانپ لیا تھا۔ ”تمہیں اچھا نہیں لگا؟“

”یہ بات نہیں ہے... جنگل کا عقبی ڈھلان والا کنارہ ٹوٹ گیا ہے اور وہ پہلے کی طرح محفوظ نہیں ہے۔ بابا نے مجھے بچانے کے لیے وہاں رسی کے ساتھ گھنٹیاں باندھی تھیں۔“

”وہاں اب ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔“

شہنا نے گہری سانس لی۔ ”ہاں، دس برس کا عرصہ بہت طویل ہوتا ہے۔“

”میں سوچ رہی ہوں اب میں وہاں رسی باندھوں گی۔“ رافیہ نے کہا۔ ”تاکہ تم پہلے کی طرح بلا خوف و خطر وہاں گھوم سکو۔“

”ابھی تو نہیں، موسم ٹھیک ہو جائے اس کے بعد دیکھیں گے۔“ شہنا نے ٹال دیا۔ ”اب تم بتا کر جانا، میں پریشان ہو گئی تھی۔“

”یہاں خطرہ ہے؟“

”کیا کہا جا سکتا ہے۔ میرے بابا یہیں پلے بڑھے تھے اور وہ اچانک موت کا شکار ہوئے۔ ویران جگہوں پر آدمی کو ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیے۔“

رافیہ نے موضوع بدل دیا۔ ”میں دیکھ رہی ہوں یہاں کئی ہتھیار ہیں۔ تمہارے بابا کو شوق تھا؟“

”ہاں، انہوں نے مجھے بھی شوٹنگ سکھائی تھی۔ مجھے آواز پر نشانہ لگانا سکھایا تھا۔“

رافیہ حیران ہوئی۔ ”سچ مچ؟“

”ہاں وہ چھوٹے گلک استعمال کرتے تھے۔ ان میں کنکر بھر کر کہیں لٹکا دیتے تھے اور پھر ایک ڈوری سے ان کو ہلاتے تھے۔ کنکر بجتے تو میں ان کی آواز پر نشانہ لگاتی تھی۔ آخر دنوں میں میرا نشانہ بہت اچھا ہو گیا تھا۔“

”موسم اچھا ہو تو ہم اس کی پریکٹس... بھی کریں گے۔“

اگلے دن شریف گل پھر کام سے نکلا۔ وہ برف باری کے آغاز سے پہلے کچھ سامان جمع کر لینا چاہتا تھا۔ شہنا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، رات ہلکا بخار ہو رہا تھا اور وہ صبح بستر پر اونگھ رہی تھی جب رافیہ آئی۔ ”میں ذرا باہر جا رہی ہوں۔ تم اٹھیں نہیں؟“

”میری طبیعت سست ہے۔“ شہنا نے رضائی لپیٹ کر کہا۔ ”میں کچھ دیر سے اٹھوں گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ رافیہ بولی۔ ”میں جا رہی ہوں، ایک گھنٹے میں آ جاؤں گی۔“

”زیادہ دور مت جانا۔“ شہنا نے کہا۔

رافیہ باہر آئی، ابھی برف باری شروع نہیں ہوئی تھی لیکن درجۂ حرارت رات کو صفر سے نیچے چلا جاتا تھا۔ اس نے ویلوٹ کی اسکن ٹائٹ شرٹ کے ساتھ اونی ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ اوپر فر والی جیکٹ اور پیروں میں گرم لانگ بوٹ تھے۔ ہاتھوں میں دستانے اور سر پر اونی ٹوپی تھی۔ اس کے باوجود وہ باہر نکلی تو ایک لمحے کو لرز اٹھی۔ پھر وہ مکان کے عقبی دروازے سے نکل کر تیز قدموں سے اوپر جانے لگی۔ اس کی نظریں آس پاس بھٹک رہی تھیں۔ باغ ویران تھا۔ اکثر درختوں سے پتے جھڑ گئے تھے اور زمین پر ان کا ڈھیر تھا۔ شریف گل ہر دوسرے تیسرے دن گوڈی کرا کے ان پتوں کو زمین میں دبوا دیتا تھا۔ آنے والی بہار تک یہ گل سڑ کر زمین کے لیے بہترین کھاد بن جاتے تھے۔ مگر جتنے پتے دبائے جاتے، درختوں سے اس سے زیادہ ہی جھڑتے تھے۔ تیز سرد ہوا پتوں کو اڑا رہی تھی۔

رافیہ جنگل میں داخل ہوئی تو اس نے ایک بار پھر پلٹ کر آس پاس دیکھا۔ کسی کو نہ پا کر وہ آگے بڑھی۔ اس کا رخ بڑے تنے والے درخت کی طرف تھا۔ درخت کے پاس پہنچ کر اس نے پھر آس پاس دیکھا اور وہیں کھڑی ہو گئی۔ اس کا رخ دوسری ڈھلان کی طرف تھا۔ اچانک عقب میں اسے آہٹ سنائی دی اور وہ تیزی سے گھومی۔ سامنے ایک نوجوان آدمی کھڑا تھا۔ اچھا خوش شکل نوجوان تھا۔ مناسب ناک نقشہ اور ستواں ناک تلے ہلکی سی مونچھیں اسے اور جاذبِ نظر بنا رہی تھیں۔ رافیہ نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

”یہ سوال میں تم سے کر سکتا ہوں۔“ نوجوان نے کہا۔

”میں رافیہ ہوں۔ شہنا داؤد کے ساتھ رہتی ہوں، اس کی سیکریٹری ہوں۔“ رافیہ نے باقاعدہ تعارف کرا دیا۔ نوجوان کے لہجے سے اس نے جان لیا تھا کہ وہ پڑھا لکھا ہے۔

”میں جانتا ہوں۔“ نوجوان نے کسی قدر درشت لہجے میں کہا۔ ”میں پوچھ رہا ہوں تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”کچھ نہیں، ایسے ہی گھومنے آئی تھی۔“

”تم کل بھی یہاں آئی تھیں جب بہت تیز بارش ہو رہی تھی۔“

”کیا یہاں آنا منع ہے... یہ جنگل شہنا داؤد کی ملکیت ہے۔“ رافیہ نے تیز لہجے میں کہا۔

”اس کی اور میری مشترک ملکیت ہے۔“ نوجوان نے کہا۔ ”یہاں اکیلی لڑکی کا گھومنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ بہتر ہو گا آئندہ یہاں آنے سے گریز کرنا۔“

”اوہ... تو تم سرمد ہو۔“ رافیہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”مسعود خان کے بیٹے جس نے...“

”فضول باتیں مت کرو اور یہاں سے جاؤ۔“ سرمد کا لہجہ مزید درشت ہو گیا۔ ”یہ جنگل بعض اوقات خطرناک ہو جاتا ہے۔“

سرمد نے کہا اور پلٹ کر چلا گیا۔ رافیہ اسے گھورتی رہی پھر خود بھی وہاں سے چل پڑی۔ سرمد نے اپنے باغات کا رخ کیا تھا۔ وہ دوسری طرف شہنا کی ملکیت والے باغات میں داخل ہوئی اور مکان کی طرف چل پڑی۔ اسے علم نہیں تھا کہ اوپر جنگل سے دو آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

دن میں شہنا کا بخار تیز ہو گیا تھا مگر شام تک اس کی حالت بہتر ہو گئی۔ رافیہ اصرار کر رہی تھی کہ وہ ڈاکٹر کے پاس چلے مگر شہنا نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا۔ ”مجھے اس موسم میں کبھی کبھی بخار ہو جاتا ہے۔“

وہاں تمام ضروری ادویات تھیں۔ شہنا انہیں استعمال کر رہی تھی۔ پھر ریحانہ نے اس کے لیے سوپ بنایا اور اس میں کچھ مقامی جڑی بوٹیاں بھی شامل کیں۔ ان سے بھی اچھا اثر ہوا۔ شام تک بخار تقریباً اتر گیا۔ ریحانہ نے آدمی بھیج کر شریف کو بلا لیا تھا کہ اگر ایمرجنسی میں شہنا کو اسپتال یا ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہو تو وہ موجود ہو۔ رافیہ نے کہا۔ ”آج رات میں تمہارے ساتھ سوؤں گی۔ میں یہاں قالین پر لیٹ جاؤں گی۔“

”نہیں، میں ٹھیک ہوں اور سردی بہت ہے۔ تم نیچے لیٹو گی تو تم بیمار ہو جاؤ گی۔“

”بی بی، میں رک جاتی ہوں۔“ ریحانہ نے پیشکش کی۔ ”میں بستر لے آؤں گی، نیچے بچھا کر لیٹ جاؤں گی۔“

شہنا نے بہ مشکل ان دونوں کو یقین دلایا کہ وہ اب ٹھیک ہے، رات کو آرام سے رہے گی۔ اگر اس کی طبیعت کو کچھ ہوا بھی تو رافیہ کو آواز دے لے گی۔ سردی کی وجہ سے وہ رات کا کھانا سات بجے ہی کھا لیتے تھے۔ پھر ریحانہ چلی

جاتی تھی۔ کچن کے دروازے کی چابی اس کے پاس ہوتی تھی اور وہ صبح اسی چابی سے اندر آتی تھی۔ دروازہ ٹھوس لکڑی کا تھا اور اس پر بہت مضبوط لاک لگا ہوا تھا۔ دوسرا داخلی دروازہ جو لاؤنج میں کھلتا تھا، وہ بھی اسی قسم کا تھا جبکہ داؤد کی اسٹڈی کا باہر کھلنے والا دروازہ لوہے کا تھا اور اسے اندر سے بند کیا جا سکتا تھا۔ تمام کھڑکیوں پر خوب صورت ڈیزائن کی لیکن مضبوط فولادی گرل تھی۔ گویا کسی کے لیے مکان میں گھسنا آسان کام نہیں تھا۔ اس لیے ریحانہ اور شریف گل مطمئن تھے۔ شروع میں ریحانہ فکرمند رہی تھی کہ شہنا کو اکیلے رہنا پڑے گا لیکن اس نے اسے اطمینان دلایا کہ وہ رات کو آرام سے اکیلے بھی رہ سکتی ہے۔ شام کو ایک بار پھر بادل آگئے اور بارش شروع ہوگئی۔ ریحانہ نے جانے سے پہلے آتش دان میں تازہ کوئلے ڈال دیے تھے وہ شہنا اور رافیہ کے لیے کافی لے آئی تھی۔ ریحانہ کے جانے کے بعد رافیہ نے شہنا کو صبح والا قصہ سنایا۔ ''تمہارے کزن کا رویہ عجیب سا تھا جیسے اسے میرا وہاں آنا ناگوار گزرا ہو۔''

''ہوسکتا ہے... ویسے بھی وہ کچھ اکھڑ مزاج کا آدمی ہے۔''

''اس نے مجھے کچھ دھمکی بھی دی تھی کہ یہ جنگل بعض اوقات خطرناک بھی ہوجاتا ہے۔''

''یہ تو ہے۔'' شہنا نے سرد آہ بھری۔ ''بابا اسی جنگل میں قتل ہوئے تھے۔''

''تم غور نہیں کررہی ہو۔'' رافیہ نے کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے وہ کسی کا وہاں آنا پسند نہیں کرتا۔ آخر ایسی کیا بات ہے وہاں؟''

شہنا کو یاد آیا جب سرمد نے اسے پہاڑی سے گرنے سے بچایا تھا، تب بھی اس نے کچھ ایسا ہی رویہ اختیار کیا تھا جیسے اسے اس کا وہاں آنا پسند نہ ہو اور وہ چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ وہاں نہ جائے۔ اس نے سر ہلایا۔ ''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔''

''ممکن ہے وہاں سے تمہارے تایا چھپ کر اپنے گھر جاتے ہوں۔''

''وہاں سے۔'' شہنا چونک گئی۔ ''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''تم بھول رہی ہو اس پہاڑی کے پیچھے سے سڑک گزرتی ہے۔''

''ہاں، میں جانتی ہوں لیکن اس طرف کوئی آبادی نہیں ہے۔ یہ سڑک دریا پار کی طرف جاتی ہے۔ کوئی بھی یا تو ہری پور سے آئے گا یا دریا پار سے آئے گا۔''

''یہ سارا علاقہ بہت ویران ہے، کوئی بھی کہیں چھپ سکتا ہے۔'' رافیہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''فرض کرو تمہارے تایا نے یہیں کہیں کوئی خفیہ ٹھکانا بنا رکھا ہو اور وہیں چھپے ہوتے ہوں۔ جب دل چاہتا ہو گھر والوں سے ملنے اور کھانے پینے کا سامان لینے آتے ہوں۔''

شہنا نے یہ سب نہیں سوچا تھا۔ اب رافیہ نے کہا تو اسے خیال آیا کہ واقعی ایسا ہوسکتا ہے۔ اس علاقے میں بس یہی ایک سڑک تھی اور اس پر سفر کرنے والا سب کی نظر میں آجاتا۔ بار بار آنا جانا ممکن نہیں تھا۔ ہاں اگر تایا سعود یہاں چھپے ہوئے تھے تو بہت جگہ تھی اور ان کے لیے اپنے گھر آنا جانا بھی آسان تھا۔ مگر وہ اس طرح کیسے رہ رہے ہوں گے؟ یہ علاقہ رہائش کے اعتبار سے آسان نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کوئی بڑی آبادی نہیں تھی۔ کہیں کہیں سو پچاس گھروں کی بستیاں تھیں۔ راستے ناپید تھے۔ زمین اچھی نہیں تھی۔ جنگل میں رہنا تو اور بھی مشکل تھا۔ شہنا سوچ رہی تھی اگر تایا سعود کسی جنگل میں چھپے تھے تو یہ بھی کتنی اذیت ناک زندگی ہوگی۔ انہیں سردی اور بارش برداشت کرنی پڑتی ہوگی۔ کھانا اور پانی لانا پڑتا ہوگا۔ سب سے بڑھ کر اپنا بڑا سا آرام دہ گھر ہوتے ہوئے وہ بے گھر تھے۔ بیوی اور بیٹے سے دور تھے۔ شہنا نے گہری سانس لی۔

''کیا فائدہ ایسی زندگی کا... اس سے تو بہتر تھا وہ خود کو پولیس کے حوالے کردیتے۔ ممکن ہے انہیں شک کا فائدہ مل جاتا یا معمولی سزا ہوتی تو اب تک وہ واپس اپنے گھر میں آباد ہوتے۔''

''واقعی کسی نے ان کو اپنے بھائی پر گولی چلاتے نہیں دیکھا۔'' رافیہ بولی۔ ''پتا نہیں پولیس نے کیسے کیس بنایا ہوگا۔''

''پولیس نے کچھ نہیں کیا۔'' شہنا تلخی سے بولی۔ ''کچھ عرصے بعد اس نے کیس ہی بند کردیا تھا۔''

''تب بھی تمہارے تایا واپس نہیں آئے۔'' رافیہ نے حیرت سے کہا۔ ''اب تو ان کو اتنا خطرہ نہیں رہا ہوگا، وہ کوئی بھی وضاحت دے سکتے تھے پولیس کو۔''

''مجھے یا کسی اور کو اس بارے میں کچھ نہیں پتا۔'' شہنا نے کہا۔ ''تائی اور سرمد نے ہم سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھا۔''

''کیونکہ سب یہی سمجھتے ہیں کہ داؤد انکل کو ان کے بھائی نے قتل کیا۔ مجھے یاد ہے رشنا آنٹی ناپسندیدگی سے ان کا ذکر کرتی تھیں۔''

''کچھ بھی سہی۔'' شہنا نے گہری سانس لی۔ ''وہ ہیں

تو میرے تایا اور ان کے بیوی بچے بھی ہمارے رشتے دار ہیں۔ کاش کہ یہ سب نہ ہوا ہوتا۔''

رافیہ اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی مگر اس نے پھر کچھ کہا نہیں۔ رات گہری ہورہی تھی اور باہر بارش تواتر سے جاری تھی۔ رافیہ کھڑی ہوگئی۔ ''اب تم سو جاؤ میں بھی جاتی ہوں۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو پلیز مجھے فوراً آواز دے دینا۔''

''تم فکر مت کرو۔'' شہنا نے سینے تک رضائی کھینچ لی۔ ''ویسے میں تقریباً ٹھیک ہوگئی ہوں۔''

رافیہ نے اسے گڈ نائٹ کہا اور کمرے کی لائٹ آف کرکے چلی گئی۔

☆☆☆

صغیر احمد اور اس کے ساتھ وہ دونوں افراد ایک کار میں اسلام آباد سے تربیلا کی طرف جارہے تھے جو اسے جیل سے نکال کر لایا تھا۔ وہ ایک سرکاری افسر ہی تھا۔ اس کا نام خالد حیات تھا مگر اسے جیل سے نکلوانے والا ولی خان ہی تھا۔ وہ جیلوں کے شعبے میں ایک اہم پوسٹ پر تھا اسی لیے اس نے آسانی سے اسے جیل سے نکلوالیا تھا۔ پہلے اس نے سونے کی موجودگی سے انکار کیا مگر جب ولی خان نے صغیر کی بیٹی کا حوالہ دیا تو اس کے پاس کوئی چارہ نہیں رہا۔ مجبوراً اس نے اقرار کیا کہ وہ جانتا ہے کہ سونا کہاں چھپا ہوا ہے۔ مگر اس نے کہا کہ وہ براہِ راست نہیں جانتا بلکہ اس کے ساتھیوں نے جس جنگل میں سونا چھپایا تھا، وہ اس سے واقف ہے۔ ظاہر ہے ان دونوں نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں مسلح تھے اور خالد نے اسے خبردار کیا تھا کہ وہ کوئی غلط حرکت نہ کرے ورنہ اپنی موت کا ذمے دار خود ہوگا۔ کئی دن انہوں نے اسے ایک سرکاری ریسٹ ہاؤس میں رکھا اور اب وہ اسے لے کر تربیلا کی طرف جارہے تھے۔ گاڑی میں وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ خالد ڈرائیونگ کررہا تھا اور ولی خان پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے سگار پی رہا تھا۔ صغیر احمد نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''میری بیٹی کہاں ہے؟''

''وہ محفوظ ہے۔'' اس کی جگہ خالد نے جواب دیا۔ ''جب تک تم ہمارے ساتھ تعاون کررہے ہو۔''

''سونا حاصل کرنے کے بعد تم میرے ساتھ کیا کرو گے؟''

''تم واپس جیل جاؤ گے اور کچھ عرصے بعد تمہاری باقی سزا معاف ہوجائے گی۔'' اس بار ولی خان نے کہا۔

''واپس جیل جاؤں گا یا کسی نامعلوم قبر میں...'' صغیر نے تلخی سے کہا۔ ''کیا تم لوگ مجھے چھوڑ دو گے؟''

وہ دونوں چپ رہے تو صغیر احمد کو امانت اور جہانگیر کا خیال آیا جو اسی علاقے میں ایک نامعلوم قبر میں پڑے تھے۔ سونا چھپا کر وہ واپس جارہا تھا کہ بدقسمتی سے گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا اور وہ شدید زخمی ہوا تھا۔ زندگی تھی اس لیے بچ گیا مگر پولیس نے گرفتار کرلیا۔ اسے حیرت ہوئی جب اس پر صرف زیورات اور رقم کی ڈکیتی کا مقدمہ بنا اور یہ دونوں چیزیں حادثے کے بعد پولیس کو مل گئیں۔ وہی اس کے خلاف ثبوت کے طور پر پیش کی گئیں اور سنار کے بچ جانے والے ملازم نے اسے شناخت کیا۔ اسے سزائے موت اور دو بار عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ بعد میں موت کی سزا اپیل پر معاف کردی گئی مگر وہ دو بار عمر قید کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ سات سال میں پہلی عمر قید ختم ہوگئی تو دوسری عمر قید کا آغاز ہوا اور اب وہ پورے چودہ سال بعد جیل سے رہا ہوتا۔ اسے دو لاکھ روپے کا جرمانہ ہوا تھا اور عدم ادائیگی پر مزید دو سال کی سزا ہوئی تھی مگر اس کے اچھے چال چلن کی وجہ سے یہ دو سال معاف ہوگئے تھے۔

صغیر کی ایک ہی بیٹی رافیہ تھی اس کے جیل جانے کے بعد اسے ولی خان کی تحویل میں دے دیا گیا تھا کیونکہ اس نے شروع میں پولیس کو اپنے بارے میں نہیں بتایا تھا اور نہ ہی اس کا کوئی سابق ریکارڈ تھا اس لیے اس کے خاندان والوں کو پتا نہیں چلا۔ بعد میں رافیہ کے بارے میں معلوم ہونے کے بعد اس نے ولی خان کو کئی بار پیغام بھیجا مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے سوچا تھا کہ جیل سے نکل کر وہ سونا اور اپنی بیٹی کو لے کر کہیں دور چلا جائے گا۔ دس کروڑ روپے بہت بڑی رقم تھی۔ وہ باہر ملک بھی جا سکتا تھا مگر ابھی اس کی سزا میں کئی سال باقی تھے۔ اچانک ہی یہ افتاد آپڑی تھی۔ ولی خان نے اچانک پوچھا۔ ''تم حیران ہوگے کہ مجھے سونے کا علم کیسے ہوا؟''

''ہاں کیونکہ مجھ پر کیس چلنے کے دوران اس کا کہیں ذکر نہیں تھا۔''

''جب میں سونا حاصل کرلوں گا، تب تمہیں بتاؤں گا کہ مجھے سونے کا کیسے پتا چلا۔''

وہ شام کے وقت روانہ ہوئے تھے۔ اس پورے علاقے کا موسم خراب تھا لیکن جیسے ہی وہ ہری پور روڈ پر پہنچے، انہیں تیز بارش کا سامنا کرنا پڑا اور اس میں گاڑی کی رفتار نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ ولی خان فکرمند ہوگیا۔ اس

نے خالد سے کہا۔ ”اس رفتار سے تو ہم صبح پہنچیں گے۔“

اس نے تسلی دی۔ ”نہیں، اس جگہ سڑک بھی خراب ہے۔ یہاں سے نکلیں گے تو دو گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گے۔“

اس کی بات درست ثابت ہوئی۔ خراب ٹکڑا نصف گھنٹے بعد ختم ہو گیا تھا اور اب وہ تقریباً بیس میل فی گھنٹا کی رفتار سے سفر کر رہے تھے۔ صغیر فکر مند تھا۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”فی الحال تو ایک سرکاری گیسٹ ہاؤس میں رکیں گے۔“ ولی خان نے کہا۔ ”اس کے بعد دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے؟“

”وہ جنگل زیادہ بڑا نہیں ہے لیکن باغات کے بالکل ساتھ ہے۔ کوئی زیادہ دیر دوسروں کی نظروں سے بچ نہیں سکتا۔“ صغیر احمد نے انہیں خبردار کیا۔

”تم اس کی فکر مت کرو۔“ خالد نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اگر کسی نے مداخلت کی تو ہم نمٹنا جانتے ہیں۔“

ولی خان نے سر ہلایا۔ ”بہ وقتِ ضرورت ہم پولیس کی مدد بھی لے سکتے ہیں۔“

”اگر سونا مل گیا تو تم کیا کرو گے؟ اسے اصل مالک کے ورثا کے حوالے کر دو گے؟“

صغیر کے اس سوال پر وہ دونوں خاموش رہے۔ دو گھنٹے بعد وہ ایک سرکاری ریسٹ ہاؤس میں موجود تھے۔ اس موسم میں ریسٹ ہاؤس خالی تھا اس لیے انہیں آرام سے دو کمرے مل گئے۔ ایک کمرے میں صغیر اور خالد تھے، دوسرے میں ولی خان رکا تھا۔ ان کے لیے کھانا آیا پھر کافی آئی اور کافی پینے کے بعد صغیر اونگھنے لگا پھر وہ اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ اسے سوتا دیکھ کر خالد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

☆☆☆

سرمد خان شدید بارش میں برساتی میں سر جھکائے، تیز قدموں سے باغ کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ برستا پانی مٹی کو کیچڑ میں بدل رہا تھا۔ بارش سامنے سے آ رہی تھی اور اس سے اپنا چہرہ بچانے کے لیے اس نے برساتی کا ہڈ آگے کر رکھا تھا۔ باغات سے نکلتے ہی اس نے جیب سے ایک بڑی ٹارچ نکال کر روشن کر لی اور اس کا رخ زمین کی طرف کر کے اوپر جنگل کے آخری حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ ڈھلان پر پھسلن تھی مگر اس کے قدم مضبوطی سے جم رہے تھے۔ وہ یہیں پلا بڑھا تھا اور ہر موسم کا آشنا تھا۔ چند منٹ بعد وہ دوسری طرف والی ڈھلان پر تھا۔ اس نے ٹارچ کا رخ نیچے کی طرف کیا اور اسے دائرے میں گھمانے لگا۔ پہلے اس نے اسے تین بار کلاک وائز گھمایا اور پھر تین بار اینٹی کلاک وائز گھمایا۔ کچھ دیر انتظار کر کے اس نے پھر یہی عمل دہرایا۔ چند لمحے بعد نیچے سے ویسے ہی اشارہ ملا۔ کوئی شخص سڑک کے پاس کھڑا ٹارچ گھما رہا تھا۔ سرمد نے پھر اشارہ کیا۔ فوراً ہی نیچے سے روشنی اوپر کی طرف آنے لگی۔ کئی جگہوں پر روشنی رکی کیونکہ یہاں ڈھلان بہت زیادہ اور کسی قدر مشکل تھی مگر آنے والا کسی طرح اوپر پہنچنے میں کامیاب رہا۔ آخر میں اس نے ہاتھ اوپر کیا، سرمد نے پکڑ کر اسے اوپر کھینچ لیا۔ وہ دونوں کنارے سے ہٹ کر درختوں تلے آئے۔ انہوں نے ٹارچیں بند کر دی تھیں۔ آنے والا سعود خان تھا، داؤد کا بھائی۔ اس نے بیٹے سے پوچھا۔

”کیا رہا؟“

”کچھ نہیں۔“ سرمد نے جواب دیا۔ ”آپ کل آئے نہیں تھے؟“

”میں آیا تھا۔“ سعود نے کہا۔ ”لیکن اس لڑکی کو دیکھ کر واپس چلا گیا۔“

”ماں جی انتظار کرتی رہ گئیں۔“

سعود نے اس کی بات نظر انداز کی اور رافیہ کے بارے میں پوچھا۔ ”وہ یہاں کیوں آئی ہے؟“

”میں نے معلوم کیا ہے۔ وہ ولی خان کے کسی رشتے دار کی بیٹی ہے، اس کے بعد اس کی ذمے داری میں آئی۔ شہنا کے ساتھ ہی اس کے گھر میں پلی بڑھی ہے۔“

”مجھے یہ لڑکی مشکوک لگ رہی ہے۔“

”میں اس پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔“ سرمد نے کہا اور پھر دبے انداز میں بولا۔ ”بابا، موسم بہت سرد ہو گیا ہے اور آگے مزید ہوگا۔ آپ گھر آ جائیں۔ میں نے بندوبست کر لیا ہے۔ کوئی آپ کو دیکھ یا تلاش نہیں کر سکے گا۔“

”میں نہیں آ سکتا۔“ سعود نے انکار کیا۔ ”تو جانتا ہے اس میں خطرہ ہے اور میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ مجھے یقین ہے کہ میں کامیابی کے قریب ہوں۔“

”بابا، جگہ تو وہ بھی محفوظ نہیں ہے جہاں آپ چھپے ہوئے ہیں۔ پھر موسم...“

”کچھ نہیں ہوتا مجھے۔“ سعود نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”میں اپنا خیال رکھوں گا۔ اچھا، اب میں چلتا ہوں۔“

”ایک منٹ بابا۔“ سرمد نے برساتی کے نیچے سے بڑا

سا پیک شاپر نکالا۔ ”یہ ماں جی نے بھیجا ہے۔ آج ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی مگر آپ کے لیے بنایا ہے۔ اس میں سوجی کا حلوہ اور میٹھی ٹکیاں ہیں... آپ کو پسند ہیں۔“

سعود نے پیکٹ لے لیا۔ کچھ دیر ساکت کھڑا رہا پھر اس نے کھینچ کر سرمد کو سینے سے لگایا۔ چند لمحے بعد وہ ڈھلان پر اتر رہا تھا۔ سرمد اس وقت تک کھڑا رہا تھا جب تک اس کا باپ سڑک تک نہیں پہنچ گیا۔ پھر وہ سڑک پار کر کے دوسری طرف ڈھلان پر غائب ہو گیا۔ سرمد نے سر جھکایا اور واپس چل پڑا۔ اس بار اسے سر نہیں جھکانا پڑ رہا تھا کیونکہ بارش عقب سے آ رہی تھی۔ نیچے اترتے ہی اس کے قدموں کی رفتار بڑھ گئی اور باغ کے پاس پہنچ کر اس نے ٹارچ بند کر دی۔ جیسے ہی اس نے ٹارچ بند کی، اوپر جنگل کے درختوں میں ایک سایہ حرکت میں آیا۔ سائے نے ایک محدود روشنی والی ٹارچ جلائی اور اس کی روشنی میں نیچے اترنے لگا۔ پھر وہ شہنا والے باغات تک آیا اور اس نے بھی باغ میں داخل ہوتے ہی ٹارچ بجھا دی۔

☆☆☆

شہنا کی آنکھ کھلی تو باہر بارش رک گئی تھی لیکن بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ کبھی کبھی یہ کھڑکی جھنجوڑ دیتی تھی۔ شہنا بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔ وہ واش روم میں آئی، منہ ہاتھ دھو کر اس نے بال باندھے اور باہر آئی تو ریحانہ کچن میں ناشتا تیار کر رہی تھی۔ وہ دو دن سے اسے نہیں اٹھا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”بی بی، صبح آئی تھی میں آپ کو دیکھنے... آپ سو رہی تھیں۔“

”ہاں رات اچھی نیند آئی۔“ شہنا بولی۔ ”رافیہ اٹھ گئی؟“

”نہیں بی بی، وہ سو رہی ہیں۔“

شہنا فکر مند ہو گئی۔ ”اب اس کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی ہے؟ میں دیکھتی ہوں۔“

وہ رافیہ کے کمرے تک آئی۔ دستک کے جواب میں اس کی غنودہ آواز آئی۔ ”آ جاؤ۔“

شہنا اندر آئی۔ ”طبیعت ٹھیک ہے تمہاری... اتنی دیر تو نہیں سوتیں؟“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ رافیہ نے کہا۔ ”دروازہ بند کر کے میرے پاس آؤ۔“

رافیہ دروازہ بند کر کے اس کے پاس آ گئی۔ رافیہ نے اسے کھینچ کر پاس بٹھایا اور سرگوشی میں بولی۔ ”کل رات میں نے کچھ جاسوسی کی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”میں کبھی کبھی رات میں باہر نکلتی ہوں۔ کل رات میں نکلی تو میں نے باغ سے اوپر جنگل میں روشنی دیکھی۔ ایسا لگا جیسے کوئی ٹارچ کی روشنی میں اوپر جا رہا ہے۔“

شہنا کا دل دھڑک اٹھا۔ ”پھر تم نے کیا کیا؟“

”میں بھی پیچھے گئی تھی۔ بڑی مشکل سے میں اوپر پہنچی۔ کئی مرتبہ پھسل کر گرتے گرتے بچی۔“

”تم نے غلط کیا۔“ شہنا نے اضطراب سے کہا۔ ”اگر تمہیں چوٹ لگ جاتی تو اس وقت تم کسی کو مدد کے لیے بھی نہیں پکار سکتی تھیں۔“

”ہاں غلطی تو کی لیکن بس اچانک ہی خیال آ گیا اور میں نے اس پر عمل کیا۔ مگر شہنا بہت اہم بات معلوم ہوئی۔ تم جانتی ہو اوپر جانے والا کون تھا؟“

”کون تھا؟“

”تمہارے تایا کا بیٹا سرمد۔“ رافیہ نے انکشاف کیا۔ ”اور یہ سن کر تم اچھل پڑو گی کہ وہ اوپر جنگل میں کس سے ملنے گیا تھا؟“

”سعود تایا سے۔“ شہنا نے کہا تو رافیہ اچھل پڑی۔

”تمہیں پتا ہے۔“

”کامن سینس کی بات ہے... اس طرح چھپ کر سرمد اپنے باپ سے ہی ملنے جا سکتا ہے۔“

”ہاں، وہ پیچھے والی طرف سے اوپر آیا۔ دونوں باپ بیٹے کھڑے آپس میں بات کرتے رہے۔ میں دور تھی اور پھر بارش کا شور بھی تھا اس لیے ان کی باتیں نہیں سن سکی۔“

”رافیہ! تم نے بہت بڑا خطرہ مول لیا اگر وہ جان جاتے تو...“ شہنا کہتے کہتے رک گئی۔

”یہ تو بعد میں احساس ہوا۔ اس وقت مجھے جوش آ گیا تھا۔ دونوں باپ بیٹے دس منٹ باتیں کرتے رہے پھر تمہارے تایا پلٹ کر چلے گئے۔“

”کہاں چلے گئے اور وہ کہاں سے آئے تھے؟“ شہنا مضطرب ہو گئی۔

”میں نے جہاں تک دیکھا، وہ سڑک کراس کر کے دوسری طرف چلے گئے تھے۔ شہنا! مجھے ایک خیال اور آ رہا ہے۔“

”وہ کیا؟“

”وہ یہیں کہیں پاس چھپے ہوئے ہیں۔ تم نے خود بتایا تھا کہ یہ سارا علاقہ ویران ہے۔ ممکن ہے انہوں نے جنگل

میں کوئی خفیہ پناہ گاہ بنالی ہو اور وہاں رہ رہے ہوں۔"

شہنا نے سوچا تو اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ "اتنی مشکل زندگی... تم موسم دیکھ رہی ہو اس وقت؟"

"ہاں لیکن یہ آزادی اور زندگی سے بڑھ کر تو نہیں ہو سکتا۔"

"رافیہ چھوڑو اس چکر کو... اب تم باہر نہیں جاؤ گی۔ میں نے تمہیں اب تک کوئی حکم نہیں دیا ہے لیکن یہ میرا حکم ہے۔ اب تم اس چکر میں نہیں پڑو گی۔ تمہیں ذرا بھی نقصان ہوئیہ میری برداشت سے باہر ہے۔"

"اچھا بابا، اب نہیں جاؤں گی۔" رافیہ بستر سے اترتے ہوئے بولی۔ "بس ذہن پر سنک سوار ہو گئی تھی۔"

"واش روم سے آجاؤ۔" شہنا کھڑی ہو گئی۔ "ناشتا تیار ہے۔"

ریحانہ ناشتا لگا رہی تھی جب رافیہ آگئی۔ انہوں نے ناشتا کیا۔ ناشتے کے بعد شہنا نے باہر چلنے کو کہا۔ رافیہ تیار ہو گئی۔ "لیکن باہر بہت کیچڑ ہوگا۔"

"اس کے لیے ربر بوٹ ہیں۔" ریحانہ نے بتایا اور اسٹور سے ربر بوٹ نکال لائی۔ یہ لانگ شوز کی طرح تھے اور لچک دار ہونے کی وجہ سے نارمل سائز میں آرام سے آجاتے تھے۔ ہوا بہت تیز اور سرد تھی اس لیے وہ پوری طرح تیار ہو کر باہر آئے۔ شہنا نے لانگ کوٹ پہنا، سر پر ٹوپی اور ہاتھوں میں دستانے تھے۔ دھوپ نکلی تھی مگر سرد ہوا کے سامنے بے اثر لگ رہی تھی۔ شہنا نے ریحانہ کے سامنے نہیں کہا لیکن باہر آکر اس نے رافیہ سے کہا۔ "ہمیں پہاڑی پر جانا ہے۔"

رافیہ کو حیرت ہوئی۔ "وہ کیوں؟... تم تو مجھے منع کر رہی تھیں؟"

"رات میں اور اکیلے جانے سے۔" شہنا نے تصحیح کی۔ "اب دن ہے اور ہم دو ہیں۔"

"تب چلو۔" رافیہ خوش ہو گئی۔

"مجھے وہ جگہ دکھانا جہاں سرمد اور تایا ملے تھے۔"

"مجھے یاد ہے۔" رافیہ نے کہا۔ وہ عقبی دروازے سے باغ میں نکل آئے۔ بارش کے بعد وہاں مٹی گیلی تھی مگر کیچڑ کم تھا۔ جہاں تھا، رافیہ اسے بچا کر نکال لے جاتی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ پہاڑی جنگل کے آغاز پر تھے۔ یہاں سے شہنا خود چھڑی کے سہارے چلنے لگی۔ دوبارہ یہاں آنے کے بعد سارا جنگل اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا تھا۔ وہ اتنے آرام سے چل رہی تھی کہ رافیہ کو حیرت ہوئی۔ اس نے کہا۔

"لگتا ہے تمہیں سب پتا ہے کہ کہاں کیا ہے؟"

"ہاں، مجھے سب معلوم ہے۔" شہنا نے اعتماد سے کہا۔ وہ بڑے تنے والے درخت تک پہنچ گئیں۔ شہنا اس کے سیٹ نما حصے پر بیٹھ گئی۔ "اب بتاؤ وہ لوگ کہاں ملے تھے؟"

رافیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر سیدھا کیا اور پھر ایک طرف گھمایا۔ "بالکل اس سیدھ میں تقریباً دس قدم کے فاصلے پر جہاں کچھ گھنے درخت ہیں... ان کے نیچے۔"

"اور تایا کس طرف سے آئے تھے؟"

اس بار رافیہ نے مخالف سمت میں اس کا ہاتھ گھمایا۔ "اس طرف سے... اور بہت مشکل سے آئے ہوں گے کیونکہ یہاں ڈھلان بہت زیادہ ہے۔ وہ جہاں بات کر رہے تھے، میں اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھی۔"

"میں یہاں بیٹھی ہوں، تم ذرا آس پاس چلو پھرو۔"

رافیہ کو تعجب ہوا مگر اس نے شہنا کی فرمائش پر عمل کیا۔ وہ آس پاس ٹہلتی رہی اور اس سے بات کرتی رہی۔ بلندی کی وجہ سے یہاں ہوا تیز تھی مگر درختوں کے درمیان اس کا زیادہ زور محسوس نہیں ہو رہا تھا پھر بھی پتے اڑ رہے تھے اور ہوا کا شور تھا۔ شہنا نے اسے بلا لیا۔ "اب میرے پاس آجاؤ اور خاموش بیٹھو۔"

"کیا تم کسی خاص مقصد کے تحت آئی ہو؟" رافیہ نے آہستہ سے پوچھا۔

"ششش۔" شہنا نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ وہ کان لگا کر سن رہی تھی۔ پھر اس نے بہت آہستہ سے کہا۔ "کوئی نیچے سے آرہا ہے مگر اس طرف دیکھنا مت۔"

آنے والا اب نزدیک تھا اور اس کے قدموں تلے آتے پتوں اور ٹہنیوں کی آواز نمایاں تھی۔ چند لمحے بعد وہ ان کے سامنے تھا۔ رافیہ نے اسے دیکھا اور طنزیہ انداز میں بولی۔ "مسٹر سرمد... لگتا ہے تم اس جنگل پر نظر لگائے بیٹھے رہتے ہو۔"

"میں تم سے بات نہیں کر رہا۔" وہ خراب لہجے میں بولا۔ "مجھے شہنا سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"تم مجھ سے بات کر سکتے ہو۔" شہنا بولی۔

"میں تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں، رافیہ میرے ساتھ رہے گی۔"

"پلیز شہنا۔" سرمد کا لہجہ نرم ہو گیا۔

"میں چلی جاتی ہوں۔" رافیہ کھڑی ہو گئی۔ "تم بات کرلو۔"

رافیہ ان سے دور چلی گئی۔ سرمد اس کے پاس ایک پتھر پر ٹک گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "کیا تم اس پر اعتماد کرتی ہو؟"

"اگر تمہارا اشارہ رافیہ کی طرف ہے تو میرا جواب ہاں میں ہے۔" شہنا نے جواب دیا۔

"کیا یہ پہلی بار یہاں آئی ہے؟" سرمد نے اگلا سوال کیا۔ "میرا اشارہ تمہارے گھر کی طرف ہے۔"

"ہاں، یہ اس سے پہلے کبھی یہاں نہیں آئی۔"

"تب تم بے خبر ہو... یہ ایک بار پہلے بھی یہاں آچکی ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" شہنا کا لہجہ تیز ہو گیا۔

"میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم ہوشیار رہو... اگر تمہارے علم میں یہ بات نہیں ہے تو سمجھ لو، یہ تمہیں دھوکا دے رہی ہے۔"

"وہ دھوکا دے رہی ہے یا تم لوگ پھر کوئی سازش کر رہے ہو۔" شہنا کو غصہ آنے لگا۔ "اب تو یہ سب بند کردو اور تایا سے کہو خود کو پولیس کے حوالے کردیں۔ یوں چھپ چھپ کر رہنے کا فائدہ۔ میں بابا کے کیس کی پیروی نہیں کروں گی۔ تم لوگوں کے پاس پیسا ہے، تایا خود کو کلیئر کرا سکتے ہیں۔ لیکن پلیز یہ ڈراما بند کرو۔"

سرمد چونکا۔ "تم کیسے جانتی ہو یہ بات؟"

"صرف میں نہیں یہاں رہنے والا ہر فرد جانتا ہے کہ تایا سعود چھپ کر یہاں آتے ہیں اور تم لوگوں سے ملتے ہیں۔"

سرمد نے گہری سانس لی۔ "شہنا! میں تم سے اس پر بات نہیں کرنا چاہتا۔ میں صرف تم کو خبردار کرنے آیا ہوں۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہم یہاں ہیں۔" شہنا اس کی بات نظر انداز کر کے بولی۔ "اس کا مطلب ہے رافیہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تم یہاں کی نگرانی کرتے ہو اور تمہیں اس کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"مجھے حق ہے۔ یہ جنگل ہماری مشترکہ ملکیت ہے۔" سرمد نے کہا اور پلٹ کر نیچے جانے لگا۔ اس کے جاتے ہی رافیہ آگئی۔

"یہ یقیناً میرے خلاف کچھ کہہ رہا ہوگا؟"

"نہیں... وہ کہہ رہا تھا کہ بابا کی موت میں تایا سعود کا ہاتھ نہیں ہے۔" شہنا نے تردید کی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ رافیہ کو اصل بات نہیں بتائے گی اس لیے نہیں کہ اسے سرمد کی بات سے شک ہوا تھا بلکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ رافیہ کا دل خراب ہو۔ اس ویرانے میں وہی اس کی ہم مزاج اور ہم راز تھی۔ وہ چلی جاتی تو شہنا بہت بور ہوتی۔ اس کچھ عرصے میں وہ کہیں زیادہ شدت سے رافیہ سے منسلک ہو گئی تھی۔ اتنی تو وہ ان دس سالوں میں نہیں ہوئی تھی جب وہ رشنا کے گھر ساتھ رہے تھے۔ پتا نہیں رافیہ کو اس کی بات کا یقین آیا تھا یا نہیں کیونکہ اس نے بے دلی سے کہا۔

"اب چلتے ہیں۔"

شہنا نیچے جاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ سرمد کی بات درست ثابت ہو یا نہ ہو لیکن رافیہ کی بات درست ثابت ہو گئی تھی کہ سرمد یا اس کا کوئی آدمی مسلسل اس جنگل کی نگرانی کرتا تھا تاکہ جیسے ہی کوئی یہاں آئے، اسے پتا چل جائے۔ آخر ایسی کیا بات تھی اس جنگل میں؟ اگر ایسا تایا سعود کے یہاں آنے کی وجہ سے کیا جا رہا تھا تو اس کی تک نہیں بنتی تھی کیونکہ آس پاس بہت سے راستے تھے جن سے فارم تک بہ آسانی آیا جا سکتا تھا بلکہ اس راستے کی عقبی ڈھلان خاصی مشکل اور بعض جگہوں سے خطرناک تھی۔ جب داؤد اسے یہاں لاتا تھا تو اس نے شہنا کو خاص طور سے خبردار کیا تھا کہ وہ اس ڈھلان سے دور رہے اور کسی صورت اس پر قدم نہ رکھے۔ پھر کیا وجہ تھی جو تایا سعود اس طرف سے آئے تھے اور سرمد یہاں کی کڑی نگرانی کرتا تھا۔ وہ یہی بات جاننے کے لیے اس موسم میں یہاں تک آئی تھی۔

رات تک ہوا رک گئی تھی مگر آسمان پر گہرے سرمئی بادل جمع ہونے لگے تھے۔ ریحانہ نے رات میں ہی پیش گوئی کردی تھی کہ کل برف باری ہوگی۔ اس نے کہا۔ "اس بار جلدی ہو رہی ہے ورنہ دسمبر کے پہلے یا دوسرے ہفتے میں ہوتی ہے۔"

"کیا ہر جگہ ہوتی ہے؟" رافیہ نے پوچھا۔

"نہیں بی بی، بس چند بلند جگہوں پر ہوتی ہے۔ ہری پور یا نیچی جگہوں پر ہر سال نہیں ہوتی۔ جب موسم بہت زیادہ سرد ہو جائے تب ہوتی ہے۔"

"یعنی یہ ویسی برف باری نہیں ہوگی جیسی مری یا دوسری بلند جگہوں پر ہوتی ہے؟"

"نہیں بی بی... برف گرتی ہے اور چند دن بعد صاف ہو جاتی ہے پھر گرتی ہے اور پھر صاف ہو جاتی ہے، مستقل نہیں رہتی۔ بہت زیادہ بھی نہیں ہوتی۔"

رافیہ پُرجوش ہو گئی۔ اس نے شہنا سے کہا۔ "اگر کل برف گری تو ہم باہر جائیں گے۔"

شہنا جب تک یہاں تھی، وہ پہلی برف باری میں باہر

ضرور جاتی تھی۔ وہ اور داؤد برف سے کھیلتے تھے۔ پھر وہ رشنا کے پاس چلی گئی۔ ان دس برسوں میں وہ دو بار ہی برف باری دیکھنے مری گئی تھی اور اسے قطعی مزہ نہیں آیا تھا کیونکہ وہاں رش بے پناہ تھا اور ذرا بھی پرائیویسی نہیں تھی۔ پھر داؤد اس کے ساتھ نہیں تھا جو اس کے ساتھ کھیلتا اور شہنا انجوائے کرتی۔ رافیہ نے برف باری کے حوالے سے بات کی تو وہ بھی پُرجوش ہوگئی۔ رافیہ نے نیچے آنے کے بعد سرمد کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ شہنا کو اس پر شک نہیں تھا مگر وہ سوچ رہی تھی کہ رافیہ پہاڑی والے جنگل میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی نہیں لے رہی ہے۔ یہاں آنے کے بعد وہ کئی بار وہاں جا چکی تھی اور پہلی بار تیز بارش میں چلی گئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ بارش میں اس جگہ کا نظارہ کرنا چاہتی تھی۔

شام کے وقت شہنا کی طبیعت پھر گری گری سی ہونے لگی۔ سر میں درد اور ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ ایسی کیفیت اسے بخار سے پہلے ہوتی تھی۔ وہ دوا لے کر سرِشام ہی لیٹ گئی اور ایم پی تھری پلیئر پر اپنی پسند کے گانے سننے لگی۔ رافیہ بھی اپنے کمرے تک محدود تھی۔ اوپر سے آنے کے بعد اس نے بس لنچ کیا اور اس کے بعد اپنے کمرے سے نہیں نکلی تھی۔ شریف گل نے ہری پور جانے کی اجازت طلب کی۔ اسے ٹرک کا حساب کتاب کرنا تھا۔ ساتھ ہی کچھ کام بھی کرانا تھا۔ اس نے کہا۔ ''بی بی، سردی میں اکثر کاریگر چلے جاتے ہیں، اس سے مشکل ہوتی ہے۔ میں ٹرک کے ضروری کام کرانا چاہتا ہوں تاکہ باقی سیزن میں کوئی مسئلہ نہ ہو۔''

''ٹھیک ہے، تم چلے جاؤ۔'' شہنا نے اسے اجازت دے دی۔

☆☆☆

صبح سے موسم خراب تھا۔ جہاں ریسٹ ہاؤس تھا، وہاں ہلکی بارش ہو رہی تھی اور رپورٹ تھی کہ اوپری علاقوں میں برف باری ہو رہی تھی۔ وہ سارا دن آرام کرتے رہے۔ صغیر کی آنکھ اسی کرسی پر کھلی جس پر وہ گزشتہ رات سویا تھا۔ آتش دان جل رہا تھا اس لیے سردی نہ ہونے کے برابر تھی۔ خالد نے مسکرا کر کہا۔ ''تم بیٹھے بیٹھے سو گئے تھے۔''

اس نے بدمزگی سے کہا۔ ''میں سو گیا تھا یا مجھے کافی میں کچھ دیا گیا تھا۔''

''تم کچھ بھی سمجھنے کے لیے آزاد ہو۔'' خالد نے بے پروائی سے کہا۔ انہوں نے کمرے میں ہی ناشتا اور دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ صغیر سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ یہاں کیوں رکے ہیں؟ وہ جانتا تھا کہ وہ جگہ یہاں سے کچھ ہی دور ہے۔ اس نے شام کے وقت ولی خان سے پوچھا۔

''ہم یہاں کیوں رکے ہیں؟''

''رات کے انتظار میں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''تاریکی ہوتے ہی ہم روانہ ہوں گے اور تم ہمیں وہاں لے جاؤ گے جہاں تم نے سونا چھپایا تھا۔''

''میں بتا چکا ہوں سونا...''

''جھوٹ مت بولو... سرغنہ تم تھے اور سونا دوسرے کیسے چھپا سکتے ہیں۔'' خالد نے غرا کر کہا۔

''تم اپنی بیٹی کے بارے میں سوچو، اس سے تمہیں بہتر فیصلہ کرنے میں مدد ملے گی۔'' ولی خان نے اسے مشورہ دیا۔

صغیر نے سرد آہ بھری۔ ''بیٹی کی وجہ سے تو مجبور ہوں میں۔''

''اسی میں تم دونوں کی بہتری ہے۔'' خالد بولا۔

صغیر اب تک نہیں سمجھ سکا تھا کہ خالد کس حیثیت سے اس معاملے میں شامل تھا۔ اپنے ڈیل ڈول اور دبنگ انداز سے وہ کسی ایجنسی کا آدمی لگتا تھا۔ مگر اب تک اس نے اپنا عہدہ نہیں بتایا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ولی خان نے اسے صغیر کی نگرانی اور اس پر قابو رکھنے کے لیے شامل کیا تھا۔ ولی خان خود عام سا آدمی تھا۔ وہ جانتا تھا، صغیر ایک سفاک مجرم ہے اور اس کے ہاتھوں پر کئی انسانوں کا خون تھا۔ اس لیے اس پر سخت نگرانی رکھنا لازمی تھا۔ صغیر کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ کہیں جا نہیں سکتا تھا اور نہ ہی کسی سے رابطہ کر سکتا تھا۔ وہ اتنے محتاط تھے کہ اسے رات کو کافی میں نیند کی دوا دے دی تاکہ وہ سوتا رہے اور ان کی کسی غفلت سے فائدہ اٹھا کر فرار کی کوشش نہ کرے۔ سات بجے انہوں نے رات کا کھانا بھی کھا لیا۔ صغیر کا خیال تھا کہ وہ اس کے فوری بعد روانہ ہوں گے۔

مگر وہ دس بجے وہاں سے نکلے۔ انہوں نے لباس بدل لیے تھے اور اب وہ گرم لباس اور لیدر جیکٹوں میں تھے۔ پاؤں میں ایسے جوتے تھے جو پہاڑی راستوں کے لیے موزوں تھے۔ وہ تمام سامان کے ساتھ آئے تھے۔ بارش رک گئی تھی لیکن آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی وقت بارش کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جائے گا۔ حسبِ سابق خالد ڈرائیونگ کر رہا تھا اور ولی خان پیچھے بیٹھا تھا۔ نصف گھنٹے بعد وہ پہاڑی کے نیچے تھے۔ یہاں برف پڑی تھی اور ڈھلان کے پاس ڈھیر

کی صورت میں جمع ہو گئی تھی۔ صغیر نے پہاڑی کے اوپر اشارہ کیا۔ ''سونا وہاں ہے۔''

''چلو اترو۔'' خالد نے کہا اور نیچے اتر کر ڈکی کھولی اور اس سے زمین کھودنے کا سامان نکالنے لگا۔ صغیر نے منع کیا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے، ایک کھرپی کافی ہوگی۔''

ولی خان نے اسے شک سے دیکھا۔ ''تم نے وہ سونا ایسے چھپایا تھا کہ صرف ایک کھرپی سے نکال لیا جائے تمہارا کیا خیال ہے، وہ اب وہاں ہوگا؟''

''وہ جگہ ایسی تھی۔'' صغیر نے کہا۔ ''ہاں، یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ سونا وہیں ہے یا کسی نے نکال لیا ہے۔''

''کون نکال سکتا ہے؟''

''میرے ساتھی۔'' صغیر بولا۔ ''جو گرفتار نہیں ہوئے تھے۔''

''وہ زندہ نہیں ہیں۔'' ولی خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے یقین ہے تم نے انہیں قتل کر کے ان کی لاشیں کہیں دفنا دی ہوں گی۔ تبھی وہ غائب ہیں۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' صغیر نے اسے گھورا۔ وہ خود کو بے پروا ظاہر کر رہا تھا لیکن وہ ہل کر رہ گیا تھا۔

''جب تم گرفتار ہوئے تو تمہارے پاس سے لوٹ کا سارا مال نکلا تھا۔ اگر وہ زندہ تھے تو انہوں نے تم سے حصہ کیوں نہیں لیا؟''

صغیر کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ چند لمحے بعد وہ سر جھکائے پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ سب سے آگے ولی خان تھا، اس کے پیچھے صغیر اور اس کے پیچھے پستول بدست خالد تھا۔ خالد نے اسے پھر خبردار کیا تھا کہ وہ فرار یا کسی غلط حرکت کا سوچے بھی مت ورنہ وہ اسے شوٹ کر دے گا۔ برف کی وجہ سے ڈھلان پر بہت پھسلن تھی اور بعض جگہوں پر انہیں باقاعدہ چاروں ہاتھوں پیروں سے چڑھنا پڑا۔ چند منٹ بعد وہ اوپر کھڑے اپنی سانسیں درست کر رہے تھے۔ ولی خان نے کہا۔ ''اب بتاؤ سونا کہاں ہے؟''

''اس درخت کی جڑ میں۔'' صغیر نے بڑے تنے والے درخت کی طرف اشارہ کیا۔

☆☆☆

شہنا سونے کی کوشش کر رہی تھی مگر طبیعت کی بے چینی کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ گھر کے اندر سناٹا تھا جس میں کبھی کبھی آتش دان میں چٹخنے والے کوئلے کی آواز ارتعاش پیدا کرتی تھی۔ اچانک شہنا کو لگا جیسے رافیہ کے کمرے سے عجیب سی آواز آئی ہو۔ یہ آواز ایسی تھی جیسی کسی الیکٹرانک آلے سے بیپ آتی ہے مگر صرف ایک لمحے کے لیے تھی۔ اس نے سماعت مرکوز کی۔ اس بار اسے واضح آہٹیں سنائی دیں۔ ایک دفعہ ایسی آواز آئی جیسے جوتا فرش پر رکھا گیا ہو۔ شہنا چونک گئی۔ کیا رافیہ اس وقت کہیں جا رہی تھی؟ شہنا نے اٹھ کر دروازے سے کان لگایا اور پھر اس نے جلدی سے اپنے جوتے اور گرم کوٹ پہنا۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو وہ رافیہ سے پوچھ لیتی لیکن اتنی رات گئے وہ کہاں جا رہی تھی؟ جب تک

اس نے کوٹ پہنا برابر والے کمرے کا دروازہ کھلا اور رافیہ باہر آگئی۔ شہنا نے عجلت میں اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کرلیا۔ چند لمحے بعد باہر سے ہینڈل گھمایا گیا مگر دروازہ اندر سے لاک تھا اس لیے نہ کھل سکا۔

رافیہ کچھ دیر کھڑی رہی پھر جوتوں کی آہٹ دور جانے لگی۔ شہنا نے چھڑی اٹھائی پھر اسے خیال آیا اور اس نے سائڈ دراز کھول کر اس کے اندر رکھی ایک چیز نکال کر کوٹ کی جیب میں رکھی اور جیسے ہی بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی، وہ باہر نکل آئی۔ گھر میں اسے چھڑی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ باہر آنے والی یخ بستہ ہوا نے اسے لرزا دیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ واپس پلٹ جائے مگر وہ متجسس تھی۔ رافیہ یوں چھپکے سے کہاں جارہی تھی؟ وہ ہمت کرکے باہر نکل آئی۔ رافیہ گھر سے نکل گئی تھی کیونکہ اس کے پیروں کی آہٹ نہیں آرہی تھی۔ وہ عقبی دروازے سے باغ میں آئی تو اسے آہٹ سنائی دی۔ رافیہ اوپر کی طرف جا رہی تھی۔ شہنا چھڑی سے زمین ٹٹولتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ یہاں باغ میں درخت سیدھی قطاروں میں لگے تھے اور ان کے درمیان.... صاف راستہ تھا۔ اس لیے اسے کوئی مشکل نہیں ہورہی تھی۔ وہ دوسری قطار میں آگئی تاکہ رافیہ پلٹ کر بھی دیکھے تو اسے نظر نہ آئے۔ کچھ دیر میں وہ جنگل کے سرے پر تھے اور رافیہ یہاں سے بھی آگے بڑھ گئی تھی۔ درمیان میں ایک جگہ شاید ٹھوکر کھا کر اس نے زیرلب شٹ کہا تھا اور شہنا کا رہا سہا شبہ بھی جاتا رہا۔ وہ جنگل کے کنارے کھڑی سوچ رہی تھی کہ اب کیا کرے۔

☆☆☆

ولی خان اور خالد، صغیر کے سر پر کھڑے تھے اور وہ درخت کی جڑوں کے درمیان والی جگہ کھود رہا تھا۔ وہ کھرپی استعمال کر رہا تھا۔ اس جگہ اس سے بڑے کسی اوزار کے استعمال کی گنجائش نہیں تھی۔ انہوں نے چھوٹی سی ٹارچ روشن کی ہوئی تھی اور اس کی روشنی کو بھی محدود رکھا تھا تاکہ دور سے دکھائی نہ دے۔ خالد بار بار صغیر کو جلدی ہاتھ چلانے کو کہہ رہا تھا۔ ایک بار وہ جھنجلا گیا۔ اس نے ہاتھ روک لیا اور بولا۔ ”اگر تمہیں جلدی ہے تو خود کھودلو۔“

”اسے کام کرنے دو۔“ ولی خان نے آہستہ سے کہا۔

”یہ وقت ضائع کررہا ہے۔“

”کتنا وقت ضائع کرے گا... اسے سونا نکالنا ہی پڑے گا۔“

صغیر اکڑوں بیٹھا ہوا دونوں جڑوں کے درمیان والی خالی جگہ سے مٹی کھود رہا تھا۔ وہ کھرپی مارتا اور پھر نکلنے والی مٹی کھرپی سے پیچھے پھینکتا۔ ہاتھ سے یہ کام ممکن نہیں تھا کیونکہ زمین برف کی طرح سرد تھی۔ پھر کھرپی کسی دھاتی چیز سے ٹکرائی کیونکہ آواز ایسی آئی تھی۔ آواز ولی خان اور خالد نے بھی سنی تھی۔ وہ اضطراری طور پر آگے آئے۔ خالد نے کہا۔ ”یہ آواز کیسی تھی؟“

”دیکھ رہا ہوں۔“ صغیر نے ٹٹولتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے ایک طرف سے آواز آئی۔

”تم دونوں اپنے ہاتھ اوپر کرلو... تم میرے نشانے پر ہو۔“

آواز رافیہ کی تھی اور وہ ایک درخت کی آڑ میں تھی۔ خالد نے بھڑک کر پستول کا رخ اس کی طرف کردیا۔ ولی خان نے بےیقینی سے کہا۔ ”رافیہ تم...؟“

”ہاں میں۔“ رافیہ نے کہا۔ اس وقت ولی خان اور خالد دونوں کی توجہ اس کی طرف تھی۔ اس لیے وہ صغیر کو حرکت کرتے نہیں دیکھ سکے۔ اس نے اچانک ہی جڑوں کے درمیان سے ایک درمیانے سائز کا چاقو نکالا اور خالد کے پیٹ میں اتار دیا۔ وہ کراہ کر جھکا اور اس کے ہاتھ سے پستول گر گیا۔ صغیر نے پھرتی سے پستول اٹھا کر اس کا رخ ولی خان کی طرف کردیا۔

”آں... ہاں، حرکت مت کرنا۔“

ولی خان کا جیکٹ کی جیب کی طرف بڑھتا ہاتھ رک گیا۔ اس نے کہا۔ ”تم اچھا نہیں کررہے ہو صغیر۔“

”میں اکثر اچھا نہیں کرتا اسی لیے جیل گیا تھا۔“ صغیر نے کہا اور اس کی جیکٹ سے پستول نکال لیا۔ پھر اس نے رافیہ کی طرف دیکھا، وہ سامنے آگئی تھی۔ ”تمہیں میرا سگنل مل گیا تھا؟“

”بالکل ابو، اسی لیے تو میں یہاں ہوں۔ آپ کو ریڈیو آرام سے مل گیا تھا؟“

”ہاں، جڑ میں سامنے ہی چھپا ہوا تھا۔“ صغیر نے کہا۔ ”میں دیر کررہا تھا کہ تم آجاؤ۔“

”میں سگنل ملتے ہی روانہ ہوگئی تھی۔“

ولی خان حیرت سے ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ ”کیا تم دونوں پہلے سے واقف تھے کہ ہم یہاں آئیں گے؟“

”بالکل...“ صغیر نے کہا۔ ”یہ میرا پلان تھا۔

میں نے رافیہ کو اس میں شامل کیا تھا۔“

”تم رافیہ سے رابطے میں تھے؟“ ولی خان مزید حیران ہوا۔ ”مجھے علم ہی نہیں تھا۔“

”میں دو سال سے ابو سے رابطے میں تھی۔“ رافیہ نے کہا۔ ”پہلے میں نے تمہیں قابو کرنے کی کوشش کی لیکن تم قابو میں نہیں آئے۔“ رافیہ کا لہجہ بےشرم ہوگیا۔ ”حالانکہ تمہاری بیوی بھی مرچکی تھی۔ اگر تم مجھ سے شادی کرلیتے تو میں تمہاری مدد سے ابو کو جیل سے نکلوا لیتی۔“

”یہ ممکن نہیں ہوتا۔“ ولی خان نے نفی میں سر ہلایا۔

”بالکل اسی طرح ممکن تھا جیسے ابھی نکلوایا ہے۔“ صغیر نے کہا۔

ولی خان نے جھک کر خالد کو دیکھا۔ وہ ہوش میں تھا اور اپنے زخم پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ ”تم ٹھیک ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

ولی خان نے صغیر کی طرف دیکھا۔ ”اسے اسپتال لے جانا ہوگا۔ یہ مرگیا تو تم پر ایک مقدمہ اور بنے گا اور اس بار تمہیں پھانسی ہوگی۔“

”تم اس کی نہیں، اپنی فکر کرو۔“ صغیر نے سرد لہجے میں کہا۔

”سوال یہ ہے کہ جب تمہارا اپنی بیٹی سے رابطہ تھا تو تم نے اتنا لمبا چکر کیوں چلوایا؟ خالد کو نامعلوم شخص کی طرف سے خط بھیجا گیا جس میں سونے کا ذکر تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ جب ہم نے تحقیق کی تو پتا چلا کہ پچ سنار کی دکان سے ایسا ایک بریف کیس بھی لوٹا گیا تھا مگر یہ سونا غیر قانونی تھا اور اسمگل ہوکر آیا تھا اس لیے ایف آئی آر میں اس کا ذکر نہیں ہوا۔ مگر جب میں نے اپنے طریقے سے تحقیق کرائی تو بات کھل گئی۔“

”وہ خط میں نے خالد کو لکھا تھا۔“ رافیہ بولی۔ ”مجھے معلوم تھا کہ وہ تمہارا ماتحت ہے اور تم سے ضرور ذکر کرے گا۔“

”اور تم لاج میں آجاؤ گے۔“ صغیر نے کہا۔

ولی خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم غلط سمجھ رہے ہو... ہمارا مقصد اس گم شدہ سونے تک پہنچنا تھا، وہ حکومت کی امانت ہے۔ اس کام کے بعد تمہیں دوبارہ جیل پہنچا دیا جاتا۔“ ولی خان نے کہا۔ ”شاید تم نہ مانو لیکن یہ سچ ہے اور تم نے بتایا نہیں کہ جب تمہارا رافیہ سے رابطہ تھا تو تم اسے سونے کی جگہ بتادیتے، یہ نکال لیتی۔“

”میں نے یہی کیا تھا۔“ صغیر بولا۔

آدھی قیمت

دکان دار گاہک سے: ”کیوں جناب آپ ریڈیو کی آدھی قیمت کیوں دینا چاہتے ہیں؟ یہ ریڈیو بالکل نیا ہے۔ سیکنڈ ہینڈ نہیں ہے۔“

گاہک: ”اس لیے جناب کہ میں ایک کان سے سنتا ہوں۔“

”اور میں یہاں آئی تھی۔“ رافیہ بولی۔ ”یہ چھ مہینے پہلے کی بات ہے مگر مجھے سونا نہیں ملا۔ اسے پہلے ہی کسی نے نکال لیا تھا۔“

”اب میں معلوم کروں گا کہ سونا کس نے نکالا۔“ صغیر مسکرایا۔ ”میرا اصل مسئلہ جیل سے باہر آنا تھا، وہ تم نے حل کردیا۔“

ولی خان نے رافیہ کی طرف دیکھا۔ ”میں نے تمہیں بیٹی سمجھ کر اپنے گھر میں رکھا۔ پھر رشنا کے بعد تم نے روپ بدلا، تب بھی میں اسے کچھ اور سمجھا لیکن تمہاری حقیقت اب سامنے آئی ہے۔ تم ایک مجرم باپ کی مجرم ذہن رکھنے والی لڑکی ہو۔“

”تم جو چاہے سمجھو۔“ وہ بےپروائی سے بولی۔ ”ابو، میرا اندازہ ہے کہ سونا یہاں سے سرمدیا اس کے باپ نے نکالا ہے۔ ان سے نمٹ کر ہم ان کی طرف چلتے ہیں۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ ایک طرف سے آواز آئی تو صغیر اور رافیہ بھی اچھل پڑے۔ ”سونا میں نے نکالا تھا... میں جاننا چاہتا تھا کہ کون یہاں اس سونے کے لیے آتا ہے۔“

”کون ہو تم؟“ صغیر سخت لہجے میں بولا۔ ”سامنے آؤ۔“

”میں سعود خان ہوں، داؤد خان کا بھائی۔“ وہ بولا۔ ”دس برس سے میں انتظار کررہا تھا کہ میرے بھائی کا قاتل آئے اور میں اس سے بدلہ لے سکوں۔“

صغیر نے چھوٹی ٹارچ کا رخ اس طرف کردیا تھا جہاں سعود موجود تھا لیکن وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ رافیہ ابھی تک تاریکی میں تھی، وہ خاموشی سے پیچھے کھسکنے لگی۔ صغیر نے اس کی حرکت محسوس کرلی۔ اس نے سعود کو متوجہ کرنے کے لیے بات جاری رکھی۔ ”تمہارا خیال ہے داؤد خان کو میں نے قتل کیا ہے؟“

''ہاں، مجھے تمہاری صورت نظر نہیں آ رہی ہے لیکن میں نے قاتل کو دیکھا تھا اور میں اسے پہچان سکتا ہوں۔''
''میں وہ نہیں ہوں۔''
''تم وہی ہو۔'' سعود خان بولا۔ اس کا لہجہ جذباتی ہو رہا تھا۔ ''تم یہاں سونا چھپا رہے تھے جب داؤد نے تمہیں دیکھ کر للکارا اور تم نے اسے شوٹ کر دیا۔ حالانکہ وہ خالی ہاتھ تھا۔ فائر کی آواز سن کر میں اس طرف آیا تو تمہیں بھاگتے دیکھا اور میں نے تم پر فائر کیے۔ جب تک میں ڈھلان تک پہنچا، تم نیچے موجود گاڑی میں بیٹھ کر بھاگ نکلے۔ کاش کہ میں چند لمحے پہلے آجاتا تو تم اسی دن مارے جاتے۔''
''اپنے بھائی کو تم نے قتل کیا تھا اور اسی خوف سے تم چھپے رہے۔''
''نہیں، میں اس خوف سے نہیں چھپا تھا۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ مجھ پر شک کیا جائے گا مگر میں صرف تمہارے لیے روپوش ہوا تھا۔ میں نے سونے والا سوٹ کیس داؤد کے قتل کے چند دن بعد ہی تلاش کر لیا تھا۔ مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم جیل میں ہو۔ میں تو تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اگر جانتا تو تمہیں قتل کرنے کے لیے جیل آجاتا۔''
صغیر نے گہری سانس لی۔ ''تو اب تم جان گئے ہو... وہ سونا کہاں ہے؟''
''وہ محفوظ ہے لیکن وہ تمہیں نہیں ملے گا بلکہ جس کی امانت ہے، اسے واپس ملے گا۔ تمہیں صرف موت ملے گی جو دس برس سے یہاں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔''
صغیر نے اچانک ہی ولی خان کو قابو کر کے سامنے کر لیا۔ اس نے پستول آگے رکھا تھا۔ ''اگر تم نے مجھ پر گولی چلائی تو پہلے یہ مرے گا۔''
''تم کیا سمجھتے ہو، اس وقت مجھ سے بچ جاؤ گے۔ ٹھیک ہے میں ابھی گولی نہیں چلاؤں گا لیکن میں ہمیشہ تمہیں تلاش کروں گا... چاہے تم دنیا کے دوسرے سرے پر چلے جاؤ اور میں تمہیں تلاش کر کے ضرور قتل کروں گا۔'' سعود کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔
''تم ایسا نہیں کرو گے سعود خان۔'' رافیہ کی آواز آئی۔ ''ہلنا مت، تم میرے نشانے پر ہو۔''
☆☆☆
شہنا ان سے کچھ فاصلے پر تھی۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی تھی اور اس نے اپنی چھڑی تہ کر کے رکھ لی تھی۔ وہ یخ بستہ زمین کو چھو چھو کر آگے بڑھ رہی تھی اور اس کے کان آہٹوں پر مرکوز تھے۔ ساتھ ساتھ وہ ان لوگوں کی گفتگو بھی سن رہی تھی۔ سعود کی آواز سن کر اس کا دل تڑپا اور یہ جان کر وہ بے تاب ہو گئی کہ اس کا چچا اس کے باپ کا قاتل نہیں تھا بلکہ وہ قاتل کے انتظار میں دس برس سے گھر سے دربدر تھا۔ اسے معلوم تھا کہ رافیہ کہاں ہے اس لیے جب اس نے حرکت شروع کی تو شہنا کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی اور طرف جا رہی ہے۔ صغیر اور سعود میں بات جاری تھی مگر رافیہ خاموش تھی۔ پھر اس نے سنا رافیہ سعود سے کہہ رہی تھی کہ وہ حرکت نہ کرے، اس نے اسے نشانے پر لے رکھا ہے۔ جواب میں سعود نے اس سے کہا۔
''تمہارا باپ میرے نشانے پر ہے۔''
''میں تین تک گنوں گی۔'' رافیہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اگر تم نے رائفل نہیں پھینکی تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گی۔''
شہنا نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ رافیہ گنتی گن رہی تھی۔ شہنا نے ہاتھ سیدھا کیا۔ اپنی سماعت مرکوز کی اور سانس روک لی۔ جیسے ہی رافیہ نے تین کہا، اس نے فائر کر دیا۔ دھماکے کے ساتھ ہی رافیہ کی چیخ سنائی دی۔ وہ نیچے گری تو صغیر چلّایا۔ ''رافیہ... کیا ہوا؟''
رافیہ مسلسل چیخ رہی تھی۔ صغیر ولی خان کو چھوڑ کر اس کی طرف لپکا۔ وہ زمین پر گری تھی اور اپنی ران تھامے رو رہی تھی۔ سعود اس سے کچھ دور کھڑا تھا۔ صغیر نے اس کی طرف دیکھا اور غضب ناک لہجے میں بولا۔ ''تو نے گولی چلائی ہے۔ میری بیٹی کو کچھ ہوا تو میں تجھے مار ڈالوں گا۔''
سعود حیران تھا اور اس کا رائفل والا ہاتھ جھک گیا تھا۔ صغیر نے اس کی طرف پستول سیدھا کیا تو اس کے پاس موقع نہیں تھا کہ وہ رائفل پھر سے اوپر کرتا۔ مگر اس سے پہلے کہ صغیر گولی چلاتا، عقب سے ولی خان نے اس کے سر پر شاخ ماری۔ وہ دبے قدموں اس تک آیا تھا۔ شاخ اسے پاس ہی پڑی ملی تھی۔ ایک منٹ میں صغیر بے بس اور نہتا نیچے پڑا تھا۔ سعود نے رائفل اس کی طرف سیدھی کی۔ ''اب بولو کون مرے گا۔ آج برسوں بعد میں سکون کی نیند سو سکوں گا۔''
''نہیں تایا۔'' شہنا بولی تو وہ چونک گیا۔ وہ اب تک تاریکی میں تھی اور کسی نے اسے فائر کرتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ حیران ضرور تھے کہ رافیہ پر کس نے گولی چلائی ہے؟
''شہنا... تو یہاں ہے۔'' سعود نے بے یقینی سے کہا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور پھر اسے سینے سے

لگالیا۔ ''تو ٹھیک ہے نا... یہاں کیسے آئی؟''

''میں رافیہ کا پیچھا کرتے ہوئے آئی تھی۔'' شہنا نے نفرت سے کہا۔ ''مجھے بالکل پتا نہیں تھا یہ ایسی ہوگی۔ کیا یہ زندہ ہے؟''

اب رافیہ خاموش تھی۔ سعود نے پہلی بار اس کے پاس پستول دیکھا اور حیران ہو کر بولا۔ ''گولی تو نے چلائی تھی؟''

''ہاں، بابا نے مجھے آواز پر نشانہ لگانا سکھایا تھا۔'' وہ فخر سے بولی۔

داؤد کے ذکر پر سعود کو یاد آیا کہ اسے اپنے بھائی کا انتقام لینا ہے۔ اس کے لیے اس نے دس مشکل برس انتظار کیا تھا اور اب قاتل اس کے سامنے تھا۔ وہ آگے جانے لگا تو شہنا اس سے لپٹ گئی۔ ''نہیں تایا... اسے مت ماریں... اسے پولیس کے حوالے کریں۔ اب اس پر بابا کے قتل کا مقدمہ چلے گا۔ یہ پھانسی کی سزا پائے گا۔''

''لیکن اس سے میرا دل ٹھنڈا نہیں ہوگا۔''

''پلیز تایا... پلیز۔'' شہنا نے التجا کی۔ ''بابا کے بعد میں آپ سے محروم ہونا نہیں چاہتی۔ ابھی آپ نے مجھے سینے سے لگایا تو مجھے بابا کی خوشبو آئی تھی۔ پلیز تایا... آپ کو بابا کی قسم۔''

سعود اتنی آسانی سے نہ مانتا۔ وہ نہایت مستقل مزاج شخص تھا ورنہ یوں دس برس انتظار نہ کرتا۔ مگر بھائی کی قسم نے اسے مجبور کر دیا۔ اس دوران میں نیچے سے سرمد اور دوسرے لوگ آگئے تھے۔ انہوں نے بھی فائر کی آواز سنی تھی۔ خالد زندہ تھا، اسے فوری طور پر رافیہ کے ساتھ ہری پور روانہ کر دیا گیا۔ سرمد خود اپنی گاڑی میں انہیں لے گیا تھا۔ اسی نے پولیس کو اطلاع دی تھی۔ دو گھنٹے بعد پولیس آئی مگر سرمد کی اطلاع پر نہیں بلکہ ولی خان اور خالد کا سن کر جو وفاقی افسران تھے۔ پولیس آئی تو ولی خان نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے سعود سے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ سچی بات ہے میں بھی وہی سمجھ رہا تھا جو دوسرے سمجھ رہے تھے اس لیے بھی اس کیس سے دور رہا۔ مگر اب میں خود اسے دیکھوں گا۔ تم فکر مت کرو، اب یہ پھانسی سے نہیں بچے گا۔''

شہنا نے ولی خان کو بتایا کہ رافیہ نے اس کے بارے میں کیا کہا تھا تو وہ دکھی ہو گیا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ میں نے اسے اپنی بیٹی سمجھا... مگر رشنا کے بعد اس کا رویہ بدل گیا، تب بھی میں نے اسے فطری بات سمجھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے باپ کی طرح مجرم ذہن کی نکلے گی۔''

''اس نے مجھے گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ رشنا خالہ کی موت بھی طبعی نہیں تھی۔''

''یہ حقیقت ہے۔'' ولی خان نے انکشاف کیا۔ ''میں نے بتایا نہیں لیکن ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ رشنا کے جسم میں کچھ ایسے زہر پائے گئے ہیں جو جگر کو ناکارہ بنا دیتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ رشنا نے غلطی سے کوئی ایسی چیز کھالی تھی۔''

''یہ غلطی نہیں ہوگی۔'' سعود نے کہا۔ ''اب مجھے شک ہے یہ بھی اسی لڑکی کا کام ہے۔ وہ رشنا کی جگہ لینا چاہتی تھی اور اس کی زندگی میں یہ ممکن نہیں تھا اس لیے اس نے اسے راستے سے ہٹا دیا۔ ایسے زہر حاصل کرنا ہمارے ہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''میں تحقیق کراؤں گا۔''

ولی خان صبح کے وقت صغیر اور رسونا لے کر روانہ ہوا کیونکہ اسے دونوں کو اپنی اپنی جگہ پہنچانا تھا۔ شہنا ساری رات کی جاگی ہوئی تھی۔ اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی مگر وہ بہت خوش تھی۔ برسوں سے اس کے دل پر بوجھ تھا کہ کیا اس کا تایا ہی اس کے باپ کا قاتل ہے؟ آج یہ بوجھ اتر گیا تھا۔ سعود اس کے پاس تھا۔ وہ اسے خود سے الگ ہی نہیں کر رہا تھا جیسے برسوں کا پیار ایک ہی بار دینا چاہتا ہو۔ وہ شہنا کو بتا رہا تھا کہ اس کے اور داؤد کے مزاج میں فرق تھا۔ ان میں بے تکلفی نہیں تھی مگر اسے دنیا میں اگر کسی سے سب سے زیادہ محبت تھی تو وہ اس کا بھائی تھا۔ باپ کے ذکر پر بار بار شہنا کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ مگر وہ خوش تھی کہ اسے باپ جیسا تایا مل گیا تھا اور اس کے باپ کا اصل قاتل پکڑا گیا تھا۔

خالد بچ گیا تھا اور یہ کیس اسی کے نام رہا تھا۔ صغیر کو واپس جیل بھیج دیا گیا اور اب اس پر داؤد کے قتل کا مقدمہ چل رہا تھا۔ رافیہ بھی پولیس کی تحویل میں تھی اور اس نے اعتراف کیا تھا کہ رشنا کو اس نے زہر دیا تھا مگر وہ عدالت میں اس اقرار سے مکر گئی۔ کیونکہ رشنا کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوا تھا اس لیے رافیہ پر فرد جرم عائد کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ البتہ اسے اپنے مجرم باپ کی معاونت کرنے پر مقدمے کا سامنا تھا۔ چند سال کی سزا سے بچنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ستار کے ورثا نے سونے پر ڈیوٹی ادا کر کے اسے قانونی بنا لیا تھا اور وہ بھی خوش تھے کیونکہ ستار کے قتل اور ڈکیتی کے بعد وہ مالی مشکلات کا شکار رہے تھے۔ اب انہیں کروڑوں روپے مالیت کا سونا مل گیا تھا۔ اس کی مدد سے وہ پھر اپنا کاروبار شروع کر سکتے تھے۔